رجسٹرڈ نمبر ۱ اے — جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی
و
شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت :- چھ روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب مین داخل کر لیا، اس لئے چند برسون کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم، اور اضافون کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہین، اور بعض زیر طباعت ہین، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصہ اوّل

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی و تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۲۹۵ صفحے قیمت: سے

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت:- ۳۶۳ صفحے

قیمت:- سے

"منیجر"

تاریخ اسلام حصہ سوم

(بنی عباس اوّل)

یعنی ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ ۷۵۰ء سے ابواسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ ۹۴۴ء تک دو صدیون کی سیاسی تاریخ، قیمت عہ

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ،

ضخامت:- ۳۳۲ صفحے

قیمت:- عہ

"منیجر"

جلد ۶۶ ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۵۰ء عدد ۱

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکومت کی زبان ہندی قرار پاجانے کے بعد اردو زبان کی خدمت کی نوعیت اور اُس کے طریقہ کار میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ناگزیر ہے، اس لئے انجمن ترقی اردو ہند نے نئے حالات کے مطابق اپنے اغراض و مقاصد اور لائحۂ عمل متعین کیا ہے، اس میں دوسرے کاموں کے ساتھ ہندوستانی زبان کی اشاعت اور دیوناگری اور رومن رسم الخط میں اردو کی معیاری کتابوں کا منتقل کرنا بھی ہے، غالباً اس کی مصلحت یہ ہے کہ ہندوستانی زبان اور ہندی رسم الخط کے ذریعہ جو خاص اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے مقابلہ میں ہندی سے زیادہ قریب ہے، اردو کے مخالفوں کی شدت کم اور ان کو اس کی جانب مائل کیا جائے، اور جو نئی زبان بن رہی ہے، اس کو ہندوستانی سے متاثر کیا جائے، اس طرح کسی نہ کسی حد تک اردو کا وجود باقی رہ جائے گا، گو یہ مصلحت حقیقت سے یکسر خالی تو نہیں ہے لیکن اس میں حسن ظن کو زیادہ دخل ہے، جس ذہنیت کو آسان ہندی تک گوارا نہیں، وہ ہندوستانی کو کس طرح برداشت کر سکتی ہے،

درحقیقت موجودہ حالات میں جو کچھ خطرہ ہے وہ علمی و ادبی اردو کے لئے ہے، عام بول چال کی زبان کو جسے اردو کہا جائے یا ہندوستانی کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، اور اسے کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی، زبانیں جبر اور قانون کے ذریعہ نہیں بنائی جاتیں، بلکہ وہ مختلف طبعی عوامل کے ماتحت صدیوں میں خود بخود بنتی اور بگڑتی ہیں، اس لئے جو نئی مصنوعی زبان بنائی جارہی ہے، وہ کبھی عوام کی زبان نہیں بن سکتی، اور اس کا دائرہ حکومت کے دفاتر اور علم و فن تک محدود رہے گا، روزمرہ کی زبان پر اس کا بہت کم اثر پڑیگا، زیادہ سے زیادہ اس میں ہندی کے کچھ الفاظ داخل ہو جائیں گے، اور وہ تھوڑے تغیر کے ساتھ قائم رہے گی، اس کے مخالفین بھی بجز اس کے کہ نیل گھوڑی کی طرح اس کا نام بدل دیں اسکو نہیں چھوڑ سکتے، اس لئے اس کو بچانے کے لئے ہندوستانی کو وسیلہ بنانے کی ضرورت نہیں، اور علمی و ادبی اردو کو جو خطرات ہیں، انکے لئے یہ تدبیر کارآمد نہیں ہے اور وہ اپنے حامیوں کی کوششوں ہی سے قائم رہ سکتی ہے،

نئی زبان کو اردو سے متاثر کرنے کے لئے بھی ہندوستانی کو وسیلہ بنانے کی ضرورت نہین، اس مقصد کے لئے اردو اور ہندوستانی دونون برابر ہین، اس لئے کہ جب ایک مقام پر ایک سے زیادہ زبانین رائج ہون گی تو وہ فطری طور سے ایک دوسرے سے متاثر ہون گی، اس مین اردو اور ہندی کی تفریق نہین، بلکہ اُن کے بجائے اگر ہندوستان مین عربی اور فارسی بھی بول چال کی زبان ہوتی، تو ہندی ان سے بھی متاثر ہوتی جس طرح ایک زمانہ مین ہو چکی ہے، اس لئے نئی زبان پر اثر ڈالنے کے لئے بھی ہندوستانی کی ضرورت نہین ہے، وہ اردو دشمنی کے باوجود اس سے متاثر ہو کر رہے گی، اور ان دونون کے میل جول سے جو زبان پیدا ہو گی، وہی اصلی ہندوستانی ہو گی،

اس تحریر کا مقصد ہندوستانی زبان کی مخالفت نہین ہے، اگر کوئی ادارہ اسکی تبلیغ و اشاعت کرنا چاہے تو یہ بھی ایک مفید کام ہے، لیکن انجمن ترقی اردو کا یہ کام نہین ہے، جس کو ہندوستانی کلچر سوسائٹی الہ آباد اور اس کا رسالہ عرصے سے انجام دے رہا ہے جس مین ہندو مسلمان دونون شریک ہین، انجمن کا مقصد خالص اردو کی خدمت ہونا چاہئے، اردو کی معیاری کتابون کو ہندی رسم الخط مین منتقل کرنے کی تجویز البتہ معقول و مفید ہے، اس سے ہندی زبان اور ہندی دان طبقہ دونون متاثر ہون گے، لیکن رومن رسم الخط کی مصلحت سمجھ مین نہین آتی، یہ محض اندھی تقلید ہے جس کا کوئی فائدہ نہین،

انجمن نے دوسرا مفید کام اپنے ذمہ یہ لیا ہے کہ سرکاری اسکولون مین اردو کے ساتھ جو بے اعتنائی بلکہ دشمنی برتی جارہی ہے، اور اسکو ان حقوق سے بھی محروم کیا جارہا ہے، جو دوسری مقامی زبانون کے طفیل مین اس کو حاصل ہوئے ہین، اُن کی تحقیقات و تدارک کے لئے ایک کمیٹی بنا دی ہے، جس نے اپنا کام شروع کر دیا ہے، اس کا مرکز لکھنؤ ہے، اب یہ اردو کے بہی خواہون کا فرض ہے کہ وہ شعبۂ تعلیم کے حکام کی اردو دشمنی اور اسکولون مین اردو کی حق تلفی کے صحیح واقعات سے کمیٹی کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ کے پتہ پر مطلع کرین،

پاکستان کی قومی زبان اردو مان لی گئی ہے، لیکن اخبارات کی اطلاع سے معلوم ہوتا ہے، کہ سرکاری دفترون اور تعلیم گاہون مین بھی بدستور انگریزی مسلط ہے، گو اس بارہ مین اتنی عجلت اور سختی کی ضرورت نہین کہ تمام دشواریون اور مقامی زبانون کے حقوق کو نظر انداز کر کے فوراً اردو کو جبری رائج کر دیا جائے، لیکن یہ ضروری ہے کہ مقامی زبانون کی اہمیت کو قائم رکھتے ہوئے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جائین جن سے جلد سے جلد

اردو دفتری اور تعلیمی زبان بن سکے، اور انگریزی کی احتیاج باقی نہ رہ جائے، اردو کسی ضرورت کی تکمیل سے بھی قاصر نہیں ہے، حیدرآباد میں اس کا پورا تجربہ ہو چکا ہے، اور ۲۵ برسوں سے حکومت کے تمام شعبوں اور یونیورسٹی کی تعلیم زبان رہ چکی ہے، اسی کے ذریعہ ہر فن کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ہوتی رہی ہے جس کے نتائج سب سامنے ہیں، اور کسی شعبہ کو اس کی تنگ دامانی کی شکایت نہیں ہوئی، اب یہ بار امانت پاکستان کو اٹھانا ہے، اس کے لئے اردو کی اہمیت تنہا لسانی نہیں بلکہ مذہبی اور تمدنی بھی ہے، مذہب کے بعد وہی اہل پاکستان میں قومی اور تمدنی وحدت کا ذریعہ ہے، اس لئے اس کو جلد سے جلد عملاً قومی زبان بنانے کی ضرورت ہے۔

ہم نے لاہور کے اس ناشر کے خلاف جس نے سیرۃ النبی جلد اول چھاپ لی تھی، پاکستان کی حکومت اور وہاں کے اخبارات کو توجہ دلائی تھی، ہم کو مسرت ہے کہ ان دونوں بلکہ اہل پاکستان نے بھی اپنی اخلاقی وعملی ہمدردی کا ثبوت دیا اور لاہور کے مشہور تاجر کتب شیخ مبارک علی صاحب کے ذریعہ یہ معاملہ بخیر و خوبی طے ہو گیا، دارالمصنفین اپنے ان تمام ہمدردوں کا شکر گذار ہے، اب اس کی قانونی بندش بھی کر دی گئی ہے اس لئے آیندہ کوئی صاحب دارالمصنفین کی کسی کتاب کے چھاپنے کا قصد نہ کریں،

سکہ کے اختلاف کی وجہ سے عرصہ سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان وی پی آ جا نہیں سکتے، اب ایک نئی دشواری یہ پیدا ہو گئی ہے کہ پاکستان کے تاجر کتب حکومت سے لائسنس حاصل کئے بغیر ہندوستان سے کتابیں نہیں منگا سکتے، اس لئے فی الحال پاکستان سے تجارت بالکل بند ہے، لیکن یہ صورت عارضی ہے، اور یقین ہے کہ تاجر کتب جلد لائسنس حاصل کر لیں گے، لیکن سکہ کے تبادلہ کی دشواری پھر بھی باقی رہ جائیگی، اس لئے جب تک اس کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، اس وقت تک شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور دارالمصنفین کے ایجنٹ ہیں، جن لوگوں کو یہاں کی کتابوں کی ضرورت ہو وہ شیخ صاحب سے طلب کریں، اور پاکستان کے معارف کے خریدار اپنا چندہ بھی انھیں کے پاس بھیجیں ان سب کا چندہ ختم ہو چکا ہے، لیکن ان کے اعتماد پر رسالہ بند نہیں کیا گیا، اس لئے ان کا بھی یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ فوراً اپنا چندہ ادا کر دیں۔

مقالات

جن سے مین متاثر ہوا

از

سید سلیمان ندوی

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے کئی سال ہوئے "نذرِ اعترافِ" کے عنوان سے ہندوستان کے ممتاز علماء و مشاہیر سے تقریرون کا ایک سلسلہ نشر کرایا تھا، اس سلسلہ مین حضرت الاستاذ مدظلہ نے بھی تقریر فرمائی تھی، یہ تقریر مختلف حیثیتون سے قابلِ اشاعت تھی، لیکن اس کی نوبت نہ آسکی اور اب کئی سال کے بعد یہ تحفہ ناظرینِ معارف کی خدمت مین پیش کیا جاتا ہے۔ (بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

انیسوین صدی ختم ہو رہی تھی، تو میرے ہوش اور تمیز کی آنکھین کھل رہی تھین، پندرہ سولہ برس کا سن ہوگا، اس وقت قدیم و جدید کی کشمکش سے سارا ہندوستان خیالات کا دنگل بنا ہوا تھا، کانون مین دو قسم کی تحریکون کی آوازین دمبدم آرہی تھین، ایک سرسید کی تحریک یعنی انگریزی تعلیم کی اشاعت اور مذہب مین عقل اور فطرت کی مطابقت کی کوشش، اور دوسری علماء کو نئے زمانہ کے نئے خیالات اور فلسفہ سے آشنا کرکے پرانی عربی تعلیم کی ازسرِنو تنظیم کی تحریک، جس کو لے کر چند روشن خیال علماء اُٹھے تھے، اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ اس تحریک کا مرکز بھی علی گڈھ کی ایک عربی درسگاہ تھی، جو مولانا لطف اللہ صاحب کی ذات سے عبارت تھی، اس تحریک کا دوسرا مرکز دہلی تھا، جہان مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی درس دیتے تھے،

کانون مین یہ دونون آوازین پڑین، مگر میرا خاندانی ماحول اسی دوسری تحریک سے متاثر تھا، اس لئے اسی دوسری تحریک سے دلچسپی ہوئی، اور وہ بڑھتی گئی، اور پھیلتی گئی، اور وہی میری زندگی کا جز بن گئی،

اس تحریک کا پہلا اثر یہ تھا کہ علما نے قدیم و جدید کی آمیزش سے نئی عربی درسگاہ کے قیام کی کوشش کی، اور سب سے پہلے مولوی سید نذیر حسین صاحب کے مشہور شاگرد مولانا ابراہیم صاحب آروی نے آرہ صوبۂ بہار مین مدرسۂ احمدیہ کی بنیاد ڈالی، اور اس کے بعد ندوۃ العلماء نے لکھنؤ مین اپنا نیا مدرسہ دارالعلوم کھولا، میرے والد مرحوم نے مدرسۂ احمدیہ مین مجھے بھیجنے کا ارادہ کیا، مگر میرے خاندان کے چند عزیزون کا تعلق ندوۃ العلماء کی تحریک سے تھا، اس لئے دارالعلوم ندوہ لکھنؤ مین داخلہ کی تجویز میرے لئے مناسب بتائی گئی، مگر ابھی اسکے داخلہ مین کچھ تاخیر تھی، تو چند ماہ بہار کے مشہور علمی و مذہبی حلقہ خانقاہ پھلواری مین مجھے رکھا گیا، یہان خانقاہ مین ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اس کے اثر سے اس قصبہ مین شعر و سخن کا خاصہ چرچا تھا اور ہے، مین نے بھی اس فضا مین سانس لی، اور یہین سب سے پہلے مین نے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول "منصور موہنا" دیکھا، اس کا یہ اثر ہوا، کہ جس وقت کتاب ختم کی، خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دیا،

ایک برس کے بعد مجھے دربھنگہ کے ایک اور نئے مدرسہ امدادیہ مین جو دارالعلوم ہی کے خاکہ پر بنا تھا اور اب تک ہے چند ماہ رکھا گیا، یہان سب سے پہلے مین نے طلبہ کی انجمن دیکھی، اور لوگون کی تقریرین سنین، اور دوسرے ہی ہفتہ مین وقت کے عنوان پر ایسی تقریر کی کہ ہر طرف سے شاباش ملی،

مین نے جس ندوۃ العلماء کا اوپر ذکر کیا، وہ علما کی ایک مجلس کا نام ہے جس نے سب سے پہلے علماء کی منتشر جماعت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، اور قوم و ملت اور علم و فن کی خدمت کے نئے راستون اور نئے طریقون سے ان کو مانوس کیا، اس کے جلسے سال بسال ہندوستان کے بڑے بڑے شہرون مین ہوتے تھے، ۱۹۰۰ء پورا ہو رہا تھا جب اس مجلس کا سالانہ جلسہ بڑے دھوم دھام سے پٹنہ مین ہوا، یہ جلسہ کیا تھا، جوش و خروش کا ایک سمندر تھا، یہ پہلا موقع تھا جب علماء اور سیدھے بکے ہوئے علماء اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب دونون نے ایک پلیٹ فارم پر بیٹھکر قوم و ملت

کی چارہ نوازی کی فکر مین کین، مین بھی اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ اس جلسہ مین شریک تھا، میری آنکھون نے قومی خدمت کا یہ پہلا تماشا دیکھا تھا، مین نے اسی جلسہ مین یہ پُراثر منظر دیکھا کہ کوٹ پتلون مین ملبوس ایک بیرسٹر تقریر کر رہے تھے، اور خود رو رہے تھے اور بڑے بڑے جبہ و دستار والے علما، اور مشائخ کو رُلا رہے تھے،

اسی جلسہ مین سب سے پہلے مین نے اس سلسلۂ تقریر کے اگلے مقرر یعنی شیخ (سر) عبد القادر لاہور کو دیکھا، وہ اس وقت آبزرور کے اڈیٹر تھے، وہ اپنی اس تقریر کی تمہید مین ٹرنسوال مین بوئر دن کی لڑائی کی مختلف خبرین جو اس وقت آرہی تھین، دلچسپ انداز مین اُن کا حوالہ دیکر یہ کہہ رہے تھے کہ اخبار نویسون کی بات پر اعتبار کیون کر کیا جائے"، اس تمہید کے بعد انھون نے کہا کہ "مین بھی اخبار نویس ہون، اور اگر تم سے یہ کہون کہ تمھارے بزرگون کی بہت بڑی دولت آج بھی الماریون اور صندوقون مین بند پڑی ہے مگر تم کو خبر نہین، تو تم کو بھی میری اس بات کا کیونکر یقین آئے گا" یہ کہکر انھون نے ندوۃ العلما کی نگرانی مین اگلے بزرگون کی کتابون کو محفوظ کرنے کی تجویز پیش کی، ان کی تقریر ایسی دلچسپ تھی کہ جس نے پورے جلسہ کے ساتھ مجھے بھی محو حیرت بنا دیا، اور دل مین ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا، جس کی مشق بعد کو ہوئی،

جلسہ کے اختتام پر میرے شوق نے پر و بال پیدا کئے، اور مین اڑ کر لکھنؤ پہنچا، اور ندوۃ العلما کی درسگاہ مین داخل ہوگیا، اور یہ وہ مقام تھا جو اس وقت سارے ہندوستان کے علماء کا مرکز اور قوم کے بڑے بڑے لوگون کا مرجع بنا ہوا تھا، یہین آنکھون نے سب کچھ دیکھا، اور کانون نے سب کچھ سُنا،

یہان ہندوستان کی ایک مشہور ہستی صدر مدرس تھی، مولانا فاروق چریا کوٹی، یہ اپنے زمانہ مین ادب اور معقولات کے امام تھے، ان کی خاص چیز اُن کے پڑھانے کا طریقہ تھا، وہ جو کچھ پڑھاتے تھے عملی طور سے پڑھاتے تھے اور اسکی مشق کراتے تھے، صرف، نحو، ادب، عروض، منطق و فلسفہ ہر ایک فن مین ان کا یہی طرز تھا، دوسری خصوصیت ان کی یہ تھی کہ وہ کتاب کے لفظون کے پابند نہ تھے، یعنی وہ کتاب نہین پڑھاتے تھے، بلکہ اس فن کے مسائل پڑھاتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم فن پر قابو پا لیتا تھا، ان کی طرز تعلیم کی

بہتری کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مولانا شبلی جیسا کامل ان کی درسگاہ سے پیدا ہوا،

بہر حال موصوف کے طرز تعلیم نے چند ہی دنوں میں یہ کیفیت پیدا کر دی کہ آنکھوں سے پردے ہٹ گئے اور وہ مسئلے جو پہلے استادوں کے سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آئے تھے، وہ روز روشن کی طرح نظر آنے لگے، یہ پہلی شخصیت تھی، جس نے میرے دل و دماغ پر اپنا پرتو ڈالا،

میں کہہ چکا ہوں کہ اردو ادب کی پہلی کتاب مولانا شرر کی منصور موہنا میرے ہاتھ میں آئی، اس لئے میری تحریر پر سب سے پہلا اثر شرر کے طرز تحریر کا پڑا،

۱۹۰۱ء میں شیخ عبد القادر نے لاہور سے مخزن نکالا، آج کل کے بہت سے بوڑھے اہل قلم اس کے نوجوان مضمون نگار تھے میں نے بھی اپنی زندگی کا پہلا مضمون اسی میں لکھا، بلکہ اسی کو پڑھکر مضمون لکھنے کی تحریک دل میں پیدا ہوئی،

۱۹۰۴ء میں خود ندوہ کی طرف سے الندوہ نکلا، مولانا سید عبد الحئی صاحب مددگار ناظم ندوہ نے مجھے اس میں مضمون لکھنے کی طرف متوجہ کیا، میں نے ایک مضمون علم حدیث اور دوسرا منطق پر لکھکر پیش کیا، دونوں قبول ہوئے اور الندوہ میں لکھنے کو دئیے گئے، مگر عین وقت پر میری علمی زندگی کے اصلی رہنما مولانا شبلی ۱۹۰۵ء میں ندوہ آگئے، یہ دونوں مضمون شرر مرحوم کے طرز میں تھے، مولانا نے پہلے مضمون کو تو کچھ اصلاح دیکر باقی رکھا، اور دوسرے کو جس میں شرریت زیادہ تھی نکال ڈالا، اس وقت سے مولانا کے رنگ کی تقلید شروع کی، مگر اصل منزل تک پہنچنے میں کچھ دیر لگی، کیونکہ ابھی یہ رنگ پوری طرح چڑھنے بھی نہ پایا تھا، کہ ۱۹۰۶ء میں شمس العلماء آزاد دہلی کی سخندان پارس کے مطالعہ کا اتفاق ہوا، اس کی دلکشی نے اپنی طرف کھینچا، ایک دو مضمون اس رنگ میں لکھے، مگر یہ طرز تحریر ایسا تھا کہ جو آمد ہو تو کیا کہنا، اور بدقسمتی سے اگر وہ آورد ہو تو اس سے برا کوئی اور نہیں، ناچار ادھر سے ہٹ کر پھر استاد کی بتائی ہوئی شاہ راہ پر آجانا پڑا، کیونکہ علمی مضامین کے لئے ان کے طرز تحریر سے بڑھکر کوئی دوسرا طرز کار آمد نہیں، اس لئے بار بار

اُن سے اصلاحیں لیں، اُن کی ایک ایک تصنیف کئی کئی دفعہ پڑھی، اور سالہا سال اُن کی صحبت اٹھائی، تو علمی زندگی کا ایک نہج تقریر کا ایک طرز اور تحریر کا ایک رنگ نکل آیا،

میرا سیاسی ذوق بھی مولانا شبلی مرحوم کا فیض ہے، وہ اٹھارہ برس سر سید کے ساتھ رہنے کے باوجود اُن کے سیاسی خیالات کے سخت مخالف تھے، پھر طرابلس کی لڑائی، مسجد کانپور کا ہنگامہ اور بلقان کی جنگ نے اس نشہ کو اور تیز کیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا ابوالکلام نے جو خود بھی مولانا شبلی کی صحبتوں سے متاثر تھے، جب ۱۹۱۲ء میں اپنا اخبار الہلال نکالا، تو میں اس کے اسٹاف میں شامل ہو گیا، اخبار کے لٹریچر اور ادبی سطح کو یکساں رکھنے کے لئے میں نے اسی کے طرز میں لکھنا شروع کیا، چنانچہ الہلال میں اس زمانہ میں جو تحریریں میرے قلم سے نکلیں، ان میں ابوالکلام کا طرز اتنا نمایاں ہے کہ لوگ غلط فہمی سے اس کو مولانا ابوالکلام کے نام سے بے تکلف چھاپ رہے ہیں، اور پڑھ رہے ہیں، اور میری پہلی کتاب ارض القرآن میں بہت کچھ مٹانے پر بھی اس کی جھلک موجود ہے،

معارف میں جو شذرات لکھے جاتے ہیں، اس کا آغاز میں نے الہلال ہی میں کیا تھا، لیکن معارف میں آکر ہلالیت کم ہو کر ایک اور خاص رنگ ابھر آیا،

لیکن بہر حال چند روز ادھر اودھر بھٹک کر پھر اسی راستہ پر آگیا، جس پر استاد مرحوم نے لاکر مجھے کھڑا کر دیا تھا، خصوصیت کے ساتھ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے جانتے اُن کے طرز ادا کے نباہنے کی پوری کوشش کی ہے،

میں نے شروع ہی میں اپنے ایک جرم کا جس کو میں چھپاتا رہا۔ ہلکا سا اقبال کر لیا ہے، یعنی شعر و سخن کا ذوق میں نے جب آنکھ کھولی، تو ملک میں امیر اور داغ کے معرکے تھے، میرے ایک استاد شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس دار العلوم جو جنرل عظیم الدین خان کے زمانہ میں رامپور میں رہے تھے، اور وہاں منشی امیر احمد صاحب مینائی کی صحبت برسوں اُٹھائی تھی، وہ اکثر امیر مرحوم کے تذکرے کیا

کرتے تھے، اور اُن کے شعر سناتے تھے، ایک اور اتفاق یہ ہے کہ حضرت امیر مینائی کے جلیل القدر شاگرد جلیل مانک پوری جواب نواب فصاحت جنگ سے مخاطب ہیں، اُن کے بڑے صاحبزادہ مولوی صدیق صاحب (متوسل سرکار نظام) میرے ساتھ دارالعلوم ندوہ میں پڑھتے تھے، ان کے ذریعہ سے حضرت امیر کی بہت سی غزلیں میری نظر سے گذریں اور دل میں امیر مرحوم کی قدر و منزلت نے گھر کیا، انکا دیوان مرآۃ الغیب اکثر مطالعہ میں رہتا، دارالعلوم میں لڑکوں کے مشاعرے ہوتے تھے غزلیں پڑھی جاتی تھیں، ایک صاحب داغ کا روپ بھرتے تھے، اور مجھے امیر مرحوم کی پیروی کا دعویٰ تھا، لیکن ۱۹۱۲ء میں جب مولانا شبلی نے نئی اردو شاعری کی طرح ڈالی، تو دل نے اس میں بھی استاد کی پیروی کا حق ادا کرنا چاہا، متعدد نظمیں اس رنگ میں لکھیں جن کا خاتمہ استاد کے ماتم پر ہوا، جو نوحۂ استاد کے نام سے ۱۹۱۵ء میں پونہ میں چھپا، جہاں ان دنوں دکن کالج میں فارسی کا لکچرر تھا، میں نے جب یہ نوحہ لکھا تو اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، عزیز لکھنوی، مولانا شروانی وغیرہ اور استاد مرحوم کے اکثر دوستوں اور قدر دانوں کے پاس اس کو تحفہ بھیجا، سب نے تعریفیں کیں، اور دل بڑھایا، مگر ایک آزمودہ کار صاحب کمال ایسا تھا جس نے شفقت کی راہ سے مجھے لکھا کہ معاف کیجئے آپ شاعر نہیں، اور اس کے بعد ایک ایسا نکتہ مجھے بتایا جو میرے دل میں پیوست ہو گیا، انھوں نے فرمایا کہ جب تک انسان کسی فن میں کامل نہ ہو جائے، اس کو دوسروں کے سامنے عرض ہنر نہیں کرنا چاہئے، میں نے اسی دن بساط سخن لپیٹ دی اور شاعری سے توبہ کر لی، اس کے بعد اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا، اور اگر چھپ نہ سکا، اور چھپ گیا، تو نام کو رمز و اشارہ بنا دیا، یہ آزمودہ کار صاحب کمال جنھوں نے مجھے یہ قیمتی نصیحت کی، جس نے میرے رُخ کو نظم سے تمامتر نثر کی طرف پھیر دیا، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے،

اسی طرح طالب علمی کے زمانہ میں ایک اور بزرگ نے عین وقت پر میری ایسی رہبری کی جس نے میرے خیالات کی دنیا پلٹ دی، یہ بزرگ ندوۃ العلماء کے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی صاحب ہیں، مجھے

اُس زمانہ مین عربی ادب اور منطق کا شوق تھا، ایک دن اونھون نے مجھے بلواکر پوچھا کہ تم کو کس کس فن سے ذوق ہے، مین نے عربی ادب اور منطق کا نام لیا، فرمایا کیون، مین نے کہا اس لئے کہ یہ دونون دوسرے اصل مقصود علوم کے خادم اور ذریعہ ہین، ارشاد ہوا کہ آخر ان اصل علوم کی طرف توجہ کب ہوگی، عرض کی جب اُن مین کمال پیدا ہو جائے گا، فرمایا تو اسی خادم اور ذریعۂ علوم مین تو ہمارے علما کی پوری عمرین بسر ہو جاتی ہین، اور اصل مقصود کی نوبت نہین آتی، اس پر انھون نے یہ حکایت بیان کی، کہ "ایک صاحب کو تصنیف کا شوق پیدا ہوا، تو وہ قلم بنا بنا کر رکھنے لگے، یہان تک کہ تمام کمرہ قلمون سے بھر گیا، کسی نے اُن سے پوچھا کہ حضرت یہ آپ اتنے قلم بنا بنا کر کیون رکھ رہے ہین؟ تو متانت سے ارشاد ہوا کہ "میرا اراد ہ تصنیف کا ہے"، پوچھنے والون نے کہا کہ "پھر وہ کب ہوگی"؟ فرمایا "جب ان قلمون سے فرصت ملے گی"،

یہ تمثیل اس بات کی تھی کہ عربی نصاب تعلیم کا بڑا حصہ دینی علوم کی تمہید اور ذریعہ کے طور پر پڑھایا جاتا ہے، مگر ہوتا یہ ہے کہ یہ ذریعۂ تعلیم اصل تعلیم کی جگہ لے لیتا ہے، مولانا کی یہ حکایت میرے لئے اس درجہ موثر ہوئی کہ مین نے پھر تمام عمر ذریعۂ علوم اور مقصد علوم کے درمیان کبھی مغالطہ نہین کھایا،

دار العلوم ہی مین تھا کہ ایک اور بزرگ سے نیاز حاصل ہوا، یہ مولانا شبلی کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین صاحب بی اے تھے، یہ عربی کے عالم اور انگریزی کے گریجوایٹ تھے، فلسفہ مین وہ ڈاکٹر آرنلڈ کے اور ادب مین مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے شاگرد تھے، یہ ان لوگون مین تھے جو تنہا ذریعۂ علوم کی تکمیل کی بھول بھلیون سے نکل کر اصل مقصد کی منزل تک پہنچ گئے تھے، سالہا سال سے وہ قرآن پاک کے حقائق و معانی پر غور کر رہے تھے، اُن سے قرآن پاک اور فلسفۂ جدید کے سبق تو کم ہی پڑھے، مگر صحبت بار بار اُٹھائی، اور مشکلات مین مشورے بار بار کئے، سیرت کی تیسری جلد مین جو معجزات پر ہے، انہی کے فلسفہ کی تقلید کی ہے،

سب جانتے ہین کہ میرا تصنیفی ذوق مولانا شبلی مرحوم کی تربیت کے دامن مین پرورش پایا ہے،
استاذ مرحوم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نوآموزون کو پہلے مضمون لکھنے کی ہدایت کرتے تھے، کبھی وہ عنوان خود
بتاتے تھے، اور کبھی طالب علم خود ہی مقرر کر لیتے تھے، پھر وہ اس مضمون کے متعلق معلومات کا سراغ
کتابون مین بتاتے تھے، طالب علم اپنی محنت سے ان کا کھوج لگاتے تھے، اور جب کافی معلومات
جمع ہو جاتے تو اُن کو لکھ کر اُن کے سامنے پیش کرتے، وہ اس مین کاٹ چھانٹ کرتے، مضمون کے بعد
پھر رسالون کی، اور اس کے بعد کتابون کی تصنیف کی باری آتی، تاکید ہوتی کہ معلومات اور مواد کو ہر کونہ
اور گوشے سے محنت سے ڈھونڈ کر پھر کوئی کونہ خالی نہ رہ جائے، اس عنوان پر اگر پہلے کسی نے لکھا ہو تو
اُس سے تمھارا مضمون بالکل الگ رہے، یا اس سے بڑھ جائے، مستند حوالہ کے بغیر کوئی واقعہ نقل نہ
کیا جائے، حوالہ مین سب سے قدیم اور سب سے مستند ماخذ کا خیال رکھا جائے، خوبی کے ساتھ عبارت کی چستی
طرزِ ادا کی شگفتگی اور تشبیہ و استعارہ کی ندرت ہاتھ سے نہ جائے، پامال معلومات، مبتذل محاورات اور
عامیانہ الفاظ سے پوری طرح پرہیز کیا جائے، یہ ان کا طریقہ تھا، اور اسی طریقہ کی پابندی ہمارے دار المصنفین
مین جس مین علما اور گریجویٹ اصحاب کو تصنیف و تالیف کی تعلیم دی جاتی ہے، اب تک کی جاتی ہے،

خطباتِ مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۵ء مین مدراس مین سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤن پر
آٹھ خطبے دیے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانون نے ان کو بیحد پسند کیا،

ضخامت ۱۹۴ صفحے،

قیمت ہے (چوتھا اڈیشن)

"منیجر"

الجزیہ

از

جناب مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دارالمصنفین

"جزیہ کے متعلق غیر مسلمون مین مدتون سے جو غلط فہمی چلی آرہی تھی، اس کو سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے الجزیہ لکھ کر دور کیا لیکن اسکے بعض پہلو پھر بھی تشنۂ تحقیق تھے، اس مضمون مین تمام ضروری پہلوؤن پر مفصل بحث کر کے جزیہ کی حقیقت واضح کی گئی ہے"۔

جزیہ کا لفظ جزیہ کس زبان کا لفظ ہے؟ اس کے متعلق دو خیال ہین،

(۱) پہلا خیال یہ ہو کہ وہ عربی ہے، اس کا مادہ ج ز ی ہے، یہی خیال زیادہ عام ہے، طبری (۳۱۰ھ) جصاص (۳۷۰ھ) ابوبکر سجستانی (قبل ۳۸۶ھ) جوہری (۳۹۳ھ) راغب اصفہانی (اوائل ۵۰۰ھ) محی السنہ بغوی (۵۱۶ھ) زمخشری (۵۳۸ھ) معافری (۵۴۳ھ) مرغینانی (۵۹۳ھ) امام رازی (۶۰۶ھ) جمال قرشی ۶۸۱ھ) بیضاوی (۶۸۵ھ) نسفی (۷۰۱ھ) ابن مکرم (۷۱۱ھ) ابوحیان غرناطی (۷۴۵ھ) فیروزآبادی (۸۱۷ھ) مہائمی (۸۳۵ھ) بدرالدین عینی (۸۵۵ھ) جلال الدین محلی (۸۶۴ھ) جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) ابوسعود (۹۵۱ھ) شربینی (۹۷۷ھ) محمد طاہر (۹۸۶ھ) زبیدی (۱۲۰۵ھ) محمد اشرف (۱۲۴۳ھ) آلوسی (۱۲۷۰ھ) سید صدیق حسن خان (۱۳۰۷ھ) جو مشہور کتب تفسیر، فقہ اور لغت کے مصنف ہین، یہی لکھتے ہین،

(۲) دوسرا خیال یہ ہے کہ وہ فارسی ہے، اصل مین گزیت تھا، جس کے معنی خراج کے ہین، یہ خیال

ابو عبداللہ محمد بن احمد بن یوسف خوارزمی (۳۸۷ھ) نے مفاتیح العلوم (ص ۵۹) مین ظاہر کیا ہے، اس کی کتاب ۱۸۹۵ء مین G. van Vloten نے شائع کی ہے، اور ایک کتاب منتخب اللغات کے قلمی نسخہ مین بھی جو ناقص الاطراف ہے، یہی لکھا ہے، اس کتاب سے مراد اگر منتخب اللغات شاہجہانی ہے تو اس کا مصنف عبدالرشید حسینی مدنی ٹھٹہ (سندھ) کا رہنے والا تھا جس نے اس کتاب کو حسب روایت ریو، سخاؤ، اور ایتھے ۱۰۴۶ھ مین تمام کیا،

گزیت کے دو تلفظ ہین، فردوسی کے ان اشعار

گزیتے نہادند بر یک درم	گرا یدون کہ دہقان بود کو درم
گزیتے زیار و رشش درم	بجز ماستان بر نہین زد دم قدم

اور نظامی کے اس شعر

گہش خاقان خراج چین فرستد	گہش قیصر گزیت دین فرستد

مین گزیت امیر کے وزن پر ہے، لیکن مفاتیح العلوم کے ناشر نے اس کو دہبر کے وزن پر پڑھا ہے،

جزیہ کا تلفظ | جزیہ کو جو لوگ معرب نہین مانتے، بلکہ عربی سمجھتے ہین، وہ اس کا تلفظ دو طرح پر کرتے ہین،

الف :- جِزیہ جیم کے نیچے زیر یہ عام تلفظ ہے، جیسے شکوہ بمعنی شکایت،

ب :- جَزیہ جیم کے اوپر زبر جیسے قعدہ اور جلسہ، یہ امام ابن جریر طبری (۳۱۰ھ) نے اپنی مشہور تفسیر جامع البیان (ص ۷۰ ج ۱۰) مین اور امام ابوحیان غرناطی (۷۴۵ھ) نے بحر المحیط (ص ۳۰ ج ۵) مین لکھا ہے، دوسری کتاب مین قعدہ کی جگہ پر عقدہ چھپ گیا ہو جو غلط ہے،

تنقید | میرے نزدیک عربی جزیہ، معرب جزیہ سے زیادہ قدیم ہے، اور اس کے حسب ذیل دلائل ہین،

(۱) یہ لفظ قرآن مجید میں موجود ہے، اور چونکہ آیت جزیہ ۹ھ میں نازل ہوئی ہے[۵۱] اس لئے عربی ادبیات میں اس کو رواج پائے ہوئے تیرہ سو ساٹھ برس کا زمانہ گذرا ہے،

(۲) عرب کے ایک جاہلی شاعر ابو کبیر ہذلی (عامر بن حلیس[۵۲]) جنھوں نے اسلام کا زمانہ بھی پایا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے مشرف ہوئے ہیں[۵۳] لسان العرب ابن مکرم (۷۱۶ھ) میں جو عربی زبان میں لغت کی سب سے بڑی کتاب ہے ان کا ایک شعر نقل کیا ہے (ص ۵۹ ا جلد ۱)

واذا الکماۃ تعاوروا طعن الکلی

تذر البکارۃ فی الجزاء المضعف

اس میں جزار کا لفظ جزی اور جزی کی جمع ہے، اور یہ دونوں لفظ جزیہ کی جمع ہیں،

(۳) حدیث کی کتابوں میں یہ لفظ عام طور پر ملتا ہے،

(۴) امام ابو یوسف (۱۸۲ھ) نے کتاب الخراج، خاص خراج اور جزیہ پر لکھی ہے لیکن جزیہ کو معرب نہیں کہا ہے،

(۵) امام یحیی بن آدم (۲۱۳ھ) نے بھی کتاب الخراج تصنیف کی ہے، اور اس میں بعض ایسے الفاظ بھی آئے ہیں، جو معرب ہو کر مستعمل ہو چکے ہیں، مثلاً زمین کے خراج کے لئے طسق (ص ۵۷) بیعنامہ کے لئے وصر (ص ۵۹) یا دستجہ جو غالباً دستہ کا معرب ہے، (ص ۱۴۴) لیکن جزیہ کو معرب نہیں لکھا ہے،

(۶) ابو حنیفہ احمد بن داؤد دینوری (۲۸۲ھ) نے الاخبار الطوال میں بعض معرب الفاظ لکھے ہیں جیسے شمرتج جو سمرہ کا معرب ہے لیکن جزیہ کے متعلق وہ بھی خاموش ہیں،

---

[۵۱] تفسیر ابن جریر ص ۶۵، ۶۸، ج ۱۰: [۵۲] کتاب الشعر والشعراء ابن قتیبہ (۲۹۶) مطبوعہ لیڈن ۱۹۰۲ء
[۵۳] اصابہ وغیرہ،

(۷) تمام مفسّرین اور فقہا نے جزیہ کو عربی الاصل سمجھا ہے،

(۸) کوئی اہل لغت اس کو معرب نہین کہتا،

(۹) گزیت کا سب سے قدیم عربی ماخذ خوارزمی ہے جس نے ۳۸۷ھ مین وفات پائی،

(۱۰) فارسی ماخذ مین گزیت کا لفظ سب سے پہلے فردوسی کے ہان ملتا ہے جس نے ۴۱۱ھ مین استعمال کیا تھا، اس لحاظ سے اس لفظ کو فارسی اسلامی ادبیات مین آئے ہوئے نوسو اٹھاون برس ہوئے اور یہ مدت عربی جزیہ سے بقدر ۲۴۰ برس کم ہے،

(۱۱) فارسی مین علم لغت کی پہلی کتاب ابوالحسن علی بن احمد اسدی طوسی نے لکھی جس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ چھٹی صدی ہجری سے قبل فرض کیا جاسکتا ہے، اس کتاب کا نام لغت فرس ہے اور بقول مصنف بلخ، ماوراء النہر اور خراسان (گویا ایران و ترکستان) کی فارسی کے الفاظ جمع کئے ہین، جو عربی کی آمیزش سے بالکل پاک ہین، اور ان کی سند مین اشعار بھی پیش کئے ہین، لیکن بااین ہمہ اس کتاب مین گزیت کا لفظ نہین ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گزیت فارسی نہین بلکہ جزیہ کا مفرس ہے،

(۱۲) گزیت کے جو معنی خوارزمی (۳۸۷ھ) نے لکھے ہین، بالکل وہی معنی جزیہ کے اُن عربی مصنفین نے لکھے ہین، جو اُن سے مقدم تھے، مثلاً طبری (۳۱۰ھ) اور سجستانی (قبل ۳۸۶ھ) اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ معرب نہین، بلکہ گزیت مفرس ہے

(۱۳) چونکہ صحیح لفظ گزیت بروزن امیر ہے، جیسا کہ فردوسی اور نظامی کے اشعار سے ثابت ہے اس لئے جزیہ اُس سے معرب نہین ہوسکتا،

(۱۴) ان تمام باتون کے باوجود یہ امکان ضرور ہے کہ اسلام سے پیشتر یہ لفظ ایران سے یمن آیا ہو اور معرب ہوکر عرب مین رائج ہوگیا ہو، لیکن یہ امکان ہی امکان ہے، شواہد سے اس کی تائید مشکل ہے،

(۱۵) یہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ اسلام سے پیشتر نہ صرف ایران، بلکہ چین اور ہندوستان مین بھی جزیہ کا رواج تھا، اور اہل عرب تجارتی سلسلہ سے ان مقامات مین آتے جاتے تھے، اس لئے جس طرح یہ ممکن ہے کہ جزیہ کا لفظ ایران سے لیا گیا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ چین یا ہندوستان مین جزیہ کا طریقہ دیکھ کر اہل عرب نے اس کا عربی نام جزیہ رکھ لیا ہو،

جزیہ کے معنی| مفسرین فقہا، اور ائمہ لغت نے جزیہ کے معنی خراج کے لکھے ہین،

(ا) امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری (۳۱۰ھ) جامع البیان (۸ ج ۱۰ مصر) مین لکھتے ہین،

حتّٰی یعطوا الخراج عن رقابھم، یہان تک کہ وہ اپنی گردنون کی طرف سے خراج دین،

(ب) امام ابوبکر محمد بن عزیز سجستانی جنھون نے ۳۳۰ھ سے قبل وفات پائی، اپنی تصنیف غریب القرآن (عرف نزہتہ القلوب) ص ۴۳ (مصر ۱۳۲۵ھ) مین فرماتے ہین،

الجزیتہ، الخراج المجعول علی راس الذّمّی، جزیہ وہ خراج ہے جو ذمی کی ذات پر لگایا جاتا ہے،

(ج) شمس الائمہ ابوبکر محمد بن ابوسہل سرخسی (۴۸۳ھ) مبسوط (ص ۷۷ ج ۱۰ مصر) مین لکھتے ہین:-

وضع خراج علی رؤس الرجال آدمیون پر فی راس خراج لگانا (جزیہ) ہے،

(د) محی السنتہ ابومحمد حسین بن مسعود بغوی (۵۱۶ھ) کی معالم التنزیل (ص ۷۶ جلد ۲ بمبی ۱۲۶۹ھ) مین ہے:-

وھی الخراج المضروبۃ علی اور وہ جزیہ ان (ذمیون) کی گردنون پر

مقررہ خراج ہے،

۵- علامہ ابوالقاسم جاراللہ محمود زمخشری (۵۳۸ھ) کی اساس البلاغۃ (ص ۶۵ جلد ۱، مصر) میں مرقوم ہے،

واشتری من دھقان ارضًا — اور اس نے کسی زمیندار سے زمین

علیٰ ان یکفیہ جزیتھا ای — اس شرط پر خریدی کہ اس کا جزیہ

خراجھا، — یعنی خراج ادا کرے گا،

و- علامہ جمال الدین محمد بن کرم (۷۱۱ھ) نے لسان العرب (ص ۱۵۹ ج ۱۸ مصر) میں لکھا ہے.

والجزیۃ خراج الارض والجمع جِزَی — جزیہ زمین کے خراج کو کہتے ہیں،

وجِزْی، — جِزَی اور جِزْی اسکی جمع ہے.

ز- علامہ اثیرالدین ابوحیان محمد بن یوسف غرناطی اندلسی (۷۴۵ھ) اپنی تالیف تحفۃ الاریب بما فی القرآن من الغریب (ص ۲۰، حماۃ ۱۳۴۵ھ) میں جس کا نام سیوطی نے نحاۃ (ص ۲۲) میں اتحاف الاریب لکھا ہے فرماتے ہیں،

الجزیۃ خراج المجعول علیٰ راس الذمی، — جزیہ وہ خراج ہے جو ذمی کے سر پر لگایا گیا ہو،

ح- علامہ مجدالدین ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروزآبادی (۸۱۷ھ) نے القاموس المحیط (ص ۱۳ ج ۴) میں تحریر فرماتے ہیں،

والجزیۃ بالکسر خراج الارض — جزیہ (جیم کو زیر) زمین کا خراج ہے اور

ومایؤخذ من الذمی — جو ذمی سے لیا جائے (وہ بھی جزیہ) ہے،

ط ۔ علامہ ابن احمد مہائمی (۸۳۵ھ) کی تفسیر تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان (ص ۲۹۰ ج ۱)
مین ہے،

وھی الخراج المضروب علی الرقاب،	اور وہ (جزیہ) خراج ہے جو گردنون پر لگایا جاتا ہے،

ی ۔ علامہ جلال الدین محمد بن احمد محلی (۸۶۴ھ) اور علامہ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی (۹۱۱ھ) کی تفسیر جلالین (ص ۱۷۰) مین ہے،

الخراج المضروب علیھم کل عام	(جزیہ) ان (ذمیون) پر مقرر کیا ہوا سالانہ خراج ہے،

ک ۔ علامہ محمد بن احمد شربینی خطیب، جنھون نے سراج المنیر کے نام سے ایک تفسیر ۹۶۸ھ مین تالیف کی، اس کے ص ۴۰۳ ج ۱ مین لکھتے ہین،

وھی الخراج المضروب علی رقابھم،	اور وہ (جزیہ) خراج ہے جو ان (ذمیون) کی گردنون پر مقرر کیا جائے

ل ۔ مولینا محمد طاہر جنھون نے ۹۶۷ھ مین مجمع البحار الانوار کے نام سے ایک لغت تصنیف کیا، اس کی جلد اص ۱۷۰ مین لکھتے ہین

من اخذ ارضا بجزیتھا ، لارض ای بخراجھا،	جو شخص کوئی زمین جزیہ (یعنی خراج ادا کرنے کی شرط) پر لے،

م ۔ علامہ سید محمد مرتضی زبیدی حسینی واسطی (۱۲۰۵ھ) نے تاج العروس (ص ۳، ج ۱۰ مصر) مین قاموس کی مندرجۂ بالا عبارت نقل کرکے اس کے ایک لفظ (وما یوخذ) کی یون تصریح کی ہے:

(و) منه (ما یوخذ)	اور جزیہ ہی ہے جو ذمی سے (فرض) لیا جاتا ہے

ن ۔ مولانا محمد اشرف لکھنوی نے ایک جماعت کے ساتھ مل کر، ضخیم جلدون مین تاج اللغات تصنیف کی تھی، اس کتاب کے مصنفین اور سنہ تصنیف کا کچھ پتہ نہین ہے، مولانا محمد اشرف کا نام مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے کتاب کی پہلی جلد کے سرورق پر تحریر فرمایا ہے، اور یہ عبارت لکھی ہے،

"یکے از مؤلفینش مولانا محمد اشرف لکھنوی است در ۱۲۸۰ھ وفات یافت"

بہرحال اس کتاب کے (ص ۲۵۵) مین ہے:۔

"جزیہ بالکسر حاصلِ زمین و چیزیکہ گرفتہ شود از کفار اہلِ ذمہ"

س ۔ امیر الملک والاجاہ نواب سید صدیق حسن خان (۱۳۰۷ھ) نے تفسیر فتح البیان (ج ۴ جلد ۴، مصر ۱۳۰۱ھ) مین لکھا ہے،

وھو الخراج المضروب علیٰ	اور وہ (جزیہ) خراج ہے جو گردنون
رقابھم کل عامٍ	پر سالانہ مقرر کیا جاتا ہے،

غرض ۳۱۰ھ سے ۱۳۰۰ھ تک جتنے مشہور عالم گذرے ہین، بالاتفاق سب نے جزیہ کے معنی خراج کے لئے ہین،

جزیہ کی اصطلاح | جزیہ کے لغوی معنی جو اوپر بیان کئے گئے، انہی سے اس کے اصطلاحی معنی متفرع ہوتے ہین، لغت مین جزیہ کے معنی خراج کے ہین، اب اگر وہ خراج رعایا کے ہر فرد سے بحساب فی کس سالانہ وصول کیا جائے، تو اس کو جزیہ کہا جائے گا، اور یہ عام معنی ہونگے لیکن اگر وہ خراج سلطنت اسلام مین صرف غیر مسلم رعایا سے وصول کیا جائے، تو یہ شرعی اور اصطلاحی جزیہ ہوگا، اس سے چند باتین معلوم ہوتی ہین،

۱۔ لغت مین جزیہ اور خراج محصول کو کہتے ہین، خواہ وہ کسی چیز کا ہو، اور کوئی شخص ادا کرے

۲۔ مسلم اور غیر مسلم رعایا پر انفرادی حیثیت سے جو محصول عائد ہو، لغت کے لحاظ سے اس کا نام جزیہ ہے، اور اس مین کوئی تفریق نہین ہے،

۳۔ صرف غیر مسلم رعایا جو فرداً فرداً محصول ادا کرے، اوس کو شرع کی اصطلاح مین جزیہ کہتے ہین، اور مسلم رعایا جو محصول ادا کرتی ہے، اس کو زکوٰۃ، صدقہ، اور دوسرے نامون سے تعبیر کیا جاتا ہے،

جزیہ اقوام غیر مین جزیہ کے لغوی معنی سمجھنے کے بعد یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کا رواج دوسری قومون اور ملکون مین بھی تھا؟ ہندوستان، ایران، اور چین، اس کا جواب اثبات مین دیتے ہین،

ہندوستان مین جزیہ منو شاستر سے جو ہندوستان کا مدنی اور سیاسی قانون ہے[۱] اور جدید تحقیقات کے مطابق حضرت مسیحؑ کے دو تین سو سال پیشتر تالیف ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جزیہ (Poll Tax) کا رواج ہندوستان مین کم از کم بائیس سو برس سے ہے، منو جی نے کتاب مذکور کے باب ۷ اور ۸ مین جزیہ کے متعلق حسب ذیل دفعات درج کئے ہین:۔

دفعہ ۱۲۸۔ جس طریق سے کام کرنے والے کو اور راجہ کو فائدہ ہو، اس طریق کو دیکھ کر راجہ اپنے محصولات کو تجویز کرے، جو کہ ہر شخص پر برابر ہو،

دفعہ ۱۳۳۔ ...... وید پڑھنے والے برہمن سے محصول نہ لیوے،

دفعہ ۱۳۷۔ راج مین چھوٹے آدمیون سے بھی تھوڑا ساگ، پتا، وغیرہ سالِ تمام مین بطور محصول کے لیوے،

دفعہ ۱۳۸۔ رسوئین بنانے والے و ہر قسم کے کاریگر و شودر جسم کی تکلیف سے اوقات بسر کرنے والے

---

[۱] تمدن ہند موسیو گستاولی بان مترجمہ مولانا سید علی بلگرامی ص ۲۱۰۔

(پیشہ وار وغیرہ) ان سبھون سے ہر مہینہ مین ایک دن کام کرائے، ان کا یہی محصول ہی،

دفعہ ۱۳۹ - اگر بہ تقاضائے محبت، محصول رعیت سے نہ لیوے تو راجہ اپنی جڑ اکھاڑتا ہی،

دفعہ ۱۵۴ - آٹھ کامون کو............ بچارے، آٹھ کام یہ ہین، رعیت سی محصول

لینا،.......... (باب ۸)

دفعہ ۳۹ - چیز مدفونہ یافتہ کے نصف حصہ کو لینے والا راجہ ہے، کیونکہ حفاظت کرتا ہی اور

سب کا مالک ہے،

دفعہ ۳۹۴ - اندھا، بہرا، لنگڑا، ستر برس کی عمر والا، دھن دہانیہ سے ویدیا پاٹھون

کا اُپکار کرنے والا، ان سبھون سے راجہ باوجود خالی ہونے خزانہ کے اپنے لینے کے لائق محصول

کو نہ لیوے،

دفعہ ۴۰۵ - گاڑی وغیرہ محمولہ اشیاء وغیرہ سے بلحاظ چیز ہائے محمولہ کے سارا سار بچار کرکے

محصول مقرر کرنا چاہیئے، اور جس گاڑی وغیرہ مین اشیا وغیرہ نہین ہے اور جو آدمی کچھ سامان وغیرہ

نہین رکھتا، اُنھون سے تھوڑا محصول لینا چاہئے،

ان دفعات سے اصولی طور پر پتہ چلتا ہے، کہ

(۱) پیشہ ور اور غیر پیشہ ور سب پر جزیہ تھا (۲) عورتین مستثنیٰ نہ تھین، اور نہ بچے مستثنیٰ تھے (۳)

غیر مستطیع لوگون کو بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا (۴) معذور، زیادہ معمر اور برہمن مستثنیٰ تھے (۵) مزدور،

چمار، نوکر، جو محصول ادا کرنے کے قابل نہ تھے، اُن سے محصول کے عوض ہر مہینہ مین ایک دن بیگار

لی جاتی تھی (۶) خراج نہ لینا، سلطنت کی بیخ کنی کے مرادف تھا (۷) محصول ہر شخص

پر برابر تھا،

ایران مین جزیہ | ایران مین جزیہ رقاب کب سے رائج تھا؟ اس کا صحیح جواب ہم نہین

دیکھئے، البتہ اتنا معلوم ہے کہ نوشیروان سے پہلے بھی اُس کے وصول کرنے کا دستور تھا، طبری (ص ۹۶۰ ج ۲) مین ہے،

وکان ملوک فارس یاخذ ون من کور من کورھو قبل ملوک کسرٰی انوشروان فی خراجھا الثلث ومن کور الربع، ومن کور الخمس ومن کور السدس علی قدر شربھا وعمارتھا، ومن جزیۃ الجماجم	اور ایران کے بادشاہ نوشیروان سے پہلے خراج مین بعض صوبون سے تہائی بعض سے چوتھائی بعض سے پانچوان بعض سے چھٹا حصہ شادابی، اور پیداوار کے مطابق لیا کرتے تھے، اور کھوپڑیون کے جزیہ مین بھی کچھ مقرر رقم وصول کیجاتی تھی،

قباد بن فیروز نے اخیر زمانہ سلطنت مین خراج کی صحیح تشخیص کرانی چاہی، لیکن اس کا انتقال ہو گیا، اور اس کام کو اس کے بیٹے نوشیروان نے انجام دیا، طبری (حوالۂ سابق) مین ہے،

حتی اذا ملک ابنہ کسرٰی امر باستتمامھا واحصاء النخل والزیتون والجماجم ..... وامر کاتب خراجہ ان یقرء علیھم الجمل التی استخرجت من اصناف غلات الارض، وعدد النخل والزیتون والجماجم	جب اس کا بیٹا کسرٰی بادشاہ ہوا تو اُس نے اس کام کو مکمل کرایا، کھجور، زیتون اور کھوپڑیان شمار کی گئین، ..... اور محکمۂ خراج کے سکریٹری کو حکم ہوا کہ لوگون کو وہ الفاظ پڑھ کر سنائے جو زمین کے متعدد اقسام کے غلون اور کھجور، زیتون، اور کھوپڑیون کی تعداد کے متعلق درج تھے،

کسرٰی نوشیروان نے اس تشخیص کی وجہ یہ تبلائی ہے،

انا قد رأينا ان نضع على ما احصى
من جربان هذه المساحة
من النخل والزيتون والجماجم
وضائع، ونامر بانجامها في
السنة في ثلثة انجم، ونجمع في
بيوت اموالنا من الاموال مالو
أتانا من ثغر من ثغورنا او طرف
من اطرافنا فتق او شئ نكرهه
واحتجنا الى تداركه او حسمه
ببذل لنا فيه مالا كانت الاموال
عندنا معدة موجودة، و
لم نرد استئناف اجتبائها على
تلك الحال (طبری ۲۰۹۰-۲۰۹۱ جلد ۲)

مابدولت کی راے ہے کہ مابدولت کھجور
اور زیتون کی پیمائش شدہ جریبون اور
کھوپڑیون پر ٹیکس لگائین، اور سال
مین اُن کو تین قسطون مین ادا کرنے کا
حکم دین، تاکہ مابدولت کے خزانون مین
اس قدر دولت جمع رہے، کہ اگر کبھی کسی
سرحد یا کسی سمت سے کوئی بغاوت یا
بدامنی رونما ہو، اور مابدولت کو اس
کے تدارک یا قلع قمع کرنے مین روپیہ خرچ
کرنے کی ضرورت پڑے تو وقت پر
ہمارے پاس روپیہ موجود رہے اور
نئے سرے سے اس وقت مابدولت کو
روپیہ جمع کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے

اور اس جزیہ کی شرح یہ تھی،

والزموا الناس الجزية ما خلا
اهل البيوتات والعظماء و
المقاتلة والهرابذة والكتاب
ومن كان في خدمة الملك،
وصيروها على طبقات اثنى

اور لوگون پر انھون نے جزیہ لگایا سوا
اونچے گھرانون، معززین، فوج، پیشوایان
مذہبی، محرر اور ملازمین شاہی کے، اور
اور اس (جزیہ) کی چند شرحین رکھین،
یعنی بارہ درہم اور آٹھ اور چھ اور چار

عشر درهما و ثمانية و ستة و اربعة كقدر اكثار الرجل و اقلاله، ولم يلزموا الجزية من كان اتى له من السنين دون العشرين او فوق الخمسين

آدمی کی ثروت اور فقر کے لحاظ سے، اُنہ جس شخص کا سن بیس سے کم یا پچاس سے اوپر تھا، اوس پر جزیہ نہین لگایا،

(طبری ص ۹۶۲ ج ۲)

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ ایران مین انسانون پر محصول عائد تھا،

۲۔ ان محاصل کا مقصد بغاوتون کے رفع کرنے اور دشمنون کا مقابلہ کرنے کیلئے تیاری تھی

۳۔ بیس برس سے کم اور پچاس سال سے زیادہ کے آدمی محصول سے مستثنیٰ تھے،

۴۔ عورتین مستثنیٰ نہ تھین،

۵۔ جزیہ حسب حیثیت تھا،

۶۔ اونچے گھرانے، معززین، فوج، مذہبی پیشوا، منشی، اور سلطنت کے ملازم جزیہ ادا نہین کرتے تھے

چین مین جزیہ | چین مین جزیہ رقاب عرصہ سے تھا، مسلمانون مین پہلا مصنف جس نے اس کا تذکرہ کیا، سلیمان تاجر ہے، جس نے اپنا سفرنامہ ۲۳۷ھ کے حدود مین لکھا ہے، وہ لکھتا ہے،

ولكن عليهم جزية على الجماجم الذكور حسبما يرون من الاحوال وان كان بها احد من العرب او غيرهم اخذ منه جزية ماله

اور لیکن ان پر حالات کے مطابق جزیہ ہر جو نر سرون (مردون) سے لیا جاتا ہے اور اگر وہان عرب یا دوسرے ملک کا کوئی شخص ہوتا ہے، تو اس سے اس کے

لیحرز ماله،	مال کا جزیہ لیا جاتا ہے تاکہ اوس کے مال
(سفرنامہ ص ۴۰)	کی حفاظت کیجائے۔

دوسری جگہ لکھتا ہے،

ولیس علیھم خراج فی ضیاعھم	اور ان پر جائداد کا خراج نہین ہے، بلکہ
وانما یوخذ من الرؤوس علی	سرون (مردون) سے مال اور جائداد کا
قدر اموالھم وضیاعھم (ص ۴۴)	تخمینہ کرنے کے بعد (جزیہ) لے لیا جاتا ہے

آگے چل کر کہتا ہے،

فاذا بلغ ثمانی عشرة سنة اخذت	جب وہ (مرد) اٹھارہ برس کا ہوتا ہے
منه الجزیة فاذا بلغ ثمانین سنة	تو اس سے جزیہ لیا جاتا ہے، اور جب اسی
لم توخذ منه جزیة (ص ۴۴)	برس کو پہونچتا ہے، تو جزیہ نہین لیا جاتا

اس سے چند باتین معلوم ہوتی ہین،

(۱) چین مین دو قومین آباد تھین چینی اور مسلمان (۲) چینیون سے حسب حیثیت جزیہ لیا جاتا تھا (۳) جزیہ مین مردون کی تخصیص تھی (۴) عورتین مستثنیٰ تھین (۵) اٹھارہ اور اسی سال کے درمیان عمر والون سے جزیہ لیتے تھے، اٹھارہ سے کم اور اسی سے زیادہ عمر کے لوگ مستثنیٰ تھے (۶) عرب اور دوسری قومین جو تجارت کے سلسلہ سے وہان قیام پذیر تھین، ان سے جزیہ رقاب نہین لیا جاتا تھا، یہ لوگ صرف مال کا محصول ادا کرتے تھے (۷) غیر قومون سے جزیہ کی وصولی حفاظت مال کی غرض سے تھی،

اسلام مین جزیہ ہندوستان ایران اور چین کی طرح سلطنت اسلامیہ مین بھی رعایا پر جزیہ تشخیص کیا گیا جس کو لین پول اور سرکار کی طرح ہم بلاتامل جزیہ رقاب نہین کہہ سکتے، اسلامی سلطنت مین چین کی طرح دو قسم کی رعایا تھی، مسلم اور غیر مسلم، اور چونکہ دونون مین سلطنت کی امداد اور ملک کی حفاظت

کے متعلق قدرتی طور پر نقطۂ نظر کا اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے ضرور تھا کہ دونون کے لئے جزیہ کی شرح مختلف ہو اور اس کا علٰحدہ علٰحدہ نام رکھدیا جائے تاکہ سننے والون کو سمجھنے مین آسانی ہو، اسی بنا پر مسلمانون کے محصول کا نام زکواۃ اور غیر مسلمون کے خراج کا نام جزیہ رکھا گیا، معنی کے لحاظ سے زکواۃ یا جزیہ مین شرف یا ذلت کا کوئی پہلو نہین ہے،

زکواۃ اور جزیہ کا فرق | چونکہ مسلم اور غیر مسلم رعایا کی ذمہ داریان کسی حد تک مختلف تھین، اس لئے ان کے محصولون (زکواۃ اور جزیہ) کے تشخیص مین بھی اس کا لحاظ رکھا گیا،

مسلمانون کی سلطنت قومی تھی اور ضرورت کے وقت ان کو مال تو مال خود جان سے بھی دست بردار ہونا پڑتا تھا، اس لئے ان کے محصول مین "ایثار" کے جذبہ کو بہت زیادہ سامنے رکھا گیا، چنانچہ ان پر (۱) زکواۃ مقرر کی گئی، جو مختلف انواع کی جامع تھی، مثلاً

(ا) اونٹون پر زکواۃ (ب) کھجور پر زکواۃ (ج) مسکوک سونے چاندی پر زکوۃ (د) معادن پر زکاۃ، (ھ) دفینہ پر زکواۃ (و) زیور، بے سکہ سونا اور عنبر پر زکواۃ (ز) یتیمون کے مال پر زکواۃ (ح) میراث پر زکواۃ (ط) قرض کی پر زکواۃ (ی) مال تجارت پر زکواۃ، (ک) بکریون پر زکواۃ (ل) گائے پر زکواۃ (م) تجارتی گھوڑون پر زکواۃ، (ن) پھلون پر زکواۃ، (س) عید الفطر کی زکواۃ،

ان انواع مین سے اگرچہ کبھی کوئی مسلمان محصول (زکواۃ) ادا کرے تو اچھی خاصی رقم ہو جاتی ہے بخلاف اس کے غیر مسلم رعایا کی ہمدردی زیادہ سے زیادہ "عزت وطن" کے نام سے حاصل کیجا سکتی تھی، جو اگرچہ اس وقت بھی اجنبیون (عرب) کے قبضہ مین تھا، تاہم دوسرے اجنبیون (مخالفین عرب) کے ہات مین جانے سے اس کے امن وامان اور نظم ونسق مین خلل پڑنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا، اس بنا پر غیر مسلم رعایا سے واجبی محصول یا جبری مواجب (Compalsary dues) کا ایثار

لیحرز ماله، مال کا جزیہ لیا جاتا ہے تاکہ اوس کے مال کی حفاظت کیجائے۔

(سفرنامہ ص ۴۰)

دوسری جگہ لکھتا ہے،

ولیس علیھم خراج فی ضیاعھم وانما یوخذ من الرؤوس علی قدر اموالھم وضیاعھم (ص ۴۴)

اور ان پر جائداد کا خراج نہین ہے، بلکہ سرون (مردون) سے مال اور جائداد کا تخمینہ کرنے کے بعد (جزیہ) لے لیا جاتا ہے؛

آگے چل کر کہتا ہے،

فاذا بلغ ثمانی عشرۃ سنۃ اخذت منہ الجزیۃ فاذا بلغ ثمانین سنۃ لم توخذ منہ جزیۃ (صف ۴۴)

جب وہ (مرد) اٹھارہ برس کا ہوتا ہے تو اس سے جزیہ لیا جاتا ہے، اور جب اسی برس کو پہونچتا ہے، تو جزیہ نہین لیا جاتا

اس سے چند باتین معلوم ہوتی ہین،

(۱) چین مین دو قومین آباد تھین چینی اور مسلمان (۲) چینیون سے حسب حیثیت جزیہ لیا جاتا تھا (۳) جزیہ مین مردون کی تخصیص تھی (۴) عورتین مستثنیٰ تھین (۵) اٹھارہ اور اسی سال کے درمیان عمر والون سے جزیہ لیتے تھے، اٹھارہ سے کم اور اسی سے زیادہ عمر کے لوگ مستثنیٰ تھے (۶) عرب اور دوسری قومین جو تجارت کے سلسلہ سے وہان قیام پذیر تھین، ان سے جزیہ رقابہ نہین لیا جاتا تھا، یہ لوگ صرف مال کا محصول ادا کرتے تھے (۷) غیر قومون سے جزیہ کی وصولی حفاظت مال کی غرض سے تھی،

اسلام مین جزیہ ہندوستان ایران اور چین کی طرح سلطنت اسلامیہ مین بھی رعایا پر جزیہ تشخیص کیا گیا جس کو لین پول اور سرکار کی طرح ہم بلا تامل جزیۂ رقاب نہین کہہ سکتے، اسلامی سلطنت مین بھی چین کی طرح دو قسم کی رعایا تھی، مسلم اور غیر مسلم، اور چونکہ دونون مین سلطنت کی امداد اور ملک کی حفاظت

کے متعلق قدرتی طور پر نقطۂ نظر کا اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے ضرور تھا کہ دونوں کے لئے جزیہ کی شرح مختلف ہو اور اس کا علحدہ علحدہ نام رکھدیا جائے، تاکہ سننے والوں کو سمجھنے میں آسانی ہو، اسی بنا پر مسلمانوں کے محصول کا نام زکوٰۃ اور غیر مسلموں کے خراج کا نام جزیہ رکھا گیا، معنی کے لحاظ سے زکوٰۃ یا جزیہ میں شرف یا ذلت کا کوئی پہلو نہیں ہے،

زکوٰۃ اور جزیہ کا فرق چونکہ مسلم اور غیر مسلم رعایا کی ذمہ داریاں کسی حد تک مختلف تھیں، اس لئے ان کے محصولوں (زکوٰۃ اور جزیہ) کے تشخیص میں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا،

مسلمانوں کی سلطنت قومی تھی اور ضرورت کے وقت ان کو مال تو مال خود جان سے بھی دست بردار ہونا پڑتا تھا، اس لئے ان کے محصول میں "ایثار" کے جذبہ کو بہت زیادہ سامنے رکھا گیا، چنانچہ ان پر (۱) زکوٰۃ مقرر کی گئی، جو مختلف انواع کی جامع تھی، مثلاً

(ا) اونٹوں پر زکوٰۃ (ب) کھجور پر زکوٰۃ (ج) مسکوک سونے چاندی پر زکوٰۃ (د) معادن پر زکوٰۃ، (ھ) دفینہ پر زکوٰۃ (و) زیور، بے سکہ سونا اور عنبر پر زکوٰۃ (ز) یتیموں کے مال پر زکوٰۃ (ح) میراث پر زکوٰۃ (ط) قرض کی پر زکوٰۃ (ی) مال تجارت پر زکوٰۃ، (ک) بکریوں پر زکوٰۃ (ل) گائے پر زکوٰۃ (م) تجارتی گھوڑوں پر زکوٰۃ، (ن) پھلوں پر زکوٰۃ، (س) عید الفطر کی زکوٰۃ،

ان انواع میں سے اگرچہ کبھی کوئی مسلمان محصول (زکوٰۃ) ادا کرے تو اچھی خاصی رقم ہو جاتی ہے، بخلاف اس کے غیر مسلم رعایا کی ہمدردی زیادہ سے زیادہ "عزت وطن" کے نام سے حاصل کیجا سکتی تھی، جو اگرچہ اس وقت بھی اجنبیوں (عرب) کے قبضہ میں تھا، تاہم دوسرے اجنبیوں (مخالفین عرب) کے ہاتھ میں جانے سے اس کے امن و امان اور نظم و نسق میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا، اس بنا پر غیر مسلم رعایا سے واجبی محصول یا جبری مواجب (Compulsary dues) کا اتباع

چاہا گیا، جو زکوٰۃ سے مقدار مین کم اور اس کی طرح گوناگون نہ تھا، اور یہ ایک صریح رعایت تھی،

(۲) مسلمانون کا محصول (زکوٰۃ) ایک مذہبی فرض تھا، جن کو وہ کارِ خیر سمجھ کر ثواب کے لئے ادا کرتے تھے، اس لئے اس کی مقدار زیادہ ہونے مین کچھ ہرج نہ تھا، بخلاف اس کے غیر مسلمون کا محصول (جزیہ) محض سیاسی تھا، جس پر ان کے عقیدہ کے مطابق کوئی اُخروی ثواب مرتب نہین ہوتا تھا، اس لئے اس کی شرح زیادہ نہین رکھی گئی،

۳ - مسلمانون کا محصول معاف نہین ہوسکتا تھا، کیونکہ وہ مذہبی فرض تھا، لیکن غیر مسلمون کا محصول (جزیہ) نقدی شکل مین معاف ہوسکتا تھا، موانید کا مسئلہ جزیہ کے باب کا ضروری مسئلہ ہے، مبسوط (ص ۸۲ ج ۱۰) مین اس کے متعلق جو کچھ ہے ذرا تفصیل کے ساتھ ہے اور امام اعظمؒ اور صاحبینؒ کے اختلافات دکھائے ہین لیکن فتاوائے سراجیہ مین جو ۵۶۹ھ کی تصنیف ہے، یعنی مبسوط کے بعد کی ہے، اس مسئلہ کو بلا اختلاف ذکر کیا ہے اور موانید کے معنی بھی تبلائے ہین، یعنی فی الفارسیۃ ماندہا[۵۲]،

اس مسئلہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی ذمی (غیر مسلم) پر برسون سے جزیہ باقی چلا آتا ہو، تو اس کا مطالبہ نہ کیا جائے گا، بلکہ جس سال حاکم مطالبہ کرے گا، اسی سال کا جزیہ ادا کرنا ہوگا، اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ فقہا، جزیہ کو قرض نہین سمجھتے، بلکہ عطیہ اور صلہ سمجھتے ہین، مبسوط مین ہے،

لان الجزیۃ صلۃ مالیۃ ولیست	اس لئے کہ جزیہ ایک مالی صلہ ہے واجب
بدین واجب (ص ۸۰ ج ۱۰)	قرض نہین،

(۴) مسلمانون کی زکوٰۃ مین تخفیف نہین ہوسکتی لیکن جزیہ مین کمی کی جاسکتی ہے، چنانچہ نجران کے وہ عیسائی جو عراق چلے گئے تھے، انھون نے حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت مین تخفیف جزیہ کی درخواست کی تو امیر المومنین نے ولید بن عقبہ حاکم عراق کے نام ایک فرمان بھیجا، جس مین یہ فقرے

---

[۵۱] کشف الظنون ج ۲ ص ۶۷، [۵۲] فتاویٰ سراجیہ قلمی باب الجزیہ۔

بھی تھے،[1]

وانی قد خففت عنھم ثلاثین | مین نے اُن کے جزیہ سے تیس حلّے
حلۃ من جزیتھم، | کم کردیئے،

یحیٰ بن آدم (۲۰۳ھ) نے اپنی تصنیف کتاب الخراج مین جو ابھی حال مین چھپی ہے، لکھا ہے کہ حسن (شاید حسن بن صالح) کا قول تھا کہ جن لوگون پر حضرت عمرؓ نے ۴۸، ۲۴، ۱۲ کے شرح سے جزیہ مقرر کیا تھا، اُن پر اُس سے زیادہ نہ مقرر ہونا چاہئے، اور ان مین سے جو ادا نہ کرسکتا ہو اُس کے جزیہ مین تخفیف کردی جائے، کیونکہ حضرت عمرؓ یہ بھی فرماتے تھے کہ اُن کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دیجائے،[2]

۵- مسلمانون مین جو صاحبِ نصاب ہو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہین ہو سکتا، لیکن غیر مسلم خدمات کے صلہ مین نقد رقم جزیہ سے مستثنیٰ ہو سکتے ہین، چنانچہ عراق، آذربائیجان، آرمینیہ، جرجان کے فتوحات کے سلسلہ مین طبری نے حضرت عمرؓ کے فرامین اس مضمون کے متعلق نقل کئے ہین (واقعات ۱۷ھ و ۲۲ھ ہجری)

۶- اگر کوئی اسلامی ملک دشمن کے نرغہ مین ہو تو مسلم رعایا کا محصول (زکوٰۃ) واپس نہین کیا جاتا، لیکن غیر مسلم رعایا کا جزیہ واپس کردیا جاتا ہے، چنانچہ حضرت ابو عبیدہ رضؓ نے شام کے تمام عمال سے نہ صرف جزیہ بلکہ خراج تک واپس کرادیا تھا،[3]

۷- زکوٰۃ مسلمان عورتون اور بوڑھون بلکہ یتیم بچّون سے بھی وصول کیجاتی تھی، لیکن جزیہ غیر مسلم بچّون، عورتون اور بوڑھون سے نہین لیا جاتا تھا،

---

[1] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۴۲ [2] کتاب الخراج یحیٰ بن آدم قرشی ص ۲۳،

[3] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۸۱،

۸۔ زکوٰۃ مسلمانون کے مختلف ذرائع آمدنی سے وصول کی جاتی تھی، لیکن جزیہ کی یہ حالت نہ تھی،

۹۔ روپیہ کی تعداد زیادہ ہونے سے زکوٰۃ کی رقم بڑھتی جاتی ہے، لیکن جزیہ بڑے سے بڑے مالدار شخص کو بھی ۴۸ درہم سالانہ سے زیادہ نہین ادا کرنا پڑتا، رقم جزیہ کی زیادتی کے شاکی، اور غیر مسلم رعایا کی اقتصادی حالت کے مرثیہ خوان سرجدوناتھ سرکار کو حساب لگا کر دیکھنا چاہئے تھا کہ ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم پر محصول کا بار کس تناسب سے پڑتا تھا ؟

۱۰۔ زکوٰۃ کا نصاب متعین ہے لیکن جزیہ کی کوئی شرح متعین نہین، اسی لئے اس مین فقہاء مختلف الرائے ہین، جزیہ کا تقرر دو طرح پر ہوتا ہے، صلح سے کوئی رقم طے ہو جائے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوس سے اور نجران کے عیسائیون سے جزیہ طے فرمایا تھا، ایسے جزیہ کی رقم پر اضافہ نہین ہو سکتا،

غلبہ کے بعد بادشاہ جزیہ مقرر کرے، اس مین بادشاہ کو کمی بیشی کا اختیار ہوتا ہے، احکام القرآن مصنفہ امام ابو بکر احمد بن علی رازی، الجصاص (۳۷۰ھ)، اور رمز الحقائق شرح کنز مصنفہ قاضی بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی (۸۵۵ھ) وغیرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے جزیہ کی رقم متعین کرنے مین فقہاء نے اختلاف کیا ہے، حنفیہ اور حسن بن صالح ۱۲، ۲۴، ۴۸ درہم سالانہ یا ایک دو اور چار درہم ماہوار مقرر کرتے ہین، جو حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے ثابت ہے، امام مالکؒ کے نزدیک ہر بالغ پر چار دینار یا ۴۰ درہم ہین، امام شافعیؒ ایک دینار فی کس تجویز فرماتے ہین، اور امام احمدؒ تشخیص کا کام بادشاہ پر چھوڑتے ہین[۵]،

ان رعایتون اور خصوصیتون کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی ذی عقل جزیہ کو غیر ضروری ٹیکس خیال نہین کر سکتا،

جزیہ کی حیثیت | جیسا کہ اوپر کے عنوان سے معلوم ہوا ہوگا، جزیہ کی حیثیت محض سیاسی تھی، یعنی اس کو

---

[۵] احکام القرآن ج ۳ ص ۹۲ و رمز الحقائق ج ۱ ص ۳۲۰

مذہب سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا، اب یہ دیکھنا ہو کہ اس کے تعین کا باعث کیا تھا؟ کس مقصد کو سامنے رکھکر اس کی تشخیص ہوئی؟ اور اس کو کس چیز کا معاوضہ یا بدل قرار دیا گیا؟ اس مین علمار کے متعدد اقوال ہین،

جزیہ جان کا محصول ہو

مبسوط وغیرہ مین بعض علمار کے جو اقوال نقل کئے گئے ہین، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ جان کا معاوضہ ہو کیونکہ غیر مسلم جزیہ قبول کرکے قتل سے محفوظ رہتے ہین یہ وہی خیال ہو جس کی بنیاد پر لین پول نے مڈیول انڈیا مین اور جدو ناتھ سرکار نے تاریخ عالمگیر مین جزیہ کو (Poll tax) کہا ہو لیکن درحقیقت اس خیال کی کوئی اصل نہین شمس الائمہ سرخسی نے اس کو نقل کرکے خود تردید فرمائی ہے، وہ لکھتے ہین،

ثبوت الحقن لیس بالمال، بل بانعدام علۃ الاباحۃ وھو القتال،	قتل سے محفوظ رہنا مال کی وجہ سے ثابت نہین ہوا، بلکہ (خون) مباح ہونے کی علت یعنی لڑائی کے نہ ہونے کی وجہ سے (ثابت) ہوا ہے،
(مبسوط مثـ ج ۱۰)	

دوسری جگہ فرماتے ہین،

وَلا ھُوَ بدل عن حقن الدّم، لان الآدمی فی الاصل محقون الدم، و الاباحۃ بعارض القتال فاذا زال ذالک بعقد الذمۃ عاد الحقن	اور نہ وہ (محصول) حفاظتِ خون کا بدلہ ہے کیونکہ آدمی درحقیقت خون (جان) کے لحاظ سے محفوظ پیدا کیا گیا ہے یعنی اوس کو مارنے کا کسی کو حق نہین) اور (خون کا) مباح ہونا لڑائی پیش آنے کے سبب سے ہوتا ہے پس

الا صلی. ۔۔۔ جب یہ عارض (لڑائی) ذمہ کے معاہدہ

(صفحہ ۸ ج ۱۰) ۔۔۔ کے سبب سے دور ہو جائے، تو حق اصلی (جان

کے محفوظ رہنے کا اصلی حق) واپس آجائیگا'

جزیہ جان و مال کا محصول ہو؟ یہ خیال بہت قدیم ہو کہ جزیہ جان و مال کا محصول ہے، اس کا منشا یہ ہے کہ جان اور مال سے سلطنت کی امداد کرنے کے بجائے اس کو ایک خاص محصول رعایا ادا کرتی ہے، اور حفاظت کا کام فوج کے متعلق ہو جاتا ہے، منوشاستر (باب ۸، دفعہ ۳۴) سے ہندوستانیون کا، اور نوشیروان کے فرمان (مندرجہ طبری ص ۹۶۰ - ۹۶۱ ج ۲) سے ایرانیون کا جزیہ کے متعلق یہی خیال معلوم ہوتا ہے، مسلمانون مین قرن اول کے بعض حضرات مثلاً حضرت ابو عبیدہؓ وغیرہ نے اور فقہاء مین مرغینانی (۵۹۳ھ) نے ہدایہ مین اور ابن نجیم (۹۷۰ھ) نے البحر الرائق مین اُس کو ظاہر کیا ہے کہ غیر مسلمون کا جزیہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا محصول ہے،

تعجب ہو کہ سر جدوناتھ سرکار اس کو جدید خیال کہتے ہین[1] اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہین کہ ۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ) تک جزیہ خود ٹرکی مین مذہبی آزادی کا محصول سمجھا جاتا تھا، اس کے بعد فوجی خدمت سے آزادی کا معاوضہ قرار پایا، لیکن اُن کو معلوم نہین کہ جس جدید مصنف (غالباً علامہ شبلی مرحوم) کی طرف وہ اس نظریہ کو منسوب کر رہے ہین، اس سے بہت پیشتر پہلی صدی ہجری مین خود صحابہ کرام اور چھٹی صدی ہجری کے بعض مشہور فقہاء کا یہی نظریہ معلوم ہوتا ہے، رہا مذہبی آزادی کا معاوضہ ہونا تو یہ اکثر فقہاء کا جزیہ کے متعلق خیال نہین ہے، اور نہ اس کو کوئی خاص وقعت عملی طور دی گئی ہے،

جزیہ کفر کا محصول ہو امام ابوبکر جصاص (۳۷۰ھ) نے احکام القرآن مین قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ

---

[1] تاریخ عالمگیر حاشیہ ص ۲۷۴ ج ۳،

معافری اندلسی (م ۵۴۳ھ) نے جو "ابن العربی" کے نام سے مشہور ہیں، احکام القرآن میں، مرغینانی (م ۵۹۳ھ) نے ہدایہ میں، حافظ الدین ابو البرکات عبد اللہ بن احمد نسفی (م ۷۱۰ھ) نے مدارک التنزیل میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ جزیہ کفر کا محصول تھا، یا بالفاظ دیگر مذہبی آزادی کا معاوضہ تھا، لیکن اس کا ثبوت قرآن مجید یا حدیث سے نہیں مل سکتا،

جزیہ مکان کا محصول ہے | شمس الائمہ سرخسی (م ۴۸۳ھ) نے مبسوط میں، اور محمد بن احمد شربینی خطیب (موجود ۹۶۸ھ) نے تفسیر سراج المنیر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جزیہ سکونت کا معاوضہ ہے، اس طرح اس کی حیثیت کرایۂ مکان یا محصول مکان (House-Tax) کی ہے، مبسوط میں اس کو بعض کا قول لکھکر اس طرح تشریح کی گئی ہے،

قد قیل انہ بدل من السکنیٰ	بعض نے کہا ہے کہ وہ (جزیہ) سکونت
لانہ مع الاصرار علی الکفر	کا بدلہ ہے، کیونکہ وہ (ذمی) کفر پر قائم رہ
لا یکون من اھل دار الاسلام	کر دار الاسلام کے (اصلی) باشندوں میں
اصلاً ولا یمکن من السکنیٰ	کبھی شامل نہیں ہو سکتا، اور دوسرے
فی دار الغیر الا بکراء،	کے گھر میں سکونت کرایہ کے بغیر ممکن
(صفہ ۷۷ ج ۱۰)	نہیں،

پھر آگے چل کر اس خیال کی تردید کرتے ہیں،

لانہ بعقد الذمۃ صار من اھل	کیونکہ وہ ذمہ کا معاہدہ کرکے ہمارے گھر
دارنا، فانما لیسکن دار نفسہ	والوں میں سے ہوگیا، تو وہ اپنے گھر میں
ولا یسکن ملک نفسہ حقیقۃ	رہتا ہے، البتہ اپنی ملکیت میں دراصل
وقولنا دار الاسلام نسبۃ	نہیں رہتا، (کیونکہ اب اصلی ملکیت اسلام

للولایۃ ، | کی ہوگئی ہے،) اور ہمارا قول دار الاسلام
(صفحہ ۸ ج ۱۰) | ولایت (تولیت) کی نسبت کے سبب ہے،

اس تردید کے الفاظ پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ امام سرخسی غیر مسلم آبادی کو اس سے بلند سمجھتے ہین کہ اس کو سلطنتِ اسلام کا کرایہ دار فرض کرین ،

جزیہ امن کا محصول ہے

امام ابوحیان غرناطی اثیر الدین ابوعبد اللہ محمد بن یوسف جیانی (م ۷۴۵ھ) نے تفسیر البحر المحیط مین لکھا ہے کہ جزیہ امن کا معاوضہ ہے ،

جزیہ کسی چیز کا محصول نہین بلکہ مالی امداد ہے

ان نظریات کے نقل کرنے کے بعد اب ہم اس مقام پر پہنچے ہین ، جہان دراصل غیر مسلم رعایا کی صحیح منزلت اور جزیہ کی اصل حقیقت نظر آتی ہے شمس الائمہ سرخسی (م ۴۸۳ھ) جنھون نے ۳۰ جلدون مین المبسوط لکھی ہے ، جو فقہ حنفی کی مستند کتابون مین سب سے بڑی کتاب ہے ، جزیہ کے متعلق یہ خیال ظاہر فرماتے ہین کہ وہ کسی چیز کا معاوضہ یا محصول نہین ہے ، بلکہ مالی امداد ہے ، ان کے الفاظ یہ ہین ،

لان الجزیۃ صلۃ مالیۃ (ص ۸ ج ۱۰) | کیونکہ جزیہ مالی امداد ہے ،

دوسری جگہ لکھتے ہین ،

فاذا ثبت انہ لیس بعوض عن شیئ عرفنا انہ صلۃ ، (ص ۸۲) | جب یہ ثابت ہوگیا کہ وہ (جزیہ کا مال) کسی چیز کا عوض نہین ، تو ہم نے سمجھا کہ وہ (مال) صلہ ہے ،

ان الفاظ کو پڑھو اور بار بار پڑھو کیا یہ وہی جزیہ ہے جس کو یورپ اور ہندوستان کے غیر مسلم حد درجہ ذلت آمیز اور نفرت انگیز خیال کرتے ہین ، اور جس کی باعث ان کے دلون مین اسلامی سلطنتون کی طرف سے بغض و عناد بھرا ہوا ہے ، محکوم قومون کے محصول کا مالی امداد نام رکھنا فاتح و مفتوح کی

اس مساویانہ حیثیت کو نمایان کرتا ہو جس کی نظیر خود اعتراض کرنے والون کی قومی تاریخون مین بھی نہین مل سکتی،

جزیہ ایک خاص عطیہ ہو، شمس الائمہ سرخسی کا نظریہ بیان کرنے کے سلسلہ مین اب یہ دکھانا ضروری ہو گیا ہو کہ مشرق کی طرح مغرب بھی غیر مسلمون کا اسی فراخ دلی سے خیر مقدم کرتا تھا، اور سلطنتِ اسلامیہ کے پورے طول و عرض سے جزیہ کے متعلق ایک ہی آواز آتی تھی، ابن العربی اندلسی قاضی ابو بکر معافری (۵۴۳ھ) نے جزیہ کو ایک مخصوص عطیہ لکھا ہے، جس سے ان شریفانہ جذبات کا پتہ چلتا ہے، جو غیر مسلم رعایا کے احترام کے متعلق اسلامی قانون سازون اور قانون دانون کے دلون مین موجود تھے، اور جنھون نے فقہ (قانون) کی کتابون مین جگہ پا کر عملی حیثیت اختیار کر لی تھی، کیا وہ محصول جو "مالی امداد" ہو "عطیۂ خاص" ہو، کسی شخص کی دل آزاری یا ذلت کا باعث ہو سکتا ہو؟ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبے است
گل است سعدی و درچشم دشمنان خار است

جزیہ نشان فرمانبرداری ہو اس حد تک لکھنے کے بعد اب یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، کہ جزیہ فرمان بردار رعایا ہونے کی ایک علامت ہے، آج بھی جو رعایا محصول ادا نہین کرتی، باغی سمجھی جاتی ہے، اسی طرح اسلامی حکومت کے زمانہ مین جو لوگ جزیہ نہین دیتے تھے، حربی (جنگجو) سمجھے جاتے تھے، اور جزیہ ادا کرنے والے سلطنت کے مطیع اور فرمانبردار متصور ہوتے تھے شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہین،

لان الذمی ملتزم احکام الاسلام فیما یرجع الی المعاملات،	کیونکہ ذمی اسلام کے ان احکام کا پابند ہوتا ہے، جو معاملات سے متعلق ہین،

(مبسوط ص ۸۴ ج ۱۰)

(باقی)

تاریخ بابل

سلسلۂ اعلام القرآن

از

مولانا ابوالجلال صاحب ندوی

"مولانا ابوالجلال صاحب ندوی اعلام القرآن کے نام سے جو کتاب لکھ رہے تھے، افسوس ہے کہ وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے لیکن اس کے متفرق اجزاء لکھ گئے ہیں، ان میں سے بعض معارف میں شائع بھی ہو چکے ہیں جن کو اہلِ علم نے بہت پسند کیا، اور ان کو جاری رکھنے کی فرمائش کی اس لئے وقتاً فوقتاً اس کے مختلف ٹکڑے ہم شائع کرتے رہیں گے۔ "م"

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مخالفون میں سے ایک کا نام اخیاہ تھا، سفر ملوک میں اسی کو نبی بتایا گیا ہے، حضرت سلیمانؑ کی زندگی ہی میں اُس نے اُن کے ایک نوکر کو حضرت سلیمانؑ سے ان پر کفر و شرک کا الزام لگا کر بھکایا، کہ ان کے خلاف بغاوت کر دو، یربعام نے بغاوت کی، ناکام ہوا، مصر بھاگ گیا، ان کی وفات کے بعد وہ مصر سے واپس آیا اور بنی اسرائیل کے دس قبیلوں کو یربعام نے خاندان سلیمان سے توڑ لیا، ۵ برس بعد فرعون مصر شیشق نے یروشلم پر چڑھائی کی، اور اس کو لوٹ مار کر چلا گیا، اس سے یربعام کی حکومت مستحکم ہو گئی، کچھ عرصہ بعد یربعام نے اپنے زیر اثر بنو اسرائیل کو بہکا کر بچھڑے سے دین سامری کو رواج دیا اور بنو اسرائیل کا یہ طبقہ بچھڑا پوجنے لگا،

یہ واقعہ سفر ملوک نمبر ۱ (۱۱: ۲۹، ۴۰، و ۱۲: ۲۰، و ۱۴: ۲۵) اور سفر ایام میں بہ تشریح مذکور ہے۔

عرب کے اندر آغاز اسلام میں ایسے بنی اسرائیل بھی تھے، جو حضرت سلیمانؑ کی بابت اخبار کے فتوی پر ایمان رکھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر اعتراض کرتے ہوئے اخبار کو نبی ماننے والے چند اہل کتاب نے کوئی ایسی بات کہی جس کے جواب میں خدا نے فرمایا،

ولما جاءھم رسول من	اور جب ان کے پاس ایک پیغمبر آئے اللہ
عند اللہ مصدق لما معھم	تعالی کی طرف سے جو تصدیق بھی کر رہے ہیں
نبذ فریق من الذین اوتوا	اس کتاب کی جو اُن کے پاس ہے، ان اہل
الکتاب کتاب اللہ وراء	کتاب میں سے ایک فریق نے خود اس کتاب
ظھورھم کانھم لا یعلمون	اللہ ہی کو پس پشت ڈال دیا، جیسے گویا
واتبعوا ما تتلوا الشیاطین علی ملک	اصلا علم ہی نہیں اور انھوں نے ایسی چیز
سلیمان وما کفر سلیمان ولکن	کا اتباع کیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے
الشیاطین کفروا یعلمون الناس	شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی
السحر وما انزل علی الملکین	سلطنت میں اور حضرت سلیمان علیہ السلام
ببابل ھاروت وماروت،	نے کفر نہیں کیا، مگر شیاطین
(بقرہ ۱۲ : ۹۵ و ۹۶)	کفر کیا کرتے تھے، اور حالت یہ
	تھی کہ آدمیوں کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے
	تھے، اور اس کا بھی جو ان دونوں فرشتوں
	پر نازل کیا گیا تھا بابل میں جن کا نام
	ہاروت و ماروت تھا،

حضرت سلیمان کے حالات سفر ملوک اور سفر ایام کے مؤلفوں نے ناتن بنی (؟) کی کتاب اور سیلانی

اخیاہ کی پیشین گوئیوں اور عبدوینی کی روایتوں کی کتاب سے نقل کئے ہین' (سفر ایام ۹ - ۲۹) یہ کتابین اب ناپید ہین، حضرت سلیمانؑ پر اہل کتاب کے کفر کا فتوی دراصل سیلانی اخیاہ کی کتاب کا اعادہ تھا، یہ کتاب نزول قرآن کے زمانہ تک موجود تھی، اور کلام اللہ سمجھ کر اس کی تلاوت کی جاتی تھی، اسی کتاب کا ذکر قرآن کی اس آیت مین ماتتلوا الشیاطین کے لقب سے آیا ہے، اس آیت مین خدا نے بتایا ہی کہ سلیمان علیہ السلام نہین بلکہ اُن پر کفر کا فتوی لگانے والے شیاطین خود کافر تھے، اُن کے کافر ہونے کی دلیل یہ ہی کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو سحر کی اور ہاروت اور ماروت کے نام سے سحر کی تعلیم دیتے تھے،

ہاروت اور ماروت کی ہستیوں (وران) کے نام سے سحر کا یہ محل نہین ہے، یہ فرشتے کہلانے والے اشخاص بابل کے باشندے تھے،

وجہ تسمیہ | بابل کو یہ نام کیون دیا گیا؟ اس سوال کے جواب مختلف دئیے گئے ہین، یاقوت نے معجم البلدان مین لکھا ہے،

قال ابو المنذر ھشام بن محمد	ابو المنذر ہشام بن محمد نے کہا کہ......
..... ومدینۃ بابل بناھا بیوراسب	بابل کا بانی بیوراسب جبار تھا، بابل کی
الجبار واشتق اسمھا من اسم المشتری	پرانی زبان مین مشتری کو بابل کہتے تھے
لان بابل باللسان البابلی الاول اسم	اسی کے نام سے یہ شہر موسوم ہوا،

(معجم، ج ۲)

بانی بابل کا نام بیوراسپ غالباً ایران کی کہانیون سے ماخوذ ہے، پرانی کلدانی مین بابل مشتری کو کہتے تھے یا نہین اس کا ہم کوئی فیصلہ نہین کر سکتے، یہ بات یاقوت نے تذکرہ بابل مین کہی ہے' فسطاط مصر کا ایک زمانہ مین کسی وجہ سے بابیرن نام تھا، بابلیون کے ذکر مین یاقوت نے لکھا ہی،

ذکر اھل التوراۃ ان منازل آدم	اہل توراۃ کا بیان ہے کہ آدم علیہ السلام
علیہ السلام کان بابل فلما قتل	بابل مین رہتے تھے جب قابیل نے ہابیل

قابیل ھابیل مقت آدم قابیل فھرب قابیل باھلہ الی الجبال عن ارض بابل فسمیت بابل یعنی الفرقہ

کو قتل کیا تو آدم علیہ السلام قابیل سے نفرت کرنے لگے، اور قابیل پہاڑون کی طرف بھاگ گیا، اس لئے اس کا نام بابل یعنی "جدائی" رکھا گیا،

معلوم نہین اہلِ تورات کا یہ قول یاقوت نے کہان سے نقل کیا، سفرِ تکوین مین یہ ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم کے اسلاف اس دیار مین قدم سے آئے، اُن کے یہان آنے سے پہلے

وھی کل ارض شفتیم احل یعر دوبریواحل یھو،

ساری زمین ایک ہونٹ اور ایک بولی تھی،

یہان پہنچنے کے بعد ان لوگون نے ایک برج بنانا چاہا، خدا کو یہ ارادہ ناگوار گذرا، اس لئے خداوند نے ان کی بولی بات مین اختلاف ڈال کر ان کو تمام روے زمین مین پراگندہ کیا، سو وے اس شہر کے بنانے سے باز رہے۔ یہ واقعہ نقل کر کے سفرِ تکوین کے جامع نے لکھا ہے، کہ

"اس لئے اس کا نام بابل (اختلاف) پڑا کیونکہ خداوند نے وہان ساری زمین کی زبانون مین اختلاف (ببل) ڈالا، اور وہان سے اُن کو تمام روے زمین پر پراگندہ کیا، (تکوین ۱۱: ۱ تا ۹)

یاقوت نے ابوبکر احمد بن مروان المالکی الدینوری کی کتاب المجالس کے حوالہ سے تقریباً یہی قصہ حضرت انس بن مالک رضؓ کی طرف منسوب کیا ہے، جس مین انھون نے اخیر مین فرمایا ہے کہ پھر لوگ بہتر زبانین بولنے لگے،

وتبلبلت الالسن، فسمیت بابل،

اور زبانین گڈمڈ ہوگئین، اس لئے اس کا بابل نام پڑا،

کسی عمارت کی تعمیر اختلاف السنہ کا سبب نہیں ہو سکتی، جس عمارت کی تعمیر کے عزم کا توراۃ
مین ذکر ہے، اور بتایا گیا ہے کہ بولی بات مین اختلاف کی بدولت وہ اس عمارت اور شہر کی تعمیر سے باز
رہے، بعد مین ان لوگون مین جو یہین رہ گئے، اسے بنایا، اس عمارت کا نام سمیری زبان مین تنتر کی
کادنجر (دیوتا کا آستانہ) تھا، اسی کا ترجمہ یہان کے سامی باشندون نے باب ایل (خدا کا پھاٹک) اور
باب ایلون (خداؤن کا پھاٹک) کیا، جو مختصر ہو کر بابل ہو گیا، یہ پہلے اسی برج کا نام تھا، جسے تورا تی
بیان کے مطابق تعمیر کرنے کے عزم کی بنا پر خدا نے وہان والون کی بولی بات مین اختلاف ڈالا، پھر تدریج
یہ نام اس شہر کا جس مین یہ عمارت تھی، اور اس کے بعد اس پورے علاقہ کا نام ہو گیا، جس پر شاہانِ
شہر بابل حکومت کرتے تھے، توراۃ مین جس قسم کی بولی بات کے اتحاد اور اختلاف کا ذکر ہے، وہ مذہبی
کلمہ کا اتحاد اور مذہبی کلمہ کا اختلاف ہے، اس بولی بات کے اختلاف کی نظیر بابل کے دو بادشاہون
کے نامون مین ملتی ہے،

ایک شاہ بابل کا نام تھا سامو ابی یعنی میرا باپ سام ہے، اس نام مین کوئی بات ایسی ہے
جس سے ایسے نام خدا کو ناپسند تھے، چنانچہ توراۃ کے بیان کے بموجب حضرت ابراہیم کا نام جو اُن کے
باپ نے رکھا تھا، وہ ابی رام تھا، (میرا باپ رام ہے) خدا نے حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ یہ نام بدل دو،
اور آج سے تمھارا نام ابی رام نہین، بلکہ ابراہام ہوگا، حضرت ابراہیم کا نام جس سبب سے خدا نے
بدلوایا، اس کو سمجھنے کے لئے حضرت یرمیاہ کے صحیفہ مین خدا کا ارشاد پڑھو،

"جس طرح چور جب پکڑ لیا جاتا ہے رسوا ہوتا ہے، اسی طرح اسرائیل کا گھرانا
اوران کے بادشاہ اور امیر اور کاہن اور جھوٹے موٹے نبی رسوا ہونگے، جو کاٹھ
سے کہتے ہین کہ تو میرا باپ ہے، پتھر سے کہ تو نے مجھے جنا، انھون نے میری طرف رُخ نہین
بلکہ پشت پھیر رکھی ہے مگر مصیبت کے وقت کہین گے اُٹھ اور ہمین بچا، (یرمیاہ ۲: ۲۶، ۲۷)

اس سے معلوم ہوا کہ ابی رام اور ساموابی جیسے نام رکھنے کا مطلب اس عقیدہ کا اعلان تھا' کہ راموا یلو (رام ایک خدا ہے) اور ساموا یلو (سام ایک خدا ہے) اب ساموابی کے نام کا مطلب سمجھنے کے بعد اس کے ایک جانشین کا نام سنو، سامولوا یلو (سام خدا نہین ہے) اس قسم کے بہت سے نام باشندگان بابل کے پیش کئے جاسکتے ہین مثلاً بل بالی (بعل خالق ہے) اور یابنی (یا خالق ہے) ان نامون سے ظاہر ہے کہ بابل مین جاکر بسنے کے بعد وہان والون مین جس قسم کا اختلاف اُن کی بولی بات مین پڑا تھا، وہ مذہبی اختلاف تھا، اور اسی مذہبی اختلاف کی وجہ سے بابل کو باب ایل نہ ماننے والون نے اسے بدل کر بیل بنا دیا، اور اب اس نام کے معنی طرح طرح کی بولی بولنا ہوگئے، بابل کی توراتی وجہ تسمیہ کو جدید تحقیقات کی روشنی مین غلط نہین کہنا چاہیئے، بلکہ اسے ترمیم اسم کی وجہ قرار دینا چاہیئے، بابل کے مندر کو باب ایل تسلیم کرنا سفر تکوین کے جامع کے لئے ناممکن تھا اسلئے اختلاف کلمات کے مطالب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس شہر کے نام مین ترمیم کردی گئی،

محل وقوع | بابل عراق کے ایک شہر کا نام ہے، عراق دریاے دجلہ وفرات کی درمیانی وادی کا نام ہے، عرب کے نقشہ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ طول بلد ۴۸، و ۵۰ اور عرض بلد ۳۰ تک خلیج فارس، ایران وعرب کے درمیان گھسی ہوئی ہے، جس مین دریاے دجلہ وفرات گرتے ہین، جو واسط کے پاس پہنچکر ایک ہوجاتے ہین، واسط سے شمال کی جانب طول بلد ۴۵ اور عرض بلد ۳۰ کے پاس فرات کے مغربی کنارہ پر ایک مقام واقع ہے، جو تل نمرود کہلاتا ہے، اسی مقام کا نام بابل تھا، جسے عرصہ دراز کی بول چال نے دوآبہ دجلہ وفرات کے ثلث زیرین کا نام بنا دیا تھا،

باشندگان بابل | بابل کی وجہ تسمیہ مین ایک قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ یہی مقام آدم کا ابتدائی مسکن تھا، جہان سے قابیل جیال نود کو بھاگا تھا، یہ قول قابل استناد نہین ہے، یاقوت نے لکھا ہے،

ویقال ان اوّل من سکنہا نوح — اور کہا جاتا ہے کہ بابل مین سب سے پہلے

علیہ السلام وھو اول من   حضرت نوح آباد ہوئے، اور یہاں وہ
عمرھا وکان نزلھا بعقب الطوفان   طوفان کے بعد آئے،

قرآن مجید کے بیان کے مطابق جس پہاڑ پر حضرت نوحؑ کی کشتی لگی تھی، اس کا نام جودی ہے،
اور توراتی نام اس پہاڑ کا اراراط ہے، آشوری روایات کے مطابق اس پہاڑ کا نام نسر تھا، (دیکھو
بحث جودی) حضرت نوحؑ اور اُن کے اصحاب کشتی اسی پہاڑ کے آس پاس بسے ہونگے، یہ آرمینیہ مین
واقع ہے، حضرت نوحؑ کا بابل مین آباد ہونا مشکل سے یقین کیا جاتا ہے، مگر آشوری افسانہ ازدوبار
مین جس کا تذکرہ قصہ نوح مین کیا گیا ہے، طوفان سے پیشتر حضرت نوحؑ کا آشوری نام تاسیت ناپشتم
(سشیث کا مل) تھا شہر شد پاک کے باشندے اور اُبارا تو تو (قوم اُبار) کے فرزند تھے، یہ شہر خود اس افسانہ
کے مطابق "ساحل فرات" پر واقع تھا، غالبًا اسی روایت نے بعد مین یہ صورت اختیار کر لی کہ حضرت
نوح کا مسکن بعد طوفان بابل مین تھا، توراۃ کے بیان کے مطابق بنی نوح جو اس دیار مین بسے یہان
کے قدیم باشندے نہین تھے، بلکہ وہ اس دیار مین قدم سے آئے،

"اور جب وے قدم سے روانہ ہوئے، تو ایسا ہوا کہ انھون نے سنعار کے ملک مین ایک
میدان پایا، اور وہین رہ پڑے، (تکوین ۱۱: ۲)

اسی ملک سنعار کے اس حصہ کا جس مین بنی نوح یا بالفاظ دیگر اسلاف ابراہیم علیہ السلام
آباد ہوئے، دوسرا نام بابل ہے، (تکوین ۱۱: ۹)

توراۃ کی اس آیت مین میدان کی بجائے اصل عبرانی لفظ "قاعہ" ہے، "قاعہ" چٹیل میدان کو کہتے
ہین، جہان نہ آدم ہو نہ آدم زاد، اور وہان نہ درخت ہو اور نہ کوئی اور سایہ دار چیز، بنی نوح یا اسلاف
ابراہیم علیہ السلام یہان ایسے زمانہ مین آئے جب یہ علاقہ غیر آباد تھا،

حضرت ابراہیم کے اسلاف مین ایسے افراد بہت گذرے ہین، جو اپنے نام "ساموابی" جیسے رکھتے

تھے، اس لئے وہ بنو سام کہلائے، ان لوگون کے یہان آنے کے بعد لیکن اُن کے برسرعروج آنے سے پہلے ایک اور قوم اس دیار مین آبسی جس کی زبان اور طرز زندگی کے علاوہ صورت شکل بھی مختلف تھی، آثار باقیہ کے علمار نے اس قوم کو سمیریون کا نام دیا ہے، سفر تکوین کا جامع اور اس کے اتباع مین بعد کے عرب مورخین تمام اقوام عالم کو حضرت نوحؑ کے تین بیٹون کی اولاد بتاتے ہین جن مین سے ایک تو بنو سام کا مورث تھا سام، ایک بیٹے کا نام حام تھا، دراصل یہ نام مصری لفظ خم کی عبرانی صورت ہے، خم سرزمین مصر کا نام تھا، کیونکہ وہان کی زمین سیاہ ہے، اور خم کے معنی ہین کالی مٹی، رفتہ رفتہ یہ اہلِ مصر اور ان کے ہم نسلون کے مورثِ اعلیٰ کا نام ہوگیا، تورات کے بیان کے مطابق بنو حام بھی ابتدا مین سرزمین بابل مین رہتے تھے، پھر مصر وغیرہ مین جا بسے، تیسری قوم کا تورانی نام بنو یافث ہے، یہ بھی ابتدا مین بابل مین رہتے تھے، ان بابلی بنو یافث کو ہم آثارِ قدیمہ کی سمیری قوم سے تطبیق دیسکتے ہین حاصل اس تفصیل کا یہ ہو کہ شنعار مین جو کہ بعد مین ارضِ بابل یا کلدانیون کی سرزمین کہلایا، ابتدا مین تین قومین آباد تھین (۱) بنو یافث (۲) بنو حام، (۳) بنو سام

لیکن بابلی آثار قدیمہ کے علمار اس علاقہ کی دو ہی قومون کو جانتے ہین جن مین سے ایک سومیری قوم تھی اور ایک سامی لیکن توراۃ کے بیان کو بالکل بے اصل نہین کہا جا سکتا،

اور کی حکومت کے قیام سے پہلے کش نام ایک شہر مین مسلیم نام ایک فرمانروا تھا جس کے جانشینون کا راج عروج وزوال کے ساتھ ۴۲۰۰ سے ۳۱۰۰ قم تک قائم رہا، یہ خاندان سامی النسل تھا، ۴۵۰۰ قم ۲۱۰۰ قم تک شہر سرلا نام ایک شہر مین جس کو جمدسو، تن جمسو، اور سنجر بھی کہا جاتا تھا، ایک بادشاہ اوہ کا جنا اور اس کے جانشین راج کرتے رہے، ان بادشاہون کو سمیرین قوم سے بتایا گیا ہے، مسلیم کے برسرعروج آنے سے پہلے ۵۰۰۰ قم مین ایک شاہ کنجی گذرا ہے، جس نے مسلیم کے پیش رو حکام کش کو شکست دیکر یہان کا مال غنیمت آثارِ قدیمہ کی شہادت کے مطابق "زمینون کے خداوند ابلیل" کی

خدمت مین نذر پیش کیا تھا، اس بادشاہ کی بابت ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ کی پہلی جلد کے مولف نے لکھا ہے کہ ہمارے پاس یہ بتانے کے لئے مواد موجود نہین ہے کہ وہ کس قوم سے تھا سامی تھا یا سمیری تھا،

لیکن اس کا نام تھا، ان شنگ کوش انا، جو چار لفظون کا مجموعہ ہے،

(۱) شنگ یا سنگ = سردار (۲) انا = آسمان رتبہ (۳) ان = آقا، (۴) کوش = یہ نام تورانی کوش بن حام کے نام سے ملتا جلتا ہے، جس کے فرزند نمرود کی بابت توراۃ مین ہے، کہ

اس کی حکومت کی ابتدا شنعار کی سرزمین مین بابل ارک، اکاد اور کلنہ مین ہوئی مگر پھر وہ اشور کو نکل گیا، اور نینوی کا احاب عبرادر کلح کو بنایا، اور نینوی اور کلح کے درمیان اس کی تعمیر کی، جو بڑا شہر ہے، (تکوین ۱۰: ۱۰ تا ۱۲)

چونکہ بنو حام بالکل ابتدائی زمانہ مین اس دیار سے نکل گئے تھے، اسلئے اُن کے نشانات یہان نہین ملتے، مگر واقعہ یہ ہو کہ اس دیار مین پہلے تین قومین آباد تھین، ان تینون کو سفر تکوین کے جامع نے حضرت نوحؑ کی اولاد بتایا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ قصہ کہان تک درست ہو کہ تمام زبانین بولنے والی دنیا بھر کی تمام قومین حضرت نوحؑ کی اولاد ہین،

بنو سام یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسلاف اس دیار مین قدم سے آئے تھے، قدم کے لغوی معنی سامنے کے ہین، مصر والے مشرق کو قدم کہتے تھے، توراۃ پر مصری محاورہ کا فی اثر ہے، قدم توراۃ مین خصوصیت کے ساتھ عرب کا نام ہے دوآبہ فرات و خابور کے علاوہ پورے عرب کو بشمول آرمینیہ جہان دجلہ و فرات کے سرچشمے واقع ہین، توراۃ مین قدم کہا گیا ہے جس قوم کو سمیری کہا جاتا ہے ہمارے خیال مین اسی کا قرآنی نام یاجوج اور ماجوج ہے،

افسانوی تاریخ | قرآن مجید کی جس آیت مین بابل کا ذکر ہے نہ صرف اُس کے بلکہ قرآن مجید کے

اکثر قصون کے فہم کے لئے ابتدا سے بنی اسرائیل کی اسیری بابل کے عہد تک دوآبہ دجلہ و فرات کی اجمال کے ساتھ پوری تاریخ دینا زیادہ مفید ہوگا، ہر قوم خصوصًا ایسی قوم کی تاریخ جس کا زمانہ عروج فن تحریر کی ایجاد سے پہلے گذرا ہو خلاف عقل کتھاؤن سے شروع ہوتی ہے، ان کتھاؤن مین زمانہ دراز کی بھول بھلیون اور شاعرون کی بلند پروازیون نے بہت مشکلات پیدا کردی ہین لیکن ہر ایک کتھا اپنے اندر قدیم تاریخ کو چھپائے ہوئے ہے،

اہل بابل کی ایک کتھا کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدا مین دو ہستیان تھین جن کے نام ہین اپسو اور تیامت، یہ دونون میان بی بی تھے، ان سے لخمو اور لخامو پیدا ہوئے، جو انشر اور کیشر کے والدین تھے، ان دونون نے انو، بل اور ایا وغیرہ دیسی دیوتاؤن کو جنم دیا، ان دیسی دیوتاؤن سے ناراض ہوکر تیامت نے چند شریر ہستیون کو چن کر اُن کا امیر کنجو کو مقرر کیا، اور کنجو کی فوج دیوتاؤن سے ان کی خدائی چھیننے کو چلی، اس کی خبر انشر کو ہوگئی، اس نے اپنے ایلچی جاجا کو بھیج کر دیوتاؤن کو متنبہ کیا، چنانچہ مردوک اُن سے لڑنے کو اترا اور اس نے تیامت کو چیر کر دو حصے بنا دیئے جن سے آسمان اور زمین، پھر سیارے اور انسان وجود پذیر ہوئے، (ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ ج ا ص ۵۰۰)

اس افسانہ کے اندر قدیم تاریخ موجود ہے، قدیم زمانہ مین عرب کو خالدیہ والے ماتی تیامت، (ارض البحر) کہتے تھے، نخم عرب مین ایک خاص قسم کی مچھلی کو کہتے ہین، اس لئے ماتی تیامت یعنی ارض البحر کے قدیم باشندے نخم کہلائے، یہ بنو نخم جب اس سرزمین مین پہنچے جس کا قرآنی نام بابل ہے، تو وہ انشر اور کیشر بن گئے، یہان انھون نے انو، بل اور ایا وغیرہ بہت سے دیوتاؤن کو جنم دیا، اور وہ مشترک اور متعدد دیوتاؤن کے قائل ہوگئے، اس وقت کنجو نام ایک رئیس کے ماتحت تیامت یعنی ارض البحر کے رہنے والے ایک دوسرے گروہ نے دیوتاؤن کی خدائی سے محروم کرنے کی جد و جہد شروع کی، ان دونون گروہون مین جنگ ہوئی، ایک گروہ کا رئیس کنجو تھا، دوسرے کا مردوک، مردوک

کے گروہ مین ایک تیسرا گروہ بھی شامل تھا جس کا نام (Gaga) ہے یہ نام توراتی جوج کے نام سے ملتا جلتا ہی، جوج کا نام قرآن مین یاجوج اور آشوری کتبون مین اجی جی ملتا ہے، اس جنگ مین غلبہ اس گروہ کو ہوا، جس کو جوج کی تائید حاصل تھی، اور مردوک نے پھاڑ کر تیامت کے دو حصّے کر دئیے، ان مین ایک حصّہ آسمان (سام) اور دوسرا حصّہ زمین (حام) کے نام سے موسوم ہوا،

اثری تاریخ | یہ تاریخ اس زمانہ کی ہے، جب فن تحریر ایجاد نہین ہوا تھا، اس کی ایجاد کے بعد ہم کو اس دیار مین دو قومین ملتی ہین جن مین سے ایک کو آثار قدیمہ کے علما نے سمیری قوم کا نام دیا ہے کیونکہ قدیم شاہان عراق جو شمالی اور جنوبی دونون حصّون پر حکومت کرتے تھے، اپنے آپ کو اکاو اور سومیر کا بادشاہ کہتے تھے، اور دوسرے گروہ کو بنو سام نام دیا گیا ہے جن کی بولی عربی اور عبرانی وغیرہ بانون کے مطابق تھی،

انسانوی تاریخ مین سمیری قوم کا ذکر جاجا کے نام سے آیا ہے، جو توراۃ کا جوج اور قرآن کا یاجوج ہے اس زمانہ مین یہ قوم لحم اور کنجو کے مقابل غیر اہم تھی لیکن اثری زمانہ مین جو فن تحریر کی ایجاد کے بعد گذرا ہے ابتدا مین یہی قوم سب سے اہم تھی، اور سب سے پہلے اسی قوم نے اس دیار کے متعدد شہرون مین چھوٹی چھوٹی حکومتین قائم کین، پھر کچھ عرصہ بعد سامی زبانین بولنے والون نے بھی حکومت اور اقتدار مین حصّہ بٹانا شروع کیا، اسی زمانہ کی بابت توراۃ مین ہو کہ

"عابر سے دو فرزند پیدا ہوئے ان دو مین سے ایک کا نام فلج رکھا، کیونکہ اس کے زمانہ مین زمین بانٹی گئی، اور دوسرے کا نام یقطن رکھا گیا،

سب سے قدیم سامی بادشاہ جس نے ارض عراق مین اپنی حکومت قائم کی تھی، حال کی تحقیقات کے مطابق کش کا شہریار مسیلم تھا، اس کا زمانہ اندازاً ۵۵۰۰ ق م قرار دیا جاتا ہے، اس کے جانشینون کی حکومت عروج و زوال کے ساتھ ۳۰۰۰ ق م تک قائم رہی، پھر پورے علاقہ مابین دجلہ و فرات

پر ایک دوسرے سامی خانوادہ نے قبضہ کر لیا، جس کا مرکز حکومت اکاد تھا، اور اس خانوادہ کے بانی کا نام تھا،

شارجنی سارعلی بن اتی بل

اس کو آشوری روایتون کے مطابق سرجون اکبر بھی کہا جاتا ہے، یہ نام توراتی عابر کے پوتے سروج بن رعو کے نام سے ملتا جلتا ہے،

سرجون اکبر کے برسر عروج آنے سے پہلے ایک شہر سربرلامن پر جس کو جرسو، بن جرسو، اور سنجر بھی کہتے تھے، ایک سمیری خانوادہ حکومت کرتا تھا، جس کے قدیم ترین فرمانروا کا نام اور کا جنا ہے اس کی حکومت مسلم سے تقریباً سو برس پہلے قائم ہوئی، اور سرجون اکبر کے زمانہ تک عروج وزوال کے ساتھ قائم تھی، سرجون اکبر کے پہلے اور اور گوئی نام دو شہرون مین دو اور حکومتین سومیریون کی تھین، خاندان سرجون کی حکومت ضعیف ہو جانے اور ابرخ، امی س، اور لارسا مین چھوٹی چھوٹی حکومتین قائم ہوئین، ۲۴۰۰ ق م کے قریب ان تمام حکومتون کو ایک نئے خاندان نے جس کے بانی کا نام ساموابی تھا، اور جس کا پایۂ تخت شہر بابل تھا ختم کر دیا، سوموابی کے خانوادہ کو عربی خاندان بتایا جاتا ہے،

اس طرح بابل مین یکے بعد دیگرے سات خانوادون نے ۸۲۰ ق م تک حکومت کی جن مین سے دوسرے خانوادہ کے گیارہ بادشاہون کے نام سومیریون کے سے ہین، اس خانوادہ کے خاتمہ (۱۸۳۷ ق م) کے بعد سے سمیری قوم بتدریج اس طرح نابود ہو جاتی ہے کہ پھر اس کا سراغ نہین ملتا،

۱۳۰۰ ق م کے قریب ملک اشور مین ایک اور سامی قوم نے اپنی عظمت ووقار کی بنیاد رکھی قرآن کریم مین قوم یونس کے نام سے اسی قوم کا ذکر آیا ہے، جس کے ایک بادشاہ تغلات پلاسر

(نوکلتی اپلا اشور) نے ۷۲۸ھ مین بابل کی حکومت کا خاتمہ کرکے اس علاقہ پر خود اپنا راج قائم کرلیا،

لیکن ۶۲۶ھ ق م کے بابل کے ایک اشوری گورنر بنواپل اشور نے بابل مین ایک نئے خانوادہ کی بنیاد

ڈالی جس کو ۵۳۸ھ ق م مین ایرانیون نے شکست دیکر اپنے ماتحت کرلیا،

یہ ہے بابل کے اس عہد تک کی مختصر تاریخ جس عہد کے بابل کا قرآن کریم مین ذکر آیا ہے،

بنواپل اشور (نبو پلاسر) کے فرزند نبوکدرا وسر کا بائبل مین بنوکدصر کے نام سے ذکر آیا ہے، یہ

نام نبوخد نصر پھر نبوخت نصر، پھر بخت نصر ہوکر عربی تاریخون مین بخت نصر بن گیا ہے، اسی بخت نصر

کے زمانہ کی تاریخ بنی اسرائیل کی طرف خدا نے سورۂ بنی اسرائیل کی پانچوین آیت مین اشارہ فرمایا ہے؛

بنو اسرائیل پر بخت نصر نے چڑھائی کی، اور بہتون کو گرفتار کرلیا اور لیجاکر بابل کی سرزمین میں انکو بسایا،

ایرانیون کے زمانہ مین اُن کو وطن واپس آنے کی اجازت ملی، اسی اسیری بابل کے زمانہ مین بنو اسرائیل

نے وہ چیز سیکھی جس کی بابت قرآن مجید مین ارشاد ہوا ہے کہ

يُعلمون النّاس السحر و مَا انزل على الملكين ببَابل هَارُوتَ وَ

مارُوت،

اہل بابل کے دین و مذہب اور اُن کے طور طریقہ پر یاجوج و ماجوج، قوم ابراہیم، قوم یونس

اور لفظ بنی اسرائیل کے تحت مشرح بحث کیجائے گی،

ارض القرآن حصہ اول

عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد، ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح

لکھی گئی ہے جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر اور موجودہ آثار قدیمہ

کی تحقیقات سے تائید و تصدیق کی ہے،

فتاوی بابری

از

جناب شیخ فرید صاحب برہان پوری

دودمانِ گورگانیہ کے آخری جلیل القدر شہنشاہ حضرت محی الدین اورنگزیب عالمگیرؒ کے عہد کی بہترین علمی و مذہبی یادگار فتاوی عالمگیری محتاجِ تعارف نہیں، مقام حیرت ہے کہ اسی خاندان کے عظیم المرتبت فاتح، عدیم المثال سپاہی اور اولوالعزم بادشاہ ظہیرالدین بابر کے عہد کی فقہ حنفی کی ایک تصنیف فتاوی بابری کے ذکر سے تاریخ ادبیات فارسی کی معروف و معتبر کتب خالی ہیں[1]، اتفاق سے اس کا قلمی نسخہ مولینا سید احکام اللہ صاحب بخاری امام جامع مسجد برہان پور کے ذخیرۂ مخطوطات میں راقم السطور کی نظر سے گذرا، اس مضمون میں اسی تاریخی تبرک کا تعارف مقصود ہے،

مصنف کتاب شیخ نورالدین خوانی کے حالات کتب متداولہ میں نہیں ملتے؛ نفائس المآثر میں مختصر حالات درج ہیں، مولانا امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانہ رام پور نے میری درخواست پر متعلقہ حصہ نقل کرکے ارسال فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ شیخ زین الدین خوانی کی اولاد میں سے ہیں، سلطان حسین مرزا کے عہد میں انھوں نے ہرات میں نشو و نما پائی، شیخ الاسلام سیف الدین احمد

---

[1] معارف فتاوی بابری اگرچہ کمیاب ہے لیکن نایاب نہیں ہے، اور اس کے قلمی نسخے ہندوستان کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، پٹنہ لائبریری میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے اور اس کی فارسی مخطوطات کی فہرست میں مصنف کے ساتھ تصنیف کے بھی مختصر حالات ہیں ملاحظہ کیٹلاگ مخطوطات فارسی پٹنہ لائبریری، ج ۱۴ ص ۸۶)

کے شاگرد تھے، جو ملا سعد الدین تفتازانی کی اولاد مین سے تھے،

"از نبایر حضرت شیخ زین خانی است، بہ غایت خوش طبع و فہم عالی داشتہ، شیخ نورالدین و شیخ زین بہ وفور کمالات ممتاز اند، ایشان در زمان سلطان حسین مرزا بہ ہرات نشو و نما یافتہ، بہ تحصیل فنون و فضائل کمال شتافتہ اند، شیخ نورالدین شاگرد شیخ الاسلام[52] است کہ از نبایر مولانا سعد الدین تفتازانی است"،

مرزا علاؤالدین قزوینی نفائس المآثر مین رقمطراز ہین کہ چودہ سال کی عمر مین سلطان حسین مرزا کے مدرسہ ہرات مین صغر سنی، جمال اور سادہ روئی کے باوجود مسند درس پر فائز ہوئے، دانش مندی اور مولویت مین وہ رتبہ اور استعداد بہم پہنچائی تھی کہ بڑے بڑے فاضل اُن کی مجالس افادات سے مستفید اور بہرہ مند ہوتے تھے،

"در صغر سن و عنفوان شباب رتبۂ مولویت و دانش مندی بجائے رسانیدہ کہ دانشمندان آن زمان از مجالس افادتش مستفید و بہرہ ور می بودند"،

"در زمان شاہی بیگ خان او را در چہاردہ سالگی باوجود سادہ روئی و جمال مدرس مدرسہ سلطان حسین مرزا ساختہ بودند"

شیخ مذکور کے کمال علم و فضل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہین :-

"از غایت جودت طبع و دقت ذہن در اوان شباب از تحصیل علوم عقلی و نقلی فراغت یافتہ، گوش ہوش تلامذہ از نتائج بحر خاطر فیض مآثر بہ لآلی نکات دقیقہ گران بار گشت، و پایۂ قدر و منزلتش در مسلک زہد و تقوی و تجرد و فنون و علم فتوی از امثال و اقران در گذشتہ"

یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بحث مناظرہ مین شیخ موصوف کا پلہ اکثر بھاری رہتا تھا،

---

[51] بابر کی تنوی مبین کے شارح شیخ زین کے حالات بزم تیموریہ ص ۱۰۴ پر ملاحظہ کیجئے۔ [52] بزم تیموریہ ص ...

"مثل ملایان عصر و ملا نور الدین مثل کشتی گیرے است کہ ہر یکے را بہ طرق خاص مغلوب می
می سازد کہ ہر گز تصور آن نہ کردہ اند"،

نفائس المآثر میں ہے کہ شیخ نور الدین اور شیخ زین الدین ۹۲۲ھ میں قندھار آئے، اور حضرت
فردوس مکانی بابر کی ملازمت اختیار کی،

"در ۹۲۲ھ (اثنیٰ وعشرین وتسعمائۃ) بمجموع برادران بہ قندھار آمدہ بہ ملازمت حضرت
فردوس مکانی رسیدہ"،

فتاویٰ بابری کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۲۵ھ کے آخر میں شیخ صاحب اپنے وطن سے
روانہ ہوئے،

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بابر کی خدمت میں اُن کو باریابی کا شرف ۹۲۵ھ
میں حاصل ہوا ؟

دیباچہ کی سفر کی تاریخ اواخر خمس وعشرین وتسعمائۃ[1] سے اگر آخری دو مہینہ مراد لئے جائیں تو اس
زمانہ کی طوائف الملوکی، خوف، ہرات سے قندھار کے بُعد، سفر کی مشکلات، راستہ کی دشواریوں اور ان
موانع اور قوانسہ کے پیش نظر جن سے استخلاص شیخ کو دشوار اور مہلک نظر آرہا تھا بابر کے دربار سے شیخ
کے توسل کا زمانہ ذی الحجہ ۹۲۵ھ یا محرم ۹۲۶ھ ہوگا،

شیخ بذلہ سنج اور خوش طبع بھی تھے، صاحب نفائس المآثر نے ان کی خوش طبعی کا یہ واقعہ نقل کیا ہے:

"مولانا زلالی شاعر کہ یکے از خوش طبعان است و معمائی بودہ بجہت آن کہ سبز چہرہ بود
او را بہ غلامے نسبت می کردہ اند، در سر چار ہری (مقام) بہ شیخ نور الدین رسید و احوال پرسیدہ
از پریشانی حال خود شکایت کردہ گفتہ اند کہ بخانہ ابنائے روزگار می رویم و حکایات بلا فائدہ

---

[1] دیباچہ ملاحظہ کیجئے،

می گوئیم و می شنویم، ملا زلالی این بیت خوانده

تا کے بگرد درہا چون شیخ و شیخ زادہ

گوئیم ہرزہ ہرزہ کردیم لا وہ لا وہ

و بنیاد خندہ کردہ است، شیخ نورالدین در بدیہہ فرمودہ کہ این بیت گویا معمہ است باسم شما

کہ ہر ہر لالا ازان حاصل می گردد، شما را خندہ کردن عجب است ملا در ہم شدہ و ازین مطائبہ و

خوش طبعی نادم گشتہ"

بدیہہ گوئی مین شیخ کو ید طولیٰ حاصل تھا، وہ شعر و ادب کی محفلون مین جب دوسرے شعرار کے

اشعار سناتے تو اسی ردیف و قافیہ مین خود فی البدیہہ بیس بیس شعر کہہ کر شامل کر دیتے، اور سامعین مشکل

سے یہ تمیز کر سکتے، کہ شیخ موصوف اپنے اشعار سنا رہے ہین،

شیخ نورالدین نے کابل مین وفات پائی،

کیفیت مخطوطہ، | فتاویٰ بابری کے زیر نظر قلمی مخطوطہ کی تقطیع "۱×۲/۱ ۹، ۱۵ اور ۴۶۲ صفحات مین ہر صفحہ مین

پندرہ سطرین ہین، خط نستعلیق، روشنائی سیاہ اور عنوانات شنگرفی ہین، لوح کتاب مطلا و مینا کار نیز

جدولین سرخ اور سنہری ہین، ناقص الآخر ہین،

سبب تصنیف | کتاب کے دیباچہ مین مولانا خوافی نے لکھا ہے، کہ وہ اپنے جوہر علم و فضل کو تصنیف کی

شکل مین بادشاہ کی خدمت مین پیش کر کے اس کے وسیلہ سے دربار شاہی سے منسلک ہونے کی دیرینہ

تمنا کو پورا کرنے کے لئے اپنے وطن سے ۹۲۵ھ کے آخر مین روانہ ہوئے، اور مراحل و منازل طے

کرتے ہوئے "ممالک محروسہ" (؟) سے قریب ایک مقام پر پہنچے تھے، اور اس کشمکش مین تھے، کہ کس

فن مین اپنی تصنیف پیش کرین، کہ بادشاہ کا حکم پہنچا کہ مسائل شرعیہ مین ایک کتاب فارسی مین تصنیف

کیجائے، اس حکم پر مقتدمین کے مستند روایتون اور کتابون سے مسائل شرعیہ کو ضبط تحریر مین لانا شروع

کیا، اور ہدایہ (ہ)، کافی (ک) شرح وقایہ (شو) شرح مختصر وقایہ (ش)، خزانہ (خ) فتاوی قاضی خان (ق) اور خلاصہ (ص) سے اس کی تالیف میں مدد لی ہے، تو ہین کی علامتیں مصنف نے حوالہ کے لئے مقرر کی ہیں، جہاں مختلف فیہ مسائل میں اپنی رائے ظاہر کی ہے، وہاں علامت ن سے کام لیا ہے،

دیباچہ کتاب کتاب کا دیباچہ گو کسی قدر طویل ہے لیکن اس سے مصنف اور تصنیف کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، اس لئے اس کو نقل کیا جاتا ہے:

"باز می نماید بندۂ درماندۂ عاصی جانی نورالدین بن قطب الدین بن احمد بن زین الدین الخوانی اصلح اللہ شانہ، وصانہ عما شانہ کہ مدۃ مدید این حقیر قلیل البضاعت را داعیہ آن بود کہ خود را بہ سایۂ دولت پادشہ فضیلت پروری رساند کہ باوجود کمال فطنت، بلند شرائف اوقات ارجمند را بہ ملاحظۂ نکاتِ علوم نقلی وعقلی صرف نمودہ نحوے کامل وحظے وافر از ہر علم حاصل کردہ باشند تا بمقتضائے انما یعرف ذو الفضل من الناس ذووہ درجہ از درجات فضائل ومرتبہ از مراتب ارباب آن بر ضمیر منیرش مخفی نماند و فرصتِ بعید این کمینہ عدیم الاستطاعت عزیمت آن می نمود کہ مخزوناتِ خزانۂ سینہ را کہ حاصلِ حیوات ومحصول اوقاتِ دیرینہ است مطرح مجلس نامی ومحفل گرامی دین پناہے معدلت گسترے گرداند کہ بمقتضائے عدالتِ ذاتی وموروثی رعایت ہر امرے بہ قدر مرتبہ آن فرمودہ! اجتناب از ترجیح مرجوح واحتراز از تفضیل مفضول بر ذمت ہمت واجب داند والحق احضار این مفہومات در ذاتِ ملک صفات حضرت بادشہ اسلام پناہ مصداق مقولہ السلطان ظل اللہ، سلیمان دیوان تاج بخشے وصاحب قرانے، شہسوار میدانِ عالمگیری وکشور ستانی مطیع فرمانِ شریعت متین، متابع اعیان سلاطین، صاحبِ تمکین، تابع احکام ان اللہ یامر بالعدل والاحسان، قامع آثار اتمام اربابِ ظلمت طغیان،

مشید ارکان دین وملت، مخرب بنیان کفر و اباحت، حامی ارباب سنت وجماعت، ماحی اصحاب بدعت وضلالت، افروزندۂ چراغ علم وتقوی بعد از انطماس وانطفا، افرازندۂ لوائے درس وفتوی، بعد از اندراس و اشفا، و والی ممالک جہانداری ورعیت پروری، بانی مبانی شہریاری ومعدلت گستری، مہر سپہر جلالت وکامرانی، شاہ بارگاہ ایالت وجہانبانی، دُرّ درجِ حشمت وجلال دری برج سلطنت واقبال

آنکہ چون در مدحش اندیشم مقال

ناطقہ حیران بماند عقل لال

الممدوح بلسان ارباب الحزت واصحاب الانتباہ ظہیر السلطنت والدنیا والدین محمد بابر بادشاہ، شید اللہ ارکان الدین المتین بدوام وجودہ وبقایہ، وتمیع العالمین بتوالی جودہ وتعاقب عطایہ، چون انحصار مفہوم نیّر اعظم درجرم آفتاب ظاہر وروشن، بلکہ اظہر من الشمس وابین من الامس است

بکل زمان واحدٌ یقتدی بہ

وہذا زمان انت لاشک واحد

وعلاوہ این امور آنکہ ہمیشہ آبا واجداد این بیچارہ بہ وظائف کہ دعوات درویشان است بخاندان عالی الشان آن حضرت اشتغال نمودہ، در ظل عواطف پادشاہان این دودمان متوالی الاحسان مرفہ وخوش الحال می بودہ اند، بنا برین مقدمات اکثر اوقات درتمہید اسباب آن می بود کہ سعی وکوشش نماید تا بہ ہر حیلہ کہ از دست برآید، در سلک دعا گویان این دولت قاہرہ درآید، اما بواسطہ کثرت موانع کہ بہ سبب بہ دعدوی طالع واقع بود، شاہد این مقصود از نقاب خفا چہرہ نمی کشاد، ووصول برین مطلوب در حجاب توقف می افتاد تا آنکہ دید

اواخر خمس و عشرین و تسع مایه (۹۲۵ھ) به عزیمت آنکه اوّلا طواف آن آستانه که قبلهٔ آمال
و کعبهٔ اہلِ سعادت و اقبال است، نموده، بعد از رخصت بجانب حرمین شریفین توجه نماید، از
وطن مالوف مہاجرت اختیار نمود، و بقدم سعی و اجتہاد بسیارے از مراحل و منازل پیموده
تا به موضعے که قریب به ممالک محروسه است، رسید، و در آن موضع آن مقدار موانع و قوانسه
ظاہر گردید، که استخلاص از آن متعسر، بلکه متعذر می دید، ناگاه نسیم اقبال از مہبِ عنایات
وزید و رائحهٔ قبول از نواب بارگه فلک اشتباه به مشام جان رسانید، بموجب جذبة من جذبات
الحق یوازی عمل الثقلین" کمند شوق در گردن این مستحق انداخته موانع متنوع را مرتفع ساخته
خے
در بسیاری از بوادی بیم ناک که مظنهٔ تلف و ہلاک بود، دوانیده تا آخر الامر رختِ اقامت را به بر
از بلاد که در ظلِ نواب کامیاب از سائر مخافات مصئون و محروس است کشید، الحمد لله الذی
ہدانا لہذا و ما کنا لنہتدی لو لا ان ہدانا الله، و قبل از استسعاد و تشرفِ بساط بوسی پرتو الطاف
بش
و عنایاتِ آن آفتابِ فلک جاه و جلال برین ذرهٔ شکسته حال تافت و بانواع پرسش و نواز
نواب گردون جناب شرفِ اختصاص یافت شکر این مواہب را واجب بود که تحفهٔ دعا و صحیفهٔ
ثنا ے معروض یافت مجلس عالی گرداند، بخاطر خیال افتاد که ادائے آن دعائے و القائے آن
ثنائے بر وجہے مناسب باشد که بعد الایام بر صحیفهٔ روزگار باقی ماند بنا بر آن عزیمت جزم
نموده که در فنے از فنون رساله تالیف نموده، موسوم باسم شریف سازد. فاما در تردد آن بود
که کدام یک از علوم در نظر اشرف مقبول تر است تا بنظم ترتیب آن پردازد، ہمانا که بموجب
کلمهٔ مشہورهٔ "ارباب الدول ملہمون" پرتوِ تردد این حقیر بر ضمیر مہر تنویر افتاده و کمال مرحمت
و شفقت پادشاہانه ابقاء آن تردد را در خاطر این کمینه رخصت نداده که درین اثنا حکم جہان
مطاع رسید که به جمع و تالیف قسم عبادات از مسائل شرعیه فرعیه اشتغال نموده، آن چه

راجح و معتبر عند الاکثر است بزبان پارسی در قید کتابت آورده و سطے خلافیات در روایاتِ ضعیف نموده

خاطر بند کر آنہا مشغول ندارد ایجاباً بالحکم المطاع و اطاعۃً لامر الواجب الاتباع با وجود قلت

بضاعت و عدم استطاعت درین امر خطیر شروع نموده که بعد از اتمام به مقتضاے حدیث "رب

حامل فقه الیٰ فقیه او الیٰ من هو افقه منه" در آن محفل عالی که ملجاے و ملاذ افاضل و اعالیست معروض

دارد، از کتب معتبر بجز هفت کتاب بدست نیامد که اسامی آن کتب را عنقریب به تفصیل درمی

آرد، لاجرم چنان که حکما به واسطهٔ عدم اطلاع بر حرکاتِ ثوابت مدار علوم نجوم را بر سبعهٔ سیاره

نهاده اند و به جهت طلب اختصار بر ستاره را برقمی امتیاز داده، این فقیر ضعیف نیز چون کتابِ

دیگر نداشت بنا و این رساله برین هفت کتب می گذارد، و هر روایتے را بانکه متفق باشد به یکے

ازین کتب مستند ساخته مرقوم برقمے می گرداند و هر رقم را علامتِ کتابے می دارد چنانچه

از هدایه به هہ

و از کافی به ک

" شرح وقایه " شو

" شرح مختصر وقایه " ش

" خزانه " خ

" خلاصه " ص

" فتاوی قاضی خان " ق

تعبیر می نماید چندان که می تواند سخنانِ اکمل را به حکایاتِ ناقص خود مقرون نمی گرداند، چراکه

ناقص مصاحبتِ کامل را نشاید و اگر احیاناً کلمهٔ چند از ضرورت باشد مصدر بقسم آن که حرف اول

و آخر نقصان و نام این ناتوان است می سازد تا من اوّل را به علامت نقصان سخن و قائل آن

از سخنان اہلِ کمال ممتاز گردیدہ کسے راو ردو غلط بیندازد و از ہر قم تا رقم دیگر منسوب بدان رقم

اوّل می دارد و اصلاح سخن غیرے در ان میان نمی آرد، مامول از مطالعہ کنندگان مصنف آن کہ

چون این ضعیف بکمال عجز و نقصان معترف است اگر بر خطاے خللے اطلاع یابند بذیل عفو

و اصلاح بپوشند و بسیار در خصلت عیب جوئی و بدگوئی نکوشند فاما بجا، واثق وامید صادق

است کہ چون از پرتو توجہ خاطر کیمیا، آثر کہ آئینہ جمال نمائی مخدرات عالم غیب است جلوہ ظہور

یافتہ از شوائب عیب و خلل و مواقع ریب و زلل مصئون و محفوظ ماند، الکون العصمۃ والعون

بر ضمائر اولوا الالباب پوشیدہ نماند کہ اوّل چیزے کہ بر مکلف یعنی عاقل و بالغ فرض شود بعد از

ایمان نماز است ....

نسخہ مذکور ناقص الآخر ہے، کتاب الصلوٰۃ سے شروع ہو کر کتاب الحج کی عبارت ذیل پر ختم ہو جاتا ہے:

"حج در لغت قصد کردن است بچیزے از روے تعظیم و در شریعت عبارت است از ارکان

مخصوصہ بشرائط مخصوص کہ تفصیل آن معلوم خواہد شد، و این ارکان را حج بواسطۂ آن می گویند

کہ مشتمل است بر قصد کعبۂ معظمہ و این حج فریضہ است محکم و یکے از ارکان اسلام است و اگر کسے

از فریضۂ آن منکر شود کافر گردد و در ہمہ عمر یک بار فرض است و مر او را شرائط است کہ چون

وجود گیرد فرض شود بعد از اجتماع ...."

نغمائے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح

واقف ہیں دوبارہ چھپ گیا ہے اس ایڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہوا اور اب یہ مجموعہ پہلے سے

زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ

ہے ضخامت :- ۱۴۴ صفحے، قیمت :- مجلد للعہ، غیر مجلد ہے "منیجر"

کشمیر میں شاہانِ مغلیہ کے چند آثار

از

جناب مولانا سید بدرالدین صاحب علوی استاد عربی مسلم یونیورسٹی

مندرجۂ بالا عنوان سے میرا ایک بسیط مقالہ معارف اعظم گڈھ بابت ماہ مارچ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا، اس میں ملاحظہ ہو ص ۲۰۰) چشمۂ شاہی کے متعلق لکھا تھا کہ اس کا ذکر جب مجھ کو قدیم شاہی زمانے کی کتابوں میں نہ مل سکا، تو دوسرے وسائل سے کوشش کی لیکن اس میں بھی ناکامی رہی، البتہ مندرجۂ ذیل قطعہ تاریخ غیر معلوم شاعر کا مل گیا،

دوشش دیدم نشستہ بر کوثر — شاہ مردان علی جہاہی

گفتمش السلام، گفت علیک — گفت، برگو دگر چہ می خواہی

گفتمش بہر چشمہ تاریخے — گفت برگوئے، کوثر شاہی
۱۰۴۲ھ

اگست ۱۹۴۲ء میں میرا لکھنؤ جانا ہوا، اتفاقاً عزیزم مولوی نثار احمد صاحب ایڈووکیٹ و چیرمین میونسپل بورڈ سیتاپور سے ملاقات ہوئی، انھوں نے میرے پاس بیٹھتے ہی کچھ فارسی اشعار گنگنانے شروع کئے جن میں چشمۂ شاہی کا نام سُن کر میرے کان کھڑے ہوئے، اور میں نے وہ اشعار اُن سے باواز بلند پڑھوائے، یہ ایک قطعہ کے اشعار تھے، جو اُن کے پردادا مولوی مظہر علی صاحب نے بزمانہ قیام کشمیر چشمۂ شاہی کی مرمت کے موقع پر کہا تھا، یہ قطعہ سنانے کے بعد انھوں نے وہ قطعہ بھی پڑھا، جو اوپر درج ہے، مولوی مظہر علی صاحب کے قطعہ سے میرے علم میں یہ اضافہ ہوا کہ سابق کا دستیاب شدہ قطعہ ابو طالب

کلیم کا ہے، مین نے اس وقت عزیز موصوف کو مختصراً اپنی دلچسپی کی وجہ بتا دی اور یہ بھی کہدیا کہ اس وقت کا واقعہ معارف مین بطور ضمیمہ مضمون سابق شائع ہوگا،

لکھنؤ سے واپس آتے ہی ابو طالب کلیم کے کلیات اور اس کے حالات کی تلاش کی کہ اس کی جانب قطعہ کی نسبت جو معلوم ہوئی ہے، وہ پختہ طور پر ثابت ہو جائے، تذکرون مین حالات ملے، اور کشمیر سے اس کا شغف بھی معلوم ہوا، لیکن افسوس ہو کہ کلیات کا نسخہ نہ ملا، حیرت اور نہایت افسوس اس بات پر ہے کہ مطبوعہ ہوتے ہوئے بھی وہ نایاب ہے، جہان جہان سے مستعار مانگا وہان بھی نہ تھا، پرانی کتابون کے فروخت کرنے والون سے علی گڈھ اور لکھنؤ مین رجوع کیا، مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی، پھر قلمی نسخون کا خیال کیا، ایک ناقص نسخہ ہماری لٹن لائبریری مین ہے، اس کی بنیاد پر فیصلہ غیر مناسب تھا، بعض احباب کے ذریعہ سے کچھ اور قلمی نسخے ملے جن مین سے بعض ناقص اور بعض مکمل تھے لیکن اس قطعہ سے خالی، بالآخر مصداق

تجری الریاح بما لا تشتھی السفن

اسلئے مجبور ہونا پڑ رہا ہے، کہ جیسا کچھ بھی ہے، اس انکشاف کو ناظرین معارف کے سامنے پیش کر دیا جائے،

مولوی منظر علی صاحب کا قطعۂ تاریخ مرمت چشمۂ شاہی درج ذیل ہے،

چشم بد دور چشمۂ ایست کہ ہست	آب و تابش ز ماہ تا ماہی
برہ او نہادہ سر تسنیم	سلسبیلش نمودہ ہمراہی
بود خاکش بسر ز حسرتِ شاہ	آبش افزود شیخ جم جاہی
پیش ازین کلک تر زبانِ کلیم	در فشان شد کہ چشمۂ شاہی
سال تاریخ حال چشمۂ شیخ ۱۲۵۰ھ	گفت منظر زروئے آگاہی ۱۲۵۹ھ

چوتھا شعر بتلا رہا ہے کہ پہلا قطعہ کلیم کا ہے، اور یہ کہ مادہ تاریخ چشمۂ شاہی ہے، لیکن اس کے

اعداد ۲۶۶ ہین، اس وجہ سے یہ مادہ نہین ہوسکتا، بلکہ جیسا اصل قطعہ کے اندر ہے، مادہ کوثر شاہی

ہے، جس سے ۱۰۳۲ ؁ھ برآمد ہوتے ہین، لہذا ع

در فشان شد کہ چشمۂ شاہی

سے مولوی صاحب کا مقصد اس نام کی طرف اشارہ کرنا ہے جس سے وہ مشہور ہے،

اس انکشاف کے بعد اپنے محولۂ بالا مضمون کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ خود اس کے اندر شاعر کا نام

موجود تھا، جو ماخذ مین کتابت کی غلطی سے مخفی رہ گیا، کیونکہ وہان تحریر ہے کہ "حکم بدیہۃ تاریخ گفت" اسکو

"کلیم بدیہۃ تاریخ گفت" ہونا چاہئے تھا،

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مولوی مظہر علی صاحب کا مختصر حال لکھدیا جائے، جو مولوی

نیاز احمد صاحب مرحوم برادر کلان مولوی نثار احمد صاحب موصوف کی عبارت مین بعینہ ملاحظہ ہو،

مولوی مظہر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکابر علماے عصر مین سے تھے، اور صاحب تصانیف بھی

تھے، قبل تعین بصفت صدر امین و قاضی القضاۃ بریاست کشمیر مولوی صاحب مرحوم مدرسہ عالیہ کلکتہ

مین پرنسپل تھے، اپنے ایک انگریز دوست کی فرمایش پر قلم برداشتہ ۲۹ روز مین ایک کتاب موسوم بہ

اصول العلوم عربی زبان مین لکھی، جس مین دس علوم متداولہ پر ایسی اجمالی روشنی ڈالی کہ باریک سے

باریک نکات بھی روشن ہوگئے ہین، اس کی نقل میرے پاس بھی موجود ہے، یہ کتاب خود اپنی نظیر ہے،

۱۲۷۲ ؁ھ مین جب کہ مولوی صاحب لاہور ہوتے ہوے وطن آرہے تھے، تو بغرض قدمبوسی خلاصہ

دودمان مصطفوی نقاوہ خاندان مرتضوی سید السادات جناب مولانا سید رجب علی خان بہادر بمقام

لدھیانہ قیام کیا، اور جناب مولانا کی فرمایش پر ایک کتاب بزبان فارسی الموسوم بالرحمۃ النازلہ فی شرح

التحفۃ المرسلۃ لکھی جو کہ مطبع نیر اعظم بنگالہ مین چھپی ہوئی یہ کتاب ہم کو بہت تلاش کے بعد کتب خانہ انوری تکیہ

شریفیہ کاکوری مین ملی جس کی نقل ہمارے پاس موجود ہے، علاوہ اس کے مولوی صاحب نے ایک تفسیر

کلام مجید بزبان عربی لکھی، جس کا نام مجھکو یاد نہین، یہ تفسیر میرے یہان موجود نہین، اس کا مسودہ بھی مولوی صاحب نے اپنے ایک دوست کو دیا، اور ہنوز انہی کے پاس ہے، اَللّٰھُمَّ ارددالینا ضالتنا،

مولوی صاحب کا کشمیر مین بزمانہ مہاراجہ گلاب سنگھ قاضی القضاۃ ہونا اُن کی مہر سے ثابت ہے جس کی نقل ذیل مین درج ہے، یہ نقل مجھ کو مولوی نیاز احمد صاحب مرحوم نے دی تھی،

بہادر مولوی مظہر علی
صاحب گلاب سنگھ ۱۲۶۳ ھ
متعینہ سرکار سرمہاراجہ
مہر صدر امین وقاضی القضاۃ

اس مہر کی عبارت کو اس طرح پڑھنا چاہئے:۔ "مہر صدر امین وقاضی القضاۃ مولوی مظہر علی متعینہ سرکار سر مہاراجہ گلاب سنگھ صاحب بہادر ۱۲۶۳ھ"

مین نے چاہا تھا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ سے مولوی صاحب کے حالات بحیثیت صدر مدرس معلوم کرون مگر اس مین بھی کامیابی نہ ہوئی، معلوم ہوا کہ ملک کی تقسیم کے وقت جو سامان کلکتہ سے ڈھاکہ کو گیا اس مین مدرسہ کی تاریخ بھی چلی گئی، اس لئے یہ پہلو بھی تشنہ رہ گیا،

ارض القرآن حصہ دوم

قرآن مجید کے اندر جن قومون کا ذکر ہے ان مین سے مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسمٰعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، بنو قیدار انصار، اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر تفصیل مباحث،

(زیر طبع)

ایک نادر کتاب کا تعارف

از

جناب سید نجم الحسن صاحب رضوی خیرآبادی

مولانا فضل امام خیرآبادی (علامہ فضل حق رحمہما اللہ کے والد ماجد) دنیائے علم مین ایک نامور معقولی اور یگانۂ روزگار فلسفی کی حیثیت سے متعارف ہین منطق مین آپ کی مشہور تصنیف مرقات ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے مدارس عربیہ کے نصاب مین داخل ہے لیکن بہت سے اہل علم بھی اس سے واقف نہین ہین، کہ مولانا کی جولانگاہ محض معقولات تک محدود نہ تھی، بلکہ دوسرے علوم و فنون پر بھی آپنے طبع آزمائی کی ہے، آمد نامہ[1] جو فارسی قواعد کے تمام شعبون پر حاوی ہے، اور جس کی ایک فصل مین مشاہیر اہل علم کا بھی ذکر ہے، خاص خاص حلقہ مین روشناس ہو چکا ہے، حال مین موصوف کی ایک تاریخی تصنیف حکیم سید مشرف حسین مرحوم خیرآباد کے کتب خانہ مین نظر سے گذری جس سے لوگ واقف نہین ہین، اس لئے اس کا تعارف کرا دینا مناسب معلوم ہوا،

یہ کتاب فن تاریخ و سیر مین ہے اور فارسی زبان مین ہے، اور اتنی خستہ اور بوسیدہ ہو چکی ہے کہ جا بجا اوراق کے ٹکڑے اڑ گئے ہین، کتاب مین کافی غلطیان موجود ہین بعض مقامات پر کاتب نے پورا صفحہ سادہ چھوڑ دیا ہے جس کی وجہ سے اگلی اور پچھلی عبارت مین ربط باقی نہین رہ گیا ہے، پوری کتاب چھ سو ستر صفحات مین تمام ہوئی ہے، ہر صفحہ مین سترہ سطرین ہین، قلم متوسط ہے، مصنف نے اس

[1] اس کا قلمی نسخہ بخط مصنف کتبخانہ ٹونڈلا ہر پور ضلع سیتاپور مین محفوظ ہے ۱۲،

تصنیف کا سبب دیباچہ مین یہ بیان کیا ہی:

"پس می گوید اضعف عباد اللہ المتوکل علی المفضل المنعام الہادی محمد فضل امام بن محمد ارشد الخیرآبادی غفر لہ ولوالدیہ واحسن الیہما والیہ کہ روزے بخاطر فاتر این بندۂ نحیف گزشت کہ چون انسان را احوال گزشتگان موجب عبرت و خبرت می باشد، و بسا امور دینی و دنیوی ازان انتظام می یابد لہٰذا اساتذہ در ہر زمان بتالیف کتب سیر و تواریخ پرداختہ اند و دفاتر ہا ازان پرساختہ در دین زمان بسبب قصور فہم اکثر ابنائے روزگار ازین علم شریف عاری و عاطل اند، و بسبب قلت مبالات ازین فن شریف بسیارے ارباب زمانہ بے بہرہ و غافل اند، مناسب است کہ مختصرے از کتب متعارفہ التقاط کردہ اید کہ گزشتگان را تذکارے و برائے آئندگان یادگارے باشد، بنا برآن این چند اجزا از کتب معتبرہ مانند تاریخ فرشتہ و شمشیر خانی و منتخب التواریخ و دیگر کتب بعبارت سلیس و واضح انتخاب کردہ در سلک تحریر کشیدہ شد، و بنائے این کتاب بر چند گفتار نہادہ اند"

پوری کتاب سات گفتارون اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہی:۔

"گفتار اول در ذکر احوال خلقت آدم علیٰ نبینا علیہ السلام و ذکر امتہائے دیگر و غیر مرسل گفتار دوم، در ذکر صوفیائے کرام و اولیائے عظام، گفتار سوم در ذکر ملوک ایران، گفتار چہارم در ذکر راجگان کہ حکومت بہ دہلی و دیگر بلاد داشتند، گفتار پنجم در ذکر حکام غزنویہ و لاہور، گفتار ششم اسلاطین سلاطین سلجوقیہ، گفتار ہفتم در ذکر مشاہیر حکما و اطبا و مشاہیر خوشنویسان، خاتمہ در بیان بلاد ہفت اقلیم و عجائب و غرائب بلدان"

کتاب کی تصنیف کا زمانہ وہ ہے جب مولانا دلی مین افتا کے منصب پر فائز ہوئے تھے، اس لئے مشاغل کی کثرت، دربار کی حاضری اور درس و تدریس کی مشغولیت نے کتاب پر نظرثانی کا موقع بھی نہین دیا،

اور دوستون کے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر مسودہ اسی طرح انکے حوالہ کر دیا اگر مصنف کو اس کتاب کی تکمیل و تصحیح کا پورا موقع ملا ہوتا، تو اس کتاب کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا، اس کا مصنف کو افسوس تھا، وہ لکھتے ہین -

تالیف این کتاب وقتے اتفاق افتاد کہ قائمہ قضا و قدر این کمترین خلائق را در دہلی انداختہ بفتوی نویسی عدالت آنجا مبتلا ساختہ بود، و ذلک فی ۱۲۳۳ھ[1] ہجری قدسی و چون انتحال این احوال بر سبیل استعجال اتفاق افتادہ و فرصت آن نشد کہ نظر ثانی کردہ آید، چہ اکثر در دربار می گزشت و برخے از اوقات در تدریس صرف می شد و آن قدر مہلت کہ برائے سیر کتب سیر و تواریخ وغیرہ گنجایش تواند داشت دست بہم نمی داد و بعضے دوستان در نقل گرفتن و انتساخ این سخت عجلت و جلدی فرمودند لاجرم ہمان نسخہ مسودہ حوالہ او شان نمودہ شد، بنا بر آن از ناظرین توقع آن دارد کہ اگر بر سہوے و خطائے وقوف یابند آن را بر بے مائگی راقم و بے سوادی مولف حمل کردہ بہ ذیل عفو بپوشند، والعفو عند کرام الناس مقبول،

راقم ڈاکٹر سید انتظار حسین نبیرۂ حکیم سید مشرف حسین مرحوم کا ممنون ہے جنھون نے اس نایاب گران بہا گنجینہ کے جس کا غالباً اور کہین وجود نہین ہے، مطالعہ کا موقع دیا، یہ کتاب اس لائق ہے کہ اس کی نقل حاصل کی جائے تاکہ یہ تاریخی یادگار ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائے،

---

[1] غالباً کاتب نے ۱۲۲۳ھ کو غلطی سے ۱۲۳۳ھ لکھ دیا ہے، اس لئے کہ مرزا غالب نے مولانا کا سنہ وفات اپنے قطعہ تاریخ مین ۱۲۳۰ھ لکھا ہے، یعنی اس سے چار سال قبل آپ وفات پا چکے تھے، مرزا کے قطعہ کا شعر یہ ہے،

گفتم اندر سایۂ لطف نبی

باد آرامشگہ فضل امام

۱۲۴۴ھ

(باغی ہندوستان بحوالہ سبد چین غالب)

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان مین مسلمانون کے تمدنی اثرات

"موجودہ عہد مین "ہسٹری آف اورنگ زیب" کے مصنف جدو ناتھ سرکار مغلیہ دور کے بڑے مستند اور بلند پایہ مورخ سمجھے جاتے ہین، انھون نے اورنگ زیب کی ضخیم تاریخ جس نقطۂ نظر سے لکھی ہے اس کو مسلمانون نے پسندیدہ نگاہون سے نہین دیکھا ہے، اس لئے وہ مسلمانون کی تاریخ اور تمدن کے دوست اور ان کے حامی نہین سمجھے جاتے لیکن انھون نے اپنے ایک مضمون مین غالباً بادل ناخواستہ کچھ ایسے حقائق لکھے ہین، جن کا مطالعہ آج کل بعض حیثیتون سے بہت مفید اور دلچسپ ہوگا، ان کا ایک انگریزی مقالہ اپریل ۱۹۲۹ء کے ہندوستان ریویو مین "اسلام ان انڈیا" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، گو یہ مضمون بھی بہت سے غلط واقعات و مفروضات پر مشتمل ہے، تاہم اس مین بہت سی حقیقتون کا بھی اعتراف کیا گیا ہے، اس لئے اس کے خاص خاص حصے ناظرین کی خدمت مین پیش کئے جاتے ہین۔ اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہندوستان کے سنوارنے مین مسلمانون کا کیا حصہ رہا ہے، اس مضمون مین بہت سے ایسے خیالات بھی ہین جو صحیح نہین، اس لئے مضمون نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہین ہے"

مسلمانون نے جب ہندوستان کو فتح کیا، توان کی فتح گذشتہ تمام فتوحات سے مختلف تھی، وہ ہندوستان آئے، تو اُن کو یہان کے پرانے باشندے اپنے مین ضم نہ کرسکے، ورنہ اُن سے پہلے یونانی، تورانی، تاتاری اور پارتھین حملہ آور جب یہان آباد ہوئے، توچند نسلون کے بعد ہی وہ اپنے نام، لباس، رسم و رواج اور مذہب مین بالکل ہندو بن گئے، دوسری صدی قبل مسیح مین ایک یونانی ہبلیوڈورس نامی نے سفیر کی حیثیت سے ہندوستان کی سیاحت کی تھی، تو اُس نے وشنو کی پوجا کی، اور اس دیوتا کی یاد مین ایک ستون بھی بنوایا......

لیکن اسلام مین توحید کا تخیل اس قدر خالص اور شدید ہو کہ اس مین اور شرک اور تعدد الہ کی کوئی گنجایش ہی نہین ہے، اسلام کا خدا ہمیشہ زندہ اور غیور رہتا ہے، وہ کسی کو اپنا شریک نہین بنا سکتا، اور نہ اپنے اوپر ایمان لانے والون کے دلون مین کسی اور خدا کے وجود کو گوارا کرسکتا ہے، اسی لئے ہندوستان کے مسلمانون کا ہندومت کے ساتھ ضم ہونا ناممکن ہوگیا وہ اپنے اللہ کو نہ وشنو کے کثیر التعداد اوتارون مین سے ایک اوتار مان سکتے تھے، اور نہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک صاحب الہام سادھو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہوسکتے تھے، اسی لئے ہندو اور مسلمانون کے ایک ہی سرزمین مین رہتے ہوئے بھی دونون مین آمیزش نہ ہوسکی، اور ان مین جو خلیج پیدا ہوگئی، اس کو کوئی چیز پاٹ نہ سکی، ہندوستان کے مسلمانون کا رجحان ہندوستان کے بجائے باہر کی سمت رہا۔ آج بھی جب وہ نمازون مین کھڑے ہوتے ہین، تو اُن کا منہ مکہ کی طرف ہوتا ہے، وہ ہر زمانہ مین جب بھی اپنے ذہنی نشو و نما، قوانین کی تدوین، ملک کے انتظامی معاملات اور نوشت و خواند کے معیار کے سلسلہ مین کوئی نمونہ تلاش کرتے تو وہ ہندوستان سے باہر، عرب، شام، ایران اور مصر کا ہوتا، مسلمانون کی بہت سی چیزین مثلاً ان کی مقدس زبان، اُن کا لٹریچر، ان کے اساتذہ، اُن کے اولیاء اللہ اور اُن

کی درگاہین مشترکہ ہین جو تمام دنیا مین پھیلی ہوئی ہین، اور ہندوؤن کی طرح صرف ہندوستان ہی مین محدود نہین ہین،

ہندوؤن نے مسلمانون کو اپنے مین ضم کرنے کی کوشش کی، اسی لئے اونھون نے Allo-panisad لکھی، اور شہنشاہ اکبر کو اوتار تسلیم کر لینے کا خطرہ بھی مول لیا، لیکن مسلمان اپنے مذہب کی بنیادی باتون کو ترک کرنے، اور ان رسمون کو اختیار کرنے کے لئے بھی آمادہ نہین ہوئے، جو ہندو سوسائٹی مین داخل ہونے کے لیے ضروری تھین، انھون نے قرآن کے اس حکم کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کہ مشرک نجس ہین، اور کوئی نجس چیز کعبہ مین داخل نہین ہو سکتی،

ہندوستان آنے والے مسلمانون اور اُن سے پہلے کے حملہ آورون مین یہی بنیادی فرق رہا، اس کے علاوہ ایک اور خاص فرق یہ تھا کہ ۱۲۰۶ء سے ۱۵۵۶ء تک مسلمانون کی ریاست اور سوسائٹی سپاہیانہ اور خانہ بدوشانہ طرز کی تھی، حکمران طبقہ اس ملک مین اس طرح رہا، جس طرح کوئی فوجی کیمپ مین رہتا ہو، سولھوین صدی کے اخیر مین اکبر نے اس ملک کے لوگون مین یہان کی حکومت سے دلچسپی پیدا کرانے کی کوشش کی، اور خود حکومت بھی حاکمانہ فرایض کے علاوہ کچھ معاشرتی اور عمرانی فرایض انجام دینے کی طرف مائل ہوئی، لیکن مسلمان باشندے اس ملک مین رہنے کے باوجود اکبر کے عہد تک اس کا جزء بن کر نہین رہے،

اب سوال یہ ہے کہ مسلمانون نے اپنے عہد مین ہندوستان کو کیا کیا چیزین دین؟ ہمارے نزدیک یہ دس چیزین ہین،

(۱) مسلمانون نے ہندوستان کے تعلقات بیرونی دنیا سے قائم کرائے، جس کی وجہ سے بحری جہازون اور بحری تجارت کو از سرِ نو فروغ ہوا، ہندوستان مین چولا کی حکومت کے خاتمہ

کے بعد یہ دونوں چیزیں بالکل ختم ہو گئی تھیں،

۲۔ ہندوستان کے بیشتر علاقوں خصوصاً وندھیا کے شمال میں اندرونی طور پر امن و سکون قائم ہوا،

۳۔ ایک ہی قسم کے نظام حکومت سے تمام ملک میں یکسانیت پیدا ہوئی،

۴۔ مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود اونچے طبقہ کے لوگوں کے عادات و اطوار اور لباس وغیرہ معاشرتی امور میں یکرنگی پیدا ہوئی،

۵۔ ہندی اور اسلامی طرز کا ایک آرٹ پیدا ہوا، جس میں ہندوؤں اور چینیوں کے آرٹ کی بھی آمیزش تھی، اس لئے تعمیرات میں ایک نیا اسٹائل پیدا ہوا، اور عمدہ قسم کی صنعتوں کو فروغ ہوا، شال، کمخواب، قالین، اور مرصع کاری اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں،

۶۔ ایک مشترکہ زبان پیدا ہوئی جو ہندوستانی یا ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی، نثر نویسی میں ایک سرکاری اسٹائل کا رواج ہوا، جس کی بنا ان ہندو منشیوں نے ڈالی جو فارسی لکھا کرتے تھے، اور اس اسٹائل کو مرہٹوں نے بھی اپنی زبان میں رائج کیا،

۷۔ دہلی کی حکومت کی وجہ سے جب امن اور اقتصادی خوشحالی بڑھی تو ملکی لٹریچر کو بھی ترقی ہوئی،

۸۔ مذہب میں توحید کے تصور کی تجدید ہوئی، اور تصوف پھیلا،

۹۔ تاریخی لٹریچر پیدا ہوا،

۱۰۔ فنون جنگ اور تمدن کے عام شعبوں کو فروغ ہوا،

بیرونی تعلقات بودھوں کے زمانہ میں تو ہندوستان کے تعلقات ایشیا کے اور ملکوں سے پیدا ہوئے لیکن جب آٹھویں صدی عیسوی میں از سر نو ہندو سوسائٹی کی تشکیل ہوئی، تو ہندوستان دنیا سے بے تعلق ہو کر خود اپنی سرحد کے اندر محدود ہو گیا، لیکن بارھویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں

نے ہندوستان کو فتح کیا، تو ایشیا اور افریقہ کے بعض علاقون سے ہندوستان کے تعلقات پھر سے
قائم ہوئے، لیکن اس کے بعد بھی ہندو خود باہر نہین نکلے، بلکہ باہر سے ہزارون غیر ملکی ہندوستان
آتے رہتے، اور کچھ مسلمان بھی ہر سال باہر جاتے رہتے، افغانی سرحد کے درّون کی راہ سے بخارا، سمرقند،
بلخ، خراسان، خوارزم اور ایران سے عام لوگون کے علاوہ تاجرون کی آمد و رفت برابر جاری رہی
اور یہ سلسلہ مغلون کی حکومت کے خاتمہ یعنی ۱۷۳۹ء تک قائم رہا، بولن کے درہ سے قندھار اور
ایران تک راستہ جاتا تھا، اس راستہ سے جہانگیر کے زمانہ یعنی سترھوین صدی کے آغاز مین ہر
سال چودہ ہزار بار شتر تجارتی سامان باہر سے آتا تھا، مغربی ساحل پر بہت سی بندرگاہین ایسی
تھین، جن کے ذریعہ بیرونی دنیا مین رسائی ہوتی رہتی تھی، مشرق مین مسولی پٹیم کی بندرگاہ
پر گولکنڈہ کے سلاطین کا قبضہ ۱۶۸۷ء تک رہا، جس کے بعد مغلون کا قبضہ ہوا، یہان سے
لنکا، سماترا، جاوا، سیام اور چین تک جہاز جاتے رہتے تھے،

یکسانیت مغلون کے دوسو سالہ عہد حکومت مین پورے شمالی ہند اور دکن کے بیشتر حصہ مین
سرکاری زبان، نظام حکومت اور سکون مین یکسانیت پیدا ہوئی، ایک مشترکہ زبان بھی پیدا
ہوئی، جس کو برہمنون اور دیہاتیون کے علاوہ ہر طبقہ کے لوگ بولتے، مغلون کے ملکی نظام، سرکاری
خطابات، درباری آداب اور سکون کے ضوابط کو ان ہندو راجاؤن نے بھی اختیار کیا جو مغلون
کے زیر اثر نہ تھے،

مغلون کے زمانہ مین بیس صوبے تھے، ہر صوبہ مین ایک ہی قسم کا نظم و نسق تھا، ایک ہی قسم
کے خطابات بھی تھے، سرکاری کاغذات مین ایک ہی زبان فارسی استعمال کی جاتی تھی، سرکاری
عہدہ دارون اور فوجیون کا تبادلہ ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ مین برابر ہوتا رہتا تھا، اس لئے
ایک صوبہ کا آدمی دوسرے صوبہ مین اپنے کو اجنبی محسوس نہین کرتا تھا، تاجر اور مسافر آسانی سے

ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ مین آیا جایا کرتے تھے، اور اس آمد و رفت سے اُن کو اس وسیع ملک کی سیاسی وحدت کا احساس ہوتا تھا،

فنونِ لطیفہ | فنونِ لطیفہ مین مسلمانون کے بڑے احسانات حسب ذیل ہین،

۱- انھون نے تعمیرات مین ایک نیا طرز ایجاد کیا، محلون اور مقبرون کی تعمیر اُن کی خاص چیز ہے،

۲- ان کی وجہ سے مصوری مین ایک خاص اسکول قائم ہوا،

۳- ہندوستان مین فن باغبانی کا ذوق پیدا ہوا،

شروع مین مسلمانون کی مصوری کے جو نمونے خراسان اور بخارا سے ہندوستان پہنچے، ان مین خصوصًا چہرون، چٹانون، ابر و ہوا، آگ اور پانی کی چادر کی مصوری مین چینی اثرات کا غلبہ نظر آتا تھا، لیکن ہندوستان کے اصلی قومی بادشاہ اکبر کے دربار مین مسلم آرٹ مین چینی اور غیر ہندوستانی اثرات کے ساتھ ہندو آرٹ کی بھی آمیزش ہونے لگی، جس کی روایات مین اجنتا، بجاگھوت اور ایلورا کی مصوری کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی،

اکبر کے زمانہ مین مسلم آرٹ مین پہلی دفعہ تغیر پیدا ہوا، اور چینی آرٹ مین جو سختی پائی جاتی تھی اس مین نرمی پیدا کی گئی، اور اس آرٹ کی رسمی باتون سے پرہیز کیا جانے لگا، چٹان، پانی، اور آگ کی مصوری مین ایک نیا طرز اختیار کیا گیا، جس مین چینی اسکول کے اثرات تو باقی تھے، لیکن وہ فطرت سے قریب تر ہوتے تھے، پھر رفتہ رفتہ چینی اثرات زائل ہونے لگے، اور مصوری کی خصوصیات اور مناظر مین طور پر ہندوستانی ہو گئے، اور یہ ترقی اکبر کے بعد بھی جاری رہی، یہان تک کہ شاہجہان کے عہد مین چینی اثرات پر ہندوستانی اسٹائل غالب آگیا، پھر اس آرٹ نے نزاکت، رنگ آمیزی، باریکی، مرصع کاری، اور فطرت نگاری مین بڑا کمال پیدا کیا، اس لئے مسلم آرٹ کو فروغ مغلون کے دربار ہی مین ہوا، اور اس زمانہ مین ہندوستان کے مصورون نے اپنے کمالات کے جو ہر دکھائے، یہ اسٹائل

ہندوستانی آرٹ یا مغل مصوری کے نام سے اب تک باقی ہے،

زبانوں کی ترقی ۱۲۰۰ء کے بعد سے سنسکرت ایک زندہ زبان کی حیثیت سے باقی نہیں رہ گئی تھی، اور گو اس زبان میں کتابیں لکھی جاتی رہیں، اور اب بھی لکھی جاتی ہیں، لیکن یہ تمام کتابیں بناوٹی ہیں یعنی یا تو وہ شرحیں ہیں، یا شرحوں کی شرحیں ہیں، یا رسمی باتوں پر کچھ رسالے ہیں، ان میں کوئی ایسی اوریجنل تصنیف نہیں ہے، جس کو واقعی لٹریچر کہا جا سکتا ہے، اس کی کوئی کتاب نہ دل کو متاثر کرتی ہے، نہ معلومات میں اضافہ کرتی ہے، اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ۱۲۰۰ء سے ۱۵۵۰ء تک کا زمانہ جس کو عام طور سے پٹھانوں کا عہد کہا جاتا ہے، شمالی ہندوستان کا ایک تاریک دور تھا[۱] اس ساڑھے تین سو برس کی مدت میں ہندوؤں کا دماغ بالکل کورا اور بنجر رہا۔ لیکن جب اکبر نے اپنے دشمنوں پر غلبہ پا کر شمالی ہند میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تو امن وامان اور اچھے نظام سلطنت کے خوشگوار نتائج پیدا ہونے لگے، امن کی وجہ سے دولت بڑھی، اور دولت کے ساتھ ذہنی تعیشات کی جلوہ آرائی شروع ہوئی، تمام صوبوں کی زبانوں میں یکایک ترقی ہونے لگی، بنگال میں چیتنیا کے مقلدوں نے بنگالی زبان میں ایک نئی روح پھونک دی، اس زبان میں گیتوں کے علاوہ بعض اہم کتابیں خصوصاً سوانحمریاں لکھی گئیں،

ہندی زبان میں تلسی داس نے اپنی غیر فانی کتاب رام چرت مناس ۱۵۷۴ء عیسوی میں لکھنی شروع کی، اس سے پہلے محمد جائسی نے پدماوت ۱۵۴۰ء میں ختم کی تھی، اس نے ۱۵۶۰ء میں ماری گاوت بھی لکھی، اس زمانہ میں ہندی نظمیں بکثرت لکھی گئیں، انہی میں سے اکھراوت، پدماوت، کنداوت، مادھو ملاتی، عثمان چتراوتی ہیں، کبیر دادو، اور نانک نے بہت سی مذہبی نظمیں لکھیں، لیکن ان کی حیثیت

---

[۱] معارف :- فاضل مقالہ نگار مغلیہ عہد کے مورخ ہیں، اس سے پہلے کے عہد پر ان کا تاریخی مطالعہ وسیع نہیں، اس لئے اُن کی یہ راے قابلِ قبول نہیں،

مستقل لٹریچر کی نہین، وہ محض پند و نصائح ہین، جو زبانی یاد کرلئے جاتے تھے،

اردو سولھوین صدی مین پیدا ہوئی، شروع مین یہ بازاری زبان تھی، اور مصنفون اور اعلیٰ سوسائٹی کی نظرون مین حقیر سمجھی جاتی تھی، لیکن شمالی ہند مین اٹھارہوین صدی کے آخر مین یہ زبان علمی بن گئی، دکن مین ایک صدی پہلے ہی اردو جس کو ریختہ بھی کہتے تھے، شاعری کے اچھے اچھے نمونے پیش کئے گئے۔ تھوڑی اورنگ آبادی اردو کے سب سے پہلے ممتاز شاعر سمجھے جاتے ہین،

اکبر اور اس کے باجگذار حکمرانون نے علوم و فنون کی بڑی سرپرستی کی جس کی وجہ سے سولھوین صدی کے آخر اور سترہوین صدی کے نصف تک ہندوستان کے ذہن و دماغ کا حیرت انگیز نشوونما ہوا، اسی زمانہ مین بنگال کی تاریخ سنسکرت مین "شیخ سبھودیا" لکھی گئی، جس مین ایک عجیب و غریب مخلوط زبان استعمال کی گئی ہے، اسی عہد مین شاہجہان کے درباری چندر بھان برہمن کی فارسی تحریرون کی شہرت ہوئی، اسی دور مین ہندی کی تصنیف منترابندھو و نود مشہور ہوئی،

مذہبی اثرات | مشہور مورخ کننگھم رقمطراز ہے کہ

"مسلمان ہندوستان مین ایک نئی قوم کی حیثیت سے آئے، وہ اپنی شجاعت مین چھتریون کے برابر یا اُن سے بڑھکر تھے، وہ برہمنون کے تقدس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، انھون نے توحید کو بانگ دہل پیش کیا، اور یہ بتایا کہ خدا بتون سے نفرت کرتا ہے، ان تمام باتون نے ہندوستان کے لوگون کے ذہن کو متاثر کیا،......" ہندو مذہب اور اسلام کے اختلاط کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ چودھوین صدی کے آخر مین بنارس کے راما نند نے ایک مذہبی فرقہ کی بنیاد ڈالی، جس کا ہر فرد خدا کی نظرون مین یکسان سمجھا جاتا تھا اور اس مین کسی امتیاز کے بغیر ہر قوم کے لوگ راما نند کے چیلے بن کر شریک ہوسکتے تھے؛"

نظر... دوسرے یورپین مصنفون کا یہ کہنا صحیح نہین ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوؤن

مین توحید کا تخیل اور ذات پات کے خلاف جذبات اسلام کے اثر سے پیدا ہوئے، ہندؤن مین شروع سے جتنے بڑے بڑے مفکر اور مذہبی مصلح پیدا ہوئے، انھون نے یہی تعلیم دی کہ بے شمار دیوتاؤن کے پیچھے ایک ہی خدا ہے، اور ہر پجاری خدا کے نزدیک برابر ہے، ان مصلحین نے یہ بھی تعلیم دی کہ مذہبی رسم ورواج توبہت ہین، لیکن ان تمام چیزون سے بالاتر صرف ایک سیدھا سادہ عقیدہ ہے، انھون نے مذہب کی باتون کو آسان بناکر ادنی طبقہ تک پہونچانے کی بھی کوشش کی، لیکن اس مین شک نہین کہ ان تمام اصلاحی تحریکون مین مسلمانون کے آنے کی وجہ سے بڑی ترقی ہونے لگی، ہندؤن کے دماغ پر جو تعصب چھایا ہوا تھا، وہ مسلمانون کی سوسائٹی کے اثر سے دور ہونے لگا،

مسلمان صوفیون نے ہندؤن اور مسلمانون کے اعلیٰ دماغون کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم تیار کیا، اور صوفیون کے فلسفہ کے اثرات سے حکمران طبقہ محکومون سے قریب تر ہوا،

تاریخی لٹریچر تاریخ نویسی مین ہندؤن کا دماغ بالکل محدود تھا، مسلمانون کی فتح سے پہلے ہندؤن نے کوئی ایسی کتاب نہین لکھی تھی، جو صحیح معنون مین تاریخ کہی جاسکتی ہے، اس کے برخلاف عربون کا دماغ خشک، مرتب اور حقیقت پسند ہوتا ہے، وہ تمام واقعات کو تاریخ وار لکھنے کے عادی ہین، مسلمانون کا تاریخی لٹریچر بہت ہی وسیع اور متنوع ہے، اور اس مین سنہ و سال کی باضابطہ ترتیب رہتی ہے، ہندوستان کے ہر مسلمان خاندان کے زمانہ مین تاریخین لکھی گیئن مغلون کے ہر بادشاہ نے اپنے عہد کی تاریخ لکھوائی، ان تاریخون کا نہ صرف مطالعہ کیا گیا، بلکہ ہندو مصنفون اور راجاؤن نے ان کے طرز کو نقل کرنے مین تساہل سے کام نہین لیا، اس طرح ہندوستانی لٹریچر مین ایک نئے اور بہت ہی مفید فن کا اضافہ ہوگیا، چنانچہ سترہوین اور اٹھارہوین صدی مین تاریخون، سوانحعمریون اور خطون کا ایک عظیم الشان ذخیرہ فراہم ہوگیا،

کلچرل اثرات مسلمانون نے ہندوستان مین صدیون حکومت کی، اس لئے یہان اُن کے تمدنی

اثرات گوناگون ہین ،

شکار خصوصاً باز اور شکرے سے شکار کھیلنے کے طریقون مین مسلمانون کا اثر غالب ہوا ، اس کے لئے ان ہی کی اصطلاحات استعمال ہوئین ، تمدن کے دوسرے شعبون مین بھی فارسی عربی اور ترکی الفاظ ہندی بنگالی بلکہ مرہٹی زبان تک مین استعمال کئے جانے لگے ،

مسلمانون نے فنونِ جنگ مین بڑی ترقی کی تھی ، انھون نے یہ فن ترکی سے سیکھا تھا ، جو یورپ کے فنون جنگ سے متاثر تھا ، اور کچھ ایرانیون سے بھی سیکھا تھا ، مغلون کی فوج کے نظم ونسق کو ہندو راجاؤن نے بڑی رغبت سے اختیار کیا ، تمدن جیسے جیسے بڑھتا گیا ، اور جنگ مین توپون کے استعمال کی کثرت ہوئی ، تو مسلمانون نے حصار بندی کو بڑی ترقی دی ، مسلمانون ہی نے یہان بارود رائج کی ، ہندوؤن کو جنگ مین ہاتھیون پر بڑا بھروسہ رہا کرتا تھا ، لیکن مسلمانون نے سوارون کے دستے کے طریقۂ جنگ کو اتنی ترقی دی کہ ہاتھی جنگی مصرف کے لئے بیکار ہو گئے اور وہ لڑائی مین صرف باربرداری کے کام مین آنے لگے ،

ملکی نظام ، دربار کے آداب ، لباس پوشاک ، اعلیٰ طبقہ کے طرز زندگی ، سامان تعیشات ، فنونِ لطیفہ ، تعمیرات اور فن باغبانی مین مسلمانون کے اثرات بہت نمایان طور پر ظاہر ہوئے ، مغلون نے دربار کے مراسم ، خطابات اور سرکاری عہدیدارون کے آداب مین جن جن باتون کو رائج کیا ، ان کو اکثر ہندوؤن نے فخریہ نقل کیا ، راجپوت اور مالوہ کی بعض ریاستون مین سرکاری زبان اب تک اردو ہے ، اور اس کا رسم الخط دیوناگری کے بجائے فارسی ہے ،

محکمۂ مالیات کا نظام تو وہی رہا جو بہت ہی قدیم زمانہ سے ہندوستان مین رائج تھا ، لیکن اس نظام کی سرکاری ترتیب اور اس کے حساب کتاب کے طریقون اور اس محکمہ کے القاب کو مسلمانون نے رائج کیا اور ان سے ہندو ریاستون نے لیا ،

مسلمانوں کی روزانہ کی زندگی میں ہندوؤں کے مقابلہ میں تعیش زیادہ تھا، وہ زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے، اس لئے اُن کی وجہ سے صنعتوں اور فنون لطیفہ کو زیادہ فروغ ہوا، اُن کا ذوق ہندوؤں سے زیادہ بلند اور پاکیزہ تھا، متمول ہندو خصوصاً سرکاری طبقہ ان ہی کے ذوق کو اپنی زندگی کا معیار بناتا تھا حتی کہ معصیتوں میں بھی ان ہی کی ریس کرتا تھا،

مسلمانوں نے کھانے پینے کی بہت سی نئی چیزیں رائج کیں، جمالیات، عطریات اور رقص و سرود میں مسلمان شاہی خاندان کا ذوق پوری سوسائٹی کی رہبری کرتا تھا، گو رقص و سرود میں اُن کا ذوق کچھ بہت ترقی یافتہ نہ تھا،

کاغذ مسلمانوں ہی نے یہاں رائج کیا، جیسا کہ اس کے عربی نام سے ظاہر ہے: کاغذ کے رائج ہونے کے بعد پتیوں پر کتابوں کے لکھنے کا رواج بند ہو گیا اور کتابیں ظاہری حسن کے ساتھ زیادہ تعداد میں ہاتھوں میں آنے لگیں، مخطوطات کی طلاکاری ایک خاص آرٹ ہے، جو مغلوں کے زمانہ میں شروع ہوا، اکبر اور اس کے بعد کے عہد میں ہندو راجاؤں کے لئے ہندی اور سنسکرت کتابیں نقل کی جانے لگیں، اور اُن کو مصوّر بھی کیا گیا، یہاں کی فارسی کتابوں کی طلاکاری اور خطاطی کی شہرت یورپ تک پھیلی، جس کی وہ مستحق تھی، مسلمانوں ہی کے اثر سے کتابیں عام طور سے نقل کی جاتیں، اور علوم و فنون کو پھیلایا جاتا، ورنہ اس سے پہلے ہندو اپنی کتابوں اور علوم و فنون کو راز ہی میں رکھنا پسند کرتے تھے،

یونانی اطبا اپنے زمانہ کے بہترین طبی مشیر سمجھے جاتے تھے، اس کی وجہ کچھ تو یہ ضرور تھی کہ سلاطین اور امرا اُن کی سرپرستی کرتے تھے، لیکن ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوؤں کے فنِ طب کی ترقی بالکل مسدود ہو گئی تھی، اور مسلمانوں کا یہ فن روز افزوں ترقی کر رہا

تھا، کیونکہ وہ مغربی ممالک کی ترقیوں سے باخبر رہتے تھے،

مسلمان بیرونی ملکوں کا سفر کرکے تجارت کیا کرتے تھے، اس سے اُن کے ذہن و دماغ میں وسعت پیدا ہوتی رہتی تھی، ان کے مقابلہ میں ہندو گھر ہی میں بند رہنا پسند کرتے تھے، فارسی زبان میں "مرد جہاندیدہ" ایک اصطلاح ہے، جو ایسے شخص کے لئے استعمال کی جاتی تھی، جس نے بہت زیادہ سیر وسیاحت کی ہو، ایسا شخص عقل و دانش اور کلچر کا نمونہ سمجھا جاتا تھا، جو بالکل صحیح ہے،

"ص ع"

خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۷ء میں مدراس میں سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے دیئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانوں نے اُن کو بیحد پسند کیا،

ضخامت :- ۱۹۴ صفحے، چوتھا اڈیشن، قیمت :- عار

دروس الادب

عربی کی پہلی اور دوسری ریڈرین جن کو مصنف نے عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لئے اس طرح لکھا ہے کہ طالب علم کو ادب اور نحو کے ساتھ ساتھ تعلیم اور مشق ہو سکے، اکثر مدارس میں یہ داخل نصاب ہے،

قیمت :- جلد اول ۳ر، جلد دوم ۶ر

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

تاریخ اسلام کامل (حصہ اول)

از جناب مولوی عبدالقیوم صاحب ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۳۲ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت معمولی قیمت للعہ، پتہ :۔

محمد زبیر کتب خانہ امجدیہ ستر کھ ضلع بارہ بنکی،

مصنف روشناس صاحب قلم اور متعدد کتابون کے مصنف ہین، انھون نے اسلام کی ایک کامل تاریخ لکھی ہے، جس مین اُن کے بیان کے مطابق ابتدائے آفرینش سے قیامت تک کے حالات ہونگے" چنانچہ اس حصہ مین تخلیق عالم سے لیکر بنی امیہ کے خاتمہ تک کی تاریخ ہے، اس کی تالیف مین عربی ماخذون کے علاوہ اردو مین بھی مصنف کو تاریخ اسلام پر جو مستند مواد مل سکا ہے، اس سے فائدہ اٹھایا ہے، خصوصًا دار المصنفین کی کتب سیرت اور تاریخ اسلام سے بکثرت استفادہ کیا ہے لیکن حوالے اُن کے بجائے بیشتر اصل ماخذون کے دیئے ہین تاہم اس حیثیت سے یہ کتاب قابل قدر ہے کہ اس مین اسلام کی ابتدائی سو اصدی کے متعلق سیاسی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور علمی وغیرہ ہر قسم کے ضروری اور مفید معلومات سلیقہ سے جمع کر دیئے ہین، جس سے پڑھنے والون کے سامنے اسلام کی ہمہ گیر برکتون کا اجمالی نقشہ آجاتا ہے، اگر مصنف اس کتاب کا دامن ازل سے لیکر ابد تک وسیع نہ کر دیتے تو بھی اس کی حیثیت مین کوئی فرق نہ آتا اتنی جامعیت اسلامی تاریخ کے لئے ضروری بھی نہین تھی، دوسرے اس کا نباہنا بھی آسان نہین تھا، چنانچہ اس کتاب مین تخلیق عالم سے لیکر ظہور نبوی تک کی تاریخ کا کل سرمایہ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے چند ناتمام واقعات ہین اور وہ بھی دو چار صفحات سے زیادہ نہین جن کو اس دور کی تاریخ سے کوئی

نسبت نہیں، قیامت تک کے حالات کے علم کا ذریعہ تو غیب کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا، اور اگر اس سے مراد قیامت کی پیشینگوئیاں ہیں، تو ان کی حیثیت تاریخ کی نہیں ہے، ایک علمی و ادبی کتاب کی توثیق کے لئے وزرائے حکومت کی تحریریں بھی بالکل غیر ضروری ہیں، اُن کے شکرانے کے دوسرے طریقے بھی ہو سکتے تھے، تاہم ان پہلوؤں سے قطع نظر یہ کتاب تاریخ اسلام سے متعلق متفرق معلومات کے لئے مفید اور عام لوگوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

رہنمائے انسانیت یعنی دینِ فطرت } از جناب مولوی صفوۃ الرحمٰن صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۹ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت :- عہ پتہ :- ڈیوڑھی شہریار جنگ محلہ سلطان شاہی ڈاکخانہ شاہ علی بنڈہ حیدرآباد دکن،

آج کل مسلمانوں میں عقیدہ و عمل دونوں قسم کی گمراہیاں پھیلی ہوئی ہیں، ایک طبقہ جو نئے اثرات سے متاثر ہے، اسلام سے بالکل بیگانہ اور بے عمل ہے، اس کی نگاہ میں اسلامی تعلیمات کی کوئی قدر و قیمت نہیں، ایک دوسرا طبقہ جو اس کا منکر نہیں، بلکہ اس پر عامل بھی ہے لیکن بیشتر مروجہ عقائد و اعمال کو خود اسلام سے بہت کم علاقہ رہ گیا ہے، اور ان پر اوہام اور بدعات کے اتنے حجابات پڑ گئے ہیں کہ ان میں اصلی اسلامی تعلیمات بالکل گم ہو گئی ہیں، اور ان پر عمل کرنے والے بہت کم ہیں، اس لئے مسلمانوں کی اصلاح کے ساتھ خود بگڑی ہوئی اسلامی تعلیمات میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے، یہ کتاب اسی مقصد سے لکھی گئی ہے، اس میں رائج الوقت غیر اسلامی عقائد و تصورات کی پوری تردید کی گئی ہے، اور قرآن مجید و احادیث نبوی کی روشنی میں صحیح اسلامی عقائد و اعمال پیش کئے گئے ہیں کتاب اپنے مقصد پر حاوی ہے، مصنف نے ان تمام غیر اسلامی عقائد و اعمال کی تصحیح کی ہے جن میں نہ صرف عوام بلکہ بہتیرے تعلیم یافتہ تک مبتلا ہیں، اس لئے مصنف کی یہ دینی خدمت لائق تحسین ہے، لیکن جا بجا ان کا طرز اصلاحی کے بجائے مناظرانہ اور مجادلانہ ہو گیا ہے اور طریقۂ تعبیر میں شدت پیدا ہو گئی ہے جو اصلاح و تبلیغ کے لئے مفید نہیں ہے، خصوصاً ان مختلف فیہ

مسائل مین جن مین تاویل کی گنجایش نکل سکتی ہے، تشدد مناسب نہین ہے، اور مصنف کے حسن نیت اوران کے خیالات کی صحت کے باوجود اس سے بعض طبقون کو شکایت پیدا ہو سکتی ہے، تبلیغ و اصلاح مین شدت کے بجائے نرمی کے ساتھ افہام و تفہیم زیادہ مفید اور کارگر ہوتی ہے، خصوصاً جن مسائل کی مختلف تعبیرین ہو سکتی ہین ان مین زیادہ سختی مناسب نہین ہوتی، اس پہلو سے قطع نظر یہ کتاب اپنے مقصد اور خیالات کے اعتبار سے قابلِ قدر اور تعلیم یافتہ مسلمانون کے مطالعہ کے لائق ہے،

۱۸۵۷ء کے ہیرو، از سیدہ انیس فاطمہ صاحبہ بریلوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۲ صفحے، قیمت مجلد ۱۲/، پتہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ

۱۸۵۷ء کے انقلاب مین جن بلند ہمت اور حوصلہ مند شخصیتون نے ہندوستان کو انگریزون کی غلامی سے چھڑانے کی کوشش کی تھی، اس کتاب مین ان مین سے تین واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل، جنرل بخت خان اور ضیاء الملک محمود خان روہیلہ کے مختصر حالات اور کارنامے لکھے گئے ہین، واجد علی شاہ کی معزولی اور جلاوطنی کے بعد اُن کی بیگم حضرت محل نے اپنے کمسن لڑکے برجیس قدر کو تخت نشین کر کے بڑی بہادری سے انگریزون کا مقابلہ کیا تھا، جنرل بخت خان بریلی مین حافظ الملک رحمت خان کے پوتے محمود خان کو گدی پر بٹھا کر مقابلہ میں آئے، اور ضیاء الملک محمود خان نے بجنور مین بہادر شاہ کی حمایت اور سرپرستی مین مخالفت کا علم بلند کیا تھا لیکن انگریزون کے تدبر اور ہندوستانیون کی نااتفاقی سے تینون کا خاتمہ ناکامی پر ہوا، اس کتاب مین ان تینون حوصلہ مندون کی جنگ آزادی اور اس کی ناکامی کی مختصر سرگذشت بیان کی گئی ہے، اس سلسلہ مین حکومت اودھ کی مختصر تاریخ اور اس زمانہ کے متعدد مجاہدین کے حالات بھی آگئے ہین، مصنفہ کا انداز تحریر ادیبانہ اور موثر ہے، ایک خاتون کے قلم سے ایسی مفید اور سنجیدہ کتاب تحسین و آفرین کی مستحق ہے، کتاب کے شروع مین پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کے قلم سے ایک مفید اصلاحی مقدمہ ہے،

مرزا شوق لکھنوی از جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ محمد اسلم نمبر ۵، عماد الملک روڈ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ وارد وبک ڈپو بچھراون ضلع مراد آباد،

اردو کی مثنویوں مین نواب مرزا شوق کی مثنویون بہار عشق و زہر عشق خصوصاً زہر عشق کو جو حسن قبول حاصل ہوا، وہ کسی دوسری مثنوی کے حصہ مین نہین آیا، اس کی وجہ یہ ہو کہ حسن بیان ولطف زبان، محاورون اور روزمرہ کے استعمال، فصاحت وسلاست، سادگی و بے ساختگی، جذبات وکیفیات کی مصوری اور جذب وکشش مین کوئی مثنوی زہر عشق اور بہار عشق کا مقابلہ نہین کر سکتی اور ان کے جیسے بہتر نمونے ان دونون مین ملتے ہین، ان سے اردو کی دوسری مثنویان خالی ہین، اور اس وصف مین گلزار نسیم اور سحر البیان بھی اپنی تمام خصوصیات کے باوجود ان کا مقابلہ نہین کر سکتین، زہر عشق پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن بہار عشق کا پورا حق ادا نہین کیا گیا تھا، مصنف نے اس کتاب مین اس کو ادا کیا ہے، وہ صاحب ذوق ادیب ونقاد ہین، اس لئے بڑی خوبی سے زہر عشق اور بہار عشق کا تجزیہ کر کے ان کی خصوصیات اور ان کے محاسن ومعائب دکھائے ہین، انداز بیان دلکش اور ادیبانہ ہو،

ہماری کتاب قاعدہ پہلا دوسرا اور تیسرا حصہ مرتبہ جناب افضل حسین صاحب ایم اے بی ٹی ناظم درسگاہ جماعت اسلامی، تقطیع بڑی کاغذ کتابت بہتر قیمت فی حصہ ۴ر، عہ، ۸ر پتہ مکتبہ جماعت اسلامی رامپور

مسلمان بچون کی ابتدائی تعلیم کی کتابون کی کمی نہین ہو، لیکن ایسی کتابین بہت کم ہین جن مین ان کی تمام تعلیمی ضرورتون کا لحاظ رکھا گیا ہو، یہ نصاب اسی ضرورت کے پیش نظر مرتب کیا گیا ہے، اس مین اصول تعلیم کے مطابق اردو کی تعلیم کے ساتھ مذہبی واخلاقی تعلیم وتربیت، مفید مذہبی معلومات، تاریخ اسلام کے متفرق مؤثر واقعات، بچون کے ذوق کی دلچسپ حکایات ومنظومات وغیرہ وہ تمام باتین موجود ہین جو ایک مسلمان بچے کے لئے ضروری ہین، اسلئے یہ نصاب تعلیمی اور مذہبی دونون حیثیتون سے ان کے پڑھانے کے لائق ہو،

"م"

جلد ۶۶ ماہ شوال المکرم سنہ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ اگست سنہ ۱۹۵۰ء عدد ۲

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

ادبیات

شذرات

اس صوبہ مین اردو زبان کی تعلیم کے مسئلہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہین نکلا، تاہم اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ کسی حد تک اردو کا بھی حق مان لیا گیا، اور اسکو بھی تعلیم گاہون مین بار مل گیا، لیکن اسکی جو شکل اختیار کی گئی ہے، وہ عملاً بے نتیجہ ہے، اور شعبہ تعلیم کے حکام اور عہدہ دارون کی اردو دشمنی کی بنا پر اس اجازت سے بھی پورا فائدہ نہین اٹھایا جا سکتا،

اس کی تفصیل یہ ہے کہ نئے نظام تعلیم مین بنیادی طور پر یہ مان لیا گیا ہے کہ ابتدائی تعلیم مادری زبان مین دیجائے گی، اور مادری زبان وہ مانی جائے گی، جو بچون کے والدین بتائین گے، اس اصول کے مطابق پرائمری تعلیم مین اردو کو بھی ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے، اور اس کی کتابین بھی ملتی ہین لیکن اس کے متعلق احکام اتنے مجمل ہین کہ اُن سے فائدہ اٹھا کر پرائمری اسکولون سے عملاً اردو بالکل ختم کر دی گئی ہے، اور صاف جواب ملتا ہے کہ اردو کی تعلیم کا انتظام نہین ہو سکتا، اگر کسی اسکول مین کسی مجبوری کی بنا پر اس کا انتظام ہے بھی تو اردو کے ساتھ ہندی کی تعلیم بھی ضروری ہے، حتیٰ کہ اسلامی مکاتب بھی اس پر مجبور ہین، اس سے بچون پر دہرا بار پڑتا ہے، اور جب اعتراض یا گرفت کا خطرہ ہوتا ہے تو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اردو مین پڑھنے والے لڑکے ہی نہین ملتے، یہ جواب ان مقامون کے لئے جہان مسلمانون کی آبادی بہت کم اور محض ادنیٰ طبقون پر مشتمل ہو کسی حد تک قابلِ قبول ہو سکتا ہے، لیکن ان بڑی آبادیون کے لئے جہان ہر طبقہ کے مسلمان ہون، یہ عذر لنگ کسی حیثیت سے بھی قابلِ سماعت نہین، ضلع اعظم گڈھ مین مسلمانون کی بڑی بڑی بستیان ہین لیکن کسی پرائمری اسکول مین اردو مین تعلیم کا انتظام نہین یہی حال دوسرے اضلاع کا بھی ہوگا،

جونیر ہائی اسکول یعنی چھٹے ساتویں آٹھویں میں ہندی لازمی ہو اور اردو کی حیثیت جنرل سائنس اور انگریزی کے ساتھ اختیاری مضمون کی ہو، چنانچہ جن اسکولوں میں جنرل سائنس کی تعلیم کا انتظام ہے وہاں اُس کے ساتھ صرف ایک اختیاری مضمون لیا جا سکتا ہے، جو ظاہر ہے کہ اپنی اہمیت کی بنا پر انگریزی زبان ہوگی، اس طرح ان اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا کوئی موقع ہی نہیں رہ جاتا، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی طالب علم اردو لینا چاہے تو بھی اس کو مختلف قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً ہندو اسکولوں میں جن کی بڑی تعداد ہے، اردو بالکل ختم کر دی گئی ہے گورنمنٹ اسکولوں میں ممکن ہو یہ صورت نہ ہو لیکن موجودہ ذہنیت میں وہاں بھی اردو کی تعلیم دشواریوں سے خالی نہ ہوگی، اس لئے دیگر مسلمانوں کے اسکولوں میں جن کی تعداد بہت کم بلکہ برائے نام ہے، اردو باقی رہ گئی ہے، اُن کے لئے یہ مشکل ہے کہ اردو کی کتابیں نہیں ملتیں، اردو سے بے اعتنائی کا یہ حال ہے کہ اس سال کے نصاب میں دوسری تمام اختیاری باتوں حتی کہ بنگالی تک کی کتابیں مقرر کر دی گئی ہیں لیکن اردو کتابوں کا کہیں نام نہیں ایسی حالت میں جن اسکولوں میں اردو ہے بھی وہ کونسی کتابیں پڑھائیں، سکنڈری ہائر اسکولوں میں بھی کم و بیش اسی قسم کی مشکلات ہیں، اس پر مستزاد یہ ہے کہ ان میں ذریعۂ تعلیم ہندی کر دی گئی ہے اور ۵۲ء سے امتحانات کے جواب بھی ہندی میں دینا ہونگے، ایسی حالت میں اردو کی حیثیت اور اہمیت کیا رہ جاتی ہے، اس سلسلہ میں اردو کی جانب سے یہ بنیادی غفلت بھی قابلِ ذکر ہے، کہ اس سال سے ٹریننگ اسکولوں سے اردو کی تعلیم ختم کر دی گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چند دنوں میں اردو پڑھانے والے اساتذہ نہ ملیں گے،

———— (۲) ————

اگر اردو کے بارہ میں گورنمنٹ کی پالیسی اعتراض سے بچنے کے لئے اس کی تعلیم کی محض قانونی اجازت نہیں ہے بلکہ وہ درحقیقت اسکی تعلیم بھی چاہتی ہے تو ان ساری مشکلات کا حل یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے بارہ میں اسکی پوری حقیقت ہونی چاہئے کہ جن طالب علموں کی مادری زبان اردو ہوگی، ان کو صرف اردو میں تعلیم دیجائیگی، اسکے ساتھ ہندی پڑھائی جائیگی اور اردو کی تعلیم کے انتظام کے لئے طلبہ کی تعداد بھی متعین کر دینی چاہئے، تاکہ اجمال کی وجہ سے

اردو کو ختم کر دینے کی گنجائش باقی نہ رہے، جونیر ہائی اسکول مین ایک کے بجائے دو اختیاری مضمون کر دیئے جائین تاکہ دوسرے اہم مضامین کے ساتھ اردو لینے کی گنجائش بھی باقی رہے، کم از کم گورنمنٹ اسکولون مین جو اس کے اختیار مین ہین اردو کی تعلیم کے احکام پر سختی کیساتھ عمل کرایا جائے سکنڈری ہائر اسکولون مین جو اردو مین تعلیم دینا چاہین انکو اس کی اجازت دیجائے اور اُس کے نصاب کی کتابین مہیا کیجائین امتحان کے سوالات کے جوابات اردو مین بھی دینے کا اختیار دیا جائے، ٹرئننگ اسکولون مین اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے جن مقامون پر مسلمانون کی کافی آبادی ہو وہان اُردو کے مستقل پرائمری اور جونیر ہائی اسکول قائم کئے جائین جن مین صرف اردو ذریعہ تعلیم ہو اسمین کوئی دشواری نہین ہے کیا صوبہ متحدہ مین اردو کی وہ حیثیت بھی نہین ہے، جو بمبئی مین ہے، وہان گجراتی اور مرہٹی کے ساتھ اردو کے بھی مستقل اسکول قائم کئے گئے ہین، اردو سے اس بے اعتنائی کے باوجود اس صوبہ سے اس کا اتنا تعلق تو ماننا ہی پڑے گا کہ

گویان نہین یہ یان سے نکالی ہوئی تو ہے اس کو بھی اس دیار سے نسبت ہے دور کی

ورنہ موجودہ صورت مین تو اردو کی تعلیم اور اس کا باقی رہنا ممکن نہین ہے،

انجمن ترقی اردو نے اردو کے متعلق شعبہ تعلیم کی جملہ شکایتون اور بے عنوانیون کی تحقیقات اور اس کے تدارک کے لئے لکھنؤ مین جو کمیٹی مقرر کی ہے ضرورت ہے کہ تمام اضلاع بلکہ ضلع کی بڑی بڑی آبادیون مین اسکی سب کمیٹیان قائم کیجائین، جو اپنے یہان کی تعلیمی شکایات کو لکھنؤ کی مرکزی کمیٹی تک پہنچائین اب اردو کا تحفظ اور اس کی بقا صرف اس کے حامیون کی کوشش پر منحصر ہے، اس لئے گورنمنٹ نے جس حد تک بھی اسکی تعلیم کی اجازت دی ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی تمام شکلین اختیار کرنی چاہئین، اور باقی حقوق کو حاصل کرنے کے لئے جد وجہد جاری رکھنی چاہئے، اس کے لئے عمل اور ایثار و قربانی کی ضرورت ہے، اگر اردو کے حامی ہمت جرأت اور استقلال سے کام لین تو گورنمنٹ اردو کے واجبی حقوق ماننے پر مجبور ہوگی،

مقالات

الجزیہ

از

مولانا سعید انصاری سابق رفیق دار المصنفین

(۲)

جزیہ اور قرآن

جزیہ کے متعلق یہ غلط فہمی رفع کرنے کے بعد کہ وہ ذلت کا مرادف تھا، آیت جزیہ پر بحث اور مفسرین کے اقوال سے صغار کی تشریح کی جاتی ہے، سر جدو ناتھ سرکار کی طرح بہت سے معترضین اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں، اور اس سے جزیہ کی ذلت کا مفہوم نکالتے ہیں، بلا شبہ بعض مفسرین اور فقہا نے جزیہ کو ایسا ہی سمجھا ہے لیکن اسلامی حکومتوں کے عمل سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی، اس لئے اس کی حیثیت ان فقہاء اور مفسرین کے ذاتی اقوال سے زیادہ نہیں ہی،

قرآنی تعلیمات پر عمل کا سب سے مکمل نمونہ عہد رسالت اور عصر خلفائے راشدین ہی، اور ان مبارک زمانوں میں صغار (ذلت) کا مطلق پتہ نہیں چلتا، چنانچہ مفسرین کی جماعت میں سے ایک بڑے عالم علامہ محمد بن احمد شربینی خطیب جنھوں نے تفسیر سراج المنیر ۹۶۸ھ میں تالیف کی تھی، اپنی اسی کتاب (ص ۶۰۲ جلد ۱) میں لکھتے ہیں،

تفسیرہ ان یجلس الآخذ ..... اوس کی یہ تفسیر کہ یوں غیر مسلم کو ذلیل

مردود، بان هذه الهيئة باطلة ودعوى سنيتها او وجوبها اشد بطلانا، ولم ينقل ان النبي صلى الله عليه وسلم ولا احدا من الخلفاء الراشدين فعل شيئا من ذلك وعلى تفسيرها بما ذكر يمتنع التوكيل اذا قيل بوجوبه

کیا جائے) مردود ہے کیونکہ یہ (ذلیل کرنے کی) شکل غلط ہے اور اس کے سنت یا واجب ہونے کا دعوی کرنا اور بھی غلط ہے اور یہ منقول نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدینؓ میں سے کسی نے اس میں سے کچھ بھی کیا ہو (یعنی ذلت کا کوئی طریقہ بھی اختیار کیا ہو) اور اس تفسیر کے بموجب جب یہ ہیئت تذلیل بھی ضروری ہو تو

(ابوحیان غرناطی اور ابن قیم وغیرہ کی تشریحات آگے آتی ہیں)

قرآن کے ایک شارح اور عالم اسلامی کے ایک مشہور مفسر کے اس دعوی کے بعد ہم کو حق پہنچتا ہے کہ پروفیسر جدوناتھ سرکار کی تاریخ دانی سے ان واقعات کا استفادہ کریں جو غیر مسلموں سے وصول جزیہ کے وقت اسلامی دفاتر میں بطور اہانت و تذلیل پیش آئے ہوں۔ سرکار نے جو کچھ لکھا ہے وہ بے شبہہ بعض کتابوں میں موجود ہے لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کم از کم ہندوستان میں اس پر عمل بھی ہوتا تھا۔

صغار کی بحث

بہرحال قرآن مجید میں جزیہ کے متعلق جو آیت ہے وہ یہ ہے۔

قاتلوا الذين لا يؤمنون بالله ولا باليوم الآخر ولا يحرمون ما حرم الله ورسوله ولا يدينون دين الحق من الذين اوتوا الكتاب حتى يعطوا الجزية عن يد وهم

تم لڑو ان لوگوں سے جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں، نہ آخرت پر، اور نہ حرام سمجھتے ہیں ان چیزوں کو جو خدا اور اس کے رسول نے حرام کیں اور نہ سچا مذہب اختیار کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی یہاں تک

صَاغِرُوْنَ ، (توبہ) کہ وہ جزیہ دین، ہاتھ سے اور وہ پست ہون

اس آیت مین چند امور غور طلب ہین،

۱- یہ تمام غیر مسلمون کے متعلق نہین ہے، بلکہ اس کا تعلق خاص اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے ہے،

۲- تمام اہل کتاب کے متعلق بھی نہین ہے، بلکہ ایک خاص گروہ کے متعلق ہے، جو اسلام کا دشمن تھا،

۳- سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ برأت مین جن مشرکون یا یہود و نصاریٰ سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے، اُن مین یہ معائب موجود تھے، معاہدہ پورا نہ کرنا، مسلمانون کے خلاف دشمن کو مدد دینا، مسلمانون کے عہد اور قرابت کا لحاظ نہ کرنا، زبان سے محبت ظاہر کرنا، اور دل مین عداوت رکھنا، بدنیتی، لالچ، اسلام سے نومسلمون کو برگشتہ کرنا، ظلم، اسلام پر حملہ کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے جلا وطن کرنا، زیادتی مین پہل کرنا، عموماً مذہبی خدمتون پر فخر کرنا، خاص یہود و نصاریٰ مین یہ عیوب تھے، کفر، یہود حضرت عزیرؑ کو اور عیسائی حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، شرک حضرت مسیحؑ احبار اور رہبان کو خدائی کا درجہ دیتے تھے، اسلام کو فنا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس سے لوگون کو برگشتہ کرتے تھے، غلط طریقون سے مال کھا جاتے تھے، کار خیر مین سونا چاندی خرچ نہین کرتے تھے،

۴- ظاہر ہے کہ جو فرقہ مذہبی اور اقتصادی خرابیون کے ساتھ ساتھ سیاسی حیثیت سے مسلمانون کا مدمقابل ہو، جو اسلام کو فنا کرنے پر تیار رہے، جو نومسلمون کو ورغلاتا ہو، اس کی سزا اس سے زیادہ نرم اور مناسب کیا ہو سکتی ہے کہ اوس کو لڑ کر زیر کیا جائے، اور اپنا ماتحت بنایا جائے،

۵- ایسے لوگون کا ماتحت ہونا اور محصول (جزیہ) ادا کرنا، نہ صرف ان کے نقطۂ نظر بلکہ تمام دنیا کے نقطۂ خیال سے ذلت اور پستی کا مرادف ہے، خواہ حاکم ان کو ذلیل سمجھے یا نہ سمجھے،

۶- چونکہ یہ لوگ علانیہ اسلام کے دشمن تھے، اس لئے تہدیداً خدا نے فرمایا کہ مسلمانون کو ان سے برابر لڑتے رہنا چاہیئے تاوقتیکہ یہ پست ہو کر محصول نہ ادا کرین،

۷۔ آیت مین دو لفظ ہین جن سے صغار کا مفہوم پیدا کیا جاتا ہے، عن ید اور صاغرون

۸۔ عَن یدٍ کا مطلب بعض لوگون نے یہ لیا ہے کہ اصالۃً جزیہ کی رقم ادا کرنی چاہئے، وکالۃً داخل نہین ہو سکتی لیکن یہ خود مختلف فیہ مسئلہ ہے، فقہ کی متعدد کتابون مین اس کی تصریح آئی ہے کہ اصالۃً حاضر ہونا ضروری نہین، گو بہتر ہے[۱] اور آج بھی عدالتون، بنکون، اور ڈاکخانون مین روپیے کے کاروبار کے وقت اصالۃً موجود رہنا بہتر سمجھا جاتا ہے، خود اورنگ زیب کے زمانہ مین بھی اصالۃً حاضری ضروری نہ تھی، چنانچہ ۱۰۹۵ھ مطابق ۱۶۸۳ء مین چتوڑ کے رانا نے جب اس شرط پر صلح کی کہ

"قبولِ جزیہ بجد افزودن، دو سہ پرگنہ عوض زرِ جزیہ از ملک خود"[۲]

تو اس شرط کو قبول کیا گیا، حالانکہ اگر اصالۃً زرِ جزیہ لے کر حاضر ہونا ضروری ہوتا، تو نہ پرگنے اس کا عوض ہو سکتے تھے، اور نہ اپنی ریاست کے پایہ تخت مین موجود رہنا کافی ہو سکتا تھا،

۹۔ عَن یدٍ کے اور بھی معنی ہین، امام ابن العربی (۵۴۳ھ) نے احکام القرآن مین پندرہ قول نقل کئے ہین جن کا ماحصل یہ ہو کہ ید کے حقیقی معنی مراد لئے جائین یا مجازی، اگر حقیقی معنی مراد ہون تو اصالۃً زرِ جزیہ لے کر حاضر ہونا ضروری ہے، اور اگر مجازی معنی لئے جائین، تو بہت سی صورتین ہو سکتی ہین، چنانچہ اس دوسری صورت مین ید کے حسب ذیل معنی بھی ہو سکتے ہین، ہاتھون ہاتھ (یعنی دینے والا اپنے ہاتھ سے حاکم جزیہ کے ہاتھ مین دے، خواہ اصالۃً خواہ وکالۃً) نقد ادا کرے[۳] زرِ جزیہ کو باقی نہین رکھنا چاہئے، بلا تاخیر بلا مطالبہ (ادا کرے) وغیرہ (ص ۴۰۰ ج ۱ مصر) غرض ان مین سے جو صورت بھی لے لی جائے اس مین صغار (ذلت) کا کوئی پہلو پیدا نہین ہوتا،

۱۰۔ صَاغِرون کا لفظ البتہ صغار کو صاف بتاتا ہے، لیکن صغار کی کیا صورت ہو؟ اس مین فقہا کا مختلف اقوال ہین، بعض نے اس کی یہ شکل تجویز کی ہے کہ [illegible] جزیہ [illegible] چاہیے، اور

---

[۱] ہدایہ ص ۱۳۰ جلد ۲ [۲] منتخب اللباب ج ۲ صفحہ ۲۴۲ [۳] [illegible]

کھڑے ہو کر اپنی رقم داخل کرے لیکن کھڑا رہنا ذلت کی بات نہیں آج عدالتوں، بنکوں اور ڈاکخانوں میں عموماً کاروباری آدمی کھڑے ہی رہتے ہیں، کیونکہ بیٹھنے کا انتظام نہ ہوتا ہے، اور نہ ہو سکتا ہے مسلمانوں کی سلطنت میں اگر دفاتر جزیہ میں کھڑے ہو کر رقم داخل کرنا غیر مسلموں کے لئے ضروری تھا، تو معترضین کو اس کے بالمقابل یہ بھی دکھانا چاہئے کہ مسلمانوں کی نشست کا انتظام زکوۃ کے دفاتر میں ہوتا تھا! بعض کا قول ہے کہ حاکم جزیہ، ذمی سے کہے "اے ذمی! جزیہ دے" اس قول کو سرجدوناتھ نے اپنی تاریخ (ص ۲۶۹ ج ۳) میں بڑے آب و تاب سے نقل کیا ہے، اور دکھایا ہے کہ اسلامی فقہ کے رو سے وصول جزیہ کا بھی ذلیل طریقہ تھا، لیکن یہ کہیں نہیں دکھایا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں اسی طرح جزیہ وصول بھی کیا جاتا تھا، فقہ کی کتابوں میں لکھا ہونا اور بات ہے، اور اس پر عمل ہونا اور بات، اس موقع پر علامہ ابو حیان غرناطی (۷۴۵ھ) کی عبارت غور سے پڑھنے کے قابل ہے، وہ البحر المحیط (۲۹ جلد ۵) میں لکھتے ہیں کہ لوگوں نے ذلت کی جو صورتیں لکھی ہیں، ان میں آیۂ قرآنی میں ایک کا بھی تذکرہ نہیں اسی طرح امام ابن قیم (۷۵۱ھ) کی یہ رائے قابل توجہ ہے،

وھذا کلہ مما لا دلیل علیہ ... یہ تمام باتیں بے دلیل ہیں، اور آیت

ولا ھو مقتضی الآیۃ ولا نقل ... ان کو نہیں چاہتی، اور نہ رسول اللہ

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا ... صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے یہ باتیں

اصحابہ (فتح البیان ص ۹۲ جلد ۴) ... منقول ہیں،

علامہ شربینی کا وہ قول بھی دیکھنا چاہئے جس میں انھوں نے تصریح کی ہو کہ اہانت کی یہ صورت علماء ہوا، اور اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا، نواب صدیق حسن خان بھی لکھتے ہیں کہ ان چیزوں کی کوئی دلیل نہیں ہے (فتح البیان ص ۹۲ ج ۴)

بعض نے صغار کے زیادہ مناسب معنی بیان کئے ہیں یعنی جزیہ دینا خود ذلت ہے، اس بنا پر

غیر مسلمون کے لئے ذلت کی شکلیں پیدا کرنے کی ضرورت نہین ہے) یہ امر کہ محکومی اور غیر قوم کی اطاعت ذلت ہے، ریاستہائے متحدہ امریکہ آسٹریلیا، آئرلینڈ اور اُن کے سیاسی رہنماؤن سے دریافت کرنا چاہئے

بہرحال طبری (۳۱۰ھ) محی السنۃ بغوی (۵۱۶ھ) اور امام فخرالدین رازی (۶۰۶ھ) نے اپنی تفسیرون مین یہ خیال بھی نقل کیا ہے،

امام شافعیؒ کا قول ہے کہ صغار یہ ہے کہ اسلامی قانون (معاملات کے متعلق) اُن پر عائد ہوتا رہے یعنی وہ مذہبی مسائل کے علاوہ دنیاوی باتون مین قانون اسلامی کی پابندی کرتے ہین، یہ خیال جو دنیائے اسلام کے ایک بڑے امام کا ہے، تمام خیالون سے زیادہ صحیح ہے، اور محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل (ص ۷۰ ج ۲) مین امام ابن مکرم (۷۱۱ھ) نے لسان العرب (ص ۲۹ ج ۶) مین اور شربینی نے (۹۷۷ھ) نے سراج المنیر مین اسی کو نقل کیا ہے، تیسرے اور چوتھے نظریون کے مطابق صغار کا مفہوم محض ذہنی اور خیالی رہ جاتا ہے، اور اس کا تعلق مسلمان حکام سے باقی نہین رہتا، اب ان تمام مباحث کا حاصل یہ ہوا کہ

(۱) قرآن مجید کے رو سے صغار کے مستحق تمام غیر مسلم نہین ہین، بلکہ وہ مخصوص اہل کتاب ہین جو اسلام اور مسلمانون کے دشمن تھے، اور جن سے لڑائی کا حکم دیا گیا تھا،

(۲) اور غیر مسلم اس لئے جزیہ دیتے تھے کہ ان کے محصول کا یہی نام تھا، اور کوئی نیا نام رکھا نہین گیا تھا،

(۳) صغار کا لفظ قرآن مجید مین دشمنانِ اسلام کے لئے تہدیداً استعمال کیا گیا ہے اور اس پر خود عہد رسالت مین بھی عمل نہین ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زجر و توبیخ ویسی ہی تھی جیسی کہ ماں باپ اپنی اولاد کو کرتے ہین، اس کا مقصد مسلمانون کے دلون مین غیر مسلمون کی طرف سے منتقمانہ جذبات کی پرورش نہ تھی،

(۴) جو غیر مسلم دشمنِ اسلام نہین ہین، اُن کے لئے صغار بھی نہین ہے،

(۵) صغار کا مطلب ذلیل برتاؤ نہین، بلکہ ماتحتی اور سیاسی معاملات مین اسلامی قانون کی پابندی ہے، معزز ماتحت بھی بہر حال ماتحت ہے، یعقوب بن لیث الصفار کا قول ہے کہ "کمتر جون تو باید ذشت"[لہ]

اب ضرورت ہے کہ "سرجدو ناتھ سرکار" اور ہمارے معترض "ارسطو"[۵۲] اس پر غور کرین کہ اسلامی عہدِ حکومت مین غیر مسلمون کے ساتھ کیا ذلیل برتاؤ کیا جاتا تھا:

جزیہ کی شرح ہندوستان کے جزیہ کی (جس کا تذکرہ منوسمرتی میں ہے) کوئی شرح منوجی نے مقرر نہین کی، بلکہ ہر شخص پر برابر محصول لگایا (باب ۷، دفعہ ۱۲۸) جو ظاہر ہے کہ بالکل خلاف انصاف تھا، نوشیروان کے فرمان مین رعایا کی مالی حالت کے اختلاف سے جزیہ بھی مختلف مقرر کیا گیا، یعنی ۱۲، ۸، ۶، ۴، درہم (طبری ص ۹۶۲ جلد ۲) لیکن اس مین سلطنت کے مختلف صوبہ جات کی اقتصادی حالت کو سامنے نہین رکھا گیا تھا، بلکہ امرا، متوسطین اور غربا، کی یکسان حالت تمام صوبون مین فرض کر لی گئی تھی اور یکسان جزیہ لگا دیا گیا تھا، اس کے ساتھ ہی خواص و عوام کی نہایت ناگوار تفریق پیدا کی گئی تھی

لیکن اسلام مین معاشیات کا سوال ابتدا سے سامنے تھا، اس لئے مختلف ممالک کی اقتصادی حالت کے مطابق وہان کی رعایا پر جزیہ مقرر ہوا، اور اس کی مختلف شرحین قرار دی گئین، اہلِ یمن سے بحساب ایک دینار سالانہ، اہلِ شام سے ۴ دینار، مکہ کے ایک نصرانی سے ایک دینار[۵۴]، عراق کی رعایا

[لہ] زین الاخبار ص ۱۳ تالیف ابو سعید عبدالحی گردیزی در حدود ۴۴۴ھ [۵۲] اس مضمون مین ان تمام اعتراضات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، جو جزیہ پر کئے جاتے ہین، عرصہ ہوا آریہ گزٹ لاہور مین "آرسطو" کے فرضی نام سے جزیہ کے خلاف ایک مضمون نکلا تھا، اس مضمون مین ارسطو کے اعتراضات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے [۵۳] احکام القرآن ابن عربی ص ۳۷۷، جلد ا،

[۵۴] کتاب الخراج یحیٰی بن آدم ص ۷۳،

سے (بعض روایات کے مطابق) ۴۸ درہم سالانہ[۱] اور عام ممالک وصوبہ جات سے ۱۲، ۲۴، ۴۸ درہم سالانہ فی کس جزیہ وصول کیا جاتا تھا، یہ آخری شرح جیسا کہ بالتصریح معلوم ہے حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ کے زمانہ مین برابر قائم رہی[۲] اور امام ابوحنیفہؒ، امام محمد بن حسنؒ اور (بروایت مصنف فتح البیان) امام احمد بن حنبلؒ نے اسی کو اختیار کیا،[۳] جزیہ کا عالمگیری فرمان اگرچہ مرأت احمدی (ص ۳۱۳ ج ۱) مین بلفظ منقول نہین ہے لیکن سرجادوناتھ سرکار نے اس کا خلاصہ نقل کیا ہے، اس کی دفعہ ۲ مین یہی شرح موجود ہے (جو اُن کے نزدیک ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہے، جو غریبون کے کاندھون پر ڈالا گیا (اس کا جواب آگے آتا ہے))

معاشی حیثیت سے ایک اور اصول زرجزیہ کے متعلق اختیار کیا گیا ہے، قدیم ہندوستان مین محصول نقد کی شکل مین لیتے تھے؛ مثلاً روپیہ، دہرن، ستمان آتشک اپن وغیرہ (منوسمرتی باب ۸، دفعات ۱۳۵ تا ۱۳۸) ایران مین نقدی طریقہ درہم تھے، چین کا کچھ پتہ نہین لیکن اسلام مین ہر پیشہ والے کو یہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ جزیہ کی نقد قیمت کے بجائے اپنے اپنے پیشہ کی چیز کو دیسکتا ہے، البتہ مردار سور اور شراب جزیہ کی رقم مین قبول نہین کئے جائین گے،[۴] اس طرح جو سہولت غیرمسلم رعایا کو اسلامی سلطنت کے اندر میسر تھی، وہ دوسرے ممالک مین نہ تھی، اور نہ آج تک کسی ملک مین میسر ہے،

جزیہ کون لوگ دیتے تھے قدیم ہندوستان مین ہر شخص سے جزیہ لیا جاتا تھا، (منوسمرتی دفعہ ۱۳۷، باب ۷) جن مین عورتین اور بچے بھی شامل تھے، ان کو مستثنیٰ نہین کیا گیا ہے، غیر مستطیع بھی کچھ نہ کچھ دیتے تھے (دفعہ ۴۰۵، باب ۸) جو لوگ محصول ادا کرنے کے قابل نہ تھے، وہ ہر مہینہ مین ایک دن بیگار مین پکڑے جاتے تھے (دفعہ ۱۳۸، باب ۷) ایران مین اس سے کم سختی تھی، وہان ۲۰ اور پچاس سال کے درمیان عمر والے مرد جزیہ دیتے تھے، اور عورتین مستثنیٰ تھین، چین مین اس سے بھی زیادہ سہولت تھی، وہان صرف مرد دن

---

[۱] کتاب الخراج امام ابویوسف ص ۲۲ [۲] عینی شرح کنز ص ۳۳۰ ج ۳ [۳] فتح البیان ص ۹۵ جلد ۴ [۴] کتاب الخراج امام ابویوسف ص ۷۰

سے جزیہ لیا جاتا تھا جن کے لئے ۱۸ سے ۶۰ سال تک عمر کی شرط تھی،

اسلام میں ان تمام ممالک سے زیادہ جزیہ میں رعایت کی گئی، صرف عاقل بالغ اور کام کرنے کے قابل مردوں پر محصول لگایا گیا اور کام کی حیثیت سے اُن کے ۳ طبقے قرار دیئے گئے،

۱- غنی جو دس ہزار درہم یا اس سے زیادہ کا مالک ہو،

۲- متوسط جو ۲۰۰ درہم سے دس ہزار تک کا مالک ہو،

۳- فقیر جو ۲۰۰ درہم سے کم کا مالک ہو، یا اس کی آمدنی ضروریاتِ زندگی سے زائد نہ ہو،

امام ابو یوسف نے کتاب الخراج (ص ۷۰) میں اس کی پوری تفصیل بیان کی ہو کہ صراف، بزاز، مالک جائداد، تاجر، مطب کرنے والے طبیب میں جو غنی اور متوسط ہوں، وہ اپنی آمدنی کے مطابق جزیہ ادا کریں، ہاتھ سے کام کرنے والے کاریگر، مثلاً خیاط، رنگریز، موچی وغیرہ تیسرے درجہ میں ہیں، وہ اس کی شرح کے مطابق محصول دیں، اس موقع پر سر جدو ناتھ نے بعض فقہار کی رائے کے مطابق صرافوں وغیرہ کو پہلے درجہ میں اور خیاطوں وغیرہ کو تیسرے درجہ میں رکھکر درمیانی طبقہ کو غائب کر دیا ہے، (تاریخ عالمگیر ص ۲۰۹ ج ۳) حالانکہ امام ابو یوسف کی طرح اور فقہا نے بھی صرافوں وغیرہ کے دو درجے قرار دیئے ہیں، غنی اور متوسط،

ایسے اپاہج، اندھے اور لنگڑے لولے جو متمول ہوں اور جن کا کاروبار اچھا چلتا ہو اُن پر جزیہ ہے، اسی طرح دولت مند مقدس راہب اور پجاری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، (اورنگزیب کے عہد کے مالدار برہمن بھی اسی حکم میں آتے ہیں)،

کون لوگ جزیہ نہیں دیتے تھے قدیم ہندوستان میں صرف تین قسم کے لوگ جزیہ سے مستثنیٰ تھے، معذور، ستر برس کے بوڑھے اور برہمن، (منوسمرتی دفعہ ۳۹۴ باب ۸) ایران میں ۲۰ سال سے کم اور پچاس سال سے زیادہ عمر کے لوگ محصول ادا نہیں کرتے تھے، اُن کے علاوہ خاندانِ شاہی، معززین

فوج، مذہبی پیشوا دفاتر کے منشی، اور ملازمین سلطنت جزیہ کے مطالبہ سے آزاد تھے، چین میں عورتیں جزیہ نہیں دیتی تھیں، اور ۱۵سال سے کم اور ۷۰ سال سے اوپر عمر والے مرد بھی مستثنیٰ قرار دئیے دئے گئے تھے،

اسلام نے عورتوں، بچوں، پاگلوں، غلاموں، محتاج اور دراز کار رفتہ بوڑھوں، نادار راہبوں، اور بیکاریوں (نادار برہمن اورنگ زیب کے زمانہ میں اسی حکم میں شامل تے) مفلس، اندھوں اپاہجوں، اور لنگڑے لولوں کو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، اورنگ زیب نے عنایت اللہ خان مہتمم جزیہ کے نام ایک حکم بھیج کر غیر مسلم ملازمین سلطنت کو بھی جزیہ سے بری کیا تھا، مرات احمدی (ص ۳۱۴ ج ۱) میں یہ الفاظ ہیں،

"بندگان حضرت قدر قدرت عنایت اللہ خان را بتمشیت این کار تفویض فرمودند حکم اشرف اعلیٰ شرف صدور یافت کہ از ملازمان سرکار دولت مدار مواخذہ نکنند، وسوائے این از جمیع ذمیان مطابق شرع شریف بگیرد"

تعجب ہے کہ ہمارے ارسطو صاحب کی نظر اس نکتہ اور اس عبارت پر نہیں پڑی، ورنہ وہ یہ تکلیف نہ فرماتے، کہ ۱۶۷۹ء میں اورنگ زیب نے حکم دیا کہ جزیہ سب سے وصول کیا جائے خواہ اسلامی ہندوستان ہو یا رجپوتانہ کوئی سرکاری ملازم ہو یا نہ" (آریہ گزٹ)

جزیہ کے مصارف | مصارف عامہ کا بنیادی اصول بہبود عامہ ہے، اور اسلام میں جزیہ کے مصارف کو مختلف مدون میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے، کہ عوام کو ہر مد کے مصارف سے بیشتر میں فائدہ حاصل ہوتا تھا،

۱- مصارف عامہ کی سب سے پہلی اور ضروری مد فوجی انتظام ہے، اور یہ اسی جزیہ کی رقم سے ہوتا تھا امام ابو یوسف نے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے[۱]

---

[۱] کتاب الخراج ص ۱۴۴

واضع علیھم فیھا الخراج و فی	اور مین ان (ذمیون) پر زمین مین خراج
رقابھم الجزیۃ یؤدونھا	اور اُن کی گردنون مین جزیہ مقرر کرتا ہون
فتکون فیئًا للمسلمین المقاتلۃ	جس کو وہ ادا کرین گے اور جو مسلمان فوج
والذریۃ ولمن یاتی من	اور اس کی اولاد اور آئندہ آنے والون
بعدھم،	کے لئے نئے (غنیمت) ہوگا،

یہ فوج سرحدون کے علاوہ بڑی بڑی چھاؤنیون (مثلاً شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ، مصر) مین بھی رہتی تھی، جس کا اسی تقریر مین ذکر ہے، اور یہ سب فوجی وظیفہ دار تھے، خلیفہ کا فقرہ ہے واد دار العطاء علیھم، اور مبسوط ص ۸۰، ج ۱۰) مین بھی ہے،

فیوخذ منھم المال لیصرف	یعنی ذمیون سے جو وصول ہوگا، وہ اُن
الی الغزاۃ الذین یقومون ا	غازیون کو ملے گا، جو دارالاسلام کی حفاظت
بنصرۃ الدار	کرتے ہین،

(۲) ایک مد تحصیل کے اخراجات کی تھی، اس سے عمال کو تنخواہ ملتی تھی، مصنف کنز الدقائق (نہر الفائق) اور صاحب درمختار نے اس کی تصریح کی ہے،

(۳) سول یا دیوانی محکمون کی تنخواہون اور اخراجات کی مدین بہت سی مدین شامل تھین، مثلاً

امور نافعہ (پبلک ورکس) مین پتھر کے پلون (قناطر) اور لکڑی اور مٹی کے پلون (جسور) کی تعمیر کا کام اسی مد سے ہوتا تھا، (کنز و درمختار)

محکمۂ عدالت مین قاضیون اور مفتیون کی تنخواہین، (کنز و درمختار) دفاتر قضا کے محررون اور تقسیم کے گواہون کے معاوضہ (کنز و درمختار) اسی سے ادا کئے جاتے تھے،

نیا در کی نگرانی کرنے والے اسی رقم سے تنخواہ پاتے تھے، (کنز و درمختار)

تعلیمات میں علما اور طلبہ کے وظائف اسی سے نکالے جاتے تھے، (درمختار و ردّ مختار ص ۳۰۴ جلد ۳)

۴۔ مسلمانوں کے علاوہ خود ذمیوں کے ایسے افراد کو جو قابلِ امداد ہو جاتے تھے، اسی سے مدد دی جاتی تھی، حضرت خالد بن الولیدؓ نے حیرہ والوں کو جو فرمان عطا کیا، اس میں یہ الفاظ درج تھے[1]

ایّما شیخ ضعف عن العمل او	اور جو بوڑھا کام کرنے میں کمزور ہو یا اُس
اصابتہ آفۃ من الآفات او	کو کوئی آفت آگئی ہو، یا مالدار ہونے کے بعد
کان غنیًّا فافتقر وصار اھل	محتاج ہو گیا ہو، اور اُس کے مذہب والے
دینہ یتصدقون علیہ طرحت	اُس کو خیرات دینے لگے ہوں، تو اس کا
جزیتہ، وعیل من بیت المال	جزیہ معاف کیا جائے، اور مسلمانوں کے
المسلمین وعیالہ ما اقام	بیت المال سے اس کو اور اس کے بچوں
بدار الھجرۃ ودار الاسلام	کو دارالہجرۃ اور دارالاسلام میں جب تک وہ رہے، دیا جائے

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں اور مقامات کے معذور بوڑھوں کے لئے بھی یہ عام قاعدہ بنا دیا گیا تھا، اُنھوں نے ایک دفعہ ایک بوڑھے نابینا یہودی کو ایک دروازہ پر بھیک مانگتے دیکھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جزیہ کی رقم اور دوسری ضروریات کے لئے بھیک مانگ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اُس کو اور اُس کے جیسے تمام بوڑھوں کا جزیہ معاف کر دیا جائے،[2]

اسلامی اور غیر اسلامی جزیوں کا فرق (۱) اسلامی اور غیر اسلامی محصولوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ اسلام نے ربانی ذمہ داری کی بنا پر دنیا کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لیا تھا، اس لئے وہاں محصول کا اصل مقصد روپیہ نہ تھا، شمس الائمہ سرخسی (۴۸۳ھ) نے مبسوط (ص ۷۷، ۷۸، ج ۱۰) میں جابجا اس کا تذکرہ کیا ہے اور ذمیوں کی بقایا رقم (مواشیہ) کے معاف کر دینے کی وجہ بھی یہ بتلائی ہے کہ جزیہ کے ذریعہ مال جمع کرنا

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۵ [2] ایضاً ص ۷۲

مقصود نہیں ہے، بخلاف اس کے دوسرے ممالک اور اقوام میں محصول کے متعلق ہر زمانہ میں بھو کی شہنشاہیت کی گرج سنائی دی ہے، جس نے غربا کی جیبین خالی کرا کر امراء کے عیش و عشرت کا سامان مہیا کیا ہے، اور اس طرح اس بے زبان طبقہ کی سادہ مزاجی اور بھولے پن سے فائدہ اٹھاتی رہی ہے، منوسمرتی باب ۷ دفعہ ۱۳۹ و ۱۵۴ اور باب ۸ دفعہ ۵۰ بہ خاص طور سے اس سلسلہ میں قابلِ ملاحظہ ہیں۔

(۲) دوسرا عظیم الشان فرق اس سیاسی تخیل کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، جو مسلمان اور غیر مسلموں کے اندر "سلطنت" کے متعلق تھا، مسلمانوں نے نظریۂ "تولیت" (TrusteeShip) کا صحیح مفہوم سمجھ کر اپنے کو اس کا پورا عامل بنایا تھا، وہ اپنے کو ملک کا مالک نہیں، بلکہ متولی سمجھتے تھے[1] اس لئے انھوں نے محصول رعایا کی مالی حالت کے مطابق لگایا، جس سے اس کی خوشحالی میں فرق نہ آئے، اور ملک کی سرسبزی قائم رہے، بخلاف اس کے دوسری قوموں نے اپنے کو ملک کا متولی نہیں بلکہ مالک سمجھا تھا، اس لئے انھوں نے رعایا کی مالی حالت کے بجائے دوسرے اصول پر محصول متعین کئے، چنانچہ قدیم ہندوستان کے قانون منوسمرتی (باب ۸ دفعہ ۳۹) میں راجہ کو بالتصریح مالک کہا گیا ہے، اور اسی بنا پر یہاں محصول بمعیار خدمات کی ایک شق "مساوات" کا اصول پیش نظر رکھا گیا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ محصول سرکاری خدمات کا معاوضہ ہے، لیکن چونکہ سرکاری خدمات کا تخمینہ انفرادی طور پر ناممکن ہے، اور ان خدمات سے تمام ملک مستفید ہوتا ہے، اس لئے محصول بلا امتیاز بمقدار مساوی قائم ہونا چاہئے، منوسمرتی (باب ۷ دفعہ ۱۲۸) کا حکم اس بارہ میں نہایت صریح اور صاف ہے، لیکن اس اصول میں معاشی حیثیت سے چند نقائص ہیں، یہ مانا کہ خدماتِ منفردہ کا تخمینہ ممکن نہ سہی، تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا، کہ سب

---

[1] صحیح بخاری (کتاب الاعتصام باب یکرہ من التعمق) میں حضرت ابو بکرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے انا ولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر حضرت عمرؓ کا یہ قول لکھا ہے، انا ولی رسول اللہ صلعم وابی بکر، اور مبسوط (ص ۱۰، ج ۱۰) میں ہے وقولنا دار الاسلام نسبۃ للولایۃ،

لوگ سرکاری خدمات سے یکسان مستفید نہین ہو سکتے، اور بالعموم دولتمندون کو غرباء کے مقابلہ مین بہت زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے، پھر جب غرباء کو اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ پالنا بھی دشوار ہو رہا ہو، اور بسر اوقات کے لئے دوسرون کی فیاضی کے دست نگر ہون تو اُن سے ٹیکس طلب کرنا کہان تک قرین انصاف اور وصول کرنا کہان تک ممکن ہے، ؟ اس لئے مساوی ٹیکس کا یقینی نتیجہ خود ملک کی تباہی و بربادی ہے[۵۱]

ایران مین مساوات کے بجائے سرکاری خدمات کی انفرادی حیثیت پر نظر رکھی گئی، جس طرح مزدور کو محنت کی اُجرت دیجاتی ہے ٹیکس بھی سرکار کی خدمت کا معاوضہ ہے، اس لئے جو سرکار سے جتنی خدمت لے اسی کے مطابق معاوضہ بشکل ٹیکس ادا کرے، اسی بنا پر ایران مین ۱۲-۸-۶-۴ درہم کی شرح سے مختلف حیثیتون کے لوگون پر جزیہ مقرر ہوا، اور وہ لوگ جو سرکار کے مفہوم کی "وسعت" مین آتے تھے، مثلاً اونچے گھرانے، معززین، فوج، مذہبی پیشوا، منشی، اور سلطنت کے ملازم، جزیہ سے مستثنیٰ کر دیے گئے، لیکن عورتین جو سرکار کے مفہوم مین شامل نہ تھین، قدیم ہندوستان کی طرح ایران مین بھی جزیہ ادا کرتی تھین، معاشی حیثیت سے اس اصول مین بھی متعدد خامیان ہین، سب سے ناگوار چیز تو وہ تفریق ہے، جو اونچے گھرانون اور عوام مین رکھی گئی ہے، حالانکہ محصول کو "فرقہ داری" سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے (اسلام مین زکوٰۃ خود خلیفہ کو بھی ادا کرنی پڑتی ہے،) دوسرے سرکاری خدمات اس قدر بے شمار اور اُن کے نتائج اس قدر گوناگون ہین، کہ ان مین کسی شخص کے حصہ کا تخمینہ کرنا بالکل محال ہے، بیڑون، فوجون حکام کی تنخواہون، شہر کی صفائی، سڑکون کی درستی، واٹر ورکس، غرض لوکل یا امپیریل محصولون سے ہر شخص کو جو فائدہ پہونچتا ہے، اس کا جداگانہ تخمینہ کیونکر ممکن ہے ؟ اور پھر جو ٹیکس ان مصارف کے طلب کیا جائے، وہ سرکاری خدمات منفردہ کے مساوی کیونکر مقرر ہو سکتا ہے، ؟،

---

[۵۱] اصول معاشیات برنی ص ۲۹۰، ۲۹۹،

کیا شرح جزیہ مین ایران کی تقلید کی گئی ہو

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے، علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے الفاروق (ص ۱۶۰ ج ۲) نیز اپنے مضامین الجزیہ اور غیر قومون کی مشابہت (مقالات شبلی ج ۱ ص ۲۳۰، ۱۶۶) مین صاف صاف لکھا ہے، کہ حضرت عمرؓ نے نوشیروانی قواعد جاری کئے تھے، اس سلسلہ مین انھون نے ابو حنیفہ دینوری اور شاہ ولی اللہ صاحب کا نام بھی لیا ہے، اور اصلی ماخذ طبری کو قرار دیا ہے، جس نے یہ الفاظ لکھے ہین،

وھی الوضائع التی اقتدی بھا	اور یہ وہی شرحین ہین، جن کی عمرؓ بن
عمر بن الخطاب حین افتتح بلاد	الخطاب نے پیروی کی، جب انھون نے
الفرس وامر باجتباء اھل الذمۃ	فارس کے شہر فتح کئے، اور انھون نے اہل
علیھا	ذمہ سے انہی (شرحون) کے مطابق وصول
(طبری ص ۹۶۲ ج ۲)	کرنے کا حکم دیا،

شاہ ولی اللہ صاحب طبری سے متاخر ہین، اس لئے اُن کی رائے عین طبری کی راے ہو سکتی ہے تاہم وہ بھی حضرت عمرؓ کا نام لینے مین تامل کرتے ہین، ابو حنیفہ دینوری (۲۸۲ھ) البتہ طبری سے مقدم ہین، لیکن انھون نے اس کا ذکر ہی نہین کیا ہے، اب رہے، امام طبری (۳۱۰ھ) تو ان کے متعلق حسب ذیل امور قابل لحاظ ہین،

(۱) امام ابو یوسف (۱۸۲ھ) نے جہان جزیہ کی شرح بیان کی ہے، حضرت عمرؓ کی تقلید کا ذکر نہین کیا ہے،

(۲) امام موصوف نے کتاب الخراج (ص ۲۴) مین یہ بھی لکھا ہے کہ عراق فتح ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے وہان کے بعض زمیندارون کو بُلایا، اور پوچھا کہ زمین کا محصول تم عجمیون کو کیا ادا کرتے تھے، ؟ انھون نے کہا، ۲۷، فرمایا مین اس پر راضی نہ ہون گا،

۳- امام یحییٰ بن آدم (۲۰۳ھ) بھی تقلید کے ذکر سے ساکت ہیں،

۴- امام طبری (۳۱۰ھ) نے آگے چل کر جو عبارت لکھی ہے وہ تمام کتب فقہ اور تاریخ کے خلاف ہے، وہ لکھتے ہیں،

ولم یخالف عمرؓ بالعراق خاصة	اور عمرؓ نے خاص کر عراق میں کسریٰ کی ان
وضائع کسریٰ علی جربان الارض	شرحوں کی مخالفت نہیں کی جو اس نے زمین
وعلی النخل والزیتون والجماجم	کی جریبوں اور کھجور، اور زیتون اور سروں
(ص ۹۶۲)	پر مقرر کی تھیں،

(الف) اس عبارت کی رو سے ذمیوں کے طبقات چار ہونے چاہئیں کیونکہ چار شرحیں طبری نے مقرر کی تھیں (طبری جلد ۲ ص ۹۶۲)

(ب) شرح ۱۲-۸-۶-۴، درہم ہونی چاہئے،

حالانکہ اسلام نے ۳ طبقے قرار دیئے ہیں، اسی طرح ۴۸، ۲۴، ۱۲ درہم شرح رکھی ہے، اور اس کے حوالے اوپر آچکے ہیں،

(۵) طبری نے اقساط کا جو طریقہ لکھا ہے، مسلمانوں کا طرزِ عمل اس کے خلاف شہادت دیتا ہے کیونکہ وہ عموماً سالانہ جزیہ وصول کرتے تھے،

(۶) طبری کی روایت کے مطابق کسریٰ نے خاندانِ شاہی، معززین، فوج، مذہبی پیشوا اور ملازمینِ سلطنت کو جزیہ سے مستثنیٰ کیا تھا، حالانکہ حضرت عمرؓ نے ایسا نہیں کیا،

(۷) شمس الائمہ سرخسی (۴۸۳ھ) نے مبسوط (ص ۸، ج ۱۰) میں لکھا ہے کہ جزیہ کی مقدار کا علم حضرت عمرؓ کی حدیث سے ہوا ہے، اور یہی اصل ہے، انھوں نے مردوں پر ٹیکس ۱۲ درہم اور ۲۴ درہم اور ۴۸ درہم مقرر کئے، اور مقدار قیاس سے مقرر نہیں ہوتی، اس سے ہم نے سمجھا کہ انھوں (حضرت عمرؓ) نے رسول اللہ صلعم سے سماعت پر اعتبار کیا ہوگا، (یعنی انھوں نے خود یا کسی اور صحابی نے رسول اللہ صلعم سے

سُنا ہوگا،) تو ہم نے اُس کو لے لیا،

(۸) عموماً مفسرین اور فقہا تقلید کے ذکر سے خاموش ہین،

اب ایک طرف یہ تمام قدماے اسلام ہین جن کی کتابون مین نوشیروان کی پیروی کا ذکر تک نہین ہے

اور دوسری طرف مولانا شبلی ہین جن کو طبری کی روایت پر اس قدر اصرار ہے کہ وہ جزیہ کے اختلافِ

شرح کو بھی نوشیروانی پیروی کی طرف منسوب کر دینا چاہتے ہین، حالانکہ محصول اور اس کی مختلف شرحین

مقرر کرنا نوشیروان کا کوئی تمغاے امتیاز نہ تھا، یہ تو معمولی سی بات ہے، اور ہر مدبر اس کو سوچ سکتا ہے،

جزیہ اور سیاسیات — اب تک جزیہ کے متعلق جو گفتگو کی گئی، وہ قانونی (فقہی) اور کسی حد تک تاریخی پہلو لئے ہوے

ہوئی تھی، لیکن اب یہ دکھایا جائے گا، کہ پالیٹکس مین اس کی کیا حیثیت ہے ؟

(۱) اوپر جزیہ کے متعلق فقہا کے جو سات نظریات بیان کئے گئے ہین، اُن سب کا قدرِ مشترک یہ

نکلتا ہے کہ وہ ایک محصول ہے اور محصول کی تعریف بیٹیبل (Bastable) نے اپنی کتاب

"سرکاری مالیات" (Public Finance) مین اس طرح کی ہے،[۱]

"محصول (Tax) کسی شخص یا جماعت کی دولت کا وہ حصہ ہے جو بلا لحاظ اس کی رضامندی

یا ناراضگی کے سرکاری اغراض کے لئے حاصل کیا جاتا ہے"،

پروفیسر محمد الیاس برنی ایم اے، ال ال بی نے اصولِ معاشیات (ص ۲۹۶) مین اس تعریف

کو یون واضح کیا ہے،

"ٹیکس سے مراد دولت کا وہ حصہ ہے جو لوگ غیر اختیاری طور پر سرکار کو مصارفِ حکومت

کے واسطے ادا کرین"،

پھر اسی کتاب اور اپنی دوسری تصنیف علم المعیشت مین اس تعریف کے بعض الفاظ کو غور طلب قرار

---

[۱] معاشیات ص ۳۵۲ مصنفہ مولوی حبیب الرحمن ایم اے ایل ایل بی جامعۂ عثمانیہ،

دیا ہے، جن مین ایک لفظ دولت بھی ہے وہ اس لفظ کے متعلق لکھتے ہین،

اصطلاحِ "دولت" اپنے وسیع معنون مین استعمال کی گئی ہے اگویا مال وجائداد کے علاوہ "خدمات" بھی اس مین شامل ہین، چنانچہ بیگار بھی ایک ناپسندیدہ قسم کا ٹیکس ہے؛

لفظ "دولت" کی اس وسعت کو سمجھنے کے بعد جزیہ کے متعلق ایک بڑا مغالطہ دور ہو جاتا ہے، علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے الفاروق (ص ۱۰۲ جلد ۲) مین جہان جزیہ کی بحث لکھی ہے، اس کو حفاظت کا معاوضہ قرار دے کر تاریخ سے چند تائیدی دلائل بھی تحریر فرمائے ہین، اسی سلسلہ مین لکھتے ہین:۔

"اس سے بھی زیادہ قطعی شہادت یہ ہے کہ جن لوگون سے کبھی کسی قسم کی فوجی خدمت لی گئی، اُن کو باوجود اُن کے مذہب پر قائم رہنے کے جزیہ معاف کر دیا"

پھر شواہد مین ۱۷ھ اور ۲۲ھ مین عراق، آذربائیجان، آرمینیہ، اور جرجان کے غیر مسلمون سے جو معاہدے ہوئے تھے، اُن کو نقل کیا ہے،

لیکن "معاشیات" مین دولت کا لفظ جن عام معنی مین استعمال ہوتا ہے، اگر ان کو سامنے رکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے، کہ ذمیون کی جنگی خدمت بھی "دولت" کے وسیع مفہوم کے اندر داخل تھی، اس لئے اپنی جان کو لڑائی کے لئے پیش کرنا، گویا زرِ جزیہ کو نقدی صورت مین ادا کرنا تھا، اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جزیہ معاف نہین کیا گیا، بلکہ دوسری شکل مین وصول یا قبول کیا گیا،

حقیقت یہ ہے کہ جو سلطنت کسی ملک پر سیاسی حیثیت سے تسلط حاصل کرتی ہے وہ قانونًا اس کی مجاز ہے کہ بروقت ضرورت رعایا سے جانی اور مالی خدمات کا مطالبہ کرے، مسلمانون کی ابتدائی سلطنت (خلافتِ راشدہ) جو آج کل کے اعلیٰ ترین جمہوری طرزِ حکومت "منتقیہ" سے بدرجہا بہتر تھی، اس نے بھی اپنی رعایا سے دونون قسم کی خدمتین لین،

۱۔ ابتداءً جیسا کہ ہر قوم مین ہوتا ہے، صرف مسلمان فوج مین شامل تھے، ۱۷ھ مین جب غیر مسلمون

کا اس کو اعتماد حاصل ہو گیا، تو اُن کو بھی فوج مین شرکت کی اجازت مل گئی، جو حفاظت سلطنت کے لئے جانی امداد تھی ؟

۲۔ مالی امداد مصارف حکومت کے لئے تھی جس کو مسلمان بشکل زکوٰۃ اور غیر مسلم بصورتِ جزیہ دیتے تھے، اس کو فوجی خدمت سے کچھ واسطہ نہ تھا، جس طرح صاحب نصاب مسلمان فوجی خدمت کی وجہ سے زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہین ہوتے تھے، مستطیع غیر مسلمون کا جزیہ بھی معاف نہین کیا جاتا تھا؟ خلافتِ راشدہ کے بعد شخصی سلطنتون مین بھی یہ نکتہ ہمیشہ ملحوظ خاطر رہا ہے، چنانچہ سلطنتِ مغلیہ مین برابر راجپوتون کی فوج رہتی تھی، اور خود وہ شہنشاہ (اورنگ زیب) جس پر ارسطو نے اعتراضات کئے ہین، راجپوتون کو فوج مین بھرتی کرتا تھا، اور اُن سے فوجی خدمت لینے کے باوجود جزیہ بھی لیتا تھا، چنانچہ ہمارا معترض حیرت سے لکھتا ہے،

"مگر چلو ہم ایک لمحہ کے لئے یہ فرض کر لیتے ہین کہ یہ فوجی خدمت کا معاوضہ تھا، جو غیر مسلمون سے لیا جاتا تھا، تو اُن ہندوؤن سے جزیہ کا وصول کرنا کسی طرح بھی جائز نہ تھا، جو فوج مین ملازم تھے، پھر اورنگ زیب کا دسعا ہندو اور راجپوتانہ کے راجپرت راجاؤن سے جزیہ وصول کر لینا کیسے درست ہو سکتا ہے؟"...... پھر فوج کے ساتھ امیر جزیہ مقرر کئے گئے تھے، جو جزیہ وصول کرتے تھے، ۱۲ جولائی ۱۷۰۲ء (۱۱۱۴ھ) کا اعلان اُن فوجی امیرون کا ذکر کرتا ہے، اس کا صاف مطلب ہے کہ فوج مین ہندوؤن سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا، ورنہ فوج مین اُن کی موجودگی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے، پھر دوسری طرف کوئی ایسا حکم نہین جس مین فوجی ملازم ہندوؤن کو جزیہ کی ادائگی سے مستثنیٰ کیا گیا ہو، یہ صرف معمولی فوجی ملازمون سے ہی وصول نہین ہوتا تھا، بلکہ ہندو افسر تک اس حکم سے باہر نہ تھے" (آریہ گزٹ)

لیکن معترض کی حیرت کا اصلی سبب علامہ شبلی مرحوم کا یہ خیال ہے کہ جزیہ صرف جنگی خدمت کا معاوضہ تھا، اور گو تاریخی واقعات سے انھون نے اس کی تائید بھی کر دی ہے لیکن جزیہ کی سیاسی

حیثیت پر اس کی نظر نہین گئی تھی، اسی لئے جزیہ کو فوجی خدمت کا معاوضہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہین،

"اس لحاظ سے کل مسلمان فوجی خدمت رکھتے تھے، اور ضرور تھا کہ وہ جزیہ سے اسی طرح بری رہین جس طرح نوشیروان عادل نے عموماً اہلِ فوج کو اس (جزیہ) سے بری رکھا تھا لیکن غیر مذہب والے جو اسلامی حکومت کے ماتحت تھے، اور جن کی حفاظت مسلمانون کو کرنی پڑتی تھی، ان کو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہ تھا، نہ وہ لوگ ایسی پرخطر خدمت کے لئے راضی ہو سکتے تھے، اس لئے ضرور تھا کہ وہ اپنی محافظت کیلئے کوئی معاوضہ دین، اسی معاوضہ کا نام جزیہ تھا (ص ۲۳۱، ۲۳۲)

لیکن اوپر سیاسی حیثیت سے مسلمانون کے جس اصول اور عمل پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فوجی خدمت اور مالی امداد بالکل دو جداگانہ چیزین تھین، مولانا نے یہ تو لکھا ہے کہ مسلمانون کو جزیہ سے مستثنیٰ ہونا چاہئے تھا، لیکن یہ نہین بتلایا ہے کہ ان سے زکوۃ کا مطالبہ ہوتا تھا، مسلمانون کا محصول جزیہ نہ تھا، بلکہ زکوۃ تھی، اور جب وہ فوجی خدمت کے صلہ مین زکوۃ سے مستثنیٰ نہین کئے گئے، تو غیر مسلم فوج مین رہ کر جزیہ سے کیون کر مستثنیٰ ہو سکتے تھے؟ پھر یہ بھی صحیح نہین ہے کہ غیر مسلمون سے فوجی خدمت لینے کا اسلام کو کوئی حق نہ تھا، ہر سلطنت کو اپنی رعایا سے فوجی خدمت لینے کا حق حاصل ہے، اور اسلامی سلطنت کو تو بدرجۂ اولیٰ یہ حق حاصل تھا، کیونکہ اولاً تو وہ مسلم اور غیر مسلم کی نادروا تفریق پسند نہین کرتی تھی، دوسرے زمین کا مالک اس نے عام طور پر غیر مسلمون ہی کو بنا رکھا تھا،

رہا یہ امر کہ ابتدا مین غیر مسلم فوج مین کیون شریک نہین کئے گئے؟ اس کا سبب یہ تھا کہ غیر مسلم مفتوح تھے، جو مسلمانون کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور اپنی قومی سلطنت کو دوبارہ واپس لانے کا خیال ان کے دماغون مین موجزن رہتا تھا، اس بنا پر آغازِ فتح مین سیاسی حیثیت سے ان کو فوج مین بھرتی کرنا قرین مصلحت نہ تھا، البتہ جب عہدِ نبوت سے لے کر خلافتِ فاروقی تک اُن کو مسلمانون سے

سابقہ پڑا، جس مین اسلام کی عادلانہ حکومت کا سکہ اُن کے دلون پر بیٹھ گیا، اور انھون نے خود دشمنانِ اسلام سے نبرد آزما ہونے کی خواہش ظاہر کی، تو سنہ ھ مین اُن کو اجازت دے دی گئی، اور معاشی نقطۂ نظر سے اُن کی اس فوجی خدمت کو جزیہ کا قائم مقام سمجھ لیا گیا، جو اُن کے ساتھ مزید رعایت تھی،

۲- تعین محصول کے سلسلہ مین "مساواتِ محصول" (Parity of tax) کا اصول اختیار نہین کیا گیا، جس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ سب کو سرکار سے یکسان آرام اور فائدہ پہنچتا ہے اس لئے سب لوگ برابر محصول دین، بلکہ جزیہ اشخاص کی مختلف قابلیتون اور حیثیتون کے مطابق مختلف نرخ سے مقرر ہوا، کیونکہ اصولِ "مساوات" سے غربا پر جس قدر ظلم ہو سکتا ہے، محتاج بیان نہین، "مزید برآن سیاسی لحاظ سے بھی یہ اصول ناقابلِ عمل ہے[۱]"

۳- وردِ محصول (Incidence of Taxation) کی بنا پر محصول کی دو قسمین قرار دی گئی ہین (۱) یہ کہ ٹیکس کا ادا کنندہ (Payer of tax) اور مورد (Subject Tax) ایک ہی شخص ہو، یعنی جو دوسرون پر منتقل نہ ہو سکے، (۲) یہ کہ جس کے ادا کنندے اور مورد مختلف اور متعدد لوگ ہون، یعنی جو ادا کنندہ سے گذر کر بہت سے لوگون پر منقسم ہو جائے، اصطلاحاً اول کو ٹیکس بلا واسطہ (Direct Tax) اور دوم کو ٹیکس بالواسطہ (Indirect. Tax) کہتے ہین[۲]،

جزیہ بلا واسطہ ٹیکس (Direct Tax) ہے جس سے عام "سیاسی بیداری" پیدا ہوتی ہے، کیونکہ ٹیکس بلا واسطہ، لگان، سود، اجرت، یا ملک وجائداد مین سے براہ راست وصریحاً اپنا حصہ نکالتا ہے، یہ ٹیکس "سیاسی تربیت" کا نہایت کارگر آلہ ہے، انسانی خاصہ ہے کہ جس کام مین کسی کا روپیہ لگتا ہے، اس سے

---

[۱] معاشیاتِ ہند ص ۲۶۲، مصنفہ پرمتھ ناتھ بنرجی، مترجمہ مولوی الیاس برنی [۲] اصولِ معاشیات ص ۳۰۰ مصنفہ مولوی الیاس برنی،

خواہ مخواہ تعلق اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ بعض انجمنوں میں تو علاوہ مالی امداد کے دلچسپی بڑھانے کی غرض سے بھی ممبروں سے چندہ طلب کیا جاتا ہے، جب لوگ جان بوجھ کر مصارف حکومت ادا کرتے ہیں، تو ان کو سیاسی معاملات سے خود بخود تعلق زیادہ محسوس ہونے لگتا ہے، اور اس کا نتیجہ عام سیاسی بیداری ہوتا ہے،

(اصول معاشیات ص ۳۰۹)

اور واقعات شاہد ہیں کہ جزیہ کے سبب سے ہمیشہ غیر مسلموں میں سیاسی بیداری قائم رہی ہے، گو کبھی کبھی اس کا ظہور نظاہرہ کی نامناسب شکل میں بھی ہوا ہے، جیساکہ سرکار نے "تاریخ اورنگ زیب" (ص ۱۰۲ ج ۳) میں اور علامہ شبلی مرحوم نے مقالات عالمگیر (ص ۴۲) میں دکھایا ہے،

جزیہ اور معاشیات | جزیہ کو معاشیات (Economics) سے بڑا گہرا تعلق ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (ص ۲۲۵ جلد ۲۶ طبع ۱۱) میں آدم اسمتھ (Adam Smith) کی کتاب "دولتِ اقوام" کے حوالہ سے ٹکس کے حسب ذیل قوانین بیان کئے گئے ہیں،

(۱) قانونِ مساوات: ہر مملکت کی رعایا کو چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنی اپنی قابلیت کے تناسب سے یعنی اس آمدنی کے تناسب سے جو انہیں مملکت کے زیر حفاظت اپنے اپنے طور پر حاصل ہوتی ہے، حکومت کے اخراجات میں شرکت ہوں،

(۲) قانونِ تیقن: جس ٹکس کا ادا کرنا ہر فرد پر لازمی ہو وہ بالکل باقاعدہ اور یقینی ہونا چاہئے، وقتِ ادائگی، طریقۂ ادائگی، مقدار ٹکس، یہ تمام امور نہ صرف ادا کرنے والے پر بلکہ دوسرے تمام اشخاص پر بھی واضح ہونے چاہئیں،

(۳) قانونِ سہولت: ٹکس ایسے وقت پر اور اس طریقہ سے عائد کیا جائے جو ادا کرنے والے کے حق میں زیادہ سے زیادہ سہولت کا باعث ہو،

(۴) قانونِ کفایت: ہر ٹکس اس طور پر تجویز کیا جائے کہ اس کی بدولت جس قدر رقم سرکاری

خزانہ مین داخل ہوتی ہے اس کے علاوہ حتی الوسع کم سے کم مزید رقم رعایا کی جیبون سے خارج ہو،....

ان چار کے علاوہ بعض مصنفین نے دو قانون اور بھی لکھے ہین،

(۵) قانون پیدا آوری: ٹکس بدرجۂ اولی پیدا آور (Productive) ہونا چاہئے یعنی ماحصل ٹکس کی مقدار بہت معقول ہونی چاہئے، کیونکہ ٹکس قائم کرنے کا منشا مصارف حکومت کے واسطے آمدنی پیدا کرنا ہے۔ اور جب ایسی آمدنی کی مقدار قلیل ہو، تو ظاہر ہے کہ ٹکس ناقص ہوگا، اور اس سے حصول آمدنی کی غرض بدرجۂ ادنی پوری ہوگی۔

(۶) قانون تغیر پذیری: ٹکس متعدد ذرائع پر مختلف شرحون سے اس طرح قائم کرنا چاہئے کہ حسب حالات اس کی مقدار ماحصل مین اضافہ و تخفیف ہو سکے،

یہ ۶ قانون ہوئے جن کا ٹکس قائم کرنے مین لحاظ رکھنا ضروری ہے، کیونکہ ان کی خلاف ورزی سے عام مرفہ الحالی اور معاشی ترقیون کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے،

جزیہ قائم کرتے وقت ان قوانین کو پیش نظر رکھا گیا تھا، یا نہین؟ اس کا جواب ذیل مین دیا جاتا ہے،

پہلا قانون معدلت یا عدل ہے اس کی تعریف مین یہ الفاظ "اپنی اپنی قابلیت کے تناسب" ہمیشہ سے معاشی علماء کے اختلاف کا آماجگاہ رہے ہین، یہ امر کہ محصول انصاف سے قائم کرنا چاہئے بالکل مسلم ہے لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ اور محصول کے تقرر مین کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں؟ اس کے متعلق علماء نے چند راستے اختیار کئے ہین، جو محصول بمعیار خدمات، محصول مساوی، محصول متناسب (Proportional tax) وغیرہ کی شکل مین موجود ہین،

لیکن ان سب سے بہتر طریقہ محصول متزاید یا تدریجی (Progressive tax) کا ہے جو آج کل ہر جگہ اختیار کیا جا رہا ہے، اس طریقہ کے مطابق یہ ضروری ہے کہ ٹکس لگانے مین تدریج سے کام لیا جائے یعنی

(الف) ٹکس مالی حالت کے فرق کے بموجب بشرح مختلف قائم ہو، امرا پر بشرح اعلیٰ، متوسطین پر
بشرح متوسط، اور غربا پر بشرح ادنیٰ، تاکہ تمام ٹکس ادا کرنے والے مساوی بار یا ایثار محسوس کریں، تشخیص
جزیہ میں امرا، متوسطین، اور غربا کے ۳ طبقے مالی حالت کے اختلاف کی بنا پر قرار دیئے گئے ہیں، اور ان
پر بشرح مختلف ۱۲، ۲۴، ۴۸ درہم سالانہ یا ۱، ۲، ۴ درہم ماہوار محصول لگایا گیا ہے،

(ب) شرح محصول مختلف ہونے کے باوجود ایک حد تک محدود ہو یعنی اس پر متواتر اضافہ نہ ہو سکے،
تاکہ اضافۂ آمدنی کسی حالت میں لوگوں کے لئے ضرررساں نہ ہو، اور اجتماعِ دولت، بلند حوصلگی،
اور کفایت شعاری کے راستہ میں نامناسب مزاحمتیں پیدا نہ ہوں، یہ بالکل بدیہی ہے کہ "طلائی انڈے
دینے والی مرغی کو ذبح کر ڈالنا کوئی عقلمندی کا کام نہیں"، تاہم موجودہ معاشیین محصول متزائد کے مسئلہ پر غور کرتے
وقت اس چیز کو بہت کم پیش نظر رکھتے ہیں، اور اس لئے آمدنی کی مقدار بڑھنے کی حالت میں وہ برابر
شرح محصول میں اضافہ کرتے جاتے ہیں، بخلاف اس کے اسلام نے دولت و افلاس کے لحاظ سے انسانی
طبیعتوں کے لئے جزیہ کی جو شرح مقرر کی، وہ اگرچہ بذاتِ خود مختلف ہے، تاہم ہر شرح محدود ہے،
یعنی بالفاظ دیگر ہر طبقہ کی آمدنی کے متعدد مدارج قرار دے کر ان کے لئے علٰحدہ علٰحدہ شرحیں قائم
نہیں کی ہیں، بلکہ تمام غربا کے لئے ایک شرح ہے، تمام متوسطین کے لئے ایک اور تمام امرا کے لئے
ایک، اس سے ہر طبقہ پر جزیہ کا یکساں الگ الگ بار پڑتا ہے اور کسی خاص طبقہ کو زیادہ استطاعت کی
وجہ سے جزیہ بارگراں نہیں معلوم ہوتا،

(ج) آمدنی جب تک ایک خاص مقدار تک نہ پہنچے، محصول کا مطالبہ نہ کیا جائے، چنانچہ جزیہ اس
شخص سے نہیں لیا جاتا، جو ۲۰۰ درہم سے کم کا مالک ہو، یا جس کی آمدنی خاندان کی پرورش کے لئے ناکافی
ہو، کیونکہ ایسا شخص محصول ادا کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا، چنانچہ زکوٰۃ کے لئے بھی کم سے کم دوسو درہم
کا مالک ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے،

دوسرا قانون **تیقن** ہے جس کو تعیین بھی کہتے ہین، اُس کے رو سے جزیہ کی شرح ہمیشہ معین رہی ہے، جزیہ ادا کرنے والے کو اپنی مالی حیثیت کے مطابق واجب الادا رقم کی صحیح مقدار کا علم ہوتا ہے جس کی بنا پر جبر یا دھوکے سے کوئی شخص سرکاری مطالبہ سے زیادہ وصول نہین کرسکتا، جزیہ کی شرح مین تغیر و تبدل نہین ہے، اس کی ادائگی کا وقت مقرر ہے، یعنی سال تمام پر وصول کیا جائے،[ا] اور ادائگی کا طریقہ بھی بتلایا گیا ہے یعنی جانور، سامان، اور پیشہ کی ہر چیز رقم جزیہ کے عوض پیش کی جاسکتی ہے، صرف مردار، سور، اور شراب پیش نہ کرنا چاہئے، اور اگر یہ چیزین آئین تو اہلِ پیشہ کے ذریعہ سے ان کو فروخت کرا کر اُن کی قیمت دفتر مین جمع کرنی چاہئے، کیونکہ اس مین اہلِ جزیہ کو سہولت ہوتی ہے،[ب]

تیسرا قانونِ **سہولت** ہے، جزیہ کے ذرائع اور اس کی وصولی کے اوقات جن کا دوسرے قانون مین ذکر ہوا، درحقیقت ایسے تھے کہ جزیہ دینے والون کا کوئی نقصان اور ہرج نہ ہوتا تھا، نہ ان کو کوئی دقت اور دشواری محسوس ہوتی تھی،

چوتھا قانونِ **کفایت** ہے، اس کے ۳ مفہوم ہین، پہلے مفہوم کے رو سے جو کچھ فراہمی جزیہ مین صرف ہوتا ہے، اس کی مقدار بمقابلہ محاصل جزیہ ادنیٰ سے ادنیٰ ہوتی ہے یعنی اس کے فراہم کرنے کے مصارف اصلی مطالبات سے کم اور بہت کم ہوتے ہین، دوسرے مفہوم کے رو سے جزیہ ادا کرنے والون کو مقدار جزیہ سے زیادہ دینا نہین پڑتا، کیونکہ وہ کاروبار مین بہت کم حارج ہوتا ہے، تیسرے مفہوم کے رو سے جزیہ افزونی دولت، اور اضافۂ مرفہ الحالی مین مانع اور مزاحم نہین ہے،

پانچوان قانونِ **پیداآوری** جزیہ کی رقم کی آمدنی نہایت معقول ہوتی ہے، اور اس سے مصارفِ حکومت کے واسطے آمدنی پیدا کرنے کا منشا حاصل ہوتا ہے، اور سلطنتون کو چھوڑ کر خود اورنگزیب کے زمانہ مین صرف گجرات سے جزیہ کی رقم جس قدر وصول ہوتی تھی، وہ سرجدونا تھ سرکار اور ہمارے معترض آرسطو دونون

[ا] مبسوط ص ۸۲ ج ۱۰ [ب] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۶۹،

کو کھٹکتی ہے،

چھٹا قانون تغیر پذیری ہے، ٹکس متعدد ذرائع پر مختلف شرحون سے اس طرح قائم کرنا چاہئے کہ حسب حالات اس کی مقدار ماحصل مین اضافہ و تخفیف ہو سکے، یہ نہین کہ مصارف حکومت کے واسطے خواہ رقم زیادہ درکار ہو، یا کم ہر حالت مین ماحصل ٹکس کی مقدار وہی ایک رہے، جو کبھی خرچ کے واسطے بھی ناکافی ہو، اور کبھی زائد بچ رہے، بہ الفاظ مختصر، ماحصل ٹکس جس حد تک کمی و بیشی تعداد رف کی متابعت کرے بہتر ہے، جزیہ مین، اس شکل کے علاوہ جب کسی شہر یا علاقہ سے کوئی خاص رقم طے ہو جائے، ہمیشہ اس قانون کا لحاظ رکھا جاتا ہے، وہ مختلف پیشون پر مختلف شرحون سے حسب حیثیت وصول کیا جاتا ہے، اس مین کمی و بیشی کا بھی اختیار ہے، چنانچہ تخفیف جزیہ کے بعض واقعات امام ابو یوسف اور یحییٰ بن آدم کی ہمنام تصنیفات (کتاب الخراج) سے اوپر نقل کئے گئے ہین، اور معافی جزیہ کی نسبت موانیذ کا مسئلہ بھی درج کیا گیا ہے،

بیانات بالا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ چونکہ جزیہ ان تمام قوانین و اصول کا پابند ہے، اس لئے معاشی حیثیت سے وہ نہایت عمدہ محصول ہے، کیونکہ وہ تمام محصول جو ان اصول کے پابند نہ ہون، یا کم پابند ہون معاشیین کے نزدیک ناقص ہوتے ہین، (باقی)

ضروری اعلان

سکہ کے اختلاف اور بعض دوسری دشواریون کی بنا پر فی الحال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان وی پی اور منی آڈر آ جا نہین سکتے، اس لئے کتابین بھی نہین آ جا سکتین، مغربی پاکستان مین شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور، دار المصنفین کے نمایندے ہین، اُن کے یہان ہماری تمام مطبوعات ملجائین گی جن لوگون کو ضرورت ہو اُن سے منگالین، اور جن اصحاب کے ذمہ معارف کا چندہ باقی ہے، مہربانی کرکے اُسے بھی شیخ صاحب کے پاس بھیج دین،

"منیجر"

ہاروت اور ماروت

بسلسلۂ سابق

از

مولانا ابو الجلال صاحب ندوی

ہاروت اور ماروت فرشتے نہین لیکن چونکہ اُن کی بابت خود قرآن مین ملکین کا لفظ وارد ہے اسلئے فرشتون ہی کے ساتھ اُن کا تذکرہ بھی ضروری ہے،

لفظ بابل کے ماتحت ہم نے وہ آیت نقل کی ہے جس مین ہاروت اور ماروت کا ذکر ہے، قرآن کے بیان کے مطابق یہ دونون بابل کے دو معلم تھے، جن سے بنو اسرائیل نے میان بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالنے کا ہنر سیکھا تھا، جس کے سیکھنے سکھانے کو خدا نے اُن نبی اسرائیل کے کافر ہونے کی دلیل قرار دیا ہے،

بعض وقت خود بولنے والے کسی لفظ کو اپنے عقیدہ اور تصور کے برخلاف مخاطب اور فریق بحث کے عقیدہ اور تصور کے مطابق بولتے ہین، لغات مین اس کی نظیرین بہت ہین، یہود حضرت عیسیٰؑ کو نہ مسیح مانتے تھے اور نہ رسول اللہ، مگر نزول قرآن کے ایام مین انھون نے یہ کہکر ناز کیا تھا کہ انا قتلنا المسیح عیسی بن مریم رسول اللہ بعینہٖ اسی طرح چونکہ یہود ہاروت اور ماروت کو الملکین کہتے تھے، اس لئے قرآن مین بھی بطریق طنز ان کو الملکین کہا گیا ہے،

ہاروت | بابل کے ذکر مین بتایا گیا ہے کہ یہان دو قومون کے آثار پائے جاتے ہین، ایک قوم کو نو سامی اور دوسری کو سمیری قوم کہا جاتا ہے، اس دوسری قوم کا اہم ترین مرکزی شہر اُور تھا، بعد مین یہ لفظ شہر کا

مرادف بن گیا، اصل میں اس لفظ کا ترجمہ ہے روشنی، یہ قوم روشن اجرام کی پجاری تھی اور یہ شہر ایک روشن جرم فلک کا معبد ہونے کی وجہ سے اُور کہلایا، اس لفظ کو سمیریون کے یہان اس قدر اہمیت حاصل تھی، کہ ان کے اکثر بادشاہون کے نامون مین یہ لفظ پایا جاتا ہے، مثلاً

۱- اُورکاجنا ۵۰۰۰ھ (۲) اُورلاما ۴۰۰۰ ھ (۳) اُورننیا ۴۲۹۰ ھ (۴) اُورمن حرسو ۲۷۰۰ ھ (۵) اورنو اکدو ۳۵۰۰ ھ، یہ پانچون سمیری بادشاہ تھے،

سمیریون کے بے نام ونشان ہو جانے کے بعد بھی بعض غیر سمیریون کے نامون مین اُور کا لفظ پایا جاتا ہے، مثلاً کنعان کے ایک اشوری فرمانروا کا نام جو ۳۰۰۰ ق م مین گذرا ہے اور ملک تھا، مصری بولی مین تا کے معنی ہین زمین، چنانچہ پونت کو تانتر کہتے تھے، اور جو بادشاہ بالائی اور زیرین دونون مصرون کا بادشاہ ہوتا تھا، اس کو نب تا وی کہتے، اور تا کے معنی ہوئے ارض نور قدیم بابلی مین تا اور تو کے معنی تھے نسل اور قوم اس لئے اور تا کے معنی اُور کی قوم ہین، اسی لفظ کا دوسرا تلفظ آرتو ہے، جس پہاڑ پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹکی تھی، اس کا تورانی نام ارارا ط ہے یہ اور ارتو کی بدلی ہوئی شکل ہے، یہ آرمینیہ کا کلدانی اور اشوری نام ہے، اور ارتو کے معنی ہین، آرتو کی بستی، بابل کے سمیری اصل مین جہان سے بھی اس دیار مین آئے ہون، مگر آرمینیہ ہوتے ہوئے آئے تھے، اسی اور تا اور آرتو کا نام عربی لب ولہجہ مین ہاروت بنا، قرآن مین جس ہاروت کا ذکر ہے، اگر وہ نسلی حیثیت سے نہین تو مذہبی اور ثقافتی حیثیت سے اسی قوم کا ایک فرد تھا،

ماروت | اشوری بادشاہ اشور بنی پال (۶۶۸ تا ۶۲۶ ق م) کے زمانہ مین عیلام مین ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا، جس کا نام تھا اُورتاکی (حاکم ہاروت) یہ پہلے اشور بنی پال کا حلیف تھا، بعد مین کسی وجہ سے اس کا مخالف ہو گیا، اور اُس نے بابل پر جو ان دونون شاہان اشور کے ممالک مقبوضہ مین داخل تھا، حملہ کر دیا، لیکن اشوریون نے شکست کھائی، اُورتاکی کے مرنے کے بعد عیلام کا بادشاہ تی اُمان ہوا جس کی

بابت اشوری تحریر بتاتی ہے، کہ وہ اپنے پیش رو دو بادشاہوں کی طرح "مثیل شیطان" تھا، تی امان کے بعد عیلام کا حاکم اُورتا کی کا فرزند تم مار تو ہوا، یہ اشوریوں کا وفادار حلیف تھا، اس بادشاہ کا نام دو لفظوں کا مجموعہ ہے، پہلا لفظ تم ہے، جسے عربی لب ولہجہ میں تام پڑھ سکتے ہیں، بائبل کے عبرانی نسخوں میں یہ لفظ عموماً مرد کامل کے معنی میں آیا ہے، اور ہمیشہ نیکی اور راستی میں باکمال کو تم کہتے تھے، "نوح اپنے قرن میں صدیق (راستباز) اور تم (کامل) تھا، (تکوین ۶: ۹) اس کے نام کا دوسرا جزء مارتو، عربی لب ولہجہ میں ماروت بنا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ قرآن میں اسی ماروت کا ذکر ہے، جو اپنے خیال میں تم یعنی مرد کامل تھا، اور جس کا باپ اُورتا کی (حاکم ہاروت) اشوریوں کی نظر میں مثیل شیطان تھا بلکہ مارتو کے لغوی معنی ہیں "انسان کی نسل" سفر تکوین میں وارد ہے، "کہ نفلیم جن کو گبور تم بھی کہا جاتا ہے بنی الوہیم اور بنات آدم کی اولاد تھے، (تکوین ۶: ۱ تا ۴) اس سے ظاہر ہے کہ ایک زمانہ میں دو قومیں ایک ساتھ رہتی تھیں ایک کو خداؤں کی اولاد ہونے کا ادعا تھا، اور دوسری قوم کو یہ ادعا نہیں تھا، بلکہ وہ خود کو معمولی آدم زاد کہتی تھی، اسی قوم کا نام مارتو تھا، اطراف بابل میں جو بنو سام تھے، وہ خود کو امورو کہتے تھے، یہ نام عربی لفظ امرءٌ (انسان) کی قدیم شکل ہے، اسی قوم کا ذکر توراۃ میں اموری قوم کے نام سے آیا ہے بابل کے سامری بولنے والے اس قوم کو مارتو کہتے تھے، یہی نام عبرانی لب ولہجہ میں مروت اور عربی لب ولہجہ میں ماروت ہو گیا، فلسطین میں بھی چونکہ ایک وقت مارتو، ماروت، مروت اور امورو کہلانے والی قوم بستی تھی، اس لئے ایک زمانہ میں اطراف بیت المقدس کو بھی مروت کہتے تھے، چنانچہ صحیفۂ میکاہ میں ہے،

"مروت کی رہنے والی اپنے اموال کے لئے کڑھتی ہے، کیونکہ خداوند کی طرف سے بلا نازل ہوئی جو یروشلم کے پھاٹک تک پہنچی، (میکہ ۱: ۱۲)

قرآن کریم میں جس شخص کا ماروت کے نام سے ذکر ہے، وہ اسی مارتو کہلانے والی قوم کا ایک فرد تھا،

افسانۂ ہاروت و ماروت قرآن میں ہاروت اور ماروت کو طنزاً فرشتہ کہا گیا ہے لیکن مفسرین نے بہت سی ایسی روایتیں نقل کی ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ یہ دونوں واقعی فرشتے تھے، فرشتوں نے بنی آدم کی خطائیں دیکھ کر خدا سے کہا کہ ہم ہوتے تو ہم سے یہ گناہ نہ ہوتے، خدا نے کہا اچھا اپنے درمیان سے دو کو امتحان کے لئے چنو، چنانچہ ہاروت اور ماروت چنے گئے، اور انسان بنکر زمین میں اترے اور ایک خوبصورت عورت پر ریجھ گئے، اس عورت کو انھوں نے اسم اعظم سکھانے کے بعد اس کے کہنے سے شراب پی، بت پوجا، اور بہت سے گناہ کئے، پھر اس نے ان کو مسخ کی اجازت دی، وہ عورت اس کے بعد اسم اعظم کے زور سے آسمان پر اڑ گئی، خدا نے اسے ستارہ زہرہ کی صورت میں مسخ کر دیا، اور ان فرشتوں سے کہا گیا، کہ عذاب دنیا اور عذاب آخرت میں سے ایک کو پسند کریں دونوں نے عذاب دنیا کو پسند کیا، چنانچہ وہ دونوں ایک تاریک کنوئیں میں قیامت تک کے لئے لٹکا دیئے گئے، یہ ہے متعدد روایتوں کا مجموعی مفہوم یہ تمام روایتیں سیوطی نے درمنثور میں نقل کی ہیں، ہم نے سب کا ملخص لے لیا ہے، ان باتوں میں ان روایتوں میں اختلاف ہے، ایک روایت میں اس واقعہ کا زمانہ حضرت ادریس علیہ السلام کا عہد بتایا گیا ہے، حضرت ادریسؑ طوفان نوح کے بعد پیغمبر مبعوث ہوئے اور وہ کشتی نوح کے سواروں میں سے ایک تھے، لیکن متقدمین نے ان کو حضرت نوحؑ کے مورث حنوک سے تطبیق دی ہے، دوسری روایت میں ہے کہ ان فرشتوں کے پاس خدا کا یہ پیغام کہ دنیا یا آخرت کے عذابوں میں سے ایک کو پسند کر لو حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے بھجوایا تھا،

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ جو عورت زہرہ بن گئی تھی، وہ ایک روایت میں ایرانی عورت تھی، اور ایک میں اسرائیلی،

قرآن کریم میں ہاروت اور ماروت کا یہ قصہ نہیں ہے، اور نہ اسے بطور تفسیر ذکر کرنے کی آیت کا کوئی فقرہ اجازت دیتا ہے، البتہ چونکہ ہاروت اور ماروت کو طنزاً خدا نے دو فرشتے کہا ہے، اس لئے

طرز کو نہ سمجھنے والے روایت کے اس حصہ کو قرآن کی تفسیر مین اس طرح شامل کر دیتے ہین کہ تھے تو وہ دونون فرشتے ہی، مگر بعد مین کافر ہوگئے کیونکہ انھون نے ناز کیا تھا، کہ اگر بنی آدم کی جگہ ہم ہوتے، تو ہم سے یہ خطائین نہ ہوتین، اس لئے امتحان کی غرض سے خدا نے اُن کو انسان بنا کر زمین مین اُتارا، اور وہ امتحان مین ناکام رہے، باقی قصہ کا قرآن کے کسی فقرہ سے ذرہ برابر واسطہ نہین ہے،

روایات کی نوعیت اس افسانہ کی بدولت قرآن پاک پر اعتراضات کئے جاتے ہین، اس لئے اس کی پوری حقیقت کھولنا ہمارا فرض ہے، لیکن قصہ کے سرچشمون پر بحث سے پہلے روایات کی نوعیت دکھا دینا ضروری ہے،

صحاح ستہ مین ہاروت اور ماروت کا یہ قصہ نہین ہے، مستدرک مین حاکم نے اس قصہ کی حضرت علیؓ سے تخریج کی ہے، اور حضرت ابن عباسؓ سے صرف اتنے مضمون کی تخریج کی ہے، "کہ زہرہ پہلے ایک عورت تھی، جس کو اس کی قوم والے بیدخت کہتے تھے" گو حاکم نے ان دونون روایتون کی اسناد کو شیخین کی شرط پر صحیح بتایا ہے، لیکن شیخین کا اس کو روایت نہ کرنا ہی یہ بتاتا ہے کہ اس کی سند مین ضرور کچھ نہ کچھ نقص ہے،

جہان تک حضرت علیؓ کی روایت کا تعلق ہے، حاکم کی تصحیح قابل رد ہے، عمیر بن سعید نخعی کی بابت جن سے حاکم نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے، ابن حزم نے کتاب الملل والنحل مین لکھا ہے، کہ

"وہ مجہول ہے حضرت علیؓ سے اُس نے دو روایتین نقل کی ہین، ان دو کے علاوہ اس کی کسی اور روایت کا ہم کو علم نہین ہے، ایک تو شارب خمر کی حد سے متعلق ہے، یعنی وہ جس کی امام بخاری نے تخریج کی ہے، اور ایک ہاروت و ماروت کے قصہ مین اور یہ دونون جھوٹی روایتین ہین"

تہذیب التہذیب مین حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ افرط ابومحمد بن حزم یعنی محمد بن حزم نے افراط و مبالغہ سے کام لیا ہے، مطلب یہ ہے کہ انکی دونون روایتون کو جھوٹی قرار دینا حد سے تجاوز ہے، امام بخاری والی روایت قطعاً جھوٹی نہین ہو سکتی، رہی قصۂ ہاروت و ماروت والی روایت تو اس کی بابت اتنا کہدینا کافی ہے، الذ عند ھو حدیث واحدٌ عن علی فی حدّ شارب الخمر"

یعنی ائمۂ حدیث کی رائے مین حضرت علیؓ سے انھون نے صرف ایک ہی حدیث شارب خمر کے بارے مین روایت کی ہے،

حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کہ "زہرہ پہلے ایک عورت تھی" کی روایت وہم سے خالی نہین ہے ممکن ہے کہ انھون نے عربون کے قدیم تصور کی روایت کی ہو، لیکن اسے ان کا قول سمجھ لیا گیا ہو، حضرت ابن عباسؓ کے راوی ابو عثمان النھدی آنحضرت صلعم کے زمانہ حیات مین مسلمان ہوئے، مگر زیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے، اُن کے راوی سلیمان بن بلال التیمی کی ثقاہت پر شبہہ کرنا روا نہین ہے، مگر ان کی اس قسم کی بعض کمزوریون کی بنا پر اُن کی روایات کے بارہ مین عثمان بن شیبہ کا خیال تھا کہ اُن سے روایت کرنے مین حرج نہین ہے، مگر اس پر اعتماد نہین کیا جا سکتا،

سیوطی نے دُرِ منثور مین کئی کتابون کے حوالہ سے کئی بزرگون سے اس افسانہ کو نقل کیا ہے اور اکثر روایتین صحابی اور تابعی کے قول پر منتہی ہوتی ہین، ایام جاہلیت مین یہ قصہ مشہور تھا، صحابۂ کرام کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ مشہور ماجرا سنانے کے بعد اس کے متعلق قرآن مجید کی آیتین پڑھ دیتے تھے، اس طرح قرآن کی آیت مشہور عوام قصہ کی اصلاح کر دیتی تھی، ورسننے والے قصہ کو قرآن کی تفسیر نہین، بلکہ قرآن کی آیت کو قصہ کے باطل حصہ کی تردید اور سچے حصہ کی تصدیق سمجھتے تھے، اس لئے اگر صحیح سند سے کسی صحابی تک کسی ایسے قصہ کی سند پہنچتی ہے جس کا قرآن سے رابطہ ہونے کے باوجود اس مین قرآن سے زائد ناقابل یقین باتین ہین، تو ہم کو چاہئے کہ روایت کو مسترد کرنے کے بجائے مضمون قرآن کو قصہ کی اصلاح قرار دین، لیکن دشواری یہ ہے کہ بعض روایات مین ایسے الفاظ بھی ہین، جو اس کہانی کے بعض اجزار کو آنحضرت صلعم کی زبان مبارک پر بھی رکھ دیتے ہین، ایسی روائتین یقینی طور پر قابل تسلیم نہین ہین، حضرت علیؓ کی طرف منسوب روایت کو جسے حاکم نے صحیح بتایا ہے، ابن حزم نے جھوٹی کہا ہے، اور محدثین اُسے حضرت علیؓ کا قول ہی نہین مانتے، وہ اگر درست بھی مان لیجائے

تو چونکہ حضرت علی پر منتہی ہوتی ہے، اور عام عربی تصور کے مطابق ہے، اس لئے کوئی ہرج نہین، مگر دُرِ منثور مین خطیب وغیرہ کے حوالہ سے سیوطی نے نافع کا قول نقل کیا ہے، کہ ایک سفر مین انکا اور حضرت عبد اللہ بن عمر کا ساتھ ہوا اتنے مین سرخ تارا طلوع ہوا اسے دیکھ کر ابن عباس نے کہا "لا مرحبا بہا ولا اھلا" مین نے کہا سبحان اللہ نجم سحر سامع مطیع ہے، حضرت عبد اللہ بن عمر نے فرمایا ما قلت لک الا ما سمعت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

یہ فرمانے کے بعد ہاروت اور ماروت کا قصہ نقل کیا ہے لیکن ابن جریر نے عبد اللہ بن عمر عن کعب الاحبار سے اس قصہ کی تخریج کی ہے، اور یہی واقعہ ہے اس قصہ کی روایت منتہی کسی شخص تک بھی منتہی کرین لیکن ان تمام روایتون کا سرچشمہ یقیناً کعب احبار یا کسی دوسرے عالم اہل کتاب کا قول ہوگا، قرآن مجید کی آیت کو ہاروت وماروت اور زہرہ کی کہانی سے کوئی واسطہ نہین ہے، البتہ قرآن مین اُن کی بابت ظاہراً دو فرشتون کا لفظ ہے، مگر وہ واقعی فرشتے نہ تھے، بلکہ ایک ایسے ہنر کے معلم تھے جس کے سیکھنے سکھانے کو خدا نے مکفرین سلیمان علیہ السلام کے کفر کی دلیل قرار دیا ہے، اور بتایا ہے کہ خود اُن کو بھی اپنی بابت فتنہ اور اپنے ہنر کی بابت کفر ہونے کا یقین تھا، چنانچہ فرمایا کہ یہ مکفرین سلیمان،

یعلّمون الناس السحر وما انزل	آدمیون کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے
علی الملکین ببابل ھاروت وماروت	اور اس کی بھی جو کہ ان دونون فرشتون
وما یعلّمان من احد حتی یقولا	نازل کیا گیا تھا، بابل مین جن کا نام ہاروت
انما نحن فتنۃ فلا تکفر فیتعلمون	وماروت تھا، اور وہ دونون کسی کو
منھما ما یفرّقون بہ بین المرء و	نہ بتلاتے، جب تک یہ نہ کہدیتے کہ ہمارا
زوجہ وما ھم بضارین من	وجود بھی ایک امتحان ہے اسو تم کہین

أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا
يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا
لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ
مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا
بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ

کا فر مت بنجائیو، سو لوگ ان دونون
سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے، جس کے
ذریعہ سے کسی مرد اور اس کی بیوی مین
تفرقہ پیدا کر دیتے تھے، اور یہ لوگ اس
کے ذریعہ سے کسی کو بھی ضرر نہین پہنچا سکتے
مگر خدا ہی کے حکم سے اور ایسی چیزین سیکھ
لیتے ہین، جو ان کو ضرر رسان ہین اور
ان کو نافع نہین ہین، اور ضرور یہ بھی
اتنا جانتے ہین، کہ جو شخص اس کو اختیار
کرے، ایسے شخص کا آخرت مین کوئی
حصہ نہین، اور بے شک بری ہے وہ چیز
جس مین وہ لوگ اپنی جان دے ۴
رہے ہین، کاش ان کو سمجھ ہوتی

قصہ کے سرچشمے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی طرف منسوب ایک روایت سے ظاہر ہے کہ ہاروت اور ماروت کا افسانہ مسلمانون مین کعب احبار کے ذریعہ آیا، حضرت کعب احبار یمنی اور مذہباً یہودی تھے، ان کی طرف منسوب اقوال سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ نصرانی لٹریچر سے بھی واقف اور کسی حد تک متاثر تھے، موجودہ دور کے نصرانی علماء اب تو ہاروت اور ماروت کے قرآن مین مذکور ہونے پر معترض ہین، لیکن اس کے ناپسندیدہ عناصر جن کو تفسیر قرآن سمجھ کر اعتراض کیا جاتا ہے، خود نصرانی اور یہودی لٹریچر سے آئے؛

مسلمانون کا فرشتون کی بابت یہ عقیدہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام کی نافرمانی نہین کر سکتے، اور

وہ وہی کرتے ہیں جو اُن کو خداوند عالم کی طرف سے فرمایا جاتا ہے" اس عقیدہ کو اہلِ علم کے مباحث نے ایجاد نہیں کیا، بلکہ قرآن مجید میں فرشتوں کی بابت صریحاً یہ ارشاد ہے، قدیم نصرانیوں کے خیال میں ایسے فرشتے بھی ہیں جنھوں نے گناہ کیا، اپنی اصلی حالت پر نہیں رہے، بلکہ اپنے مقام کو چھوڑ دیا (یہوداؔ کا خط درس ۶ پطرس کا دوسرا خط ۲:۴) چونکہ قرآن میں ایسی چیز کے دو معلّموں کو خدا نے طنزاً دو فرشتے کہا ہے جس کا سیکھنا سکھانا کفر تھا۔ اسی لئے حضرت کعب احبارؓ نے ہاروت اور ماروت کو انھی فرشتے میں سے خیال کر لیا جن کا ذکر یہوداہ اور پطرس کے مقدس خطوں میں ہے،

نصرانیوں کا یہ تصور اُن کی اپنی ایجاد نہ تھا، بلکہ یہودیوں کے تصور میں فرشتے دو قسم کے تھے، نیک اور بد، علاوہ بریں ہر ملک کا حامی اور نگران ایک ایک فرشتہ کو مانا جاتا تھا، سفر دانیال میں ہے کہ حضرت جبریل نے ان کو خبر دی کہ

> "فارس کی مملکت کا سردار ۲۱ دن تک میرے مقابلہ میں ڈٹا رہا، اور دیکھ میکائیل جو سرداروں میں بڑا ہے میری مدد کو پہنچا، (۱۰:۳) اور اب دیکھ میں فارس کے سردار سے لڑنے کو پھر جاؤنگا تب یونان کا سردار آئے گا، (دانیال ۱۰:۳)

ان آیتوں سے سمجھا گیا کہ جس طرح فارس اور ایران کے جدا جدا غیبی سردار تھے، جو میکائیل اور جبریل کے حریف تھے، اسی طرح ہر ملک کا حامی اور مددگار خدا کی طرف سے ایک فرشتہ مقرر ہے، مصر کے حامی اور مددگار فرشتہ کا نام عزی تھا، چنانچہ ایک مدراش کی روایت ہے کہ جب بنو اسرائیل مصر سے نکلنے لگے،

> "مصر کے موکل عزی نے تخت ازل کے سامنے عرض کیا جس قوم کو تو مصر سے نکال رہا ہے اس پر میرا حق ہے،

مگر اسرائیل کے موکل میکائیل نے سامنے آکر عزی کے تمام دلائل خاک میں ملا دئیے[1]، عزی نے

---

[1] My The onlegund of Ancient Israel ص ۷۸ جلد اص Midrach Ab-Kie gonted by yalkal 241

یہ بھی کہا تھا کہ "تونے حضرت ابراہیم سے فرمایا تھا، کہ تیری نسل ۴۰۰ برس مصر کی غلامی کرے گی، ان لوگون نے میری قوم کی صرف ۸۶ برس غلامی کی ہے، اس لئے ابھی ۳۱۴ برس اور میرے لوگون کو ان سے خدمت لینے کا حق ہے، لیکن میکائیل نے بحث کرکے قائل کر دیا، کہ یہ مدت صرف مصر مین قیام کے لئے مقرر تھی،[۵۱]

عزی یعنی حمایت مصر پر مامور فرشتہ کے متعلق یہود کے تصورات ایسے تھے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی بولی مین، یہ اہل مصر کے دیوتا آمن رع کا نام تھا، اکثر وہ فراعنہ جن کا تاریخ بنی اسرائیل سے رابطہ ہے خود کو آمن رع کی نسل باور کرتے تھے،

عزی کے ایک ساتھی فرشتے کا نام عزازیل تھا، جو کہ مسلمانون کے لٹریچر مین ابلیس کا ایک نام ہی،

تکبر عزازیل را خوار کرد — بزندان لعنت گرفتار کرد

سفر احبار کے مطابق نعوذ باللہ خود خدا نے اس کے لئے بکرے چھوڑنے کا حکم دیا تھا، یہودی افسانون کے مطابق یہ دونون فرشتے تھے جو آسمان سے زمین پر اتارے گئے تھے، ان دونون نے بنی آدم کو ایسے جادو کی تعلیم دی کہ اس کے زور سے انھون نے ایام انوش مین سورج اور چاند تک کو گرلیا تھا،[۵۲] ہاروت و ماروت کو عربی روایتین سحر اور جادو کا معلم بتاتی ہین، قرآن مجید کی آیت:

"یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ"

سے ظاہر ہے کہ سحر اور چیز ہے، اور جس چیز کی ہاروت اور ماروت تعلیم دیتے تھے، وہ اور چیز ہے، کیونکہ عربی قاعدہ سے معطوف کو معطوف علیہ کا غیر سمجھا جاتا ہے جن عربی روایات مین ہاروت اور ماروت کو معلمین سحر بتایا گیا ہی، وہ عزی اور عزازیل کو قرآن کے ہاروت اور ماروت سے تطبیق دینے کا نتیجہ ہین،

یہودی تصور مین گھڑے ہوئے فرشتے صرف دو ہی عزی اور اسرائیل نہین تھے، بلکہ اور بھی کئی ایک تھے، سفر تکوین مین نفلم کی بابت جو حضرت نوح کے زمانہ مین دنیا کے اندر آباد تھے، یہ بتایا گیا ہے کہ وہ بنات آدم اور بنوالوہیم کی اولاد تھے، بنوالوہیم (ہریجن یا بنا ئ خدا) کے جنے ہوئے) جیسے کسی قدیم نام کا ترجمہ ہے،

---

[۵۱] حوالہ مذکورہ جلد ۲ ص ۲۸۶، [۵۲] دی لیجنڈ آف جیوز مولفہ لوئی گنزبرگ جلد ا ص ۱۲۵ بحوالہ متعدد کتب یہود۔

خود کو "ابناء اللہ" کہنے والی کسی قوم کا اس نام سے ذکر ہے، یہودی روایات نے ان بنی الوہیم کو ان فرشتون مین شمار کیا ہی جنھون نے گناہ کر کے اپنے مقام کو چھوڑ دیا، اور اپنی قدیم حالت مین نہ رہے، ان مین چند کے نام یہ ہین:

"برق ایل، کوکب ایل، ارض ایل، شمس ایل، شہر آیل"

اُن کے رئیس اعظم کا نام شمخزی تھا، یہودی کہانی بولتی ہے، کہ یارد کے زمانہ مین برق ایل وغیرہ فرشتون نے جو زمین پر اُتارے گئے تھے، نبات آدم کو خوبصورت دیکھ کر کہا،

"ہم اپنے لئے صرف نبات آدم سے بیبیان چنین گے، اور ان سے اولاد پیدا کرین گے"

چنانچہ باہمی مشورہ سے انھون نے اپنے اس فیصلہ پر عمل کیا۔[۱]

اس افسانہ کے اندر ہاروت اور ماروت کے ایک عورت سے ملوث ہونے کا ذکر ہے، اس کی حقیقت یہی ہے، کہ قرآنی طرز کو نہ سمجھ کر نبات آدم سے ناجائز تعلقات پیدا کرنیوالے خطاکار عزی اور عزازیل کو ہاروت و ماروت سے تطبیق دی گئی،

ہاروت اور ماروت کا زمانہ ہماری روایتون نے حضرت ادریس کا زمانہ بتایا ہے، عام طور پر حضرت ادریس کو جناب حنوک سے تطبیق دی جاتی ہے، جو حضرت نوح کے مورثون مین سے تھے، یہودی افسانہ بتاتا ہے کہ جب ان گرے ہوئے فرشتون کی شرارتین حد سے گذر گئین، تو خدا نے حضرت حنوک کو ان کی تنبیہ پر مامور کیا، انھون نے عزازیل وغیرہ تمام گرے ہوئے فرشتون کو خدا کا حکم سنا دیا، جسے سُن کر وہ سہم گئے، اور حضرت حنوک کی معرفت خدا کے پاس درخواست رحم بھیجی، لیکن خدا نے جواب مین کہلوایا، کہ بنی آدم کی شفاعت تم کو کرنی چاہئے تھی، نہ کہ خود تم نے ایک ابن آدم کو اپنا شفیع بنایا، اور اُن کی درخواست مسترد کر دی اور اُن کے جرائم گنوا کر یہ فیصلہ کہلا بھیجا، کہ تمھارے لئے اب آرام اور چین نہین ہے"[۲]

انہی کوکب ایل، اور شہر ایل جیسے فرشتون کی بابت پطرس کا بیان ہے کہ خدا نے ان کو "نہین چھوڑا"

---

[۱] دی لیجنڈ آف جیوز ج اول ص ۱۲۶ [۲] ایضاً،

بلکہ تاریکی کی زنجیروں میں جکڑ کر جہنم کے حوالہ کیا، تاکہ عدالت کے دن تک اُن کی نگہبانی ہو، (۲ پطرس ۲ : ۴) جناب یہودا فرماتے ہیں، کہ اُن کو خدا نے ابدی زنجیروں سے جکڑ کر تاریکی میں روز عظیم کی عدالت تک رکھا ہے" (یہوداہ ۱ : ۶) یہ ہیں بھٹکنے والے ستارے جن کے لئے تاریکی کی سیاہی ہمیشہ کے لئے دھری ہے۔ (یہوداہ ۱ : ۱۳) عربی روایت نے ہاروت اور ماروت کو چاہِ بابل کی تاریکی میں قید کیا ہے۔ یہ کہانی کا ایک دوسرا رنگ تھا، یا قرآن کے ہاروت و ماروت کو جن سے ۵۸۶ اور ۵۳۸ ق م کے درمیان بنی اسرائیل بابلی فنون وعلوم سیکھے تھے، ان فرشتوں سے تطبیق دینے کی بدولت اُن کے محبس کو جہنم کے بجائے ارض بابل میں اُتار دیا گیا،

وہ عورت جس سے ہاروت اور ماروت ملوث ہوئے تھے، اس کو ستارہ زہرہ کی صورت میں مسخ ہو جانے کے واقعہ کا اصل ماجرا یہ ہے کہ اہل بابل کے ایک دیوتا کا نام دوموزی تھا جس کا ذکر بائبل میں تموز کے نام سے آیا ہے جس کے لئے عورتیں نوحہ کیا کرتی تھیں، اس کو دیوی عشتر کا جسے یمن میں عثتر اور فلسطین میں عشتار کہا جاتا تھا، اہل بابل کی دیو مالا میں شوہر بتایا گیا تھا، بابلی اور آشوری روایت یہ تھی، کہ دوموزی مر گیا، اور اسکی روح دیوی الالات کے ملک ارالو (بے نور) میں قید کر دی گئی، اس کے بعد عشتار نے ازدوبار (گلگامش) کو اپنا شوہر بنانا چاہا۔ مگر اس نے اُس کی درخواست قبول نہ کی، اس لئے وہ الالات کے بے نور ملک میں جا کر دوموزی کو دوبارہ زندہ کر لائی، یہ ہے افسانہ ازدوبار کا ملخص،

تموز اور عشتار دونوں دراصل آسمانی اجرام کے نام ہیں، جن کو پوجا جاتا تھا لیکن انسانوں کے بھی یہ نام ہوتے تھے، ان ناموں کے ایک انسانی جوڑے کو ان ناموں کے دیوتاؤں کا اوتار بھی مانا جاتا تھا، یہی خیال بعد میں اس شکل میں بدل گیا، کہ عشتار نام ایک عورت جس کا عربی نام زہرہ ہے، اپنے شوہر تموز سے سیکھے ہوئے جادو یا عربی روایت کے مطابق اسم اعظم کے زور سے زہرہ بن گئی۔

قرآنی آیت کی تفسیر مین ان تفصیلات کے تذکرہ کی ضرورت نہین تھی لیکن چونکہ کتب تفسیر مین یہ افسانہ مذکور ہے، اور اس کی بدولت قرآن پر اعتراضات کئے جاتے ہین اس لئے ہم کو اس قدر تفصیل سے کام لینا پڑا،

قرآن مین یقیناً ہاروت اور ماروت کو طنزاً دو فرشتے کہا گیا ہے، لیکن یہ دونون یہودی لٹریچر کے گھڑے ہوئے فرشتون مین سے نہ تھے، کیونکہ اُن کے اسماء مین اُن کے نام نہین ملتے، یہ دونون درحقیقت تاریخی اشخاص اور بابلی استادون مین سے دو استاد تھے جن کو ان کے ماننے والے حسن اعتقاد کی بنا پر فرشتہ کہتے تھے، قرآن نے طنزاً اُن کو فرشتے کہا، اُن کے معتقدین بھی اُن کو حقیقی معنون مین فرشتے نہین کہتے تھے بلکہ اپنے گمان کے مطابق اُن کے حسن سیرت اور تقدس کے سبب سے ان کو تشبیہاً اسی طرح فرشتے کہتے تھے، جس طرح زنانِ مصر نے حضرت یوسف کی بابت کیا تھا اِنَّ ھٰذا الا ملکٌ کریم،

الدرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ

کا

ایک نادر نسخہ

از

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی صدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم مئو

گذشتہ مہینہ مین، مدرسہ مفتاح العلوم (جامع مسجد شاہی، مئو ضلع اعظم گڈھ) کے کتب خانہ مین حافظ ابن حجر عسقلانی کی تلخیص نصب الرایہ مسمی بالدرایہ کا ایک نادر و اہم نسخہ داخل ہوا ہے، یہ اس کتاب کا نصف ثانی ہے، جو کتاب النکاح سے لے کر آخر تک کے تمام ابواب پر مشتمل ہے، ہمارے علم مین یہ نسخہ اپنی گوناگون خصوصیات کے اعتبار سے انفرادی شان رکھتا ہے، سطورِ ذیل مین اس نسخہ کا تعارف کرایا جاتا ہے، اس سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ممکن ہو کوئی صاحب علم اس کے نصفِ اول کا سراغ لگا سکین، اور اصحاب علم کے شکر کے مستحق ہون،

نسخہ زیر نظر تقریباً ۲۰×۳۰ کے ۱۹۱ اوراق پر مشتمل ہے، ہر صفحہ مین اکیس سطرین ہین، خط نہایت پاکیزہ ہے، کاغذ بہت دبیز اور اتنا پائدار و بہتر ہے، کہ تقریباً ساڑھے پانچسو برس گذرنے پر بھی بوسیدگی و کہنگی کا کوئی اثر اس مین نہین ہے، ابواب کے عنوانات، ہر حدیث کی ابتدا مین لفظِ حدیث یا قولہ اور ایک حدیث کے دوسرے حوالہ یا اس کے دوسرے طریق کے بیان کے لئے لفظ اخرجہ یا ورواہ اور لہ طریق آخر وغیرہ شرح روشنائی سے لکھے ہوئے ہین،

اس نسخہ کا سنہ کتابت ۸۵۵ھ ہے، اس اعتبار سے خود مصنف کی زندگی میں اور تصنیف کے صرف تین سال بعد لکھا گیا ہے، اس لئے کہ حافظ ابن حجر کی وفات ۸۵۲ھ میں ہوئی ہے، اور درایہ کا سالِ تصنیف ۸۲۷ھ ہے،

اس نسخہ کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ابوالفتح محمد بن احمد خطیب طوخی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، یہ بزرگ نویں صدی ہجری کے مشہور عالم و کاتب ہیں، حافظ ابن حجر کے شاگرد علامہ سخاوی نے الضوء اللامع میں ان کا ذکر کیا ہے، وہ زرکشی، ابن الملقن اور دمیری وغیرہ کے شاگرد اور سبعہ کے قاری تھے، اور زین بن الصائغ سے کتابت کی مشق کی تھی، حافظ سخاوی فرماتے ہیں کہ

"انھوں نے ہمارے شیخ (ابن حجر) کی بہت سی تالیفات کی کتابت کی تھی"

حافظ ابن حجر کی مجلس املا میں ان کے امالی بھی لکھتے تھے، اور بہت تیز لکھتے تھے، اُن کی وفات ۸۶۳ھ میں ہوئی، (ضوء اللامع جلد ۷، ص ۸۸)

سخاوی کے اس بیان کی بنا پر زیرِ نظر نسخہ خود حافظ ابن حجر کے معتمد علیہ اور ان کی تالیفات کے ناقل و کاتب خاص کے قلم کا ہے، اور اس لحاظ سے یہ نسخہ نوادر روزگار میں سے ہے،

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ نسخہ ایک زمانہ میں ہندوستان کے مشہور و نامور بزرگ و عالم و مصنف حضرت مولانا غلام یحییٰ بہاری قدس سرہ کی ملک رہ چکا ہے، اور اس پر اُن کی مہر ثبت ہے جس میں اُن کے نام کا سجع "بیبشرك بغلام اسمه یحییٰ" کندہ ہے، اور مہر کے اوپر مولانا کے دستِ خاص کی یہ تحریر ہے، "ثم دخل فی ملك غلام یحییٰ البهاری فی دار الخلافة بالشراء"

یہ تو اس نسخہ کے ظاہری خصوصیات ہیں، اسی کے ساتھ اس کی سب سے بڑی معنوی خصوصیت یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس کتاب میں بہت سی حدیثوں کی نسبت یہ تحریر فرمایا ہے کہ

لم اجده　　　　میں نے اس کو نہیں پایا،

اس نسخہ مین ہر جگہ تو نہین لیکن پھر بھی بہت سے مقامات پر کسی قدیم حنفی محدث کے مختصر تعلیقات ہین، ان تعلیقات کا خط اصل کتاب کے خط سے بہت مختلف ہے، پھر بھی بہت قدیم ہے، اور اغلب یہ ہو کہ اسی عہد کے کسی بزرگ کے تعلیقات ہین، ان تعلیقات مین ان بزرگ نے یہ بتایا ہے کہ حافظ ابن حجر کو فلان حدیث نہین ملی، مگر وہ فلان فلان کتاب مین موجود ہے،

اس قلمی نسخہ کے آخری صفحہ پر حاشیہ مین ایک مٹی مٹی سی عبارت ہو، جس کے بعض الفاظ کیڑون نے چاٹ لئے ہین، اور کچھ جلد بند کی بے احتیاطی سے کٹ گئے ہین، اس لئے اس کا پڑھنا بہت مشکل ہے، تاہم بڑی کوشش سے اس کے بعض فقرے پڑھنے مین کامیابی ہوسکی، وہ فقرے یہ ہین،

"الحمد للہ طالعت ھذہ النسخۃ وعلقت فی ھوامشھا مالو یجد مولفھا...... وکتب قاسم الحنفی"

ان فقرون کو پڑھکر مین خوشی سے اچھل پڑا، اس لئے کہ ان فقرن نے ساری گرہ کھول دی، اور ان سے کاتب تعلیقات کا سراغ مل گیا، جس سے ان تعلیقات کی قیمت میری نگاہ مین بہت بڑھ گئی، یہ قاسم حنفی، شیخ ابن الہمام اور حافظ ابن حجر کے بلند پایہ شاگرد، جلیل القدر مصنف اور نوین صدی ہجری کے مشہور حافظ حدیث، و فقیہ حنفی، علامہ قاسم بن قطلوبغا ہین، جن کا ذکر آزاد بلگرامی نے یون کیا ہے،

آن کہ از جمع حلقۂ اعلام
ابن قطلوبغاست قاسم نام

اور جنھون نے متعدد کتابون (مثلاً عوارف المعارف، الاختیار شرح المختار، اصول بزدوی، تفسیر ابی اللیث، منہاج الاربعین، الاربعین فی اصول الدین، جواہر القرآن، بدایۃ الہدایۃ، اور شرح العقائد) کی تخریج احادیث لکھی ہو، اور امام عراقی و امام زیلعی جن احادیث کی تخریج مین ناکام رہے ہین، ان کی تخریج کرکے ان کی کتابون کا تکملہ لکھا ہے، ایک کا نام اتحاف الاحیاء بما فات العراقی من تخریج احادیث الاحیاء اور دوسری

کانیۃ الالمعی بما فات الزیلعی ہی، اُن کے شاگرد علامہ سخاوی نے الضوء اللامع مین اُن کا مطول ترجمہ درج کیا ہے، اور لکھا ہے، کہ یعرف بقاسم الحنفی یعنی قاسم حنفی کے نام سے معروف ہین، سخاوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حافظ ابن حجر نے اُن کو الامام العلامۃ المحدث الفقیہ الحافظ کے القاب سے یاد کیا ہے، اور اعتراف کیا ہے کہ علامہ قاسم نے میری کتاب ایثار کے پڑھنے کے دوران مین خود مجھکو فائدہ پہنچایا، اور نئی باتین بتائین، اور بہت سی جگہ مجھکو متنبہ کیا، تو مین نے اصل کتاب مین اُن کی تنبیہات و فوائد کا اضافہ کرلیا، جس سے میری کتاب کی نورانیت بڑھ گئی، (ضوء اللامع ص ۱۸۵ جلد ۶)

اس عبارت کے حل ہو جانے سے اس نسخہ کی یہ عظیم الشان خصوصیت ظاہر ہوئی کہ وہ علامہ قاسم کے مطالعہ مین رہ چکا ہے، اور اس پر خود ان کے دستِ مبارک کی تعلیقات ہین،

درایہ اب سے بہت پہلے ہمارے ہم وطن عالم مولانا محمد علی ابو المکارم صاحب مرحوم کی سعی و اہتمام سے ۱۲۹۹ھ مین طبع ہوکر شائع ہو چکی ہے، ہم چاہتے ہین کہ اس مضمون مین زیر نظر نسخہ سے علامہ قاسم کے تعلیقات بھی نقل کردین، تاکہ مطبوعہ نسخہ کا مطالعہ کرنے والے حضرات ان تعلیقات کو بھی پیشِ نظر رکھین، اور حافظ ابن حجر کی وسعتِ نظر کے اعتراف کے ساتھ ساتھ فوق کل ذی علم علیم کے یقین و اذعان سے بھی ذہول نہ ہو،

تعلیقات علامہ قاسم علی الدرایۃ

۱۔ حدیث لا نکاح الا بشھود کی نسبت حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے لم اره بھذا اللفظ (مین نے ان لفظون کے ساتھ اس کو نہین دیکھا ہے) اس پر علامہ قاسم فرماتے ہین، قلت اخرجه محمد بن الحسن فی الاصل بلاغاً و وصله الخطیب من حدیث علی (مین کہتا ہون اس کو امام محمد نے اصل مین بلاغاً ذکر کیا، اور خطیب نے موصلاً حضرت علیؓ کی حدیث سے)

۲۔ حدیث الثیب تشاور کی نسبت حافظؒ کا ارشاد ہے لم اره بھذا اللفظ، اس پر علامہ قاسم

فرماتے ہیں، قلت روی الحارثی فی المسند من حدیث ابی ھریرۃ لا تنکح الثیب حتی تشاور،

۳- ظہار کرنے والے کے حق میں ارشاد نبوی ہے، استغفر اللہ ولا تعد حتی تکفر، حافظ فرماتے ہیں کہ اس کے کسی طریق میں میں نے استغفار کا ذکر نہیں پایا، علامہ قاسم فرماتے ہیں:-
قلت رواہ محمد بن الحسن بذکر الاستغفار من مرسل طاؤس ووصلہ الحاکم بذکر ابن عباس،

۴- حدیث الحناء طیب کی نسبت حافظ ابن حجر نے لکھا ہے لم اجدہ، علامہ قاسم فرماتے ہیں:-
قلت رواہ الطبرانی فی الکبیر عنہا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تطیبی وانت محرمۃ ولا تمسی الحناء فانہ طیب،

۵- ہدایہ میں ہے، لم یاذن علیہ السلام للمعتدۃ فی الاکتحال والدھن، اس پر حافظ فرماتے ہیں، اما الاکتحال فھو فی حدیث ام سلمۃ واما الدھن فلم اجدہ، اس مقام پر علامہ قاسم نے لکھا ہے، قلت قولہ فی الھدایہ والدھن کلام مبتدأ من قبل نفسہ فانہ قال تنھی المعتدۃ عن الاکتحال والدھن لا یعری عن الطیب،

۶- ہدایہ میں ہے کہ حدیث فاطمہ بنت قیس کو حضرت زید و اسامہ نے بھی رد کر دیا تھا، حافظ فرماتے ہیں، اما حدیث زید بن ثابت واسامہ بن زید فلم اجدھما، علامہ قاسم فرماتے ہیں قلت ما عن اسامۃ بن زید رواہ الطحاوی،

۷- ہدایہ میں ہے نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن تعذیب الحیوان، حافظ فرماتے ہیں، لم اجدہ، علامہ قاسم نے لکھا، قلت الفقیہ یذکر الحدیث بالمعنی وقد روی البخاری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن تصبر البھائم،

۸۔ ہدایہ میں ہے روی سعید بن المسیب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امر بعتق امہات الاولاد وان لا یبعن فی دین ولا یجعلن من الثلث، حافظ ابن حجر نے لکھا لم اجدہ، علامہ قاسم فرماتے ہیں:۔ رواہ محمد بن الحسن فی الاصل،

۹۔ بیع امہات الاولاد میں ہدایہ کی ایک حدیث کے لئے حافظ نے بیہقی کا حوالہ دیا ہے، اس پر علامہ قاسم تحریر فرماتے ہیں، قلت ما رواہ البیہقی خلاف ما ذکر صاحب الہدایۃ والذی ذکرہ صاحب الہدایہ عند محمد فی الاصل،

۱۰۔ حدیث ادرؤا الحدود بالشبہات کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ قاسم فرماتے ہیں، قلت رواہ الحارثی فی المسند من حدیث ابن عباس،

۱۱۔ ہدایہ میں ہے ومن زفت الیہ غیر امرأتہ وقال النسوۃ انہا زوجتک فوطئہا فلاحد علیہا وعلیہ المہر قضی بذلک علی، حافظ نے یہاں لکھا لم اجدہ علامہ قاسم نے فرمایا قلت رواہ عبد الرزاق،

۱۲۔ حدیث لا قطع فی الطعام کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ بہذا اللفظ علامہ قاسم فرماتے ہیں:۔ قلت رواہ بہذا اللفظ محمد بن الحسن فی الاصل،

۱۳۔ ہدایہ میں ہے وقد صح انہ علیہ السلام نہی قتل النساء والذراری اس پر حافظ نے فرمایا لم اجدہ ہکذا علامہ نے فرمایا قلت روی الحاکم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لرجل الحق خالدا ولا تقتلن ذریۃ ولا عسیفا،

۱۴۔ حدیث ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اعطی الفارس سہمین والراجل سہما کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ قاسم حنفی نے اس پر لکھا ہے، قلت رواہ محمد بن الحسن فی الاصل وابو یوسف فی کتاب الخراج وابو یعلی الموصلی فی مسندہ،

۱۵۔ حدیث اِنَّ النبی صَلَّی اللہ عَلیہ وَسَلَّم کَانَ یاکل مِن صدقتہ (والمراد وقفہ) کی نسبت حافظ نے لکھا لم اجدہ علامہ قاسم نے فرمایا قلت رواہ الخصاف فی کتاب الاوقاف،

۱۶۔ حدیث من اشتری ارضاً فیھا نخل فالثمرۃ للبائع الا ان یشترط المبتاع کے باب میں حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ قاسم لکھتے ہیں قلت فی الطبرانی مِن حدیث ابن عمر اِن رجلاً باع ارضاً فیھا ثمرتھا فقال النبی صَلَّی اللہ علیہ وسلم الثمرۃ للذی ابرّھا الا ان یشترط المبتاع،

۱۷۔ حدیث: لا تاخذ الا سلمک اوراس مالک کے حق میں حافظ نے لکھا لم اجدہ علامہ قاسم نے فرمایا قلت رواہ الدارقطنی بلفظ مَن اسلف فی شیئٍ فلا یاخذ الا ما اسلف فیہ اوراس مالہ،

۱۸۔ حدیث: لا تقبل شہادۃ الولد لوالدہ ولا الوالد لولدہٖ ولا المرأۃ لزوجھا ولا الزوج لامرأتہ ولا العبد لسیّدہ ولا المولیٰ لعبدہ ولا الاجیر لمن استاجرہ کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ نے اس پر کہا، قلت رواہ الخصاف فی کتاب ادب القضاء مِن حدیث عائشۃ رضی اللہ عنہا،

۱۹۔ ہدایہ میں ہے، عن علی لا یجوز شہادۃٌ علی شہادۃِ رجلٍ الا شہادۃ رجلین حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ قاسم نے اس کا یوں پتہ بتایا، قلت اخرجہ محمد فی الاصل بلاغاً عنہ،

۲۰۔ حدیث عمر اذا اقر المریض بدین جاز ذالک علیہ فی جمیع ترکتہ کی نسبت حافظ ابن حجر نے لکھا لم اجدہ اس پر علامہ قاسم نے لکھا قلت رواہ محمد بن الحسن فی الاصل عن

ابن عمرؓ واللہ اعلم،

۲۱- حدیث انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجاز العمری و رد الرقبی کو حافظ نے لکھا لم اجدہ علامہ نے لکھا: قلت رواہ الامام محمد بن الحسن فی الاصل بھذا اللفظ،

۲۲- ضمان اجیر کے باب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اثر کو حافظ نے لکھا کہ لم اجدہ علامہ قاسم نے تحریر فرمایا، کہ قلت رواہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ ومحمد بن الحسن فی الاصل،

۲۳- حدیث لیس للنساء من الولاء الا ما اعتقن او اعتق من اعتقن او کاتبن او کاتب من کاتبن او دبرن او دبر من دبرن او جر ولاء معتقھن کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ ھکذا اس پر علامہ قاسم نے فرمایا قلت فی مسند رزین عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال میراث الولاء للاکبر من الذکور ولا یرث النساء من الولاء الا ولاء من اعتقن او اعتق من اعتقن،

۲۴- حدیث کان عمر اذا رأی جاریۃ متقنعۃ علاھا بالدرۃ وقال القی عنک الخمار یا دفار اتتشبھین بالحرائر حافظ ابن حجر نے فرمایا لم اجدہ اس پر علامہ قاسم نے لکھا ہے: قلت تقدم فی شروط الصلوۃ انہ لم یعرف منہ الا یا دفار ولا یتوقف الحکم علیہ واللہ اعلم،

۲۵- حدیث: من آجر ارض مکۃ فکانما اکل الربا کی نسبت حافظ نے فرمایا، ھذا کانہ تصحیف من قولہ فانما یاکل نارا، اس پر علامہ قاسم نے تحریر فرمایا، قلت رواہ الدارقطنی بلفظ اکل الرباء

۲۶- حدیث حریم العین خمس مایۃ ذراع وحریم بیر العین[۱] اربعون ذراعاً و حریم بیرالناضح ستون ذراعاً کے باب مین حافظ ابن حجر کا ارشاد ہے، لم اجدہ ھکذا علامہ قاسم فرماتے ہین، رواہ ھکذا الامام محمد بن الحسن،

۲۷- ہدایہ مین ہے وتعلیم الکلب ان یترک الاکل ثلاث مرأت وتعلیم البازی ان یرجع ویجیب اذا دعوتہ وھو ماثور عن ابن عباس، اس پر حافظ نے لکھا لم اجدہ علامہ قاسم فرماتے ہین رواہ محمد بن الحسن فی کتاب الآثار،

۲۸- ہدایہ مین ہے، اجمع الصحابۃ علی ان الرھن مضمون واختلفوا فی کیفیتہ حافظ نے لکھا لم اجدہ مگر اس کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ کے آثار نقل کئے، اس پر علامہ قاسم نے فرمایا قلت قد شرح المؤلف ما قال انہ لم یجدہ،

۲۹- حدیث لا یعقل العواقل عمداً ولا عبداً ولا صلحاً ولا اعترافاً کی نسبت حافظ ابن حجر نے فرمایا، لم اجدہ مرفوعاً الا ماروی الخ اس پر علامہ قاسم نے لکھا ساقہ مرفوعاً رزین العبدری فی مسندہ،

مین نے اس نسخہ کی اطلاع علامہ زاہد کوثری کو دی تو انھون نے اس کو فاخرۃ جداً قرار دیا، اور منیۃ الالمعی بما فات الزیلعی کے ساتھ تعلیقات قاسم حنفی کو منگوا کر چھپوا رہے ہین،

---

[۱] ھکذا فی الاصل والصواب بئر العطن،

رحمتِ عالم

مدرسون اور اسکولون کے طالب علمون کے لئے عام فہم اور سادہ زبان مین سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت :- مجلد عہ غیر مجلد ۸؎، (طبع پنجم)

"منیجر"

شہاب الدین محمود آلوسی

از

جناب حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب رفیق دار المصنفین

تفسیر روح المعانی ابھی حال ہی یعنی تیرہوین صدی کے وسط کی تصنیف ہے لیکن مقبولیت کے لحاظ سے اس کو بہت سی متقدم تفسیرون پر بھی فوقیت حاصل ہے، یہ کتاب مصنف نے بارگاہِ قدس کے اشارۂ غیبی پر تصنیف کی تھی، تفسیر کے مقدمہ مین اس کی پوری تفصیل موجود ہے،

مصنف کے نام اور اُن کی تفسیر سے تو عام طور سے اہل علم واقف ہین، مگر ان کی دوسری تصانیف اور اُن کے سوانح حیات سے کم لوگون کو واقفیت ہے، اس لئے اردو مین ان کے حالات لکھنے کی ضرورت تھی، لیکن افسوس ہے کہ مصنف کی شخصیت اور اُن کے علمی کارنامون کی اہمیت کے لحاظ سے اُن کے حالات بہت کم ملتے ہین تلاش سے جو معلومات حاصل ہو سکے ہین، وہ پیش کش ناظرین ہین،

خانوادۂ آلوسین آلوس عراق مین ایک بستی ہے جو دریاے فرات کے ساحل پر واقع ہے[۱] یہ قدیم آبادی ہے، دوسری تیسری صدی ہجری مین اس کی حیثیت ضلع کے مرکزی مقام کی تھی، اس کی جانب بہت سے علما و صلحا بھی منسوب ہین معجم البلدان مین اس کا مفصل تذکرہ موجود ہے، لیکن اس وقت اس کی حیثیت ایک قصبہ سے زیادہ نہین ہے، تیرہوین صدی مین یہان کے ایک خاندان نے علم و فضل مین بڑی شہرت و ناموری حاصل کی، اس خانوادہ کو عام طور پر خانوادۂ آلوسین کہا جاتا ہے، یہ خاندان علم و فضل کے لحاظ سے پورے

---

[۱] معجم المطبوعات جلد ۱ صفحہ ۳،

عراق مین ایک خاص حیثیت کا مالک تھا، اور پورے اہل عراق کا مرجع علم تھا، صاحب روح المعانی اسی خاندان کے ایک فرد تھے،

نام ونسب اور ابتدائی حالات — شہاب الدین محمود نام، ابو عبد اللہ کنیت تھی، ۱۵ ر شعبان بروز جمعہ ۱۲۱۷ھ کو آلوس مین پیدا ہوئے، اُن کے والد کا نام عبد اللہ صلاح الدین تھا، جو بڑے صاحب علم وفضل تھے انھی کی آغوشِ فیض مین اُن کی ابتدائی تعلیم وتربیت ہوئی، صاحبزادہ کو عربی اور فقہ، اور منطق کی متوسط تعلیم دینے کے بعد وہ عراق کے دوسرے علمار کی خدمت مین لے گئے، جن سے انھون نے تکمیل کی، اُن کے اساتذہ کے متعلق صاحب جلاء العینین[1] نے صرف اتنا لکھا ہے کہ

اخذ العلوم عن علماء المحققين واجلاء مدققين، (صفحہ ۲) — انھون نے محقق علمار اور اہل نظر فضلا سے علم حاصل کیا،

لیکن کسی کے نام کی تصریح نہین کی ہے، الاب لویس شیخو نے اپنی کتاب آداب العربیہ مین اُن کے ایک استاذ علاء الدین متوفی ۱۲۲۲ھ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

علاء الدين واحد شيوخ شهاب الدين آلوسي، — آلوسی کے شیوخ مین ایک شیخ علاء الدین بھی تھے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اور بھی شیوخ تھے،

ذہانت اور قوتِ حافظہ — بچپن ہی سے نہایت ذہین وفطین تھے، حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا، جلاء العینین مین ہے،

وكان ذا حافظة غريبة وفطنة عجيبة (صفحہ ۲) — عجیب وغریب ذہانت اور حافظہ پایا تھا،

---

[1] جلاء العینین کے مصنف شیخ آلوسی کے صاحبزادے ہین،

قوت حافظہ کا خود ان کے بیان کے مطابق یہ حال تھا،

ما استودعت ذهنی شیئًا فخاننی[۵۱]	ایسا نہیں ہوا کہ مین نے اپنے ذہن مین کوئی بات رکھی ہو، اور وہ پھر ذہن سے نکل گئی ہو

اسی غیر معمولی ذہانت کا نتیجہ تھا کہ ۱۳ برس کی عمر مین ابن ہشام کی کتاب شرح قطر الندی پر حاشیہ لکھا[۵۲] ابھی بیس برس سے بھی کم عمر تھی کہ مسند درس کے زینت بنے، اور اسی زمانہ مین صاحب تصنیف بھی ہوئے، جلاء العینین مین ہے،

وقد الف ودرس وھو دون العشرین (ص ۲۷)	بیس برس سے کم ہی کے تھے، کہ صاحب درس وتصنیف ہو گئے،

تلامذہ ابتداے عمر سے لے کر آخر عمر تک افادہ وتعلیم کا سلسلہ برابر جاری رہا، اس مدت مین ہزارون تشنگان علم اُن کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ہون گے لیکن افسوس ہے کہ ان کا مفصل تذکرہ نہین ملتا، اُن کے صاجزادہ کا بیان ہے کہ

وانتفع بہ خلق کثیر، (جلاء ص ۲۷)	اُن سے ایک مخلوق نے استفادہ کیا،

متفرق طور پر حسب ذیل تلامذہ کے نام ملتے ہین،

۱- ان کے دو صاجزادے عبد الباقی سعد الدین (۲) خیر الدین ابو البرکات جو اپنے وقت کے جید علماء مین تھے اور متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہین، جلاء العینین خیر الدین ابو البرکات ہی کی تصنیف ہے (۳) الشیخ عبد الفتاح شواف زادہ ان کو حدیث وفقہ اور عربی ادب سے زیادہ دلچسپی تھی، ادب کی تعلیم خاص طور سے انھون نے شیخ آلوسی سے حاصل کی تھی، اُن کی متعدد تصانیف ہین، حدیقۃ الورد کے نام سے دو جلدون مین شیخ آلوسی کی سوانح حیات بھی لکھی ہے اگر کاش یہ کتاب مل جاتی تو شیخ کے مفصل

---

[۵۱] جلاء العینین ص ۲۷ [۵۲] آداب العربیۃ ج ۱ ص ۸۰ [۵۳] معجم المطبوعات،

حالات اور کارنامے سامنے آجاتے (۴) محمد الاخفش، یہ شیخ کے خاص تلامذہ میں تھے، ان کی تحریری یادگاروں میں شرح الفیہ زیادہ مشہور ہے (۵) عبد الفتاح الاخرس انھوں نے شیخ سے اور کتابوں کے علاوہ کتاب سیبویہ خاص طور سے پڑھی تھی، [۱]

افتا | اس علم و فضل کے باوجود عام مجالس وعظ میں جانا پسند نہیں کرتے تھے، ۱۲۴۵ھ میں اُن کو جامع بغداد میں وعظ کے لئے بلایا گیا، تو بہت بار خاطر ہوا، جب زیادہ اصرار کیا گیا تو بکراہت گئے، اس وعظ میں والی بغداد بھی موجود تھا، وہ بہت متاثر ہوا، اور اس کو اسی دن سے شیخ سے ایک خاص عقیدت ہو گئی، اور اس کے بعد سے وہ برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور بعد میں بغداد کے مفتی کی حیثیت سے اُن کا تقرر کر دیا، شیخ نے ۱۵ برس تک یہ خدمت نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دی، [۲]

وفات | ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ کو ۵۳ برس کی عمر میں وفات پائی، اور حضرت شیخ معروف کرخی کے پہلو میں سپرد خاک کئے گئے، ..... وفات کا صدمہ خواص اور عوام سب کو ہوا، آج بھی آپ کی قبر زیارت گاہ عام و خاص ہے [۳] متعدد شعرا نے طویل مرثیے لکھے، زندگی میں شعراء نے جو مدائح لکھے، اور موت کے بعد جو مراثی کہے گئے، ان سب کو الاب لوئیس نے کتابی شکل میں جمع کر دیا ہے [۴] اس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

اولاد و احفاد | ان کے دو صاحبزادوں عبد الباقی اور خیر الدین کا ذکر اوپر آچکا ہے، اُن کے علاوہ ایک اور صاحبزادے عبد اللہ بہاء الدین تھے، دوسرے بھائیوں کی طرح یہ بھی صاحب علم تھے، اُن کے صاحبزادے (یعنی شیخ آلوسی کے پوتے) ابو المعالی متوفی ۱۳۴۲ھ نے علم و فضل میں باپ سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی، متعدد قیمتی تصانیف یادگار چھوڑیں، ان میں بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب بہت مشہور ہے، اور چھپ کر شائع ہو چکی ہے،

اخلاق و عادات | شیخ کے صاحبزادے نعمان نے ان کے ظاہری و باطنی محاسن کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے،

وکان حسن المنظر والمحاضرۃ — نہایت خوبصورت اور خوش گفتار تھے اور

---

[۱] یہ پچھلے تین آدمیوں کا ذکر آداب العربیہ میں ہے جلد ا ص ۹۳ تا ۹۵ [۲] معجم المطبوعات [۳] جلاء العینین ص ۲۵ [۴] آداب العربیہ

والمفاکھة ورعاً تقیاً عفیفاً (جلاء ص۲)

پرہیزگار اور پاک دامن تھے،

صاحب حدیقۃ الورود لکھتے ہیں :-

کریم الذات بدیع الاخلاق

کریم النفس اور اخلاق میں نادر روزگار تھے

اریج الند کے مصنف کا بیان ہے،

ولم یسمع بمثلہ فی کافة الاقالیم
منذ سنین عدیدة مع تقویٰ
وصلاح ودیانة قویة وسخاءً
وکرم وصدقات خفیة
(جلاء ص۲)

بہت دنوں سے ان ممالک میں ایسا صاحب علم
وفضل سننے میں نہیں آیا، اس علم وفضل کے
ساتھ صلاح و تقویٰ، دیانت داری اور
سخاوت اور پوشیدہ صدقات کرنے میں وہ
اپنی مثال تھے،

فضل وکمال | شیخ آلوسی کے علم وفضل کا صحیح اندازہ تو اُن کی تصانیف ہی سے ہو سکتا ہے لیکن انکے معاصرین بھی اُن کے کمالات کے معترف تھے،

لویس شیخو نے لکھا ہے،

کلف بالعلوم منذ حداثة
سنہ وبذل النفس والنفیس
فی احراز جواہرہا فی ان رغبتہ
فی طلب المعارف شغلتہ عن
حطام الدنیا وانستہ ھناء
العیش وملاذ الحیاة وبرز
بالعلوم الدینیة فصار اماماً

اوائل عمر ہی سے اُن کو علوم سے دلچسپی اور
لگاؤ تھا اور علمی جواہر پاروں کے جمع کرنے میں
انھوں نے اپنی جان و مال ہر چیز لگا دی
تھی، طلب علم کی رغبت و شوق نے ان کو
اپنی طرف اتنا مشغول کر لیا کہ وہ زخارف
دنیوی اور لذت ایام سے بھی بے نیاز ہو گئے،
اس ذوق و شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم دینیہ

فی التفسیر والافتاء وکان مع ذٰلك کاتبا بلیغا۔[۱]

مین اُن کو پورا کمال حاصل ہوگیا، چنانچہ تفسیر اور افتا مین اُن کی حیثیت امام کی ہوگئی، اسی کے ساتھ انشا پردازی اور بلاغت مین بھی کمال حاصل تھا،

صاحب حدیقۃ الورود جو اُن کے شاگرد ہین لکھتے ہین،

کشاف رموز الحقائق وغواص بحر الدقائق، علامۃ الفضلاء وحید الدھر بالاتفاق، خاتم المفسرین وسعد المحققین وفخر علماء المسلمین الواصل الی رتبۃ الاجتہاد ذکرہ فی البلاد (جلاء صفحہ ۲)

حقائق علم کا راز فاش کرنے والے اور بحر معانی کے غواص تھے، اہل فضل کی نشانی اور بالاتفاق نادرۂ روزگار تھے، خاتم المفسرین تھے اور اہل تحقیق اور علمائے اُمت کیلئے سعادت اور فخر کا موجب تھے، اُن کو اجتہاد کا رتبہ حاصل تھا، تمام ممالک مین ان کا چرچا ہے،

صاحب اریج الند کا جو شیخ کے شاگرد ہین، بیان ہے،

وکان نادرۃ الاوان حصّل العلوم النقلیۃ والعقلیۃ فتفرد بھا ودرس العربیۃ والبیان والحدیث والتفسیر ووقف علی غامضۃ العسیر... ولتوسیع

نادرۂ روزگار تھے، انھون نے علوم نقلیہ اور عقلیہ کی تحصیل کی اور اس مین تفرد حاصل کیا، ادب عربی، معانی وبیان تفسیر وحدیث کا درس دیا، اور انھی علوم کی مشکلات حل کرتے رہے،........

---

[۱] آداب العربیہ ج ۱ ص ۸۵،

بجنسہ فی کافۃ الا قالیم (صفحہ ۱) | اُن کے جیسا نادرہ روزگار سننے میں نہیں آیا،

عربی نظم ونثر | عربی نظم ونثر دونوں پر پوری قدرت تھی، نثر میں ان کی قدرت پر ان کی تصانیف شاہد ہیں، صاحب آداب العربیہ ان کی تحریر کے متعلق لکھتے ہیں،

کان السید محمود سریع الخاطر	شیخ محمود نہایت ذکی الفہم اور اپنے انداز تحریر
ونسیج وحدہ فی قوۃ التحریر و	اور عبارت کی سلاست و روانی میں
سھولۃ لکتابۃ (ج ۱ ص ۳۵)	منفرد تھے،

جلاء العینین میں ہے :-

والنثر العجیب الذی لم یسبق	ایسی اچھوتی نثر لکھتے تھے، کہ اُن کے اسلوب
حسن اسلوبہ (صفحہ ۳)	تحریر کی مشکل ہی سے تقلید کیجا سکتی تھی،

عربی شعروشاعری کا بھی نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ مذاق تھا، نثر کی طرح ان کی نظم میں بھی دو خصوصیتیں یعنی رقت و سلاست زیادہ نمایاں ہیں، نمونۃً چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں، ایک موقع پر عراق کے چھوٹنے پر کہا ہے،

اھیم بآثار العراق وذکرہ	وتغذ وعیونی من مسرتھا عبری
والثم اخفافاً وطئن ترابہ	واکحل اجفاناً بتربتہ العطری
واسھر ارعی فی الدیاجی کواکباً	تمر اذا سارت علی ساکنی الزورا

بغداد کی تعریف اور اس کے فراق میں کہتے ہیں،

ارض اذا مرت بھاریح الصبا	حملت من الارجاء مسکا اذفرا
لا تسمعن حدیث ارض بعدھا	یروی فکل الصید فی جوف الفرا
فارقتھا لا عن رضی وھجرتھا	لا عن قلی ورحلت لا متخیرا

لکنھا ساقت علی برحیھا　　　لما رایت بھا الزمان تنکراً

آخری شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بغداد کو انھون نے خوشی سے نہین ، بلکہ حالات سے مجبور ہو کر چھوڑا ،

علم نحو نحوان کا خاص فن تھا ، اوپر ذکر آچکا ہے کہ کتاب سیبویہ خاص طور سے وہ پڑھایا کرتے تھے ، اس فن سے اُن کی دلچسپی کا اندازہ اُن کی تفسیر سے ہوتا ہے ، اس مین نحو کے جو مسائل آئے ہین اگر ان کو الگ کر لیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے ،

امر بالمعروف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر علمار کا خاص فریضہ ہے ، شیخ آلوسی کو اس فرض کا پورا احساس تھا ، اور وہ درس مین علمی و دینی خدمت کے ساتھ اس فریضہ کو بھی انجام دیتے تھے ، ان کے صاحبزادے نعمان اُن کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہین ،

والامر بالمعروف والنھی عن المنکر　　امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور سُنت
والذب عن السنۃ (جلاء ص۲۰)　　نبوی کی طرف سے مدافعت بھی ان کی
(جلاء ص۲۰)　　خاص خصوصیت تھی ،

مسلک پورا خانوادہ آلوسیین شافعی المسلک تھا ، اس لئے شیخ آلوسی بھی شافعی تھے ، لیکن ان مین تشدد نہین تھا ، چنانچہ بعض مسائل مین وہ حنفی مسلک کے پابند تھے ، شاید اسی وسعت کا نتیجہ تھا کہ عہدہ افتا پر ان کا تقرر ایک حنفی مفتی کی حیثیت سے ہوا تھا[۱] ،

تصانیف شیخ کا اصل کارنامہ ان کی بیش بہا تصانیف ہین ، جن کی ... اہمیت اُن کی کمیت کی وجہ سے نہین بلکہ معنوی کیفیت کے لحاظ سے ہے ، اور اس کا اندازہ ان کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے ، اس لئے اس مضمون مین صرف اُن کے نام اور مختصر تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے ،

---

[۱] معجم المطبوعات ص۱۷ ،

قیل انہ کان لا یقصر تالیفہ فی

الیوم واللیلۃ عن اقل من ورقتین

کبیرتین (صفحہ)

صاحب جلاءالعینین نے اُن کی ۱۸ تصانیف کا ذکر کیا ہے، اُن میں سے ۱۳ مطبوعہ ہیں،

۱- الاجوبۃ العراقیہ عن الاسئلۃ الایرانیہ:- ایران کے علماے شیعہ نے چند سوالات کئے تھے، یہ کتاب اسی کے جواب میں لکھی گئی ہے، ۱۳۱۷ھ میں آستانہ سے شائع ہو چکی ہے،

۲- الاجوبۃ العراقیۃ عن اسئلۃ اللاہوریہ، یہ بھی چند سوالات کے جواب میں لکھی گئی ہے، لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کا موضوع کیا ہے، اس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۴ھ ہے، بغداد سے ۱۳۰۱ھ میں شائع ہو چکی ہے، اس کتاب کی ضخامت ۶۵ صفحات ہے،

۳- قطر الندی: فن نحو کی کتاب ہے، ابن ہشام نحوی متوفی ۷۶۲ھ کی تصنیف ہے، خود اس نے اس کتاب کی شرح بھی لکھی ہے، اس کتاب کی صاحب کشف الظنون نے بڑی تعریف کی ہے، اس پر متعدد حواشی لکھے گئے ہیں، شیخ آلوسی نے بھی اس پر حاشیہ لکھنا شروع کیا تھا، مگر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، صرف باب الحال تک لکھ پائے تھے کہ انتقال ہو گیا، انکے بعد انکے صاحبزادے نعمان نے اسے پورا کیا، ۱۳۲۰ھ میں بیت المقدس سے شائع ہو چکی ہے،

۴- الخریدۃ الغیبیہ فی تفسیر قصیدۃ العینیہ، عبد الباقی موصلی نے حضرت علیؓ کی مدح میں ایک قصیدہ عینیہ لکھا تھا، مصنف نے اس کی تشریح کی ہے، قصیدہ مع تشریح ۱۲۷۰ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے، اس کی ضخامت ۱۵۶ صفحات ہے،

۵- سفرۃ الزاد لسفرۃ الجہاد:- یہ جہاد سے متعلق ہے، ۱۲۷۰ھ میں مطبع دار السلام مصر نے اُسے شائع کیا ہے،

۶۔ الطراز المذہب شرح قصیدۃ الباز الاشہب: عبدالباقی عمری کے ایک قصیدہ کی شرح ہے، مطبع جریدۃ الفلاح نے ۱۳۱۳ہجری میں اسے شائع کیا ہے، اسکی ضخامت ۱۹۶ صفحات ہے،

۷۔ غرائب الاغتراب ونزھۃ الالباب: مصنف نے فلسطین کا سفر کیا تھا، اس میں اسی سفر کے حالات ہیں، اسی میں ان تمام علماء وصلحاء کے حالات بھی لکھ دیئے ہیں، جن سے انھوں نے اثنائے سفر میں ملاقات کی تھی، ۱۳۲۷ھ میں بغداد سے یہ سفرنامہ شائع ہوچکا ہے، کتاب کے شروع میں احمد شاکر آلوسی کے قلم سے مصنف کا ترجمہ بھی ہے، اسکی ضخامت ۴۵۱ صفحے ہیں،

۸۔ الفیض الوارد: سید محمد جواد نے اپنے شیخ الشیوخ خالد الکردی النقشبندی کا ایک طویل مرثیہ والیہ لکھا تھا، یہ اس کی شرح ہے، ۱۲۰۸ھ میں مطبع کاستلیہ نے شائع کیا، ضخامت ۴۶ صفحات ہیں،

۹۔ کشف الطرۃ عن الغرۃ درۃ الغواص فی اوھام الخواص، ابو محمد قاسم الحریری متوفی ۵۱۶ھ کی تصنیف ہے، اس کتاب میں مصنف نے خواص کے معائب اور اُن کے اوہام باطلہ پر بڑی اچھی بحث کی ہے، اس کتاب کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، دو شرحیں نظم میں بھی کی گئی ہیں، شیخ آلوسی نے بھی کشف الطرہ کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے، یہ کتاب دمشق سے ۱۳۰۱ھ میں شائع ہوچکی ہے، کتاب کے شروع میں شیخ کے صاحبزادے نعمان آلوسی کا ایک مقدمہ بھی ہے، کتاب کی ضخامت ۱۰۰ صفحات ہیں،

۱۰۔ المقامات الخیالیہ: یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ کتاب کس موضوع پر ہے، بغداد یا کربلا سے شائع ہوچکی ہے،

۱۱۔ نشوۃ الشمول: یہ سفرنامہ ہے، ۱۲۶۷ھ میں مصنف نے استنبول کا سفر کیا تھا، اس میں اسی سفر کے حالات ہیں،

۱۲- نشوۃ المدام فی العود الی مدینۃ السلام، یہ نہین معلوم ہوسکا کہ اس کا موضوع کیا ہے، غالبًا یہ سفر سے واپسی پر بغداد کے متعلق کچھ لکھا ہے، واللہ اعلم، یہ کتاب دوبار بغداد سے شائع ہو چکی ہے،

۱۳- تفسیر روح المعانی: اُن کی زندگی کا اصلی اور سب سے اہم علمی اور دینی کارنامہ یہی تفسیر ہے، اس کی تالیف ۱۲۵۲ھ مین جب کہ مصنف کی عمر ۳۴ برس کی تھی، شروع ہوئی، اور ۱۲۶۷ھ مین اختتام کو پہنچی، یہ کتاب دوبار چھپ چکی ہے،

کتاب کے شروع مین مصنف نے لکھا ہے کہ نوجوانی ہی مین قرآن کے بہت سے حقائق و معارف اُن پر منکشف ہونے لگے، اور بہت سے دقائق اُن کے ذہن مین ایسے آئے، جو متداول تفسیرون مین نہین ملتے، چنانچہ ان کو ان دقائق و معارف کے قلمبند کرنے کا خیال پیدا ہوا، ابھی وہ اس ادھیڑبن ہی مین تھے کہ ایک رات خواب مین دیکھا کہ اللہ تعالی ان کو زمین و آسمان کے لپیٹنے اور اس مین جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کو پُر کرنے کا حکم دے رہا ہے، اسی حالت مین انھون نے اپنا ایک ہاتھ آسمان کی طرف اور دوسرا پانی کی طرف بڑھایا، اس کے بعد آنکھ کھل گئی، اور تفسیر لکھنے مین جو کچھ تامل و تردد تھا، وہ رفع ہو گیا، اور انھون نے اس کام کو شروع کر دیا،

کتاب کے شروع مین، فائدے دیئے ہین جن مین تفسیر کے تمام اہم مسائل آگئے ہین، مثلاً تفسیر و تاویل، تفسیر بالرای، اسمار قرآن، کلام اللہ غیر مخلوق، حروف سبعہ، جمع و ترتیب قرآن، اعجاز القرآن وغیرہ مباحث پر مختصر طور سے اچھی بحث کی ہے، پوری تفسیر ۳۰ حصون مین ہے،

اس خاندان کے دوسرے اکابر شیخ کے صاحبزادون کا ذکر اوپر آچکا ہے، جن مین ہر ایک صاحب علم و فضل تھا، اُن کے دو پوتون نے بھی اس لحاظ سے بڑی ترقی کی، ان مین ایک ابو المعالی محمود شکری ہین جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، دوسری علی علاء الدین ہین، جنھون نے پوری زندگی علم دین کی تدریس میں گذار دی، کچھ

تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں، ۱۲ ویں اور تیرہویں صدی کے اکابر کا ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا، مگر وہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، اس کے علاوہ نحو میں ایک کتاب لکھی ہے، جو چھپ گئی ہے، ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی،

شیخ آلوسی کے دو بھائی عبد الحمید اور عبد الرحمان بھی اپنے زمانہ کے ممتاز علما میں گذرے ہیں، عبد الرحمن نہایت فصیح و بلیغ تھے، خطابت میں خاص طور سے مشہور تھے، اس کے علاوہ کرخت کی جامع مسجد میں زندگی بھر درس و تدریس کا کام کرتے رہے، ۱۲۸۱ھ میں وفات پائی، دوسرے بھائی عبد الحمید نابینا تھے، لیکن اپنے وقت کے بہترین ادبا و شعرا میں ان کا شمار ہوتا تھا، نہایت مقبول عوام تھے، ایک آدھ تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں، ۱۳۲۴ھ میں وفات پائی،

نوائے حیات

طبع دوم

جناب یحیٰی اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہیں، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

ضخامت :- ۲۱۴ صفحے،

قیمت :- مجلد للعہ غیر مجلد عہ

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک

"پروفیسر رام پرشاد کھوسلا، ام اے (پنجاب) بی اے (آکسن) پنجاب کے رہنے والے تھے اور پٹنہ یونیورسٹی مین تاریخ کے پروفیسر تھے، تاریخ ہند پر ان کی ایک کتاب Mughal Kingship and Nobility ۱۹۳۴ء مین انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوئی تھی، اس کے خاتمہ مین انھون نے جو کچھ لکھا ہے، وہ موجودہ جمہوری، اور سیکولر حکومت کے زمانہ مین مطالعہ کے لائق ہے، وہ لکھتے ہین، ص، ع"

نیض رسان بادشاہت | مغلون کی بادشاہت ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کے لئے بہتر طور پر فائدہ مند تھی، ان کی حکومت مطلق العنان ضرور تھی، لیکن انھون نے اس ملک کے باشندون کے قدیم حقوق مین کسی قسم کی مداخلت نہین کی، ان کی بادشاہت کے عیوب اپنی جگہ پر ہین، اور کوئی مطلق العنان حکومت کلیۃً باعث رحمت نہین ہو سکتی، لیکن مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغلون کی بادشاہت اپنی شان و شوکت کے ساتھ اس زمانہ کے لئے بالکل مناسب تھی، اور اپنی خوبیون ہی کی وجہ سے یہ پرشکوہ حکومت ایک طویل مدت تک قائم رہی، اس خاندان مین مسلسل چھ ایسے بادشاہ گذرے جن کی شخصیتین بہت ہی اعلیٰ تھین، عام طور پر ان کی حکومت مین نرمی اور رحمدلی تھی، انھون نے کبھی اپنی فوجی قوت کو رعایا کی فلاح و بہبود سے لاپرواہ ہو کر استعمال نہین کیا، وہ کبھی لوگون کے نجی معاملات مین دخل نہین دیتے تھے، ملک کے رسم و رواج کو کسی قانون کے ذریعہ پس پشت نہین ڈالتے تھے، نظری طور پر ان کی حکومت مطلق العنان ضرور

تھی لیکن عملی طور پر بڑی ہی فیض رسان رہی،

قیام امن — پورے ملک مین ایک ایسا دبدبہ قائم تھا کہ دور دراز صوبون کے حکام بھی اُن کے خلاف سر اُٹھانے کی جراُت مشکل ہی سے کرتے تھے،

مغلون کے زمانہ مین جب کہین بدامنی ہوتی، تو سختی سے روک دی جاتی تھی، اس عہد کے حکمرانون نے امن وامان قائم کرکے ملک کو کمزور حکومت اور متزلزل نظام سلطنت کی خرابیون سے بچائے رکھا، اُن کو قوت واقتدار کی ہوس ضرور تھی، لیکن اسی کے ساتھ وہ رعایا کی فلاح وبہبود کے لئے بھی برابر کوشان رہتے، اگر امراء کو شاہانہ سرپرستی مین ترقی ہوئی تو ادنی درجہ کے لوگون کو بھی شاہانہ عنایتون کے بدولت خوشحالی نصیب ہوئی،

کاشتکارون کی محافظت — حکومت کی جانب سے زراعت کی ترقی کے لئے بڑی کوشش اور نگرانی کیجاتی، آمدنی کا بڑا حصہ زمین ہی سے حاصل ہوتا تھا، اس لئے کاشتکارون کی فلاح وبہبود کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا، جب کسی علاقہ سے فوج گذرتی تو وہان کی رعایا کی حفاظت کا پورا سامان کیا جاتا تھا، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ شاہجہان (۱۶۳۳ء) مین لاہور جارہا تھا، تو اُس نے بخشیون کو حکم دیا کہ وہ تیراندازون کو سرراستہ کے ایک جانب کی حفاظت کرین اور میر آتش کو بندوقچیون کے ساتھ راستے کی دوسری سمت تعینات کیا جاتا کہ شاہی فوج کھیتون کی فصل کو نقصان نہ پہنچا سکے، لیکن یہ بھی احتمال تھا کہ اس انتظام کے باوجود فصل کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچ جائے گا، اس لئے پہلے ہی سے داروغہ مشرف اور امین مقرر کردیئے تھے کہ رعایا اور ایک ہزار سے کم کے جاگیردارون کے نقصان کا معاوضہ دیا جائے، ایک بار شاہی فوج ۱۶۴۹ء مین قندھار کی طرف جارہی تھی، جس سے غزنی مین کھیتون کو بڑا نقصان پہنچا، چنانچہ وہان کے کاشتکارون کو اس کے معاوضہ مین دو ہزار اشرفیان دی گئین، ہر بادشاہ کاشتکارون کی بڑی پاسداری کرتا تھا، کیونکہ انہی پر حکومت کی اصلی آمدنی کا انحصار تھا،

فنون کی ترقی | صرف زراعت ہی کو شاہانہ سرپرستی حاصل نہین تھی، بلکہ اس زمانہ مین دوسرے قسم کے آرٹ نے بھی بڑی ترقی کی، اور یہ ترقی بادشاہون کی سرپرستی کے بغیر نہین ہوسکتی تھی، یورپین سیاحون نے اس زمانہ کے آرٹ کی بڑی تعریف کی ہے، جہانگیر کے عہد مین مصوری کو بڑا فروغ ہوا، پادری فرانسکو کارڈ کا بیان ہو کہ جہانگیر کے عہد مین ایسے باکمال مصور تھے کہ جو یورپ کی مصوری کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونون کی نقل اس طرح اُتار دیتے تھے کہ اصل کا دھوکا ہوتا تھا،

ملک مین اعلیٰ قسم کے کپڑے بھی تیار ہوتے تھے، اس زمانہ کا مشہور کپڑا بافتہ ہالینڈ کے کپڑون سے بہتر ہوتا تھا، اونچے طبقہ کے لوگ جو کپڑے پہنتے، ان مین طلائی اور نقرئی تار بھی استعمال کیا جاتا،

تعمیراتِ عامہ مین بڑی بڑی رقمین خرچ کیجاتین، ان تعمیرات کے نمونے آج بھی موجود ہین، ملک کے ہر حصہ مین محلون، مسجدون، حامون، مقبرون، قلعون اور دوسری قسم کی عمارتون کی تعمیر بکثرت ہوتی رہی، شاہراہون کے کنارے مسافرون کی راحت و آسایش کے لئے سرائین اور مسافرخانے بنائے گئے، مغلیہ عہد کی شاندار عمارتون کے دیکھنے کے لئے آج تک دنیا کے مختلف حصون سے سیاح آتے رہتے ہین،

علوم کی سرپرستی | مغل بادشاہ علوم کے بھی بڑے سرپرست تھے، اُن کی فیاضی کا شہرہ سُن سُن کر دوسرے ملکون کے علماء و شعراء اُن کے دربار مین کھنچے چلے آتے تھے، ان بادشاہون مین بعض خود بھی بلند پایہ اہل قلم تھے، بابر کی تزک ایک علمی شاہکار ہے، اکبر نے ملک الشعراء کا ایک نیا عہدہ قائم کیا، اور سب سے پہلے غزالی اس عہدہ پر فائز ہوا، آئین اکبری مین ابو الفضل کا بیان ہو کہ اکبر کے دربار مین ایران کے بہت سے ممتاز شعراء کا اجتماع ہوگیا تھا، ان مین سے بعض شعراء کے نام یہ ہین، حکیم ثنائی، نظیری نیشاپوری، ہاتفی اصفہانی، جعفر بیگ قزوینی، خواجہ حسین ہروی، حیاتی گیلانی، انیسی، خسروی، وفائی، رفیقی، عرفی شیرازی، فسونی، نادری، قدسی، حیدری، تبریزی، اشکی، فہمی، آذری، جذبی، سنجر کاشی، تشبیہی، سرمدی، قاسم ارسلان، مشہدی، باباطالب، باباغیوری وغیرہ،

جہانگیر شاعر بھی تھا، اور شعر و سخن کا نقاد بھی، اُس نے بھی ایک تزک لکھی ہے،

بادشاہون اور شاہزادون کے علاوہ امرار بھی علم و ادب کے سرپرست تھے، ابو الفتح گیلانی اور عبدالرحیم خانخاناں کی قدردانی نے شعر و سخن کی ایک اکیڈیمی ہی قائم کر دی تھی، خان زمان شعرار کا بڑا مربی تھا، غزالی نے اس کی شان مین ایک ہزار اشعار کا ایک قصیدہ لکھا، خان زمان نے اس کے ہر شعر کے صلہ مین ایک اشرفی دی، کشمیر کا صوبہ دار ظفر خان مشہور شاعر صائب کا مربی تھا، بیرم خان بھی شاعر تھا، نظیری کو اس کی سرپرستی حاصل تھی، اکبر کا رضاعی بھائی خان اعظم کوکلتاش اہل قلم تھا، سبزواری، بدخشی، جعفر ہردی آتہی، اور مدائنی وغیرہ شعرار اس کی فیاضیون کے رہین منت رہے، عرفی نے ایک قصیدہ کے صلہ مین ایک لاکھ روپیے انعام پائے، امرار کے یہان برابر مشاعرے ہوا کرتے تھے، شہزادہ دانیال ہندی زبان کا شاعر تھا، شہزادہ مراد نظیری نیشاپوری کا سرپرست رہا، جہانگیر کے عہد مین طالب آملی ملک الشعرار تھا، شاہجہان نے ابو طالب کلیم کو یہ اعزاز بخشا، جہانگیر کے زمانہ مین قندھار کا صوبہ دار غازی وقاری شعرار اور علمار کا بڑا دلدادہ تھا، ایران سے جو شعرار ہندوستان آتے وہ پہلے اسی کے دربار مین قیام کرتے تھے،

ملک مین بڑے بڑے کتب خانے بھی تھے، جب بابر کی فوجون نے لاہور کے پاس قلعہ ملوٹ مین داخل ہوکر اس کو لوٹنا شروع کیا، تو بابر نے وہان کے کتب خانہ کو بچا لیا، اس کو لاہور کے علم نواز غازی خان نے قائم کیا تھا،

ملک مین ماہرین فن اور شعرار کی کثرت اس کا ثبوت ہے کہ مغل بادشاہ ان فنون کی جانب سے کبھی غافل نہین رہے، جن کو امن و امان کے زمانہ مین فروغ پانا چاہئے تھا، اُن کو جنگ و جدل سے جب بھی فرصت مل جاتی، تو رعایا کی حالت سدھارنے کی کوشش مین لگ جاتے، اُن کی آمدنی وافر تھی لیکن جو روپیہ بادشاہ کے ہاتھ مین آتا تھا، وہ مختلف ذرائع سے پھر رعایا کے ہاتھ مین پہنچ جاتا تھا،

عدل گستری مغل حکمران عدل کو ایک مقدس فرض سمجھتے تھے، اُن کے زمانہ میں ادنی آدمی کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ براہ راست بادشاہ کی خدمت میں پہنچکر انصاف کا طلب گار ہو، گو اس حق کے استعمال کا موقع کم آتا تھا تاہم اس کی وجہ سے بے انصافی کی بڑی روک تھام رہتی تھی بعض اوقات یہ حق رعایا کے لئے بڑی نعمت ثابت ہوتا تھا،

مذہبی رواداری عدل و انصاف میں اہتمام اور مذہبی رواداری کی پالیسی کی وجہ سے عوام ہمیشہ مطمئن رہے، اسلامی ریاستوں میں سیاست اور مذہب کا گہرا لگاؤ رہا ہے لیکن مغلوں کی مذہبی رواداری کی وجہ سے کوئی سیاسی خطرہ پیدا ہونے نہیں پایا، اور کسی زمانہ میں بھی یہ کوشش نہیں کی گئی کہ حکمران قوم کا مذہب محکوموں کا بھی مذہب بنایا جائے، حتی کہ اورنگ زیب نے بھی حصول ملازمت کے لئے اسلام کی شرط نہیں رکھی تھی، مغلوں کے عہد میں (Corporat-Five Act of milea) یا (Act of uni-ion act) کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے، لوگوں کے ضمیر کے خلاف کوئی (ry of ormity-) جیسا قانون نہیں بنایا گیا، ایلزبیتھ کے زمانہ میں ایک ایسا قانون تھا جس کے ذریعہ جبری طور پر عبادت کرائی جاتی تھی، مغلوں کے زمانہ میں اس قسم کا جبر نہیں کیا گیا،

(St Bartholomew Solay) کے جیسے قتل عام سے مغلوں کی تاریخ کبھی داغدار نہیں ہوئی، مذہبی جنگ کی خونریزی سے یورپ کی تاریخ بھری ہوئی ہے، لیکن مغلوں کے عہد میں ایسی مذہبی جنگ کی کوئی مثال نہیں ملتی، بادشاہ مذہب اسلام کا محافظ اور نگہبان ضرور سمجھا جاتا تھا، لیکن اُس نے کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کے عقائد پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا، بابر سے لیکر اورنگزیب کی تخت نشینی تک مغلوں کی تاریخ تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی تلخی سے تقریباً پاک ہے، مغلوں میں ولندیزیوں سے زیادہ رواداری تھی، یورپین مورخ ادرم کا بیان ہے کہ ولندیزیوں نے متعصبانہ مذہبی پالیسی اختیار کی تھی، اور جب مرہٹوں نے عیسائی مذہب اختیار کرنے

سے انکار کیا تو بہت سے مرہٹہ خاندانون پر بڑی سختیان کی گئین، ان ولندیزیون سے سیواجی کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی، وہ ولندیزیون کو اپنے مذہب کا دشمن سمجھتا تھا، اسی انتقام مین اس نے ہندوستان کے مغربی حصہ کے ولندیزیون سے چوتھ وصول کیا،

رعایا نوازی | مغلون کے زمانہ مین وقتاً فوقتاً جو شاہی اعلانات ہوتے رہے، اُن سے مغلون کی رعایا پروری کا اندازہ ہوتا ہے، اکبر کہا کرتا تھا کہ ظلم ہر شخص کے لئے ناجائز ہے، اور بادشاہ کے لئے خصوصیت کے ساتھ اور بھی ناروا ہے کہ وہ تو دنیا کا محافظ ہوتا ہے، جہانگیر اپنی تزک مین لکھتا ہے،

بہر نگہبانی خلقِ خدا / شب نکنم دیدہ بخواب آشنا

از پئے آسودگی جملہ تن / رنج پسندم بہ تن خویشتن

اورنگزیب نے شاہجہان کو اس کی معزولی کے بعد ایک موقع پر لکھا تھا کہ خداوند تعالیٰ اس کو کچھ عطا کرتا ہے، جس مین رعایا کی حالت سدھارنے اور اُن کی حفاظت کی صلاحیت ہوتی ہے، حکمرانی کے معنی لوگون کی نگہبانی ہے، نہ کہ تن پروری اور عیاشی،

مغل اپنے ان اقوال کا ثبوت عمل سے دیتے تھے، ان کا نظام سلطنت نہ صرف مستحکم بلکہ فائدہ مند بھی تھا، حکومت کا استحکام اور اقتدار لوگون کے حق مین بہت مفید تھا، اسی کی بدولت ایک عرصہ تک ملک مین امن اور اقتصادی خوشحالی رہی،

مغلون کا طرز حکومت اگرچہ مطلق العنان تھا، لیکن اس زمانہ کے لئے یہی طرز حکومت موزون تھا، حکومت کے لئے عوام کی نمائندہ جماعت کی ضرورت سمجھی نہین جاتی تھی، تمام لوگ اس طرز زندگی سے مطمئن تھے، جس کو وہ اپنی خواہش سے اختیار کر لیتے تھے، حکومت کا انحصار بظاہر فوجی قوت پر تھا، لیکن عملاً وہ فیض رسان تھا، رعایا کی تمام پرانی چیزین باقی رہنے دی گئین، ان کے رسم ورواج کو قائم رکھا گیا، جس سے ملک کو ترقی ہوتی رہی، اور لامذہبیت کو روکے رکھا گیا، امن وامان پر زیادہ

زور دیا گیا، مغلوں کے شخصی استبداد میں مستعدی اور ہوشمندی تھی، اس لئے وہ کامیاب رہا، ازمنۂ وسطیٰ میں اصلی خطرہ انار کی یعنی طوائف الملوکی کا پھیلنا تھا، کسی کے ہاتھ میں تمام اقتدار کا مرکوز ہو جانا خطرہ نہیں سمجھا جاتا تھا، مغلوں نے ملک میں تخریبی عناصر کو کبھی بڑھنے نہیں دیا، قانون کا اقتدار اعلیٰ کامیابی کے ساتھ ہر حال میں برقرار رکھا گیا، گو زیادہ تر بادشاہ کی خواہش ہی کا نام قانون ہوتا ہے لیکن لوگوں نے اس زمانہ کے طرزِ حکومت کو آسانی سے تسلیم کر لیا تھا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ طرز اُن کے سیاسی خیالات و رجحانات کے مطابق تھا، اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مغل مطلق العنان ضرور تھے لیکن اس کے ساتھ بڑے مدبر اور سیاست دان بھی تھے،

"ص، ع"

کثیر التصانیف مصنفین

قدیم مسلمان علما و مصنفین میں بہت سے ایسے اہلِ قلم پیدا ہوئے جن کی تصانیف کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، اور ان کی تحریر کا اوسطا روزانہ کئی کئی جز پڑتا ہے، ہر قوم اور ہر زمانہ میں کثیر التصانیف اہلِ قلم موجود رہے ہیں، چنانچہ یورپ کے بہت سے ایسے مشہور ناول نگار ہیں، جنھوں نے بے شمار ناول لکھے، ڈوما نے بارہ سو جلدیں لکھیں، لوپ ڈی وی گا نے اٹھارہ سو ڈرامے لکھے، عورتوں میں مرجوری بوون کی تصانیف میں ایک سو ساٹھ ناول ہیں، وہ کبھی مرد اور کبھی عورت کے نام سے اپنی کتابیں شائع کرتی تھی، مسز ہمفری وارڈ اور ایولن ایورٹ گرین نناونو ناولوں کی مصنفہ ہیں، مسز اولی فینٹ نے ایک سو بیس ناول لکھے، ای فلپس اوپنہیم کے نام سے تقریباً دو سو ناول شائع ہوئے، ایک فرانسیسی اہلِ قلم ایبل ہرمنٹ کے ناولوں ڈراموں، افسانوں اور مضامین کی تعداد سو سے زیادہ تھی، رابرٹ ہوپ مون کریف نے دو سو کتابیں تصنیف کیں، وہ بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے قصے بھی اسکارٹ اراہو کے نام سے لکھا کرتا تھا، پادری اس بارنگ گولڈ نے

تین سو معیاری کتابیں لکھیں، ان میں بہت سی ایسی بھی ہیں جو برسوں کی تحقیقات کا نتیجہ ہیں، مشہور ناول نگار جی۔ پی۔ آر۔ جیمس نے نوے کتابیں لکھ کر شہرت حاصل کی، ایڈگر ویلیس زود نویسی میں ضرب المثل تھا، اور وہ خود لکھنے کے بجائے بول کر دوسروں سے قلمبند کراتا تھا، اس نے ڈیڑھ سو ناول، چودہ ڈرامے اور ہزاروں مضامین اور افسانے لکھے، اس کا خود بیان ہے کہ اس نے ۱۹۲۷ء میں یعنی ایک سال میں چھ ڈرامے اور چھبیس ناول لکھے، ایچ جی ویلس کی تصانیف کی فہرست بڑی لمبی ہے، اس کے ناول، افسانے، اور دوسری سیاسی اور عمرانی تصانیف کی تعداد ایک سو اسی سے اوپر ہے، ارنلڈ بینیٹ نے زیادہ عمر نہیں پائی، اور اپنی مختصر زندگی میں ستر کتابیں لکھیں، سروالٹر اسکاٹ اور مسز کریک دونوں نے ساٹھ ساٹھ کتابیں تالیف کیں، والٹے نے ایک سو چالیس کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں، ہیل زیک نے پچاسی کتابیں تصنیف کیں، ان میں بعض بہت ضخیم تھیں، کوپن ہاڈ ایک دن میں ۳۵۰ اور ڈبلیو ڈبلیو جیکبس ۲۵۰ الفاظ لکھا کرتا تھا، بعض مشہور ناول نگار تین ہزار الفاظ تک روزانہ لکھتے ہیں، ایڈن فل پوٹس کی عمر اسی سال سے زیادہ تجاوز کر چکی ہے، برنارڈ شا کا سن بھی نوے سال سے زیادہ ہے، اور ان دونوں کی زندگی میں مختلف قسم کے مشاغل رہے ہیں، تاہم وہ اب تک لکھتے رہتے ہیں، فل پوٹس نے بیس ناول اور بیسیوں قصے اور ڈرامے لکھے، برنارڈ شا کے ڈرامے کی تعداد تو گنی جا سکتی ہے، لیکن اس کے مقالات، تنقیدی مضامین، ہجویات، بے شمار خطوط اور تقریروں وغیرہ کا شمار آسان نہیں ہے، وہ بوڑھا ہو چکا ہے، لیکن کام کرنے میں اب تک نہیں تھکتا، وہ اپنے سامنے گھڑی رکھ کر ہر پندرہ منٹ کے بعد ڈھائی سو الفاظ لکھتا ہے، وہ عموماً صبح کے ناشتے سے پہلے لکھا کرتا ہے، اس نے جو ناول لکھے ہیں، وہ بہت مفید ہیں، زین گرے نے بھی بہت سی دلچسپ اور حیرت انگیز کتابیں لکھیں، لکھتے وقت اس میں مشین کی جیسی تیزی اور باقاعدگی ہوتی ہے، اگاتھا کرسٹی نے پچاس طلسمی ناول لکھے، جو سب کے سب بہت

مشہور ہوئے، یو تھومار گنگش ۱۸۹۹ء سے اپنی موت تک ہر سال ایک کتاب لکھ کر شائع کرتا رہا،

جی ٹی ہی پی فرانس کی مشہور افسانہ نگار خاتون ہے، یہ کریمیا کی جنگ سے پہلے پیدا ہوئی، اور ۱۹۲۶ء تک برابر لکھتی رہی،

بہت سے ایسے اہل قلم گذرے ہین جنھون نے بہت کثرت سے لکھا لیکن بہت زیادہ مشہور نہ ہوسکے، ایک ناول نگار نے ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان تیس ناول لکھے، لیکن اس نے زیادہ شہرت نہین پائی،

ص، ع

اقبال کامل

از

مولانا عبد السلام صاحب ندوی

ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ وشاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابین لکھی گئین لیکن ان سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایان نہ ہوسکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کیلئے لکھی گئی ہے، اس مین ان کے مفصل سوانحِ حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوؤن کی تفصیل کی گئی ہے، پہلے سوانح حیات ہین، اس کے بعد ان کی اردو شاعری، پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور اُن کے کلام کی تمام ادبی خوبیان دکھلائی گئی ہین، پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعون یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریۂ ملیت تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف یعنی عورت، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، ضخامت چارسو صفحے قیمت ۲ روپیہ ۸

"منیجر"

ادبیات

رنگِ تغزل

از

جناب عارف عباسی بلیاوی

"معارف کے ذریعہ متعدد شعراء ادبی حلقہ مین روشناس ہوئے آج ایک ایسے نوجوان و ہونہار شاعر کا تعارف کرایا جاتا ہے جس سے کم لوگ واقف ہونگے، نئے شعراء مین بہتون نے جگر کے رنگ مین کہنے کی کوشش کی مگر وہ نقالی سے آگے نہ بڑھ سکے، لیکن عارف کا تغزل جگر کے رنگ مین اتنا ڈوبا ہوا ہے کہ اگر تخلص موجود نہ ہو، تو یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ یہ جگر کی غزل نہیں ہے، ابتدائی مشق مین یہ رنگِ تغزل اُن کے مستقبل کے لئے فال نیک ہے"، "م"

جس جگہ عشق کو احساسِ نظر ہوتا ہے — عالمِ حسن وہین زیر و زبر ہوتا ہے

لالہ و گل کہین خورشید و قمر ہوتا ہے — حسن ہر رنگ مین فردوسِ نظر ہوتا ہے

ایک وہ بھی طلبِ دوست کی منزل ہی جہان — وقت خود ساتھ مرے گرمِ سفر ہوتا ہے

کعبہ بھی راہ مین ہے، جلوہ گہِ ناز بھی ہی — دیکھنا ہے کہ مرا عزمِ سفر ہوتا ہے

اب مٹی جاتی ہے یہ لذتِ ناکامی بھی — کیا قیامت ہی کہ آہون مین اثر ہوتا ہے

ہر طرف چشمِ تمنا نگران ہے لیکن — تیرا جلوہ کہین پابندِ نظر ہوتا ہے

وسعتِ کون و مکان ڈوب کے رہجاتی ہی — وہ بھی عالم کبھی اے دیدۂ تر ہوتا ہی

میری اس نیند پہ بیداری کونین نثار آنکھ لگتے ہی ترے پاؤں پہ سر ہوتا ہے

ہائے اس سوختہ سامان کا مقدر عارف

ایک جلوہ میں جو برباد نظر ہوتا ہے

حشر جذبات

از جناب ثاقب صاحب کانپوری

جہان عشق میں یہ انقلاب کیا کم ہے قرار ہو کہ نہ ہو اضطراب کیا کم ہے

شعاع حسن سے رنگین نقاب کیا کم ہے کہ تیرے لطف سے تیرا عتاب کیا کم ہے

سمجھ نہ عشق میں آزار اس ودیعت کو دل خراب بحال خراب کیا کم ہے

سکون دل کا تو مژدہ کسی کو اور سنا ترے خیال میں یہ پیچ و تاب کیا کم ہے

ہے آشیان میں بھی بیچارگی کا اک عالم نہیں قفس تو قفس کا خواب کیا کم ہے

وہ جس نے جادۂ الفت میں جان تک دیدی کسی کی راہ میں وہ کامیاب کیا کم ہے

یہی ہے عشق میں وجہ سرور کیف و نشاط جبین آنکھوں میں یہ رنگ خواب کیا کم ہے

کروں میں اپنی تباہی کا اُس سے کیا شکوہ ہجوم غم میں وہ چشم پرآب کیا کم ہے

وہی ہے اب بھی ترے التفات کا عالم خراب عشق ترا کامیاب کیا کم ہے

نہیں ہے ہجر میں نظارۂ جمال اگر کنار آب و شب ماہتاب کیا کم ہے

حیات عشق تھی پابند جس سے اے ثاقب

یہ سوچتا ہوں کہ وہ اضطراب کیا کم ہے

———•———

مطبوعات جدیدہ

جامع المجددین از جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۵۶۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد، – صر پتہ: شبستان قدم رسول، ہارڈنگ روڈ، لکھنؤ۔

اسلام چونکہ آخری اور ابدی مذہب ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نیا نبی اور اسلام کے بعد کوئی نیا دین آنے والا نہیں ہے، اور امت مسلمہ ساری دنیا کی قوموں کے لئے شاہد اور نمونہ بنائی گئی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں ایسے صلحاء و اخیار و مصلحین و مجددین پیدا کرتا رہا، جو اسلام اور مسلمانوں کی تجدید و اصلاح کا فرض انجام دیتے رہے، اس مفہوم کی حدیثیں بھی ہیں، اور اسلام کی تاریخ بھی اس پر شاہد ہے، اس دور کے مسلمانوں کی پوری زندگی اسلام کی شاہراہ سے ہٹ گئی ہے، اور مذہب و معاشرت، حکومت و سیاست، علوم و فنون، عقائد و عبادات، معاملات و اخلاق، زندگی کا ہر شعبہ اصلاح کا محتاج ہے، اس لئے یہ زمانہ بھی مصلحین و مجددین سے خالی نہیں، اور بہت سے صلحاء و اخیار اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اصلاح و تجدید کی خدمت انجام دیتے رہے، لیکن جو جامعیت حضرت مولینا اشرف علی رحمۃ اللہ کی تجدید و اصلاح میں پائی جاتی ہے، وہ کسی دوسرے مصلح میں نظر نہیں آتی، انھوں نے خواص و عوام، علماء و جہلاء، عورت مرد، ہر طبقہ اور ہر صنف کے معاملات و مسائل اور مذہب و معاشرت و سیاست وغیرہ کے دقیق سے دقیق مسائل سے لے کر روزانہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں تک کی جن کی جانب نظر بھی نہیں جاتی اصلاح فرمائی ہے، اور دین و دنیا کے جملہ معاملات کے متعلق صحیح اسلامی تعلیمات کو پیش کر کے اسلامی زندگی کا ایسا قدآدم آئینہ بنا دیا ہے جس میں ہر مسلمان اپنی صورت دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ کہاں تک

اسلام کے مطابق ہے، اور اس کے کون کون سے گوشے اصلاح کے محتاج ہین، فاضل مرتب نے جو اس سے پہلے حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف و مواعظ و ملفوظات سے سلوک و تصوف کی تجدیدات کو مرتب کر چکے ہین، اب جامع المجددین کے نام سے مسلمانون کی دینی و دنیاوی زندگی کے متعلق حضرت کی ہمہ گیر اصلاحات و تجدیدات کو مرتب فرمایا ہے، اور اپنی تعلیق و تشریح سے اس کو نہایت مؤثر و دلنشین بنا دیا ہے، جس کے ذریعہ ہر مسلمان اپنی خامیون اور کوتاہیون کی اصلاح کر کے اپنی زندگی کو صحیح اسلامی سانچے مین ڈھال سکتا ہے، مباحث و مسائل کے تنوع کثرت اور جامعیت کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، کتاب کے شروع مین حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہٗ کے حقیقت شناس قلم سے ایک فاضلانہ اور حکیمانہ مقدمہ ہے، اس مین ایک طرف منصب تجدید کی حقیقت و ضرورت اس کی تاریخ اور حضرت مولینا رحمہ اللہ کی تجدیدی جامعیت کی تفصیل ہے، دوسری طرف ان خطرات کو بھی دور فرمایا ہے، جو تجدید و مجددیت کے عقیدہ مین افراط و تفریط سے پیدا ہو سکتے ہین، اور خود مولانا رحمۃ اللہ کی تحریرون سے اس کی وضاحت فرما دی ہے کہ "کسی مجدد کا مجدد ہونا اذعانی اور یقینی مسئلہ نہین ہے، اور نہ اس کے دعویٰ پر موقوف ہے، بلکہ خواص امت کو اس کے دینی کارنامون کی بنا پر یا خود اس شخص کو اپنی کوششون کی مقبولیت کی بنا پر یہ گمان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس صدی کا مجدد بنا کر بھیجا ہے (ص ۱۷) یا "مجدد کو مجدد ماننا ایمان کا ادنیٰ جز بھی نہین ہے، خصوصًا کسی ایک زمانہ کے کسی خاص مجدد کو مجدد تسلیم کرنا بھی ضروری نہین ہے" (ص ۲۰) بلکہ یہان تک احتیاط فرمائی ہے، کہ "اس تالیف کا مدعا کسی شخص کی مجددیت کے دعوی کی تشہیر یا منصب تجدید کی دعوت و تلقین نہین ہے، بلکہ یہ مصنف و مرتب (جامع المجددین) کی عقیدتمندانہ تعبیر ہے، کہ وہ حضرت (مولانا اشرف علیؒ) کی اصلاحی مساعی کو تجدیدات کے نام سے یاد کرتے ہین (ص ۲۴) ان تشریحات کی اس لئے ضرورت تھی کہ مجددیت کے عقیدہ مین افراط و تفریط نے بڑے بڑے فتنے پیدا کئے ہین، اسی لئے خود حضرت مولانا رحمہ اللہ نے بھی دوسری اصلاحات کی طرح اس عقیدہ کی

بھی اصلاح کی ضرورت سمجھی تھی، یہ کتاب اپنے گوناگون فوائد کے لحاظ سے مسلمانون کے مطالعہ کے لائق تو ہی ہے اسکے بہت سے مسائل سے غیر مسلم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہین، اللہ تعالیٰ مصنف کو اس خدمت دین کی جزائے خیر دے،

نور النور از مولانا غوث علی شاہ صاحب قادری چشتی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۳ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت نفیس قیمت مجلد ۔ غیر مجلد ۔ پتہ :- (۱) بیت النور جھنگی گوڑہ (۲) مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن،

اس کتاب مین مسئلہ وحدۃ الوجود کا اثبات اوراس کی تشریح کی گئی ہے، دیباچہ نگار کا بیان ہے کہ "اس مین توحید حقیقی (وحدۃ الوجود) خود شناسی و حق شناسی کا صحیح راز کتاب و سنت کے مطابق آسان فہم ہے، دوران عام خیال، غلط فہم بے تحقیق اور ادھ کچے اسلامی خیالات کے مدعیون کی غلط فہمیون کو دور کیا گیا ہے، جو عنوان وحدۃ الوجود کے صحیح اعتبار کو جو مترادف توحید حقیقی ہے یعنی فہم لا الہ الا اللہ اور آیت ہو ہیت ہے، اپنی نافہمی سے غیر اسلامی اور ہندی وغیرہ سمجھتے ہین" راقم نے اس کتاب کو غور و تامل سے پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی، لیکن یہ اسکا قصور فہم ہے، یا مصنف کا انداز بیان اتنا پیچیدہ ژولیدہ اور متصوفانہ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ سمجھنے سے قاصر رہا، یہ انداز تحریر عوام کیا خواص اور تعلیم یافتہ طبقہ کے فہم سے بھی باہر ہے جن لوگون کو اس کا ذوق ہے وہ شاید اس چیستان کو سمجھ سکین، اور اس مین ان کی دلچسپی کا کوئی سامان ہو، ورنہ عام مسلمانون کے لئے اس قسم کی کتابون سے کوئی فائدہ نہین، بلکہ ان سے گمراہی کا اندیشہ ہے، اور جو لوگ توحید کے اس مقام پر فائز ہین، اُن کے لئے اس کے اثبات کی ضرورت نہین،

کارنامہ اسلام از جناب میان بشیر احمد صاحب بیرسٹرایٹ لا اڈیٹر ہمایون تقطیع اوسط ضخامت ۲۱۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۔ پتہ مکتبہ :- رسالہ ہمایون نمبر ۳۲ لارنس روڈ لاہور،

مصنف نے جن کو تاریخ اسلام سے ذوق اور اس پر اُن کی نظر بھی ہے اس کتاب مین اسلام اور مسلمانون کی تیرہ سو سالہ تاریخ پر اجمالی تبصرہ کیا ہے، اور دنیا مین اسلام کے انقلاب انگیز اثرات و نتائج مسلمانون کے سیاسی علمی اور تمدنی کارنامون اور تاریخ اسلام کی تمام قابلِ ذکر حکومتون کا اجمالی نقشہ اور ان کا عروج و زوال دکھایا ہے اور قیام پاکستان تک ہندوستان کے مسلمانون کی مختصر سرگذشت بیان کی ہے جس سے مسلمانون کا سیاسی مدوجزر سامنے آجاتا ہے، اس کو رنگین نقشہ سے بھی دکھایا گیا ہے، کتاب کے آخر مین ڈاکٹر اقبال مرحوم کے منتخب ولولہ انگیز اشعار بھی دیدیئے ہین، اس کے مطالعہ سے مسلمانون کے شاندار ماضی کے ساتھ ان کا مستقبل بھی درخشان نظر آتا ہے، البتہ وہابی سنوسی اور اتحادِ اسلامی کی مذہبی و اصلاحی تحریکون مین بانی تحریک کو شامل کرنا تعجب انگیز ہے، اس کو سرے سے اسلام ہی کو کوئی علاقہ نہین، تو اصلاح کا کیا ذکر ہے،

کلمۂ طیبہ کی حقیقت (از مولانا منظور صاحب نعمانی اڈیٹر الفرقان تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ ر پتہ:- مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ،

کلمۂ طیبہ کا حقیقی مقصد محض زبان سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار نہین ہے، بلکہ اس مختصر کلمہ مین اسلامی عقائد و اعمال کی پوری روح پوشیدہ ہے البتہ اس کے مدارج ہین، زبان سے اقرار اس کا ادنیٰ ترین درجہ ہے، اور آخری درجہ تفویض کامل یعنی تمام اعمال اور پوری زندگی کو مرضی الٰہی کے تابع کر دینا ہے، اس رسالہ مین اسی نقطۂ نظر سے کلمۂ طیبہ کی تشریح کی گئی ہے، اور غیر اللہ کی نفی، توحید الٰہی اور رسالت محمدی کی تصدیق کا حقیقی مفہوم و منشا، اُس کے مدارج، اس کے حصول کی تدبیر، عقائد و اعمال مین اس کے آثار و نتائج محبت رسول وغیرہ کلمہ طیبہ کے تمام مضمرات، و متعلقات کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے، رسالہ گو مختصر لیکن نہایت مفید، اور مسلمانون کے مطالعہ کے لائق ہے، انداز بیان مؤثر و دلکش ہے،

عربی سیکھنے کا آسان طریقہ از جناب مولوی عبد الرحمٰن صاحب طاہر سورتی، فاضل آد

تقطیع اوسط، ضخامت ۱۹۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ

پتہ :- انجمن ترقی عربی ہند، محمد علی روڈ ممبئی ۳

یہ اردو میں عربی قواعد کی کتاب ہے، مصنف نے اس میں جدید طرز کے مطابق صرف و نحو کے اسباق مرتب کیے ہیں، کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو عربی زبان کا صحیح مذاق اور تعلیم کا بھی تجربہ ہے، اور انھوں نے اس نئی کتاب کی تالیف میں دونوں امور کا لحاظ رکھا ہے، اردو میں عربی قواعد کی جتنی کتابیں نظر سے گذریں ان سب میں یہ بہتر نظر آئی، اس کے ذریعہ جلد اور آسانی سے عربی زبان سیکھی جا سکتی ہے، خصوصاً جو تعلیم یافتہ اشخاص عربی سیکھنا چاہیں ان کے لیے زیادہ کارآمد ہے،

نوائے حیات: (طبع دوم) از جناب یحییٰ اعظمی تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحات کاغذ،

کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد للعہ غیر مجلد عہ، پتہ :- دار المصنفین اعظم گڈھ

ناظرین معارف جناب یحییٰ اعظمی کے کلام سے پوری طرح واقف ہوں گے، کئی سال ہوئے اس کا مجموعہ نوائے حیات کے نام سے شائع ہوا تھا، اب مزید ترمیم و اضافوں کے ساتھ دوسرا ایڈیشن نکلا ہے، اس مجموعہ کا بیشتر حصہ منظومات پر مشتمل ہے، کچھ غزلیں بھی ہیں، مصنف کے کلام میں بڑا اعتدال و توازن ہے، جو نئے شعراء میں کم پایا جاتا ہے، اس میں مذہبی و ملی روح بھی ہے وطنی و قومی حرارت بھی، جذبات و تاثرات اور واقعات و مناظر کی مصوری بھی، تغزل کی رنگینی و لطافت بھی، اور مشق و مہارت کی پختگی بھی، غرض یہ مجموعہ شاعری کے تمام ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ اسم بامسمّیٰ اور صاحب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

"م"

*

جلد ۶۶ ماہ ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۰ء عدد ۳

مضامین

مقالات

باب المراسلہ والمکاتبہ

استفسار وجواب

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

افسوس ہے کہ ہماری بزم دوشین کی وہ آخری یادگار شمع بھی خاموش ہوگئی جس سے مدتون بزم کمال منور رہی یعنی ارا گست کو نواب صدر یار جنگ مولینا حبیب الرحمن خان شروانی نے چھیاسی سال کی عمر مین اس خاکدان سفلی کو داغ کیا، عمر طبعی کو پہنچنے کے بعد موت ناگزیر ہے لیکن بعض مرنے والون کے ساتھ ایک پورا عہد اور پوری تاریخ دفن ہو جاتی ہے، مولانا شروانی مرحوم کا حادثہ وفات انہی مین ہے، وہ مشرقی و اسلامی تہذیب و شرافت کا نمونہ اور علم و عمل فضل و کمال دین وتقوی، وقار و متانت اخلاق و تواضع کا پیکر اور تنہا ایک عالم تھے، کامل ساٹھ سال تک مسلمانون کی قومی زندگی سے وابستہ رہی اس لئے ان کی وفات شخصی نہین بلکہ قومی حادثہ اور ایک مرقع کمال اور قدیم تہذیب و شرافت کا ماتم ہے،

اللہ تعالی نے ان کو دنیا وی دولت و جاہت سے بھی نوازا تھا، وہ خاندانی رئیس تھے، اور اپنے اوصاف مین دور زوال کے امراء سے بالکل مختلف تھے، وہ خود صاحب علم، اصحاب علم کے قدردان، علم دوست، علما نواز، اور علم وفن کے شیدائی اور سرپرست تھے، ان کی پوری زندگی علمی مشاغل مین گذری، مسلمانون کی علمی و تعلیمی تحریکون مین ان کا نمایاں حصہ رہا، وہ ابتدا سے مدرستہ العلوم مسلم یونیورسٹی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے رکن رکین معاون و مددگار، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری انجمن ترقی اردو کے سرپرست اور مجلس دار المصنفین کے صدر نشین تھے، عرصہ تک ریاست حیدر آباد کے شعبۂ امور مذہبی کی صدارت پر فائز رہے، ان کے خدمات کی فہرست بہت طویل ہے، کوئی علمی و تعلیمی ادارہ انکی اخلاقی امداد و اعانت سے محروم نہ تھا، مسلم یونیورسٹی نے ان خدمات کے اعتراف مین ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی،

وہ عربی کے عالم، فارسی کے ذوق شناس، انگریزی سے واقف، اردو کے صاحب طرز ادیب اور نکتہ سنج،

سخن فہم اور سخن گو تھے، ان کا ادبی ذوق بڑا ستھرا اور پاکیزہ تھا، اسلامی علوم و فنون اور مسلمانوں کی علمی تاریخ سے انکو عشق تھا، ان کا مشغلہ خالص علمی تھا، مختلف مذہبی، علمی، ادبی اور تاریخی موضوعوں پر دو درجن سے زیادہ چھوٹی بڑی تصانیف ایک مجموعۂ مضامین مقالات شروانی اور دیوان فارسی، ان کی علمی یادگار ہیں، نادر کتابوں کا بڑا شوق تھا خود اپنی تلاش و محنت اور زر کثیر صرف کر کے ایک عمدہ کتب خانہ جمع کیا، جو نوادر کتب کا بیش قیمت ذخیرہ ہی، اس کو اپنی زندگی میں مسلم یونیورسٹی پر وقف کر گئے تھے،

ان کی ذات میں جدت و قدامت کا بڑی لطیف امتزاج تھا، وہ خود پرانی تعلیم و تہذیب کی یادگار لیکن زمانہ کے حالات و ضروریات سے واقف تھے ان کا وطن علی گڈھ مغربی تعلیم کا مرکز تھا، اس لئے وہ جدید تعلیم اور نئی مفید تحریکوں کے حامی و مددگار تھے لیکن اس کے سحر سے مرعوب و مسحور نہ تھے، اور جدید تعلیم و تہذیب میں بھی اسلامی روح دیکھنا چاہتے تھے قدیم تہذیب سے والہانہ شیفتگی تھی ان کی تحریروں میں جہاں اس کا ذکر آجاتا، اور ان کی بہت کم تحریریں اس ذکر جمیل سے خالی ہوتی تھیں، ان کا قلم بے قابو ہو جاتا، اور ان کی تحریر قدیم تہذیب کا مرثیہ بن جاتی،

صورۃً خوش جمال، کشیدہ قامت، اور طبعاً نفاست و لطافت پسند تھے، وضع قطع، لباس، رفتار و گفتار نشست و برخاست ہر چیز میں تہذیب و نفاست نمایاں تھی، بڑے خوش لباس اور جامہ زیب تھے بڑھاپے کے نور نے اس میں اور زیادہ لطافت اور جذب و کشش پیدا کر دی تھی، زندگی کے تمام معمولات میں وضعداری کی شان تھی، پوری زندگی کسی معمول میں کوئی فرق نہیں آیا، اُن کے تعلقات بہت وسیع اور مختلف و متضاد مذاق و مشرب کے لوگوں کے ساتھ تھے، جن کو آخر تک نباہا، سیاست سے طبیعت کو ذوق و مناسبت نہ تھی، اور اس خارزار سے ہمیشہ دامن بچایا، لیکن بہت سے اصحاب سیاست سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے جو برابر قائم رہے اور ان پر اختلاف رائے و خیال کا اثر نہ پڑنے پایا، مولانا شبلی مرحوم سے اُن کے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے، جو اُن کے بعد دارالمصنفین کے ارکان کے حصہ میں آئے اور

آخر تک برابر قائم رہی، وہ دار المصنفین کے محض قانونی صدر نہ تھے، بلکہ اس کے اور اس کے کارکنوں کیساتھ ان کو دلی تعلق تھا، چنانچہ پیرانہ سالی میں کئی مرتبہ اس اجڑے دیار میں آنے کی زحمت گوارا کی جب آنا ہوتا تو بلا لحاظ عمر و مرتبہ ہر شخص کی قیامگاہ پر جاکر ملتے، اور بڑی شفقت و محبت سے خیریت و حالات پوچھتے اب اس وضعداری کی مثال کہاں ملیگی،

مرحوم کی ذات پر ایک عزیز دور اور اس کی خصوصیات کا خاتمہ ہوگیا، جس کا ذکر اب صرف تاریخ کے اوراق میں ملے گا، اللہ تعالیٰ اس مرقع کمال کی تربت پر رحمت و مغفرت کے پھول برسائے اَللّٰھُمَّ صبب علیہ سبیب رضوانک برحمتک یا ارحم الراحمین۔

دار المصنفین کے ساتھ مرحوم کے گوناگوں تعلقات تھے، اس لئے آیندہ کسی نمبر میں انکے تفصیلی حالات پیش کئے جائینگے،

اخبار نوائے وقت لاہور کے ایک نوٹ سے معلوم ہوا تھا، کہ سیوہارہ کے کسی تاجر کتب نے سر اقبال مرحوم کی بعض کتابیں چھپوائی ہیں لیکن پھر اخبار الجمعیۃ کے بیان سے معلوم ہوا، کہ کتابیں حیدرآباد کے کسی تاجر نے چھپوائی تھیں اور سیوہارہ کے تاجر نے صرف اُن کے ٹائٹل چھپوائے ہیں، جس نے بھی کتابیں چھپوائی ہوں ہندوستان کے کسی شخص کا پاکستان کی کتابیں چھپوانا صد درجہ نازیبا اور بڑا اخلاقی جرم ہے، اگر یہ صورت قائم رہی تو ہندوستان اور پاکستان دونوں کے مصنفوں اور علمی و تجارتی اداروں کو بڑا نقصان پہنچیگا، اور قانونی بندش کے بغیر محض اخلاقی اثر سے اس کا انسداد نہیں ہو سکتا، اور دونوں ملکوں کا نفع و نقصان اس سے متعلق ہے اس لئے انکی حکومتوں کو اس کی جانب توجہ کرنا چاہئے، اور ایسا قانون بنا دینا چاہئے کہ ایک ملک کی کتابیں بغیر اجازت کے دوسرے ملک میں نہ چھپ سکیں، اور اخبارات کو ایسے جری اور بددیانت ناشروں کا پردہ فاش کرنا چاہئے کہ اس سے کچھ تو اُن کو عبرت حاصل ہو،

مقالات

الجزیہ

(۳)

از مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دار المصنفین

یہ ثابت ہونے کے بعد کہ جزیہ موجودہ معاشی معیار سے ایک بہترین محصول ہے، آیندہ یہ دکھایا جائیگا کہ اسلام کے علماے معاشیات نے اس پر کس حیثیت سے بحث کی ہے، ہم نے جہاں جزیہ کے سات نظریات بیان کئے ہیں، وہین مبسوط کے حوالہ سے یہ بھی دکھایا ہے کہ جزیہ کی حیثیت محصول مکان کی ہے، یہ حیثیت کس طرح نمایان کی گئی ہے؟ اس کا جواب آگے آتا ہے؛

معاشیات کے متعدد مسائل کی طرح محصولِ مکان کی بحث بھی معمول سے زیادہ پیچیدہ اور توجہ طلب ہے، تاہم مختصراً بعض اہم پہلوؤن پر روشنی ڈالی جاتی ہے، محصول سے مراد مکان کی ملکیت کا خراج ہے، لیکن اسلام نے غیر مسلمون کے ساتھ جو رعایتین کی ہین، ان مین ایک یہ بھی ہے کہ مکان کو غیر مسلم کی ملکیت[1] تصور کرتے ہوئے بھی وہ اس سے ملکیت کا محصول طلب نہین کرتا، بلکہ سکونت کا محصول مانگتا ہے، اس طرح زمین کے متعلق مکاندار کی اصلی پوزیشن کو قائم رکھتے ہوئے بھی اسلام وصولی محصول کے وقت اس کو گویا یہ دائن[2] فرض کر لیتا ہے۔

---

[1] مبسوط ص ۸۱ جلد ۱۰ فانما الیسکن دار نفسہ یہ مصنف کا نظریہ ہے؛ [2] ایضاً صفحہ مجلد ۱۰، ولا یسکن بین المسلمین فی دار الغیر الا بکراء یہ معاشی علماء کا خیال ہے،

اور اس پر ہلکا ٹکس لگتا ہے، پھر دوسری رعایت یہ بھی ہو کہ ۲۰۰ درہم سے کم آمدنی والے پر کرایہ کا کوئی محصول نہین اور وہ مستثنی ہے،

مسلمان معاشی علما نے محصولِ مکان کے نظریہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ فقیر کو مکان کے لئے ایک درہم (چار آنہ) ماہوار دینا کافی ہے، متوسط الحال کو اس سے زیادہ کی ضرورت ہے، اس لئے اس کا دوگنا (دو درہم یا آٹھ آنے ماہوار) ہونا چاہئے، اور جو بہت بڑا غنی ہو، اس کی بھی یہی حالت ہے، (یعنی اس کو متوسط الحال سے بھی زیادہ بڑے مکان کی ضرورت ہوتی ہے) اس لئے دو درہم کا دوگنا چار درہم یا ایک روپیہ ماہوار اس کا کرایہ ہونا چاہئے، یہ نظریہ مبسوط (ص ۸، جلد ۱۰) مین درج ہے، اور اس کو پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ مکان کو مالی حالت کا معیار فرض کیا گیا ہے،

گذشتہ عنوان مین جن چھ قانونون کا حوالہ دیا گیا ہے، جزیہ محصول مکان ہونے کے بعد بھی ان کا پابند نظر آتا ہے، مثلاً اس کی پیداآوری یہ ہے کہ ۲۰۰ درہم سے کم مالیت والون پر عائد نہ ہونے کے باوجود اس کی مقدار معقول رہتی ہے، کفایت یہ ہو کہ اس کی فراہمی مین زیادہ خرچ نہین پڑتا، نہ مقدار معین سے زیادہ دینا پڑتا ہے نہ ترقی دولت اور مرفہ الحالی مین مزاحم ہے، کیونکہ اس کی شرح مناسب ہے، عدل یہ ہو کہ کرایہ مکان (در اصل خود مکان) کی حیثیت مکاندار (اب کرایہ دار) کی مالی حالت کے مطابق ہے، (بلکہ در اصل مکان کی حیثیت کرایہ سے بدرجہا زیادہ ہے) تغیر پذیری یہ ہے کہ معاشی ترقیون کے ساتھ مکانات کی قیمت اور کرایہ بڑھتا رہتا ہے، تعین خود اختیاری ہے، سہولت ظاہر ہے،

کیا جزیہ فرقہ وارانہ محصول ہے؟ معاشیات مین یہ بھی معیوب سمجھا جاتا ہے کہ کسی ملک مین فرقہ وارانہ محاصل قائم کئے جائین، ہمارے ملک کے سفری پرندے جو بقول مسٹر ہولینڈ ہندوستان کے ذریعہ انگلستان کو تونگر بنانا چاہتے ہین[۱]

---

[۱] مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب ص ۳۰، از جے سی کمار اپا ایم اے، بی ایس سی، مترجمہ قاضی محمد حسین بحوالہ انڈیا ان ٹرانزیشن، ...

اسلام کو اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہین کہ اوس نے فرقہ وارانہ محصول غیر مسلمون پر قائم کیا تھا، اور اس طرح معاشی حیثیت سے ایک فاش غلطی کی تھی، نظریۂ تولیت کے یہ مبلغین جب اس الزام کا اعادہ کرتے ہین تو ان کے چہرون پر فرحت و انبساط کی لہرین دوڑنے لگتی ہین، ہم الزامی جواب کے طور پر اگرچہ اس سلسلہ مین انگلستان کی تاریخ کے اس دور کو پیش کرسکتے ہین جس مین ٹیوڈر خاندان حکمران تھا، لیکن ایسا کرنے سے صرف ایک عیب کی پردہ پوشی ہوگی، جس کو ممکن ہے کہ معاشین کے لائق اور تعلیم یافتہ دماغ اپنی توہین خیال کرین، اس لئے ہم اصل حقیقت پر متوجہ ہوتے ہین،

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ محصول کا مفہوم ادا کرنے کے لئے عربی زبان مین دو لفظ پہلے سے موجود تھے، خراج اور جزیہ، اور دونون فرقہ واری اور ذلت کے مفہوم سے خالی تھے، اسلام کے بعد زمین کے محصول کا اصلاحی نام خراج رکھا گیا، جو (Land Tax) کا مرادف ہے، انسانون کی آمدنی کے محصول (Income Tax) کے دو نام رکھے گئے،

(۱) اگر وہ بشرح یک سیکڑہ کی شرح یا دوسری شرحون سے قائم کیا گیا ہو، اور اس کا طریقہ آج کل کے محصول مجموعی (Plural Taxation) کا ہو تو اس کا نام زکاۃ ہے، اور یہ مسلمانون سے لیا جاتا ہے) اس مین بہت سی چیزون کی زکاۃ وصول کی جاتی ہے، اور بحیثیت مجموعی زکاۃ دینے والون پر مساوی بار پڑتا ہے۔)

(۲) اور اگر محصول مجموعی کے طرز پر ہونے کے باوجود مختلف طبقون کی مالی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف شرحون سے قائم کیا گیا ہو، تو اس کا نام جزیہ ہے، اور غیر مسلمون سے لیا جاتا ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ زکاۃ اور جزیہ کے نامون کا فرق، فرقہ وارانہ جذبات کی وجہ سے نہین پیدا ہوا بلکہ شرح محصول کے اختلاف کی بنا پر پیدا ہوا ہے، جس طرح انکم ٹکس، ہاؤس ٹیکس، ایمپریل ٹیکس، پرسنل اینڈ فرنیچر ٹیکس وغیرہ علٰحدہ علٰحدہ نام شرحون کے مختلف ہونے کی وجہ سے رکھ لئے گئے ہین،

کیا جزیہ بھاری محصول ہے؟ زکوٰۃ اور جزیہ کا بلا واسطہ متزاید محصول جو اسلام نے مسلمان اور غیر مسلموں پر لگایا تھا، اگرچہ شخصی حکومتوں کے زمانہ میں رائج نہیں ہو سکتا تاہم یہ اسلام کا حیرت انگیز معجزہ ہے کہ اس نے تمام ادوارِ حکومت (یعنی جمہوریت و شخصیت) میں یہ محصول ہمیشہ قائم رہا، اور آج کل کے سرمایہ داروں کے علی الرغم اوس زمانہ کے دولتمندوں نے اوس کو بطیب خاطر برداشت کیا، اس محصول کا تقرر دو مختلف اصول کو پیش نظر رکھ کر ہوا ہے،

(۱) اسلامی سلطنت چونکہ مسلمانوں کی قومی سلطنت تھی اس لئے محصول متزاید (Progressive Tax) کی وہ شکل اختیار کی گئی جس میں آمدنی کے اضافہ کے ساتھ ساتھ محصول کی رقم برابر بڑھتی جاتی ہے گو شرح ایک ہی رہتی ہے، اور اس محصول کا بار دولت مند طبقہ پر زیادہ پڑتا ہے،

(۲) اسلامی سلطنت چونکہ غیر مسلموں کی قومی سلطنت نہ تھی، اس لئے محصول متزاید کی دوسری شکل پسند کی گئی جس میں ہر طبقہ کی الگ الگ حسب حیثیت ایک ایک شرح ہوتی ہے تاکہ مجموعی طور پر کسی ایک طبقہ پر زیادہ بار نہ پڑے، اور رقم محصول میں شرح کی وجہ سے اضافہ نہ ہوسکے،

چونکہ یہ دونوں محصول (زکوٰۃ اور جزیہ) آج کل کی اصطلاح میں انکم ٹکس (Income Tax) کے جا سکتے ہیں، اس لئے مناسب ہوگا کہ انکم ٹکس سے جزیہ کا موازنہ کیا جائے تاکہ معترضین کو یہ نظر آئے کہ آج کل کا یہ مقبول ٹکس اسلام کے اس ناپسندیدہ محصول پر کیا فضیلت رکھتا ہے؟

انکم ٹکس کی شرح ۱۹۱۶ء تک یہ تھی،

آمدنی	شرح
ہزار سے لے کر دو ہزار سے کم تک	۴ پائی فی روپیہ
۲ ہزار ؍؍ ۵ ہزار ؍؍ ؍؍	۵ ؍؍ ؍؍
۵ ہزار ؍؍ ۱۰ ہزار ؍؍ ؍؍	۶ ؍؍ ؍؍
۱۰ ہزار ؍؍ ۲۵ ہزار ؍؍ ؍؍	۹ ؍؍ ؍؍

۲۵ ہزار سے لے کر زیادہ	۸ ارفی روپیہ،

۱۹۱۷ء مین سوپر ٹیکس (Super Tax) حسب ذیل ہوگا،

۲۵ ہزار سے لیکر ۵۰ ہزار تک	۱ ارفی روپیہ،
۵۰ " ایک لاکھ	۲ " "
ایک لاکھ " ڈیڑھ لاکھ	۲۰ " "
ڈیڑھ لاکھ " دو لاکھ	۳ " "
دو لاکھ سے لیکر ڈھائی لاکھ تک	۳۰ " "
ڈھائی لاکھ " اوپر	۴ " "

یہ بھی واضح رہے کہ اس مین عورتین، بچے، پاگل، بوڑھے، اپاہج، اور ہر صاحب آمدنی جو ایک ہزار سے اوپر کما تا ہو، سب شامل ہیں، ٹکس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے، البتہ جو ایک ہزار روپیہ سے کم آمدنی رکھتے ہین، وہ مستثنیٰ ہین، خواہ تندرست ہون یا بیمار، عورتین ہون یا مرد، بوڑھے ہون یا بچے،

جزیہ کی شرح یہ تھی، اور ہمیشہ یہی رہی،

فاضل رقم ؎ تک	؏ سالانہ
؎ سے لے کر ڈھائی ہزار تک	؏ سالانہ
ڈھائی ہزار سے " اوپر	؏ "

یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ عورتین، بچے، اور مخبوط الحواس جزیہ سے بالکل مستثنیٰ تھے، ان کے علاوہ اور لوگ جن کا کاروبار چلتا ہو، خواہ اس کو وہ خود چلاتے ہون، یا کارندون کے ذریعہ سے انجام پاتا ہو،

ل معارف: انکم ٹیکس کی موجودہ شرح اس سے کہین زیادہ ہے، جو شاید مضمون نگار کو معلوم نہ ہو سکی، اس حساب سے انکم ٹیکس کا بار ۱۹۱۷ء کی شرح سے بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے،

جزیہ ادا کرتے تھے،

فرض کیجئے کہ ایک شخص کے پاس ایک ہزار روپیہ ہے، تو ۴ پائی فی روپیہ کے حساب سے اس کو سال میں ۲۰/۱۲/۵ انکم ٹکس ادا کرنا پڑے گا، حالانکہ اس کے جزیہ کی رقم صرف ۳ سالانہ ہوگی، اسی طرح اگر ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپیے ہیں تو ان کا انکم ٹکس ۴ر فی روپیہ کے حساب سے ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ ہوگا، اور جزیہ صرف ۱۲/۵ر!

ناظرین انصاف فرمائیں کہ سوا لاکھ کی رقم گران ہے یا بارہ روپیے! اور انکم ٹکس رعایا کے لئے سہل و مفید ہے یا جزیہ ؟

جزیہ کا اثر معاشیات اسلام پر: شاید اس موازنہ سے یہ خیال پیدا ہو کہ جزیہ کا بار امراء پر بہت کم پڑتا تھا لیکن متوسطین اور غرباء اس کے بار کے نیچے دبے ہوئے تھے، اس لئے سلطنتِ اسلامیہ کی معاشی حالت کا سرسری طور پر جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ غیر مسلم اسلامی سلطنت کے زیر سایہ معاشی حیثیت سے کس حالت میں زندگی بسر کرتے تھے،

مسٹر ہوبسن (J. A. Hobson) نے کام اور دولت (Work and Wealth) میں اندازۂ تونگری کے لئے پیمانۂ زر کے بجائے انسانی خوشی کے ایک درجہ کو پیمانہ بنانا پسند کیا ہے[1] لیکن اسلام نے ایک درجہ کے بجائے انتہائی درجہ کو پیمانہ بنانا اپنا نصب العین قرار دیا تھا، چنانچہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پایۂ تخت کے ایک دور افتادہ صوبہ (عراق) کی سب سے کمزور آبادی (بیوہ عورتوں) کی بہترین معاشی حالت کو وفات سے ۴ روز قبل ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا[2]،

"اگر خدا نے مجھکو زندہ رکھا تو میں اہل عراق کی بیوہ عورتوں کو ایسی حالت میں چھوڑ جاؤں گا،

---

[1] مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب ص، از جے سی، کمارپا مترجمہ قاضی محمد حسین [2] صحیح بخاری کتاب المناقب باب قصة البیعة

کہ میرے بعد اُن کو کسی شخص کی امداد کی احتیاج باقی نہ رہے گی"،

اور اپنے خلیفہ کو عین اُس وقت جب وہ بستر مرگ پر تھے، غیر مسلموں کے متعلق یہ وصیت فرمائی تھی[۱]،

"اور میں اس کو اُن لوگوں کے حق میں وصیت کرتا ہوں، جن کو خدا اور رسول کا ذمہ دیا گیا ہے کہ اُن سے جو معاہدہ ہے وہ پورا کیا جائے، اور اُن کی حمایت میں لڑا جائے، اور اُن کو اُن کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے"،

ان احکام اور اعلانات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعد کے زمانہ میں ہمیشہ غیر مسلم رعایا کی خوشحالی کا خیال رکھا گیا، جزیہ کی شرح جس قدر کم تشخیص کی گئی تھی، اس کا بیان ابھی ہو چکا ہے، تاہم جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، جزیہ کی یہ شرح مجموعی آبادی کی معاشی حالت کا اندازہ کرکے تخمینی دولت و ثروت کے لحاظ سے سہولۃً مقرر ہوئی تھی ورنہ اندرونی طور پر بعض صوبوں میں گذشتہ معیارِ دولت کے علاوہ بعض اور معیار بھی پائے جاتے تھے، اور انھی کے مطابق جزیہ وصول کیا جاتا تھا، اسی بنا پر شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط (ص ۸، ج ۱۰) میں لکھا ہے، کہ

"یہ ممکن نہیں ہے کہ مال کا کوئی (صحیح) اندازہ کیا جا سکے، کیونکہ وہ شہروں کے (حالات کے) مطابق مختلف ہوتا ہے"،

اس کا یہ مطلب ہے کہ غربا، متوسطین اور امرا کی دولت کا جو معیار ۲۰۰، ۱۰ ہزار، اور زیادہ کی شکل میں قائم کیا گیا ہے، وہ دراصل غربت و تموّل کا کوئی صحیح معیار نہیں ہے، کیونکہ بعض صوبے زیادہ متمول ہیں، بعض اُن سے کم، اور بعض ان سے بھی کم، اس لئے ہر جگہ کا معیار بالکل مختلف ہوگا، اسی نکتہ کا خیال کرکے امام ابو جعفر (طحاوی) کہتے ہیں[۲]،

"ہر شہر کا عرف معتبر ہے جس شخص کو لوگ اپنے شہر میں فقیر یا متوسط، یا غنی شمار کریں، وہ ویسا ہی سمجھا جائے گا، اور یہی صحیح مذہب ہے"۔

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب ما جاء فی قبر النبیؐ [۲] فتاوائے عالمگیری ص ۲۴۴، ج ۲

اس نقطۂ نظر کے مطابق تشخیص جزیہ میں جو تغیر پیدا ہوا، وہ سطور ذیل سے ظاہر ہوگا،

پہلی صدی ہجری میں شام کا صوبہ ذرائع آمدنی زیادہ رکھتا تھا، اس لئے زیادہ خوشحال تھا، یمن کا صوبہ معاشی حیثیت سے اس کی برابری نہیں کرسکتا تھا، اس لئے دونوں صوبوں کے جزیہ کی شرح مختلف رکھی گئی، شام میں فی کس ۴ دینار سالانہ، اور یمن میں ایک دینار سالانہ وصول کیا جاتا تھا، اس کا سبب جب مشہور تابعی مجاہد سے دریافت کیا گیا، تو بولے کہ

"دولت مندی کی بنا پر ایسا کیا گیا"[۱]

پانچویں صدی کے آخر میں اسلامی سلطنت کے دو اہم صوبوں عراق، اور ترکستان کی معاشی حالت کے متعلق ایک تصریح ملتی ہے، شمس الائمہ سرخسی، مبسوط (ص ۸۰، ج ۱۰) میں لکھتے ہیں کہ

"عراق میں پچاس ہزار کا مالک متوسط الحال سمجھا جاتا ہے، اور ہمارے ملک میں دس ہزار درہم کا مالک غنی شمار کیا جاتا ہے، اس لئے اس کا فیصلہ امام کی رائے پر چھوڑنا چاہئے"

اس تصریح کا منشا یہ ہے کہ صوبوں کے معیارِ دولت کا صحیح اندازہ امام کرسکتا ہے اور وہی شرح جزیہ کو مالی حالت پر منطبق کرنے کا بھی مجاز ہے، مثلاً جس صوبہ میں ۲۰۰ درہم سے لے کر ۱۰ ہزار تک کا مالک متوسط سمجھا جاتا ہے، وہاں وہ اس رقم پر چھ روپیے سالانہ جزیہ دیگا، لیکن عراق میں چونکہ پچاس ہزار کا مالک بھی متوسط ہے، اس لئے وہاں پچاس ہزار پر چھ روپیے لئے جائیں گے، اور اس کے اوپر بارہ درہم امراء کی شرحِ جزیہ ہے، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر کسی صوبہ کی استعداد پیداوار بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر جزیہ کا بار ہلکا ہوتا جاتا ہے، اور یہ اسلامی حکومت کی منفعت بخش پالیسی کا ایک بین ثبوت ہے، (موجودہ انکم ٹیکس میں جس قدر استعداد پیداوار بڑھتی ہے، ٹیکس کا بار بہت زیادہ ہوتا جاتا ہے، جو اخیر میں ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے۔)

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الجزیہ والموادعۃ،

سرجادوناتھ سرکار کا مغالطہ پروفیسر جدوناتھ سرکار نے اپنی تاریخ دانی کے زعم مین جزیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس مین پے درپے بہت سی غلطیان کی ہین جن کا دور کرنا ضروری ہے، سب سے پہلی غلطی بلکہ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ انھون نے جزیہ کا نام (Poll Tax) رکھا ہے، جو نہ صرف غیرمسلمون بلکہ خود انسانیت کے لئے باعثِ ننگ ہی پروفیسر صاحب نے اگر یہ لفظ خود ایجاد کیا، یا اس کے استعمال مین علماے یورپ کی تقلید پسند کی، تو یہ ان کا ذاتی فعل ہے لیکن اگر اس کا جواز کسی اسلامی سند کی بنیاد پر ہے، تو واضح ہونا چاہئے کہ طبری وغیرہ نے جو "جزیۃ الجماجم" یا "جزیۃ الرؤس" کا لفظ لکھا ہے، وہ علم نہین ہے، یعنی اُس ٹکس کا یہ نام نہین ہے بلکہ اس ٹکس سے پہلے چونکہ زمین کی پیداوار اور محصول کا ذکر آگیا ہے، اور آخر مین اس کا نام آیا ہے، اس لئے دوسری پیداوار مثلاً گیہون، جو، ترکاریون وغیرہ کی طرح انسانون کا تذکرہ بھی ضروری تھا، کیونکہ ذکر کے بغیر یہ کیونکر معلوم ہوسکتا تھا، کہ کس چیز کا محصول ہے؟ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ذہن مین رہنی چاہئے کہ طبری نے یہ الفاظ نوشیروانی محصول کے تذکرہ مین لکھے ہین، اس لئے اسلامی عہد کے جزیہ کی نسبت اُن کا اطلاق ثبوت طلب ہی،

دوسرا مغالطہ دوسرا مغالطہ یہ ہی کہ انھون نے جزیہ کی رقم کا نہایت غلط اندازہ لگایا ہے، اور جزیہ کی مقدار کی زیادتی کو مثال کے طور پر گجرات کے صوبہ مین ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ وہان سالانہ پانچ لاکھ روپیے کی آمدنی تھی[1]، اور اس کی شکل یہ اختیار کی ہے کہ انڈیا آف اورنگ زیب کے بیان کے مطابق (جس کا حوالہ حاشیہ ص ۴، ۲ تاریخ اورنگزیب مین ہے،) تقریباً ۱۶۹۵ء (۱۱۰۷ھ) مین گجرات کی تحصیل محض یا محاصلِ خام (Gross Revenue) ۱۴۵ لاکھ روپیہ (ایک کرور پینتالیس لاکھ روپیے) سالانہ تھی جس مین اور جزیہ کی آمدنی مین ۳ ½ فیصدی کا تناسب ہی، جو اُن کے نزدیک بہت زیادہ ہے اس کے متعلق چند باتین عرض کرنا ہین،

---

[1] مرآۃ احمدی ص ۴، ۳، ج ۱

(۱) گجرات کے جزیہ اور اس کے تناسب پر تمام ہندوستان کے جزیہ اور اس کے تناسب کو قیاس نہین کیا جاسکتا، کیونکہ گجرات مین اگرچہ ہندوؤن کی اکثریت تھی، تاہم پنجاب، کشمیر، اور سندھ وغیرہ مین مسلمان زیادہ آباد تھے، اس لئے ان صوبون مین جزیہ کی آمدنی کم اور نہایت کم ہوگی، اور تناسب بھی ۳½ فیصدی سے بہت کم ہوگا،

(۲) گجرات کے جزیہ کا تناسب دکھاتے وقت گجرات کی زکوٰۃ کا "تناسب" بھی دکھانا چاہئے تھا، کیونکہ بقول پروفیسر صاحب (ص ۲۷۴ ج ۳) گجرات مین بہت زیادہ مسلمان آباد تھے،

(۳) زکوٰۃ کی شرح ۲½ فی صدی ہے، اور دو مختلف قسم کے چیزون سے وصول کی جاتی ہے، اسلئے مسلمانون کی ایک بڑی آبادی مین اس کی مقدار گجرات کے جزیہ کی رقم کے قریب قریب ہوسکتی ہے، اور تناسب بھی شاید وہی ہوسکتا ہے، اس بنا پر اورنگزیب پر مسلمانون کی پاسداری اور ہندوؤن کی طرف سے ذاتی انتقام کا الزام غلط ہے،

(۴) گجرات کے جزیہ اور محاصلِ خام کا تناسب صرف ۳½ فیصدی ہے، جو بہت کم ہے لیکن پروفیسر صاحب اس پر بھی متحیر ہین، حالانکہ اگر اُن کو محصولون کی اس تعداد اور تناسب کا علم ہوتا، جو آج کل حکومت برطانیہ کے اندر رائج ہین، تو اُن کی حیرت سکون و خاموشی سے بدل جاتی، ! مثلاً مطالبات وطن (Home Charges -) کی رقم کو لے لیجئے، جو ہر سال انگلستان چلی جاتی ہے، وہ پرتھ ناتھ بنرجی کی تصریح کے مطابق، مجموعی مداخل (یعنی دو ارب ایک کرور روپیہ) مین چالیس فی صدی سے زیادہ ہے[1] افیون، نمک، اسٹامپ، چنگی و آبکاری، ابوآب، کروڑگیری، انکم ٹکس، رجسٹری، جنگلات، ریلوے وغیرہ سے پچاس کرور روپیہ سے زیادہ وصول ہوتا ہے، جو مجموعی مداخل (دو ارب ایک کرور) کا کم از کم پچیس فی صدی ہے، (یہ واضح رہے، کہ اورنگزیب کے زمانہ مین آج کل

---

[1] معاشیات ہند ص ۲۹۵، مترجمہ مولوی محمد الیاس برنی،

کی طرح کثرت سے محصول نہ تھے، بلکہ اکثر محصول معاف کر دیئے گئے تھے،) جزیہ کو اگر فوجی محصول مانا جائے، (جیسا کہ بعض علمار کا خیال ہے) تو اس ۳½ فی صدی محصول کا موازنہ اس ۲۳ کرور روپے سالانہ سے کرنا چاہئے، جو ہندوستان کے فوجی انتظام پر حکومتِ برطانیہ صرف کرتی ہے، اور جو محاصل خالص (Net Revenue) کا ۴۳ فی صدی ہے،[۱]

غالباً محصولون کی یہ تعداد اور تناسب حیرت دور کرنے کے لئے کافی ہوگا،

تیسرا مغالطہ | تیسرا مغالطہ یہ ہے کہ انھون نے اشخاص کی آمدنی سے جزیہ کی شرح کا تناسب معلوم کرکے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے، کہ غربا پر اس کا بہت زیادہ بار پڑتا تھا، اس کے لئے انھون نے غریب کی شرح چھ روپیہ فی صدی، متوسط کی چھ فی صدی سے ۴ فی صدی تک (یعنی ۲۰۰ درہم سے ۱۰ ہزار درہم تک حسبِ مدارج) اور امیر کی ۱۲؍ فی ہزار شرح تبلائی ہو (صفحہ ۲ جلد ۳) اگرچہ آج بھی امرا کے بہ نسبت غربا پر محصول کا بار جس قدر زیادہ پڑتا ہے، اس کی شہادت مین فرد ور لیڈر مسٹر میکڈانلڈ، سابق صدر اعظم حکومت برطانیہ کے اقوال گورنمنٹ آف انڈیا مین درج ہین، اور سرا ے کولن، اور سر ولیم ہنٹر وغیرہ نے بھی اس کے متعلق اظہار خیال کیا ہے، تاہم موجودہ انکم ٹکس کی شرح سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ اس کی شرح ایک ہزار روپیہ سے لے کر ۲ ہزار سے کم تک ۴ پائی فی صدی پچیس ہزار سے زیادہ کی ۳ فی صدی، ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک کی ۴ فی صدی اور ڈھائی لاکھ سے اوپر کی ۵ فی صدی ہے، اس کو دوسرے الفاظ مین یون سمجھئے کہ جزیہ کی سب سے کم شرح (بقول پروفیسر صاحب) ۱۲ فی ہزار ہے، لیکن انکم ٹکس کی سب سے کم شرح ۱۲ پائی فی ہزار ہے، اسی طرح جزیہ کی سب سے زیادہ شرح ۲۸ فی ہزار ہے، لیکن انکم ٹکس کی آخری شرح ۵ فی ہزار ہے، اان اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ جزیہ مین اگر ایک طبقہ کسی قدر زیادہ بار برداشت کرتا تھا، تو انکم ٹکس مین ہر طبقہ

---

[۱] محاصل خالص ۵۰ کرور اور محاصل خام ایک ارب ۲۰ کرور ہے (دیکھو معاشیات ہند صفحات ۲۰۰، ۲۰۰، مترجمہ برنی) یہ مضمون کئی سال پہلے کا لکھا ہوا ہے،

محصول کے بارگران سے دبا ہوا ہے، اور جزیہ مین غربا اگر محصول سے کچھ پریشان ہو سکتے تھے، تو انکم ٹکس سے امرا اس سے کہین زیادہ پریشان ہو سکتے ہین، شاید پروفیسر صاحب بار کے اس "تناسب" کو حساب لگاتے وقت بھول گئے تھے،

اگر تمام طبقون کو یکجا کرکے اس بار کا اوسط نکالا جائے تو جزیہ کا اوسط صرف ۲/۱ فی صدی ہوتا ہے (کیونکہ متوسطین کا سب سے کم اوسط یہی ہے) لیکن آج کل محصول کا بار اوسط آمدنی کے نو فیصدی (یعنی ۱۸/۲ فیصدی) رہتا ہے[۱]، ناظرین ۲/۱ فی صدی اور ۱۸/۲ فی صدی کے تناسب پر غور فرمائین،

مسٹر جادو ناتھ نے غربا کے متعلق جو متن لکھا تھا، ہمارے "ارسطو" نے اس پر ایک پرلطف شرح تصنیف فرمائی ہے، ارسطو کہتے ہین "تقریباً ۲۰ سال مین ساری جائداد ہی غائب غلہ ہو جائے گی" (آریہ گزٹ) اُن کی خدمت مین یہ عرض ہو کہ

(۱) معاشیات کے رو سے جزیہ پر جہان نظر ڈالی گئی ہے، وہان یہ لکھا ہے کہ چونکہ جزیہ بلاواسطہ متزاید ٹکس ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ شرح کے اضافہ کے ساتھ ساتھ آمدنی کا بھی اضافہ ہو، مثلاً اگر ایک شخص کے پاس پہلے سال ۲۰۰ درہم موجود ہین، تو وہ غربا کا جزیہ (۱۲ درہم) ادا کرے گا لیکن اگر اس کے پاس آیندہ سال صرف ۵۰ درہم رہ گئے ہین، تو اس سے کچھ نہ لیا جائے گا، اسی طرح اگر ایک متوسط نے پہلے سال ۲۴ درہم جزیہ ادا کیا، اور آیندہ سال اوس کا سرمایہ فقرا کے برابر ہو گیا تو اس سے متوسط کا جزیہ وصول نہ کیا جائے گا، بلکہ فقرا کا محصول لیا جائے گا، اس کی تصریحات فقہ کی کتابون مین موجود ہین، اس بنا پر جزیہ کی وجہ سے جائداد کے تلف ہونے کا خطرہ نہین،

(۲) جزیہ مین غریب پر پہلے سال جو بار پڑتا ہے وہ آمدنی کا سولھوان حصہ ہے یعنی پچاس پر سے لیکن انکم ٹکس مین پہلے ہی سال امیر کی آمدنی کا چوتھائی حصہ (شرح اعلیٰ مین) نکل جاتا ہے یعنی ۵ لاکھ پر سوا لاکھ، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غریب پر جزیہ سے تباہی (اگر آمدنی مین اضافہ نہو) بہ تدریج اور دیر مین آتی ہے اور انکم ٹکس پہلے ہی سال امیر کی کمر توڑ دیتا ہے،

---

[۱] معاشیات ہند پرمتھ ناتھ بنرجی ص ۲۰۹، مترجمہ مولوی الیاس برنی،

(۳) جزیہ سے غریب طبقہ دیر میں متاثر ہوتا ہے، اور متوسطین و امراء پر کچھ اثر نہیں پڑتا، لیکن انکم ٹکس میں سب سے زیادہ امراء تباہ ہوتے ہیں، اور متوسطین و فقراء بھی بربادی سے محفوظ نہیں رہتے،

(۴) بیس سال میں اگر جزیہ پچاس کی جائداد یا آمدنی کو برباد کرسکتا ہے، تو اسی قدر عرصہ میں انکم ٹکس ۵ لاکھ کی رقم اور جائداد پر پانی پھیر سکتا ہے،

چوتھا مغالطہ چوتھا مغالطہ، تیسرے مغالطہ کی دوسری شکل ہے یعنی اونھوں نے جزیہ کی شرح اور غلہ کے نرخ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غریب طبقہ مظلومی کی انتہائی حد تک پہنچا ہوا تھا کیونکہ ایک غریب کی شرح ٹکس اس کے سال بھر کے مصارفِ طعام کے برابر تھی، (تاریخ اورنگزیب جلد ۳ صفحہ ۲۷۰)

اس "تاریخی دیانت" کی "تحلیل" کے لئے حسب ذیل امور ذہن نشین ہونے چاہئیں،

(الف) جیسا کہ مسٹر ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ نے "ہندوستان وفاتِ اکبر کے وقت"[1] میں لکھا ہے، آج کل ہندوستان کی اوسط آمدنی تین صدی قبل کی حالت سے زیادہ نہیں ہے،

(ب) بقول مسٹر پرمتھ ناتھ بنرجی اس زمانہ میں جماعتِ کثیر کی سالانہ آمدنی کا اوسط صرف اٹھارہ شلنگ یعنی للعہ فی کس ہے، (معاشیاتِ ہند مترجمہ برنی ص ۴۸)

(ج) مورلینڈ کی تصریح کے مطابق اگرچہ عہد مغلیہ و برطانیہ میں آمدنی کے اوسط کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے، تاہم اجناس کے نرخ میں سات گنے کا فرق پیدا ہوگیا ہے، (اکبر تا اورنگ زیب[2])

(د) ۱۶۲۳ء (مطابق ۱۰۳۳ھ) کے نرخ سے ایک من گیہوں کی قیمت ایک روپیہ تھی (معاشی

---

[1] مترجمہ مولوی حبیب الرحمٰن خان ایم اے، ال ال بی ہاشمی "ہند کی معاشی حالت شہنشاہ اکبر کی وفات کے وقت" صـ ۲۹۲ [2] مترجمہ مولوی سید ہاشمی فریدآبادی، ہاشمی "معاشی حالاتِ ہند از اکبر تا اورنگ زیب" صـ ۲۴۵ صـ ۲۴۶،

حالات ہند از اکبر تا اورنگ زیب، مترجمہ ہاشمی ص ۲۴۶ لیکن ۱۹۳۳ء (۱۳۵۲ھ) کے نرخ سے اس کی قیمت چار روپیہ ہے، (سات گنے کا فرق اس لئے نہین ہے کہ ہم نے مغلیہ کے گران نرخ اور برطانیہ کے ارزان نرخ کو لیا ہے،)

(۷) محصول زمین بزمانہ اکبر کے لحاظ سے ۱بسوہ کی مالگذاری ۶؍ تھی، (۱۰ بسوہ مین ۴ من ۲۰ ؍ غلہ باسانی پیدا ہو سکتا ہے، مالگذاری ثلث پیداوار ہوتی تھی، دیکھو آئین اکبری ص ۲۰۷ ج ۱) اور آج کل کے مطابق عا؍ ہے، (بحساب للعہ؍ فی بگھہ)

(۸) اگرچہ اورنگزیب کے زمانہ مین محصول کا بار فی کس وہ نہ تھا، جو آج کل ہے، کیونکہ اس نے بہت سے محصول معاف کردیے تھے تاہم اس زمانہ کے سرکاری حساب کے مطابق ہم دونون زمانون (مغلیہ و برطانیہ) مین محصول کا بار فی کس ۱۱؍۴ پائی فرض کئے لیتے ہین،

اب یہان سے ۳ طریقہ پر حساب شروع ہوتا ہے،

(۱) اگر غلہ کے مصارف فی کس ۴ من ۲۰ ؍ سالانہ (بحساب ۱۰ ؍ ریومیہ) رکھے جائین، تو ۱۴ عہ؍ سالانہ آمدنی والا شخص عہد مغلیہ مین للعہ؍ کا غلہ ۶؍ مالگذاری اور ۱۱؍۴ پائی محصول ادا کرکے صرف ۵ پائی کپڑے وغیرہ کے لئے بچا سکتا تھا، لیکن عہد برطانیہ مین وہ ۶عہ؍ کا غلہ عا؍ مالگذاری اور ۱۱؍۴ پائی محصول دیکر ۱۱؍۶ پائی کا قرضدار ہوجائے گا،

(۲) اگر غلہ کا حساب فی کس ۹ من رکھا جائے، جو سرکار نے (تاریخ اورنگزیب ص ۲۰۰) رکھا ہے، تو عہد مغلیہ مین لعہ؍ کا غلہ ۶؍ مالگذاری (ایک بگھہ کی) اور ۱۱؍۴ پائی محصول پر خرچ کرنے کے بعد وہ صرف پانچ آنے دس پائی کا قرض دار ہوتا ہے جس کو وہ معمولی سی محنت سے ادا کر سکتا ہے لیکن عہد برطانیہ مین ۳۲ کا غلہ للعہ؍ مالگذاری (ایک بگھہ کی) اور ۱۱؍۴ پائی محصول پر صرف کرکے وہ ۱۱؍۳ پائی کا قرض دار ہوجائے گا، جو سال بھر کی آمدنی کا پورا دوگنا ہے، اور جس کو وہ سال بھر محنت کرکے بھی ادا

نہین کرسکتا،[۵]

(۳) اگر جزیہ اور انکم ٹکس وغیرہ کا اوسط نہ نکالا جائے، بلکہ ان کی پوری شرح کے مطابق پوری رقم فرض کر لی جائے، تو عہد مغلیہ مین للعہ کا غلہ عہ مالگذاری، اور سے رجزیہ ادا کرکے صہ ۹ پائی پس انداز ہونگے، اور سر جادونا تھ کے حساب سے اس رقم کو دوگنا کرکے بھی وہ صرف دس آنے ۲ پائی کا قرضدار ہوگا، لیکن عہد برطانیہ مین عہ کا غلہ، عار مالگذاری اور عہ پائی انکم ٹکس ادا کرکے وہ عہ پائی کا قرضدار ہوجائے گا (واضح ہو کہ محصول مین صرف انکم ٹکس کی رقم رکھی گئی ہے، اور بہت سے محصول جو اس زمانہ مین ادا کرنا پڑتے ہین، ان کا حساب نہین لگایا گیا ہے) اور جادوناتھ صاحب کے حساب سے اس پر للعہ سالانہ کا ایسا وزنی بوجھ پڑے گا، جس سے چند ہی سال مین اس کی ایک ہزار کی آمدنی یا جائداد بالکل ہی غائب ہوجائے گی، اس سے ایک بات اور ثابت ہوتی ہے، جزیہ دالا صہ رکی جائداد یا آمدنی مین جس قدر مطمئن تھا، انکم ٹکس والا الف ہزار کی آمدنی یا جائداد مین بھی اتنا مطمئن نہین ہے، (جزیہ اور انکم ٹکس بالترتیب صہ ر اور ہزار سے کم پر نہین ہین)

پہلے اور تیسرے حسابون کے لحاظ سے عہد مغلیہ مین نصف آمدنی سے کچھ کم رقم پس انداز ہوتی ہے صرف دوسرے حساب کے رو سے پانچ آنے دس پائی، کا قرض رہتا ہے جو ۳۰ وین حصہ سے کسی قدر زائد ہے بخلاف اس کے عہد برطانیہ مین پہلے اور تیسرے حساب کے مطابق سال کی پوری آمدنی صرف غلہ کے لئے بھی کافی نہین ہوتی، بلکہ للعہ رکی مزید ضرورت ہوتی ہے، اور مالگذاری و محصول وغیرہ کے لئے علٰحدہ قرض لینا پڑتا ہے، جو دوسری صورتِ حساب مین سالانہ آمدنی کا پورا دوگنا، اور تیسری صورتِ حساب

---

[۵] معارف:- یہ مضمون کئی سال پہلے کا لکھا ہوا ہے، جب یہ ہوش ربا گرانی نہ تھی، ورنہ اگر آج کل کے نرخ سے حساب لگایا جائے، تو ۹ من غلہ کی قیمت دو سو روپیے کے قریب ہوئی، اور ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کے زمانہ مین اس حساب سے زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت ہی نہین ہے،

کی ایک شکل مین تین گنے سے کچھ اوپر ہو جاتا ہے[۱]

ان حسابات سے ظاہر ہو گا کہ سرکار نے جو یہ لکھا ہے کہ جزیہ مین غریب طبقہ کے سال بھر کے مصارف طعام غائب ہو جاتے تھے، وہ کسی حسابی اصول پر مبنی نہین ہے، بلکہ ایک ساحرانہ خطابت ہے، جو صرف عوام پر اثر ڈالنے کے لئے کام مین لائی گئی ہے، !

پانچوان مغالطہ — پانچوان مغالطہ جزیہ کی "تحصیل" کے متعلق ہے، جس کو انھون نے سخت تحصیل سے تعبیر کیا ہے، اور اس سلسلہ مین چند واقعات لکھ کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ جزیہ کی وصولی مین اورنگ زیب کے حکم سے اتنا تشدد ہوتا تھا کہ غیر مسلم رعایا شورش، مظاہرہ، بلکہ بعض اوقات بغاوت پر آمادہ ہو جاتی تھی،

اس مغالطہ مین پہلی قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ باقاعدہ تحصیل کو "سخت" تحصیل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اور امیر عبد الکریم محصلِ جزیہ برہان پور کو سخت وصول کنندہ (-Strict a collector) کے لقب سے یاد فرماتے ہین، حالانکہ جس کتاب سے یہ واقعہ لکھا گیا ہے، اس مین میر عبد الکریم کے متعلق یہ الفاظ آئے ہین،

"میر عبد الکریم را کہ ضابطہ داستادزادۂ پادشاہی شد و بکلیۂ فضیلت و دیانت آراستہ بود"

(خافی خان ص ۲۰۸ ج ۲)

کیا ضابطہ، ہشیار اور باقاعدہ شخص کو سخت (.Strict) کہتے ہین ؟

دوسری چیز یہ ہے کہ پروفیسر جادو ناتھ نے جزیہ کی سخت تحصیل کا تو ذکر کیا ہے، لیکن اس کے اسباب کا ذکر غائب کر دیا ہے، جو تاریخی دیانت کے خلاف ہے، (تفصیل آگے آتی ہے.)

تیسری قابلِ گرفت بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے ان واقعات کو بالکل فراموش کر دیا ہے جو

---

[۱] اور ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کے زمانہ مین اس حساب سے زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت ہی نہین ہے

انہی کے ماخذون مین جزیہ کی "نرم تحصیل" کے متعلق مذکور ہین، مثلاً مرآۃ احمدی (ص ۳۲۱ ج ۱) مین اورنگزیب کا دیوانِ صوبہ کے نام یہ حکم مذکور ہے،

"و نیز حکم والا بنام دیوانِ صوبہ در دو یافت کہ کسانیکہ بعد وضع جزیہ پیش انا وا سے آن یکسال بر آنہا گذشتہ و سالِ دوم درآمدہ باشد اگر بے تساہلِ متصدیان سالِ اول ندادہ باشند "موافق قول ابی حنیفہ رحمہ اللہ" اصل را اعتبار نمودہ، جزیۂ سال اول از آنہا نگیرند، وجزیۂ سال دوم بگیرند، و اگر از راہ تمرد جزیۂ سالِ اول ادا نکردہ باشند، موافق صاحبین ہر دو سال از آنہا استانند"

اس سے زیادہ رعایت کیا ہو سکتی ہے کہ تحصیلدارون کے مطالبہ کے باوجود اگر غیر مسلمون نے جزیہ نہین دیا ہے، تو وہ معاف کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جزیہ نہ دینا "سرکشی" کے باعث نہ تھا! (یہ گرہ آگے کھولی جائے گی)

خود پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب کے حاشیہ (ص ۲۷۳) مین ایشور داس ناگر کی کتاب فتوحات عالمگیری (باب ۳۰) سے نقل کیا ہے کہ

"شہنشاہ (اورنگ زیب) نے حیدرآباد فتح کرنے کے بعد وہان ایک سال کے لئے جزیہ، سائر اور تمام محاصل معاف کر دیئے، کیونکہ گورنر نے یہ اطلاع دی تھی کہ رعایا غربت کی وجہ سے محصول ادا کرنے کے قابل نہین ہے، اور اگر محصول لیا گیا تو ملک برباد ہو جائے گا"

ایشور داس ناگر گجرات کے "شیخ الاسلام" کے دفتر مین ملازم تھا، اور پٹن مین رہتا تھا، اس کی کتاب کو سرکار نے اپنی تاریخ (جلد اول) کے دیباچہ مین مستند قرار دیا ہے لیکن اس کے باوجود انھون نے متن مین اس واقعہ کا ذکر نہین کیا ہے، بلکہ حمید الدین خان نیمچہ کی احکام کے حوالہ سے (جس کا سرکار نے انگریزی مین ترجمہ کیا ہے) اس کے متضاد یہ واقعہ لکھا ہے کہ

"چونکہ جزیہ کی تحصیل کا کام سختی سے ہوتا تھا، اس لئے ہندو تاجر دکن کو چھوڑ کر چلے گئے، اور غلہ کی کمی فوج شاہی میں محسوس ہوئی، اس وقت اورنگزیب نے امرار کی راے کے مطابق دکن کا جزیہ معاف کیا"

حیرت ہو کہ اس روایت کے استناد اور پہلی روایت کے عدم استناد کی نسبت کوئی راے نہ رکھنے کے باوجود سرکار نے خواہ مخواہ اس روایت پر کیونکر اعتماد کر لیا ؟ کیا ایک مورخ کی حیثیت سے تحقیق کی ذمہ داری اُن کے سر نہ تھی !

ان گزارشوں کے بعد اب اصل مغالطہ کی جانب توجہ کیجاتی ہو لیکن اُس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پیشتر سرکار کی حسب ذیل عبارت پیش نظر رہنی چاہئے،

"قدیم مسلم فرمانروایان ہند کے زمانہ میں جزیہ برہمنوں کو مستثنیٰ کر کے تمام ہندوؤں پر مقرر ہوا تھا، جو اس مبصرانہ اور مسالمانہ نظام میں معاف رکھے گئے تھے، جس کو سندھ میں محمد بن قاسم نے پیدا کیا تھا، فیروز شاہ نے اپنی پیرانہ سالی میں اس امتیاز کو مسترد کر دیا، اور برہمنوں پر دوسر کفار کی طرح محصول لگایا، اکبر کی دانشمندانہ سیاست دانی نے اس محصول کو منسوخ کر دیا اور ذلت کی ایک ہیجان انگیز علامت کو رعایا کی اکثریت سے ہٹا دیا، ایک صدی کے بعد اورنگزیب نے اس سیاست کو پلٹ دیا، (تاریخ اورنگزیب ص ۲۷۰، ۳)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیہ آغاز حکومت اسلامیہ سے لے کر عہد اورنگزیب تک برابر ہندوستان میں جاری رہا، صرف اکبر کی حکمت عملی کے سبب سے سو برس تک اس کا نفاذ نہیں ہوا، اورنگزیب نے پھر قدیم دستور کے مطابق اس کو جاری کر دیا،

اب سوال یہ ہو کہ وہ محصول جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے وقت سے تھا، اور جس پر غیر مسلم رعایا نے کبھی شور نہیں مچایا، آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اورنگزیب کے زمانہ میں اس کے متعلق ناراضی پیدا

ہوئی ؟ بلاشبہہ فیروز شاہ نے جب برہمنوں پر جزیہ تشخیص کیا تھا، تو ان کی طرف سے "بدامنی نافرمانی" ہوئی تھی اور بھوک ہڑتال چند روز تک قائم رکھی گئی تھی لیکن چونکہ برہمنوں کا جزیہ سے استثنا سلاطین قدیم کی غلطی تھی، اس لئے فیروز شاہ نے کچھ پروانہ کی، اور خود ہندوستان نے برہمنوں کو سمجھا کر بھوک ہڑتال سے باز رکھا[۱]، اور پھر عرصہ تک جزیہ کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی گئی، لیکن اورنگزیب کے زمانہ مین دفعتہً ایک ہیجان پیدا ہوا، جس نے ملک کے متعدد حصون مین آگ لگادی، فیروز شاہ کے زمانہ کے برہمن تو اپنی امتیازی شان قائم نہ رہنے پر ناراض تھے، اورنگزیب کے زمانہ کے ہندوؤن کو کس بات کا گلہ ہوسکتا تھا ؟

علامہ شبلی مرحوم نے مضامین عالمگیر (ص ۹۴) مین اس سوال کا یہ جواب دیا ہے، کہ چونکہ یہ محصول (جزیہ) ایک مدت سے موقوف ہوچکا تھا، اس کا نئے سرے سے قائم کیا جانا کیونکر گوارا ہوسکتا تھا؟" لیکن جب یہ واقعہ ہے کہ جزیہ نہایت قدیم محصول تھا، اور ہندوستان صدیون سے اس کا عادی تھا، اور اورنگزیب نے ۱۰۶۸ھ سے لے کر ۱۰۹۰ھ تک تمام خلافِ شریعت محصول اور نذرانے بند کردیئے تھے[۲]، اور اُن کے بجائے نہایت خفیف محصول (جزیہ) ۱۰۹۰ھ مین جاری کیا تھا تو پھر ایسے محصول کی اتنی شدید مخالفت اور اس کے خلاف بغاوتین سمجھ مین نہین آتین،

سرجادو ناتھ سرکار نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ محصول "ذلت" کی ایک علامت تھی، جس سے بغض وحسد کے جذبات مین ہیجان پیدا ہوتا تھا، نیز تحصیل کی شدت بھی مظاہرون اور بغاوتون کا باعث تھی آخری بات کا جواب اسی عنوان مین اور پہلی جیز کا گذشتہ صفحات مین آچکا ہے،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان بغاوتون سے اسلامی سیادت کی مخالفت مقصود تھی، ہم نے اوپر لکھا ہے کہ بلاواسطہ ٹکس سے سیاسی بیداری پیدا ہوتی ہے، اور جزیہ اس کا شاہد عدل ہے کہ اس کی وجہ سے یہ بیداری ہندوؤن مین پیدا ہوئی، سب سے پہلے فیروز شاہ کے زمانہ مین برہمنون نے سیاست مین قدم رکھا،

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۳۸۲، ۳۸۳ [۲] یہ واقعات خافی خان نے لکھے ہین، اور الفنسٹن کی تاریخ مین اس کا تذکرہ کیا ہے،

اور ہمارے اس زمانہ کے لیڈروں کی طرح اُس زمانہ میں بہت سے لیڈر پیدا ہوگئے، جنھوں نے پُرامن ترک موالات کا مقاطعۂ جوعی کی شکل میں آغاز کیا، جس سے شہر کے تمام ہندوؤں کو اُن سے ہمدردی پیدا ہوئی، بعد میں شاید آگے چل کر یہ چنگاری اندر اندر سلگ کر اور بھڑکتی، لیکن اکبر کی حکمت عملی نے اس کے ضرر سے محفوظ رہنے کے لئے، خود اس محصول ہی کو موقوف کردیا[1] اور یہ آگ کچھ عرصہ کے لئے دب گئی، اورنگزیب کے زمانہ میں راجپوتانہ کے راجپوتوں اور مہاراشٹر کے مرہٹوں نے از سرِ نو اس آگ کو ہوا دی، جس پر جزیہ کی دوبارہ تشخیص نے تیل کا کام دیا، اور سیواجی، مہارانا چتور اور راجہ جسونت[2] وغیرہ نے سلطنت مغلیہ کے خلاف وہ فضا پیدا کی کہ راجپوتانہ کی طرح دکن بھی اس سے متاثر ہوا، اور مختلف مقامات میں مخالفت کی آگ بھڑک اُٹھی، سیواجی نے جزیہ کے متعلق بارگاہِ سلطانی میں جو خط بھیجا تھا، اس کو سرجادوناتھ نے نقل کیا ہے[3]، راجپوتانہ کے راجاؤں کی سرکشی کے واقعات خانی خان وغیرہ نے قلمبند کئے ہیں، گجرات والوں کی مخالفت کا پتہ اس فرمانِ شاہی سے چلتا ہے، جو دیوانِ صوبہ کے نام آیا تھا، اور مرآۃ احمدی کے حوالہ سے اوپر نقل ہوچکا ہے، برہانپور اور دکن کے ہنگاموں کا تذکرہ خانی خان میں ہے، اور سرکار نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے،

---

[1] مگر اس کے بجائے اور دوسری قسم کے محصول بڑھا دیئے، جن پر ہمیشہ مغلوں کے عہد حکومت میں اورنگزیب کے زمانہ تک عمل رہا۔ [2] خانی خان ص ۲۶۱، ۲۶۲، ج ۲، [3] سیواجی کے اس خط کے متعلق سخت اختلاف ہے، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مسودہ میں اس کو سیواجی کی طرف منسوب کیا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے مسودہ میں شمبھوجی کا نام آیا ہے، آرم (Orme) کے اقتباسات میں جسونت سنگھ اور ٹاڈ (Tod) نے مہارانا راج سنگھ کا نام لیا ہے، شمبھوجی اور جسونت تو تاریخوں کی وجہ سے خارج از بحث ہوجاتے ہیں، البتہ اندرونی شہادت اور خود نوشت سوانحی تفصیلات راج سنگھ کے بجائے سیواجی پر منطبق ہوتے ہیں، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مسودہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خط کا مضمون نیلا پربھو نے بنایا تھا جو سیواجی کا فارسی کاتب تھا، لیکن تحریر کا انداز

ان واقعات کی روشنی میں جزیہ کی تحصیل میں باقاعدگی، یا پروفیسر جدو ناتھ کے الفاظ میں تشدد کا سبب کچھ اور معلوم ہوتا ہے، جس کو ہم بہ تفصیل لکھتے ہیں،

(۱) **مقاومتِ مجہولہ**: اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوؤں نے آزادی کے لئے جو لڑائی شروع کی، اس کی ابتدا "فیرفد شاہی" برہمنوں کی تقلید میں مقاومتِ مجہولہ یا پرامن ترک موالات سے کی گئی، سر جادو ناتھ نے لکھا ہے، کہ ۲ راپریل ۱۶۷۹ء یکم ربیع الاول ۱۰۹۰ھ) سے تمام سلطنت میں جزیہ کا قانون نافذ ہوا، جب یہ خبر پھیلی تو دہلی اور مضافات کے صدہا ہندو جمع ہو کر جمنا کے کنارے قصر شاہی کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے، اور جزیہ کی منسوخی کے لئے شور مچایا، اس کے بعد جمعہ کے دن نماز کے وقت باب قلعہ سے لے کر جامع مسجد تک سڑک پر دہلی شہر اور چھاؤنی کے ہندو کھڑے ہوئے، اس کے بعد بھی چند روز تک یہ سلسلہ جاری رہا، اسی زمانہ میں سیواجی کا خط آیا، (تاریخ اورنگ زیب ص ۲۷۲،۲۷۱) ظاہر ہے کہ ان شورشوں میں جزیہ کی آمدنی کم ہوگئی ہوگی،

(۲) **بغاوت**: چونکہ عالمگیر کی رعایا مسلح تھی، اس "پرامن" مقابلہ نے جنگ کی شکل بہت جلد اختیار کر لی، اور رانا راج سنگھ والی جے پور اس تحریک کا سرگروہ بن گیا، رانا کو "سیواجی" نے اپنے خط میں ہندوؤں کا سردار لکھا ہے، (تاریخ اورنگ زیب ص ۲۸۹، Appendix VI) **سیواجی** پہلے سے مخالف تھا، اور مرہٹہ حکومت کا خواب دیکھ رہا تھا، وہ بھی اس تحریک میں شامل ہوا، اورنگ زیب کے نام ایک سخت لکھا، ان دو کے علاوہ راجپوتانہ کے بہت سے راجا مخالف ہوگئے، پھر دکن کی رعایا بگڑ گئی، اور ایسی سرکشی اختیار کی کہ تحصیلداروں کے تقاضہ کے باوجود جزیہ دینا بند کر دیا، خافی خان لکھتا ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۴) بتلاتا ہے کہ اس خط میں بہت سے ٹکڑے الحاقی ہیں، اس کا لکھنے والا اورنگ زیب کا معاصر اور کم از کم حریف سیواجی نہیں معلوم ہوتا، بلکہ آج کل کا "مصلح" اور ملک کا نجات دہندہ "سیواجی معلوم ہوتا ہے" اس کے علاوہ اس خط میں راج سنگھ کو ہندوؤں کا لیڈر کہا گیا ہے، اور اس جملہ پر خود سر جادو ناتھ کو بھی اعتراض ہے، اور جنوری ۱۹۰۸ء کے ماڈرن ریویو میں انھوں نے اس پر تنقید بھی لکھی ہے اس لئے اس خط کی صحت بہت مشکوک، ناقابل اعتبار بلکہ جعلی ہے،

"ازانکہ کفارِ بلدہ و پرگنات دراداے جزیہ بسیار بسختی یا منصوب کردۂ پادشاہی پیش می آمدند،

و ہیچ پرگنہ نبود کہ رعایا بہ امدادِ فوجداران و مقدمانِ سرکش جنگ و ہنگامۂ فساد ننماید"

(صفحہ ۲۷، جلد ۲)

گجرات کی رعایا مین بھی بعض ایسے سرکش موجود تھے، چنانچہ شہنشاہ کے فرمان بنامِ دیوانِ صوبہ مین یہ فقرہ بھی ہے،

"داگر از راہ و تمرد جزیہ سالِ اوّل ادانہ کردہ باشد" (مراۃ احمدی ص ۳۳۲ ج ۱)

غور کرو! وہ رعایا جو سلطنت کے تحصیلدارون کے ساتھ زیادتی کرے، سرکش چودھریون، اور فوجدارون کے جتھون مین شامل ہو کر آمادۂ فساد ہو، اس کا جزیہ نہ دینا، کیا غربت اور مسکنت کی بنا پر ہو سکتا ہے؟ ایسی سرکش رعایا کے متعلق اگر اورنگزیب نے یہ حکم دیا کہ تحصیلدارون کی مستعدی اور طلب و تقاضے کے باوجود جس نے جزیہ نہ ادا کیا ہو، اور سرکشی کی نیت بھی نہ رہی ہو، تو اس کا جزیہ (بقایا) معاف کر دیا جائے، اور جس نے سرکشی سے جزیہ بند کیا ہو، اس سے وصول کیا جائے، تو اس مین کیا بے انصافی ہوئی؟ اور اگر یہ بے انصافی تھی، تو سرجدو ناتھ کو "انصاف" کی کوئی مثال تاریخ ہند سے پیش کرنی چاہیے تھی،

سرجدو ناتھ نے اعتراض کیا ہو کہ دکن کی رعایا سے بجبر جزیہ وصول کیا جاتا تھا، بے شبہہ میر عبدالکریم کے ساتھ سوار اور پیادے گئے تھے، اور کوتوال کو بھی حکم پہنچا تھا کہ "جو اداے جزیہ مین سستی کرے، اس کو سزا دی جائے" (خافی خان ص ۲۷۸، جلد ۲) اس کی وجہ یہ تھی کہ دکن کی رعایا تحصیلدارون پر سختی کرتی تھی، اور سرکش فوجدارون اور چودھریون سے اس معاملہ مین مدد لیتی تھی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، جسے معترض نے نظرانداز کر دیا ہے،

اس سرکشی کی وجہ سے جزیہ کی آمدنی پر جو اثر پڑا تھا، اس کا اندازہ صرف ایک صوبہ (دکن) کے ایک واقعہ سے کرنا چاہیے، میر عبدالکریم امینِ جزیہ برہان پور، بارگاہِ سلطانی مین اطلاع دیتے ہین،

"جزیۂ تمام بلدۂ برہان پور سال گذشتہ بیست و شش ہزار روپیہ داخلِ خزانۂ سرکار گشتہ

خانہ زاد در مدتِ سہ ماہ از پورجاتِ نصفِ بلد و یک لک و ہشت ہزار روپیہ عائدِ سرکار

ساختہ" (خافی خان ص ۲۷۹)

آدھے شہر کے مواضعات سے تین ماہ میں ایک لاکھ ۸ ہزار روپیہ وصول ہوا، جو میر عبد الکریم کے حسنِ انتظام کا نتیجہ تھا، حالانکہ اُن سے پیشتر بُرہان پور کے تمام مواضعات کا سالانہ جزیہ ۲۶ ہزار وصول ہوا تھا، پروفیسر سرکار کے نزدیک یہ حاکم کی سختی کا نتیجہ تھا، حالانکہ خافی خان کے مطابق یہ اس وصف کا کرشمہ تھا، جو لفظ "ضابط" کے اندر جھلک رہا ہے، "ضبط" کے معنی ہیں کسی چیز کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا،

(۳) **رقمِ جزیہ کی معافی**:- تیسری چیز جس نے جزیہ کی آمدنی پر اثر ڈالا یہ تھی کہ بعض رحم دل اور سادہ لوح مسلمان حکام نے ہزاروں ہندوؤں کو غیر مستطیع سمجھ کر جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا تھا، حالانکہ وہ غیر مستطیع نہ تھے، ان حکام میں سے ایک امانت خان بھی تھا، خافی خان (ص ۳۷۷، ۳۷۸) اس کے متعلق لکھتا ہے:

"آنار وزرے رشید خان دیوانِ خالصہ کرباامانت خان بارہ سوے مزاج چشمی داشت پروانہائے

معافی جزیہ راکہ امانت خان باوست آویز ہائے مختلف ہنود نوشتہ میداد و بادشاہ در اجرائے

جزیہ نہایت تقید بود از نظر گذرانیدہ، عرض نمود کہ از لطف ہنود بیشتر را امانت خان سندِ عدم

مزاحمت جزیہ دادہ خلافِ مرضی بظہور آمد"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی آبادی کے نصف سے زائد حصہ کو جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا، پھر آمدنی کیوں کم نہ ہو جاتی؟

اورنگزیب نے اسی موقع پر امانت خان سے فرمایا تھا کہ

"در مقدماتِ دیگر مالی و ملکی آنچہ سندِ معافی بر مردم می دہند، مختارید، اما جزیہ کہ بہزار دشواری بر کفار جاری ساختہ ایم، معاف نمودن آن بدعت، و باعثِ برہم خوردن بند و بستِ جزیہ می گردد"

(خافی خان)

سرکار نے اس فرمان کو اورنگزیب کی سختی اور وصولی جزیہ میں تشدد پر محمول کیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ چونکہ جزیہ کی آمدنی بہت کم رہ گئی تھی، اور انکم ٹکس کے طور پر غیر مسلموں کا وہی ایک محصول تھا، اس لئے بادشاہ نے تاکید کی کہ اور معاملات میں معافی کی سند دینے کا اختیار ہے لیکن جزیہ میں ایسا نہیں کرنا چاہئے سرکار نے ہراؔ دشواری اور "بدعت" کے الفاظ کو بڑی اہمیت دی ہے لیکن اس میں کیا چیز خلاف واقعہ ہے؟ کیا شورشوں، بغاوتوں اور مظاہروں نے جزیہ کے نفاذ میں دشواری نہیں پیدا کی تھی؟ اور کیا پرانے اور صحیح دستور کو اٹھا دینا بدعت (نئی بات) نہیں ہے؟

ناظرین! گذشتہ تینوں صورتوں سے بخوبی اندازہ ہوا ہوگا کہ جزیہ کے باقاعدہ نظم ونسق کا کیا سبب تھا؟ واقعات شاہد ہیں کہ بدامن مقابلہ بغاوتوں اور جزیہ کی معافی کے سبب سے آمدنی کم ہوگئی تھی، اس لئے محکمہ کو باضابطہ کیا گیا تھا، سرجادوناتھ نے سبب کو مسبب اور مسبب کو سبب قرار دیکر معاملہ کو بالکل الٹ دیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ چونکہ محکمہ میں سختی تھی، اس لئے گذشتہ واقعات پیش آئے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ چونکہ واقعات پیش آئے اسلئے محکمہ کو باضابطہ کیا گیا،

بعض اور غلط فہمیاں | گذشتہ پانچ بڑے مغالطوں کے علاوہ پروفیسر جادوناتھ کی بعض خوش فہمیاں اور بھی ہیں، مثلاً

(۱) جزیہ اشاعت اسلام کا ذریعہ تھا، اس کا جواب اگرچہ علامہ شبلی مرحوم نے نہایت معقول اور دلچسپ دیا ہے کہ:

"ایسا ہلکا ٹکس جس کی تعداد اس قدر قلیل تھی،.... کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اوس سے بچنے کے لئے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہئے"

(مقالات شبلی مضمون الجزیہ ص ۲۳۰ ج ۱)

لیکن یہ جواب معترض کے لئے اس بنا پر کافی نہیں ہے، کہ وہ ساری ذمہ داری عالمگیر کے "ضعیف" کاندھے پر ڈالنا چاہتے ہیں، وہ مآثر عالمگیری کے حوالہ سے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اس محصول (جزیہ) کا مقصد اسلام کی اشاعت اور کفر کا ازالہ تھا، حالانکہ یہ مقصد اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ کہاں سے نکلتا ہے کہ عالمگیر کی یہ رائے تھی، جزیہ کا فرمان اگر بلفظہٖ موجود ہو، اور یہ ثابت ہو جائے کہ الفاظ خود عالمگیر نے لکھوائے تھے تو بے شبہہ یہ استدلال صحیح ہوگا، لیکن عمالِ حکومت کے منشی اور محرر یا اس زمانہ کے مورخ اپنے جذبات کو اگر فرامین شاہی یا اپنی عبارتوں کی تمہید میں ظاہر کریں، تو اُن کا ذمہ دار عالمگیر کیسے قرار پائے گا؟ مآثر عالمگیری یا مرأۃ احمدی جس کو بھی اٹھا لیا جائے، الفاظ خود مصنفین کے ہیں، اس لئے عالمگیر اُن کی بنا پر مورد الزام نہیں ہو سکتا،

(۲) جزیہ زائد ٹکس تھا جس سے صرف مسلمان محفوظ تھے، یہ غلط ہے اورنگ زیب نے جزیہ کی طرح وصولی زکوٰۃ کا فرمان بھی نافذ کیا تھا، جو مرأۃ احمدی وغیرہ میں درج ہے، اس لئے پروفیسر صاحب کے الفاظ کو ذرا بدل کر یوں بھی کہا جا سکتا ہے "کہ زکوٰۃ زائد ٹکس تھا جس سے صرف ہندو محفوظ تھے"

(۳) ملازمین سلطنت جزیہ سے مستثنیٰ تھے، اس خیال میں سرکار اور "ارسطو" مختلف ہیں، ارسطو نے فوج میں امراے جزیہ کی موجودگی سے جن کا ذکر ۲ر جولائی ۱۷۰۲ء (سنہ ۱۱۱۴ھ) کے اعلان میں ہے، یہ استدلال کیا ہے کہ فوج میں ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا، ورنہ امراے جزیہ کی موجودگی کے کوئی معنی نہیں ہیں، لیکن مرأۃ احمدی (ص ۳۱۴ ج ۱) میں اورنگ زیب کے اس حکم کی موجودگی میں جو عنایت اللہ خاں مہتمم جزیہ کے نام ہے،

"از ملازمان سرکار دولت مدار مواخذہ نکند و سواے آن از جمیع ذمیان مطابق شرع شریعت بگیرد"

ارسطو کے خیال کی کوئی اصلیت نہیں رہتی، اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ نقدی صورت

ین، ملازمین سلطنت سے جزیہ لیا جاتا تھا، اور نہ خدمت کی صورت مین، بلکہ اُن کی خدمات پر اُن کو

اُنکا معاوضہ ملتا تھا، فوج مین امراے جزیہ کی موجودگی کے ایک اور معنی بھی ہو سکتے ہین یعنی امیر جزیہ

کے ساتھ امداد کے لئے فوج ہو، جیسا کہ میر عبدالکریم کے ساتھ فوج بھیجی گئی تھی، کیونکہ رعایا باغی تھی،

اور یہ تو بہر صورت ممکن ہے، کہ فوج مین جزیہ کا کوئی دفتر ہوتا ہو تا کہ باغی علاقون کے قبضہ مین آنے

کے بعد جزیہ وصول کیا جا سکے،

(باقی)

ضروری اعلان

سکہ کے اختلاف اور بعض دوسری دشواریون کی بنا پر فی الحال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان

وی پی اور منی آرڈر آجا نہین سکتے، اس لئے کتابین بھی نہین آجا سکتین، مغربی پاکستان مین شیخ مبارک علی

صاحب تاجر کتب اندرون لاہوری دروازہ لاہور، دارالمصنفین کے نمایندہ ہین، اُن کے یہان ہماری تمام

مطبوعات مل جائینگی، جن لوگون کو ضرورت ہو اُن سے منگا لین، اور جن اصحاب کے ذمہ معارف کا چندہ باقی

ہے، مہربانی کرکے اُسے بھی شیخ صاحب کے پاس بھیج دین، "منیجر"

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دارالمصنفین

اس مین سندھ کا جغرافیہ مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت

راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ

اور ان تمام دورون کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی

پوری تفصیل ہے، ضخامت ۴۰۰ صفحے قیمت ۶؍ "منیجر"

اعجاز القرآن

اور

اس کے وجوہ اور دیگر متعلقہ امور

از

جناب مولانا سید بدرالدین صاحب علوی استاذ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

عم محترم جناب مولانا سید محمد بدرالدین علوی صاحب نے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن کی فرمائش پر اس مقالے کو انگریزی زبان مین لکھا تھا مضمون کی اہمیت کی وجہ سے بعض اصحاب نے اصرار کیا کہ اس کو اردو کے سانچے مین ڈھال کر ناظرین معارف کی خدمت مین پیش کیا جائے، موصوف نے اسے منظور فرماکر مجھے ترجمے کی خدمت پر مامور فرمایا، مین نے کوشش کی ہے کہ حتی الوسع اصل کی خوبی ترجمے مین باقی رہے لیکن اگر اس کے باوجود کوئی نقص رہ گیا ہو تو اس کو میری ناتجربہ کاری پر محمول کیا جائے اس لئے کہ یہ میری پہلی علمی کوشش ہے"

"محمد فخرالدین علوی بی اے علیگ"

کلام پاک کو اپنے متبعین کی بے نظیر عقیدت حاصل ہے، بہت سے مسلمانون نے پوری کتاب کو حرف بحرف حفظ کرنے کے علاوہ اپنی ساری زندگی مختلف طریقون پر اس کی خدمت کے لیے وقف کردی، ان کے لئے کلام پاک علوم کا گنجینہ رہا ہے محض پچھلے علوم ہی کا نہین، بلکہ ان نئے علوم کا بھی جن کا سرچشمہ صرف قرآن ہی ہے، قرآن پاک کے علوم پر بحیثیت مجموعی اور ہر فن پر علحدہ علحدہ کتابین لکھی گئی ہین، اس مضمون مین

ان سب کا مفصل ذکر ممکن نہین، اس لئے اس مضمون مین صرف اعجاز قرآنی پر بحث کی جائے گی، کہ اس کی مثال پیش کرنے سے کیون انسان قاصر رہا ہی،

اس علم کی ابتدا، اور ترقی | قرآن خود اس بات کا دعوی کرتا ہے کہ اس جیسی کوئی چیز پیش کرنی محال ہو اور مندرجۂ ذیل آیات اس دعوی کا اعلان کرتی ہین،

(۱) فلیاتوا بحدیث مثلہ،	پس ان کو اس جیسا اسلوب بیان پیش کرنا چاہیے،
(۲) قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات	کہدو کہ اس جیسی دس سورتین بناکر لائین
(۳) وان کنتم فی ریب مما نزلنا	اگر تمھین اس مین کچھ شبہ ہے، جو ہم نے اپنے
علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ	بندے پر نازل کیا تو اس جیسی ایک سورۃ
وادعوا شھداء کم،	بنالاؤ، اور اپنے حمایتیون کو بھی بلالو،

نزول وحی کی تیئیس سالہ مدت مین اس تحدی کا نہ تو کسی مخالف نے مقابلہ کیا، اور نہ اس جیسا کلام پیش کیا، اس طرح قرآن شریف کے اعجاز کا عقیدہ قائم ہو گیا، جو تیسری صدی ہجری کی ابتدا تک اسی صورت سے قائم رہا، تاآنکہ معتزلہ پیدا ہوئے، ان کا خیال تھا کہ قرآن کی بلاغت کے مثل لانا ممکن ہے، اس زمانہ کے عوام عربی زبان مین مہارت نہ رکھتے تھے، اور بلاغت کا کیا ذکر وہ جملے کی صحیح و غلط شکل مین بھی تمیز نہ کر سکتے تھے، اس لئے اہل سنت نے پیش بندی کے طور پر وجوہ اعجاز تشریح کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت محسوس کی، اس موضوع پر پہلے مصنف محمد بن یزید واسطی متوفی ۳۰۶ھ تھے، ان کے بعد مشہور عالم الجاحظ متوفی ۲۵۵ھ ہوئے جنھون نے اس موضوع پر کتاب لکھنے کا ذکر خود اپنی کتاب الحیوان مین کیا ہی، ان کے بعد رمانی نحوی متوفی ۳۸۲ھ کا نمبر آتا ہے، اسی زمانے کے ایک دوسرے محدث خطابی متوفی ۳۸۸ھ ہوئے، جنھون نے اس موضوع پر بلحاظ اعداد کے بحث کی ہے، علامہ باقلانی متوفی ۴۰۳ھ اس موضوع پر بہترین مصنف تسلیم کئے گئے ہین،

متاخرین مین سے جنھون نے اس موضوع پر لکھا ان مین مشہور متکلم امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ،
ابن ابی الاصبع متوفی ۶۵۴ھ .... ابن سراقہ شاطبی متوفی ۶۶۲ھ قابلِ ذکر ہین کشف الظنون سے
معلوم ہوتا ہے کہ انھون نے اس موضوع پر بلحاظ اعداد کے بحث کی ہے، زملکانی ۷۲۷ھ، دورِ حاضر کے
مصری عالم مصطفیٰ صادق رافعی نے بھی اس موضوع پر کتاب لکھی ہے، ایسے علما جنھون نے اس موضوع
پر سرسری طور پر قلم اٹھایا، اتنے زیادہ ہین کہ اُن کی صحیح تعداد بیان نہین کی جا سکتی، ان مین ایسے جنھون نے اس
موضوع پر بہت لطافت کیساتھ عالمانہ انداز مین تبصرہ کیا ہو مندرجہ ذیل ہین :-

(۱) ماوردی متوفی ۴۵۰ھ جنھون نے رسالہ اعلام النبوۃ مین اس مسئلہ کو بہت خوبی کے
ساتھ لکھا ہے،

(۲) علامہ عبد القاہر جرجانی متوفی ۴۷۱ھ علم بلاغت کے بانی عالم جن کی کتاب دلائل الاعجاز
مین قرآن مجید کے اعجاز پر خاص طور پر توجہ دی گئی ہے،

(۳) قاضی عیاض اندلسی متوفی ۵۴۴ھ کی کتاب الشفاء نے قبولیتِ عامہ حاصل کی، بہت سے
علما نے اُس کی شرحین لکھین،

جیسا کہ ابھی ظاہر ہوگا، یہ مضمون علامہ جرجانی، علامہ باقلانی، ماوردی اور قاضی عیاض کی تصانیف
سے ماخوذ ہے،

قرآن شریف کے اعجاز کے معنی | علامہ جرجانی نے اس اعجاز کی تشریح اس طرح کی ہے،

قرآن پاک کی طرف سے عربون کو اس بات کی دعوت دی گئی تھی کہ وہ اس جیسا کلام پیش کرین
لیکن انھون نے اس دعوت کو قبول نہین کیا، اور اس سے روگردانی کرکے تلوار سے لڑنا پسند کیا، اگر قرآن
پاک کی مثال لانا اُن کے بس کی بات ہوتی، تو یہ اُن کے لئے مقابلہ لڑائی کے زیادہ آسان تھا، یہان یہ
سوال پیدا ہوتا ہے، جس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہو کہ قرآن پاک کی وہ کونسی خصوصیت تھی

جس نے اہلِ عرب کو اس کی نظیر لانے سے قاصر رکھا؟ کیا وہ قرآن مجید کے صحیح، عمدہ اور خوبصورت مضامین تھے یا محض الفاظ؟ اگر دوسری صورت اختیار کی جائے تو ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ الفاظ کی وہ کونسی صنو(بہت) تھی جس کی مثال وہ نہ لاسکے؟ ان سوالات کے جوابات حسبِ ذیل ہون گے،

قرآن شریف کے مخالفین نے اس کی شستگی الفاظ، اُن کی ترتیب، بیان کی خصوصیات، آیات کا غیر معمولی آغاز و اختتام، الفاظ کی روانی، واقعات کا بیان، اسلوب نصیحت اور یاددہانیون اور دلائل کو خوب دیکھا، اور اس کی ایک ایک سورہ اور ایک ایک آیت پر غور کیا، مگر ایک لفظ بھی ایسا نہ پایا جو اپنی جگہ پر غیر موزون ہو، یا جس پر اعتراض کیا جا سکتا ہو، اور اس عجز تجسیم کیجا سکتی ہو، ان خصوصیات کی وجہ سے کسی شخص کو بھی اس کی مثال لانے کی ہمت نہ پڑی، علامہ جرجانی کے جوابون کا خلاصہ یہ ہو کہ الفاظ اور مضامین دونون نے مجموعی طور پر وہ خوبی پیدا کردی جس نے کلام پاک کو ناقابلِ مثال بنا دیا،

علامہ جرجانی ایک طویل بحث کے بعد مندرجہ ذیل آیت کی خوبیون کی تشریح کرتے ہوئے اپنے بیان کی توضیح کرتے ہین کہ

وقیل یا ارض ابلعی ماءک و یا سماء	کہا گیا کہ اے زمین اپنا پانی سوکھ لے اور
اقلعی وغیض الماء وقضی الامر	اے آسمان پانی کو روک لے پانی کم ہو گیا
واستوت علی الجودی وقیل بعداً	اور حکم کی تعمیل ہو گئی، اور کشتی جودی کی پہاڑی
للقوم الظالمین ٥	پر رک گئی، اور کہا گیا کہ ظالمون پر لعنت ہو،

ان آیات کا حسن اُن کے الفاظ اور جملون کی مخصوص ترتیب سے ظاہر ہے، موقع کی اہمیت کی وجہ سے زمین کو حرف ندا سے پکارا گیا ہو، یا ایتہا سے نہین، اس کے بعد آگے اور پیچھے کے الفاظ سے قطع نظر کرتے ہوئے ابلعی کو لیجئے، یہان پانی کو کاف خطاب سے منسوب کیا گیا ہو، جو زمین کی طرف اشارہ کرتا ہو، یہ طرز خطاب بڑی خوبی کیساتھ منتخب کیا گیا ہے، اور ابلعی الماء کا سادہ طریقہ نہین اختیار کیا گیا، اس کے بعد آسمان کو

پکارا گیا، اور اس کو اپنا کام انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے، اس کے بعد تعمیل حکم کی خبر بصیغۂ مجہول یہ ظاہر کرنے کے لئے دی گئی ہے، کہ پانی خود اپنے اختیار سے زمین میں جذب نہیں ہوا، بلکہ ایسا خدا کے حکم سے ہوا، پھر تعمیل حکم کے بیان سے واقعہ کی تائید لائی گئی ہے، اور اس کشتی کے بیان سے جس کا اس سے پہلے کوئی ذکر نہیں ہے، اس واقعہ کا فائدہ اور انجام بتایا گیا ہے، بلاغت کی رو سے یہ طرز بیان واقعہ کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے، آخر میں لفظ قیل کو دوبارہ استعمال کیا گیا ہے، تاکہ جملے کے آغاز کے ساتھ مطابقت ہو جائے، یہ تمام خوبیاں سننے والے کے دماغ پر عظمت طاری کرتی ہیں، محض سادہ الفاظ کی مدد سے ہی نہیں بلکہ ان عجیب و غریب مضامین سے بھی جو ان الفاظ سے ادا کئے گئے ہیں،

علامہ جرجانی نے اپنی رائے کو اسی کتاب میں ایک اور جگہ زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"جب عربوں کو یہ چیلنج دیا گیا کہ وہ قرآن پاک کی مثل بنا لائیں، اس وقت اُن کو قرآن کی وہ مخصوص خوبیاں جو اپنی عبارتوں میں وہ نہیں پیدا کر سکتے تھے، ضرور معلوم رہی ہوں گی" کیونکہ یہ لغو بات ہے کہ کوئی شخص اپنے فعل کے کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کئے بغیر دوسرے آدمی سے یہ کہے کہ تم میری طرح اس کام کو نہیں کر سکتے، قرآن کی یہ خاص خوبی محض اس کے الفاظ، حروف، اعراب اور مسجع جملوں ہی میں مخصوص نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ تو عربوں کے نزدیک کوئی مشکل بات نہ تھی، اس لئے وہ خوبی محض ترتیب الفاظ ہی ہو سکتی ہے جو ایسے مضامین کو ادا کرتی ہے جو نزول قرآن سے پہلے نامعلوم تھے،"

یہاں علامہ جرجانی نے اپنے بیان کی تائید میں اشتعل الراس شیباً کی تشریح کی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ سر ضعیف العمری سے چمک نکلا" تا وقتیکہ کلمہ راس کو معروف باللام نہ بنایا جائے، اور اس کو اشتعل کا فاعل نہ قرار دیا جائے، اور دونوں کلموں کے ساتھ شیباً کو حالت نصبی میں بصورت نکرہ اضافہ نہ کیا جائے

جملے مین کوئی خوبی نہین پیدا ہوگی، کیونکہ جو مضمون بیان ادا کیا گیا ہے وہ اسی طرز کے ساتھ مخصوص ہے،

وجوہ اعجاز | علامہ باقلانی کی رائے کے مطابق قرآن کے اعجاز کی تین خاص وجوہ ہین، انھون نے آخری وجہ کو دس قسمون مین تقسیم کرکے کل تعداد بارہ تک کر دی ہے، ماوردی نے اُن کی تعداد بیس قرار دی ہے،[۱] قاضی عیاض چار وجہین بتاتے ہین، مگر آٹھ کا اضافہ کرکے انھون نے بھی تعداد بارہ تک پہنچا دی ہے، ان سب کی میزان چالیس ہوتی ہے، جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

(۱) الفاظ کی صحت اور ان مین آپس کی ایسی مشابہت جو عربون کی رسائی سے باہر تھی، اہل عرب زبان مین غیر معمولی مہارت کے باوجود بھی قرآن کی مثال پیش نہ کر سکے، حالانکہ یہ دعوی ۲۳ سال تک قائم رہا، ولید بن مغیرہ نے جو مکہ کا بڑا آدمی تھا، آنحضرت صلعم کو آیہ

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ — بیشک اللہ انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے

پڑھتے ہوئے سُن کر کہا، اُس بیان مین مٹھاس اور حُسن ہے، اُس کا زیرین حصہ پانی مین ڈوبا ہوا اور بالائی حصہ پھلون سے لدا ہوا ہے، اور یہ انسان کا کلام نہین ہے، ایک بدوی کسی شخص کو آیت

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ — تمھین جس امر کا حکم دیا گیا ہے، اس کا اعلان کرو.

تلاوت کرتے ہوئے سُن کر سجدے مین گر گیا، اور کہا کہ مین اس کی فصاحت کے سامنے سجدہ کر رہا ہون،

ایک رومی بطریق نے جو اچھی عربی جانتا تھا کسی مسلمان کو یہ آیہ پڑھتے سنا،

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَخْشَی اللّٰہَ وَیَتَّقْہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ — کامیاب ہونے والے وہی لوگ ہین جو خدا اور اُس کے رسول کی اطاعت اور خدا کا ... [illegible]

تو کہا کہ صرف ایک آیت مین دنیا و آخرت کے وہ تمام مسائل موجود ہین، جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئے تھے،

(۲) قرآن شریف کی حیرت انگیز عبارت اور اس کا غیر معمولی طرز بیان جو مختلف مضامین سے

متعلق ہونے کے باوجود عربون کے مروجہ طرز بیان سے علحدہ تھا، ان کے مروجہ طرز مین صرف دو چیزین تھین، نثر اور نظم، نثر کی دو قسمین تھین، مسجع اور غیر مسجع، نظم کی بہت سی قسمین تھین، شاعری بلند پایہ فن تھا، لیکن نثر ہر ایک کے بس کی تھی، قرآن اُن مین سے کسی قسم کی نثر یا شاعری سے مشابہت نہین رکھتا، کیونکہ قرآن آیات کے آخری حروف شعر کے قافیون اور نثر کے سجع سے مختلف تھے، ان بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے ایک نیا اسلوب بیان ایجاد کیا، جو اہلِ عرب کے بس سے باہر تھا، اور معصر اہلِ عرب اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہوئے،

(۳) عرب مین ایسے بلیغ کلام کا وجود نہ تھا جس مین نازک خیالات اور پختہ حقائق بیان کئے گئے ہون، اور اسالیب بیان مین طول کے باوجود باہم مشابہت بھی ہو، یہ صحیح ہو کہ عقلا نے اچھے اچھے جملے بھی کہے، اور شعراء نے اشعار بھی، مگر ان جملون اور اشعار مین اختصار کے باوجود بھی خامیان موجود تھین، اس کے برعکس قرآن پاک ہر قسم کے نقائص سے پاک ہو،

(۴) قرآن شریف کے طرز ادا مین نہ کوئی اختلاف ہو اور نہ بیان مین کوئی نقص ہے، اگرچہ اس مین قصے، نصیحتین، دلائل، حقائق، قوانین، معذرتین، وعدے وعید، محاسنِ اخلاق کی تعلیم اور دوسرے مختلف قسم کے مضامین ہین، اور کسی ایک تحریر مین ان تمام خوبیون کا مجتمع ہونا ناممکن ہے، مختلف لوگ بیان کی مختلف شاخون مین ماہر ہوتے ہین، مثلاً شاعر جو مدح کرنے مین ماہر ہو وہ ہجو کا ماہر نہین ہو سکتا، اور جو شخص ہجو نگاری مین بلند پایہ ہو گا، وہ مدح مین کمتر ہو گا، اگر بعض مرثیہ گوئی مین بہتر ہین، تو دوسری اصنافِ شاعری سے بے بہرہ ہین، بعض رجز مین مہارت رکھتے ہین، تو دوسرے اقسام پر قادر نہین، بعض اونٹوں اور گھوڑون کے اوصاف، رات کے سفر، باغ، شراب اور جذبات کی مصوری کرنے مین استاد مانے گئے ہین، اگر امرؤ القیس سواری کا بیان کرنے مین مشہور ہے، تو نابغہ ڈرانے اور ترغیب دلانے مین ماہر ہے، اسی طرح تقریرون پیامون اور دوسرے قسم کے بیانات مین اختلاف ہو

ایک شخص اپنی دلچسپی کے کسی خاص مضمون مین اپنے ہنر کا مظاہرہ کرسکتا ہے لیکن جب وہ کسی اور موضوع کو ہاتھ لگاتا ہے تو پیچھے رہ جاتا ہے، اوراس کی عبارت کی خامی نمایان ہو جاتی ہے، اسی بنا پر مندرجۂ بالا شعرا جن کی برتری اُن کے خاص مضامین مین مسلم ہے، دوسرے مضامین مین کمتر سمجھے گئے ہین، ایک ہی جملہ جس میں کوئی بندش نہ ہو، ادا کرنے والون کے اختلاف سے اختلاف پذیر ہوجاتا ہے، قرآن پاک اپنی تمام تفصیلات مین ایسی منضبط قوت کا حامل ہے، جو تمام نقائص سے پاک ہے کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کیجا سکتی جس مین قرآن پاک اپنی فصاحت کے یکسان معیار کو قائم نہ رکھ سکا ہو، ایک ہی مضمون کو بار بار دہرانے مین طرز بیان کا یکسان رہنا ناممکن ہوتا ہے لیکن قرآن مضامین کی تکرار کے باوجود بھی اپنے معیاری طرز بیان سے کبھی نہین ہٹا، اور اپنی بلاغت قائم رکھی،

(۵) فصحا کی عبارتون مین جہان وہ مختلف جملون اور خیالات کو آپس مین ملاتے اور جدا کرتے ہین، ایک نمایان بے ضابطگی پائی جاتی ہے، اُن کی یہ خامی اس وقت بھی ظاہر ہوتی ہے، جب وہ اپنی زبان کے اسالیب بیان کے مطابق کسی مضمون کو اس کے ابتدائی درجہ سے آغاز کرکے انتہا تک پہنچاتے ہین، یا اس کے برعکس انتہا سے ابتدا مین لیجاتے ہین، یہ خامی اس وقت بھی ظاہر ہوتی ہو جب کسی مضمون کو زیادہ دلچسپ بنانے یا کسی مضمون کو غیر دلچسپ اور مشکل بنانے کی کوشش کرتے ہین لیکن قرآن مین اس قسم کی کوتاہی نہین بلکہ اس کے ہر قسم کے بیانات مین مناسبت ہی،

(۶) آیاتِ قرآنی کی ساخت سے تین خصوصیات ظاہر ہوتی ہین،

(الف) الفاظ کا اس طریقہ سے استعمال کہ وہ موثر ہون،

(ب) خیالات کی ایسی جامعیت جو ابتدا ہی سے واضح ہین، اور ان کے سمجھنے کا دار و مدار آیت کے اختتام پر نہین ہے، اور خیالات اور الفاظ مین بھی مطابقت ہے، اس مین نہ کمی ہے اور نہ زیادتی،

(ج) آیات کی ساخت میں حسن ہے، اور غیر موزون بندشون کا کہین وجود نہین، اوزان میں مشابہت ہے،

(۷) عربی زبان میں متعدد اسالیب بیان ہین، مثلاً تفصیل و تطویل، اختصار اجتماع افتراق اور استعارہ وغیرہ، یہ تمام اصناف قرآن پاک میں موجود ہین، جب اُن کے قرآنی استعمال کا مقابلہ دوسرون سے کیا جاتا ہے، تو یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ قرآن کا طرز بیان انسانی طاقت سے بالاتر ہے،

(۸) قرآنی خیالات جو مذہب اور شرع کی بنیاد ہین، اس استدلال و مباحثہ اور ایسی ہم آہنگی نزاکت اور عمدگی کے ساتھ بیان کئے گئے ہین کہ اس کی مثال انسانی کلام میں ملنا ناممکن ہے، اس مین اگر بہت سے معمولی اور جانے بوجھے ہوئے خیالات ہین، تو بہتیرے نئے اور غیر معمولی بھی ہین، جدید خیالات کے مقابلہ مین جانے بوجھے ہوئے خیالات کے لئے الفاظ منتخب کرنا آسان ہے، اور معمولی تخیل کے لئے بہت عمدہ الفاظ کے استعمال کے مقابلہ مین بلند اور بہترین تخیل کے لئے بہترین الفاظ کا استعمال زیادہ مناسب ہے، اسی کے ساتھ اگر الفاظ خیالات کے مطابق ہون، اور خیالات الفاظ کے اور دونون اپنی جگہ پر بے مثال ہون جیسا کہ قرآن مین ہے، تو اس کی ندرت اور کمال فصاحت مین کوئی شبہہ نہین ہوسکتا،

(۹) کلام کا اصل حسن اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کسی نظم یا نثر مین اس کا اقتباس دیا جائے، اور اس وقت اس کی خوبی ہیرے کی طرح چمکے، قرآنی اقتباسات کو جب اس کلیہ پر منطبق کیا جاتا ہے، تو انکی خوبی اور نمایان ہوجاتی ہے، اور وہ دوسرے کلام مین نگینہ کی طرح چمک اٹھتے ہین،

(۱۰) عربی مین حروف تہجی ۲۹ ہین، اور قرآن کی وہ سورتین جو حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہین ۲۸ ہین، اور ان حروف مقطعات کی تعداد جو ان مین لائے گئے ہین، ۱۴ ہے، شاید ایسا اس لئے ہو کہ قرآن اُن کی زبان کے الفاظ سے مرکب ہے، یہ حروف بعد کے نحویون کی رائے کے مطابق دو قسم کے ہین، مہموسہ اور مجہورہ، دس مہموسہ ہین، اور باقی انیس ۱۹ مجہورہ، دونون قسمون مین سے نصف نصف سورتون

کے شروع مین لائے گئے ہین، حروف کی ایک اور تقسیم بھی ہے، حلقی وغیر حلقی، پہلے حروف تعداد مین چھ ہین، اس قسم کے اعتبار سے بھی دونون کے نصف نصف حروف سورتون کے شروع مین لائے گئے ہین، ایک تیسری تقسیم بھی ہے شدید ہ اور منطبقہ، اس قسم کے اعتبار سے بھی دونون قسمون کے نصف نصف حروف سورتون کے شروع مین موجود ہین، یہ تقسیمین نزول قرآن کے بہت بعد دریافت ہوئی ہین، اس لئے اس متاخر انکشاف کے مطابق سورتون کا افتتاح اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ قرآن انسان سے بالاتر ہستی کا کارنامہ ہے،

(۱۱) قرآن کا طرز بیان سادہ آسان اور غیر مانوس بندشون اور الفاظ سے پاک ہے، اس کی ترکیب مین کہین گنجلک نہین، اس کے مضامین ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، مگر اس سادگی کے باوجود بھی قرآن کی مثال نہین لائی جا سکتی، کسی بھی انسانی کلام مین یہ خوبی نہین پائی جاتی، جیسا کہ پہلے مذکور ہوا، اچھے شاعرون کی نظمون تک مین غیر مانوس الفاظ اور دور افتادہ خیالات بہت پائے جاتے ہین، اور اُن کی ساری کی ساری نظمون مین یکسانی نہیں پائی جاتی، اور ان مین اچھی، بُری، اور اوسط درجہ ہر قسم کی عبارتین ہین،

(۱۲) طویل مضامین اور خیالات بڑی خوبی کے ساتھ مختصر طریقہ سے ادا کئے گئے ہین، مثلاً آیہ:-

لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ، یعنی قصاص مین تمھارے لئے زندگی ہے،

کا القتل انفی للقتل سے موازنہ آیہ کی برتری ثابت کرتا ہے اس کی دوسری مثال

وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ
فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ
وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَادُّوْهُ
اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (قصص ع ۱)

یعنی ہم نے موسیٰ کی ماں پر وحی بھیجی کہ اس کو دودھ پلاؤ، اور جب تم اس کے بارے مین خوف زدہ ہو تو سمندر مین پھینک دو، اور ڈرو مت اور نہ رنجیدہ ہو، ہم اُس کو تمھارے پاس ضرور واپس لائین گے، اور اس کو پیغمبرون مین

ہے، اس آیت میں دو امر دو نہی کے صیغے، دو خبریں اور دو بشارتیں ہیں،

(۱۳) ایک ہی سلسلہ میں مختلف اقسام کے مضامین کا یکجا کرنا جو انسانی طاقت سے باہر ہے، قرآن میں بعض وقت یہ خوبی ایسے الفاظ کے استعمال سے پیدا کی گئی ہے، جن کی مختلف تشریحات ممکن ہیں،

(۱۴) اطلاعات اور پیشین گوئیاں جو آیندہ سچی ثابت ہوئیں، مثلاً یہ دعویٰ کہ مخالفین کبھی بھی قرآن کی مثال لانے میں کامیاب نہ ہوں گے، یا جنگ بدر کے بارے میں کفار کی شکست کی پیشینگوئی،

(۱۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قدیم صحیفوں سے ناواقف تھے، آپ کو اُن لوگوں سے ملنے کا بھی کبھی اتفاق نہیں ہوا جن کو ان صحیفوں کا علم تھا، مگر قرآن میں پچھلی قوموں کے قصے ابتدائے آفرینش یعنی آدم و حوا کا قصہ، اُن کا جنت میں قیام اور پھر یہاں سے نکلنا، طوفانِ نوح اور فرعون کے قصے، انبیاء علیہم السلام کی سوانح اور خصوصیت کے ساتھ ان واقعات کا تفصیلی بیان موجود ہے، جن کے بارے میں امتحاناً دریافت کیا گیا تھا، یہ تمام بیانات اصلی واقعات کے مطابق تھے، اُن کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھلے علم پر نہ تھی

(۱۶) لوگوں کے دلوں کے راز جن کو وہ چھپاتے تھے، اور جنھیں کوئی بھی معلوم نہ کر سکتا تھا، قرآن نے کھول دیئے، مثلاً

اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْکُمْ اَنْ تَفْشَلَا،	یعنی جب تم میں سے دو گروہوں نے بزدلی دکھانے کا ارادہ کیا،
اور:- وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ	وہ وقت یاد کرو جب اللہ نے تم سے وعدہ کیا کہ ان دو میں سے ایک گروہ تمہارے لئے ہوگا، اور تم نے یہ چاہا کہ تمہارے لئے وہ گروہ ہو جو غیر مسلح ہے۔

یہاں جن رازوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ظاہر نہیں تھے،

(۱۷) قرآن میں علم و حکمت کے ایسے اصول موجود ہین جن سے عرب نابلد تھے،

(۱۸) قرآن مین خالق کے وجود اس کی توحید اور معاد کے ثبوت اور دوسری جماعت سے مقابلہ و اس کی تردید کے لئے ایسے ایسے دلائل پیش کئے گئے ہین جن کو ایک امی خود اپنی انسانی کوشش سے پیش نہین کرسکتا،

(۱۹) مضامین کو پختگی کے ساتھ ایسے آسان طریقہ سے بیان کرنا کہ سہولت بیان کی وجہ سے کلام مین عامیانہ پن پیدا نہ ہو، اور غیر مانوس مضمون بھی مشکل نہ معلوم ہو، جملے کی ساخت مین آسانی اس کو عامیانہ بنا دیتی ہے اور نادر ترکیبون کا استعمال مشکل بنا دیتا ہے، دونون کا یکجا ہونا غیر مانوس تصور کیا جاتا ہے لیکن قرآن پاک نے ان تمام باتون کو بڑی خوبی سے نبایا ہے، اور جہان بھی آسان اور نادر مضمون کو یکجا کیا گیا ہے، وہان ان مین پوری مطابقت ہے اور کوئی اجنبیت نہین معلوم ہوتی،

(۲۰) قرآن کو یاد کرنا اور اس کو اپنے حافظہ مین محفوظ کرلینا آسان ہے، اس لحاظ سے دنیا کی کوئی کتاب یا صحیفہ قرآن کی برابری نہین کرسکتا، قرآن کو حفظ کرنے مین کسی شخص کی خصوصیت نہین، خواہ وہ عرب ہو یا عجم، بالغ ہو یا نابالغ، ہر ایک بڑی آسانی کے ساتھ یاد کرلیتا ہے، ابتدائے اسلام ہی سے ایسے لوگون کی ایک بڑی جماعت ہوتی آئی ہے، اور اب بھی موجود ہے، جس نے قرآن کو حفظ کیا ہے، اور کرتی ہے،

(۲۱) قرآن ایک غیر فانی معجزہ ہے، جو ابدالآباد تک رہے گا،

(۲۲) قرآن شریف مین رعب کا ایک ایسا عنصر ہے، جس سے سننے والون اور خصوصیت کے ساتھ کفار کے دل بہت مرعوب ہوتے ہین، جیسا کہ محدثین کے روایت کردہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے،

جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ انھون نے کفر کی حالت مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز مین سورۂ طور تلاوت کرتے سنا، جب آپ اس آیت پر پہنچے،

امر خلقوا من غیر شیئ ام ھم الخالقون — کیا اُن کی تخلیق بغیر کسی خالق کے ہوئی ہے

.... اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ، یا وہ خود اپنے خالق ہین یا وہ اپنے (تقدیری) معاملات کے خود مالک ہین"

تو اُن کا دل ہیبت سے لرز گیا، اور وہ سمجھے کہ اب قلب کی حرکت بند ہو ئی، اس طرح اُن کے دل مین ایمان راسخ ہوگیا،

(۲۳) قرآن کے مختلف حصے ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت ومطابقت رکھتے ہین، اور اس مین مختلف اقسام کے مضامین کا ایک خوبصورت امتزاج ہے، اور جب اس کا انداز بیان ایک موضوع سے دوسرے کی طرف جاتا ہی، تو اس تبدیلِ موضوع مین بھی خوبی ہوتی ہے، اور بے لگاؤ نہین معلوم ہوتا، حالانکہ دونون مضمونون مین بڑا اختلاف ہوتا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی سورہ مین جو مختلف مضامین بیش کئے گئے ہین کہین بھی کوئی خلا، یا بے تعلق تبدیلی نہین معلوم ہوتی، قرآن پاک جگہ جگہ اپنے موضوع کا رُخ وعدے سے وعید کی طرف، ترغیب سے ترہیب کی طرف ماضی سے مستقبل کی طرف، قصون سے امثال کی طرف اور حکم سے نزاع کی طرف بدلتا ہے، لیکن اس سے مضمون مین کوئی ناموافقت نہین پیدا ہوتی، جو نہایت ہی مشکل امر ہے، اور موضوع بدلتے وقت غیر موزونیت کا ہونا لازمی ہے، اسی لئے بہت سے شعرا ایسے مواقع پر ناکام رہتے ہین، بحتری گو عمدہ بندش اور خوبی بیان مین مشہور ہے لیکن جب وہ غزل سے مدح کی جانب آتا ہی تو اس تبدیلی کو وہ مناسب طور پر نباہ نہین سکتا، اور اس مین ناکام رہتا ہی،

(۲۴) قرآن پاک کی نقل وروایت مین اس توجہ سے کام لیا گیا ہے، کہ اس کے الفاظ مضامین و ترتیب مین تغیر کا کیا ذکر حرکات تک مین بھی ذرہ برابر تغیر نہین ہوا، ہر زمانے اور ہر ملک کے لوگون کی بس یہی کوشش رہی، کہ قرآن پاک اُن کے پاس بعینہ اسی حالت مین بغیر ذرہ برابر تغیر کے محفوظ رہے جس مین ان تک پہنچا،

(۲۵) آیات کے چھوٹے اور بڑے ہونے سے قرآن مجید کے مخصوص طرز بیان مین کسی قسم کا فرق نہین پیدا ہوتا، انسانی کلام مین اس قسم کا تفاوت ہونا لازمی ہے،

(۲۶) قرآن مجید کے پڑھنے اور سننے والے اس سے کبھی نہیں گھبراتے، اور یہ ان کے لئے ہمیشہ تازہ اور نیا رہتا ہے، جو انبساط او حسن بیان کا نتیجہ ہے، یہ خوبی کسی کلام میں نہیں پائی جاتی، خواہ وہ کتنا ہی شیریں کیوں نہ ہو،

(۲۷) جب ایک شخص بلاغت کے مطالعہ میں مشغول ہوتا ہے، تو وہ اس میں ماہر ہو جاتا ہے، اور فصاحت میں عبور حاصل کر لیتا ہے یعنی فصاحت اس کے مطالعہ کو وسیع کرتی ہے، لیکن قرآن پاک اس شخص کو فصیح و بلیغ نہیں بناتا، جو اس کو مسلسل پڑھتا رہتا ہے، اور اس میں لگا رہتا ہے، یہ خصوصیت صرف اس کے اعجاز کی وجہ سے ہو تاکہ دوسری بلاغت کی کتابوں سے ممتاز رہے،

(۲۸) قرآن شریف میں اگر کوئی بھی اضافہ کیا جائے، تو بڑی آسانی کے ساتھ تمیز کی جا سکتی ہے، اور اگر الفاظ میں کوئی تبدیلی کیجاتی ہے، تو وہ بھی فوراً ظاہر ہو جاتی ہے، اور چھپائی نہیں جا سکتی،

(۲۹) قرآن کے مخالفین اس کی مثال لانے سے قاصر رہے، باوجودیکہ اس کا یہ دعوی اب بھی قائم ہے، اور اس کی مثال لانے سے اپنی نااہلیت کا اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے، ان کا حصہ کچھ کام نہ آیا، اور انھوں نے اس کی مثال لانے سے مایوس ہو کر تلوار سے لڑنے کو ترجیح دی، جس کے نتیجہ میں ان کے آدمی قتل و غارت ہوئے اور قیدی بنائے گئے،

(۳۰) علامہ ماوردی کے نزدیک سب سے آخری وجہ الصرفہ ہے، یعنی خود قرآن نے اپنی مثال لانے سے مخالفین کا منہ پھیر دیا، اس بارہ میں اختلاف ہے کہ آیا قرآن کی مثال لانا ان کے بس ہی میں نہ تھا، یا یہ کہ ان میں اس کی صلاحیت تھی، مگر سلب کر لی گئی تھی، پہلا عقیدہ معتزلہ کا ہے، اور دوسرا اہل سنت کا، چونکہ یہ فلسفیانہ نازک مسئلہ ہے، اس لئے میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا،

کیا قرآن میں سجع ہو؟ پچھلے صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن پاک کا ایک جداگانہ طرز بیان ہے، جسے نہ تو نثر کہا جا سکتا ہے، اور نہ نظم، اب اس کی تفصیل پیش کیجاتی ہے، نثر چونکہ عموماً مسجع ہوتی تھی اس لیے پہلے

اسی کو لینا چاہئے، اس مسئلہ مین اختلاف ہو کہ قرآن مین سجع ہے یا نہین، علماء کی ایک جماعت جو سجع کو حسن بیان اور فصاحت کا جزء تصور کرتی ہے، اس خیال کی ہے کہ قرآن مین سجع ہو، اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت

قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ، ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے،

مین ہارون کو موسیٰ سے پہلے رکھا گیا ہے، حالانکہ معکوس ترتیب عموماً استعمال ہوئی ہے، جیساکہ دوسری آیتون مین ہے، مگر یہ تبدیلی (یعنی ہارون کو موسیٰ سے پہلے رکھنا) سجع کی غرض سے کی گئی ہے، سجع کا تقاضا ہو کہ اس جگہ الف مقصورہ ہو، یہان یہ نہین کہا جا سکتا کہ یہ تغیر بے ارادہ ہوا ہے، جیساکہ اس جگہ کے لئے کہا جاتا ہو، جہان کوئی قرآنی آیت وزن شعری کے مطابق پڑ گئی ہو جس کی مثالین بہت ہین،

علامہ باقلانی کی رائے سجع کے خلاف ہو، وہ لکھتے ہین "قرآن مین سجع ہونے کی جو یہ دلیل پیش کیجاتی ہو، وہ پوری طرح صحیح نہین معلوم ہوتی، اول یہ کہ قرآن مین اگر سجع ہوتا، تو وہ عربون کے طرز بیان سے جداگانہ نہ ہوتا، اور اس صورت مین اس کی مثال لانا ممکن ہوتا، اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہو کہ قرآن کا سجع بھی غیر ممکن المثال ہے لیکن قرآن کو شعر ماننے کی صورت مین بھی یہی کہا جا سکتا ہے، اور اس کے انکار کی کوئی وجہ نہین معلوم ہوتی، اور پھر اس کے کوئی معنی نہ رہ جائین گے کہ قرآن شعر نہین ہو، دوسرے یہ کہ سجع شاعری کی بنیاد ہے، یعنی وہ شاعری کا پہلا درجہ تھا، جس نے بڑھتے بڑھتے شاعری کی موجودہ صورت اختیار کر لی، قرآن مین شاعری کی مذمت اور اس سے احتراز کا اعلان اس شدت سے کیا گیا ہے کہ دونون مین دور کا تعلق بھی نہین مانا جا سکتا، اور قرآن مین سجع ماننے کی صورت مین اس تردید کا زور باقی رہنا مشکل ہو جائے گا، تیسرے یہ کہ جاہلیت کے کاہن سجع سے واقف تھے، خود قرآن شریف اور حدیث نبوی دونون نے اس کا انکار کیا ہے،

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ، یعنی کسی کاہن کی تصنیف نہین ہے،

ایک مرتبہ کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور آپ سے جنین کے بارے مین کہا:-

كيف ندي من لا شرب ولا اكل — اس کا انتقام کیسے لین جس نے کھایا نہ پیا،

ولا صاح فاستهل اليس دمه — اور نہ آواز کی، کیا اس کا خون بغیر انتقام

قد يطل، — کے رہے گا؟

آنحضرت صلعم نے جواب مین فرمایا :-

"أسجاعة كسجاعة الجاهلية — یعنی کیا یہ جاہلیت کی سی سجع ہے، یا کاہنون

أو أسجعا كسجع الكهان — کی سی،

اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم سجع کو برا سمجھتے تھے،

اب ان آیات کا سوال رہ جاتا ہے جو بظاہر سجع معلوم ہوتی ہین لیکن درحقیقت وہ سجع نہین ہین، بعض موقعون پر قرآنی ترکیب سجع کے طرز کی ضرور ہے، مگر وہ حقیقۃً سجع نہین، سجع کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس مین الفاظ کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اور معنی و مضامین کی کم، اور قرآن مین زیادہ اہمیت معنی کی ہے اور ان دونون مین بڑا فرق ہے،

اس کے علاوہ سجع جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، ایک مخصوص طرز ادا کا نام ہے جس مین اگر ذرا بھی بے توجہی سے کام لیا جائے، تو کلام انکل بے جوڑ ہو جاتا ہے، اور اس کی ساری فصاحت خاک مین مل جاتی ہے، جیسا کہ اگر شاعری مین اس کے اصول کا خیال نہین کیا جاتا، تو وہ شعر نہین رہ جاتا، اور اس کی فصاحت بھی ختم ہو جاتی ہے، بعض آیات قرآنی جن کو مسجع کہا گیا ہے، وہ دراصل سجع کے اصولون کے مطابق نہین ہین، کیونکہ ان کے بعض جملے چھوٹے اور بعض بڑے ہین کہ سجع کا حرف اس وقت آتا ہے، جب کہ دوسرا جملہ پچھلے کا دوچند ہو جاتا ہے، جو سجع کے نزدیک ناپسندیدہ اور فصاحت کے خلاف ہے، اس سے قرآن کی فصاحت پر حرف آنا پڑے گا، جس کو اس کے مخالفین بھی نہین کہتے، اگر ایسا ہوتا تو مخالفین خاموش نہ رہتے، انھون نے یقیناً اعتراض کیا ہوتا، اور اس کو سحر کبھی نہ کہتے، اس لئے سجع کو آیات قرآنی پر منطبق نہین کیا جا سکتا،

آیاتِ قرآنی کے آخری حروف فواصل خود اپنی جگہ پر ایک مخصوص طرز کے ہین، ان مین اور سجع و شعر کے قافیہ مین کوئی چیز مشترک نہین، ایک آیت مین ہارون کو اول اور موسیٰ کو بعد مین اور دوسری جگہ اس کے برعکس رکھنے کی وجہ سجع نہین، بلکہ اس سے مقصود ایک مفہوم اور ایک ہی قصہ کو مختلف الفاظ مین بیان کرنا ہے، جو لوگ فنِ بیان کے ماہر ہین، وہ جانتے ہین کہ ایک ہی واقعہ کو مختلف الفاظ ور مختلف طریقون سے بیان کرنا کتنا مشکل ہی اس مین فصاحت کا قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، قرآن پاک نے ایک ہی قصہ کو مختلف الفاظ اور مختلف پیرایون مین بار بار بیان کرنے کے باوجود اپنی فصاحت کے معیار کو قائم رکھا اور تکرار کی وجہ سے اس کی بلاغت مین کہین بھی خامی نہین پیدا ہوئی، اور یہ تنوع بھی اس خوبی کا ایک رُخ ہے جس نے قرآن کو معجزہ بنایا، الفاظ کو آگے پیچھے رکھنے کا مقصد دوسرا ہے، اور سجع سے فواصل کی یہ ظاہری مشابہت آیاتِ قرآنی کو حقیقتہً سجع کے زمرے مین نہین لا سکتی،

قرآن شاعری نہین

شاعری کے تمام اصناف عربون مین عام تھے، یہان تک کہ لڑکے بھی نظمین کہا کرتے تھے، اور اس مین کوئی دقت نہین محسوس کرتے تھے، پچھلے صفحات مین یہ بات بار بار کہی جا چکی ہے کہ قرآن پاک کا طرز بیان شاعری سے مختلف ہے، اور یہ فرق قرآن کے معجزہ ہونے کی وجہ ہے، ورنہ اگر قرآن شعر ہوتا تو اس کی مثال لانا ممکن ہوتا،

قرآن بڑے زور و قوت سے اس بات کا اعلان کرتا ہی کہ وہ شعر نہین ہے، حسب ذیل آیات اس کی شاہد ہین،

(۱) وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ :- ہم نے رسول کو شعر نہین سکھایا،

(۲) وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ :- اور یہ کسی شاعر کا کلام نہین،

قرآن پاک کی آیتون مین یہ کہا گیا ہے، کہ کفار نے یہ اعتراض کیا تھا کہ قرآن پاک ایک شاعر کا کلام ہے، اس اعتراض کی تحقیق بہت آسان ہے، اس کی بنیاد یہ ہے کہ جب مخالفین قرآن اس کے طرز بیان

پر متحیر ہوئے، تو اُن کو بے اصل اعتراضات پر مجبور ہونا پڑا، چنانچہ انھون نے کبھی کہا کہ یہ شاعری ہے، اور کبھی دعوی کیا کہ کسی کاہن کا کلام ہے، علامہ باقلانی کا خیال ہے کہ ان اعتراضات سے مقصد یہ تھا کہ وہ قرآن پاک کو شاعری ہی کی کوئی صنف سمجھتے تھے، (مگر پورے طور پر نہین) جس سے وہ آشنا نہ تھے، اس پر شعر کا اطلاق انھون نے اس وجہ سے کیا تھا کہ قرآن فطرت کا گہرا مطالعہ کرتا ہے، یعنی جس معنی مین فلسفیون نے شعر کو لیا ہے اگرچہ اہلِ عرب کے نزدیک شاعری کی تعریف دوسری تھی، ایک اور ضعیف وجہ یہ بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ عوام نے اوزانِ شعر سے ناواقفیت کی بنا پر قرآن پاک کو شعر کہہ دیا،

قرآن مین ایسی آیات بھی ہین جو وزن مین مصرعہ سے مطابقت رکھتی ہین، علامہ باقلانی نے ان آیات کو مع اوزان کے پیش کیا ہے، اختصار کے خیال سے یہان صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے،

وجفان کالجواب وقدور راسیاتٍ	اور پانی کے بڑے بڑے برتنون جیسی نادین
. . . .	اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی دیگین، (سلیمان
. . . .	کے تابع جنات اُن کے لئے بنایا کرتے تھے)

لیکن اس اعتراض کے جواب سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ شعر کہتے کسے ہین، شعر کی تعریف ہے کہ

"وہ کلام جو ارادۃً مقفّٰی رکھا گیا ہو، اور جو وزن پر منطبق ہو، اور جو اپنی جگہ پر مکمل تخیل پیش کرنے کیساتھ ساتھ ایک سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہو شعر کہا جاتا ہے"

اس سے ظاہر ہوا کہ شعر کے لئے دو شرطین ہین، ایک یہ کہ وزن اور قافیہ ارادۃً ہو، اور دوسری یہ کہ اس مین ایک ایسے زیادہ اشعار ہونے چاہئین، اور قرآن پاک کی بعض آیات غیر ارادی طور پر علم عروض کے مطابق ہین، جیسے بعض اوقات روزمرہ کی گفتگو مین بھی اتفاقاً کوئی فقرہ شعر کے وزن پر ہو جاتا ہے، جیسے کوئی کہے :

اغلق الباب واتنی بالطعام	یعنی دروازہ بند کر دو اور میرے لئے کھانا لاؤ،

یا:- اسقنی الماء یا غلام سریعًا، یعنی اے لڑکے مجھے پانی جلدی پلا،

یہ جملے وزن کے مطابق ہین، مگر ایسا ارادۃً نہین کیا گیا اس لئے اُن کو شعر نہین کہا جا سکتا، اس کے علاوہ دوسری شرط کہ شعر مین ایک سے زیادہ بیت ہونی چاہئین، قرآن پاک کی آیات پر منطبق نہیں ہوتی، دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر قرآن شعر ہوتا، تو یہ حقیقت یقینًا مخالفین قرآن کے علم مین ہوتی، اور بغیر کسی پس و پیش کے وہ یہ سمجھے کہ قرآن شعر ہے، اور یہ ناقابلِ قیاس ہے کہ پچھلے لوگون نے وہ سمجھا جس کو معاصرین نہ سمجھ سکے تھے، ایک اور جواب یہ ہے کہ اگر مخالفین قرآن نے اس کو شاعری سمجھا ہوتا، تو انھون نے اس کا مقابلہ کیا ہوتا، کیونکہ تمام اصنافِ شاعری پر انھین قدرت حاصل تھی، قرآن شریف کی مثال لانے سے اُن کی عاجزی اس بات کا بین ثبوت ہو کہ وہ قرآن کو شاعرانہ کلام تصور نہ کرتے تھے،

قرآن کے معارضین تاریخ مین ایسے چند لوگون کے نام بھی ملتے ہین، جنھون نے پچھلی ۱۴ صدیون کے دوران مین یا تو خود قرآن کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی یا دوسرون نے اُن کی تصنیف کو قرآن کے مقابلہ مین پیش کیا، ایسے لوگ دو قسم کے ہین (۱) وہ جنھون نے پیغمبری کا ڈھونگ رچایا، اور جھوٹا الہامی کلام بھی پیش کیا (۲) وہ جنھون نے محض فن کی حیثیت سے کچھ لکھا، او نھون نے یا دوسرون نے سمجھا کہ اس کو قرآن شریف کے مقابلہ مین پیش کیا جا سکتا ہے پہلی قسم کے لوگون مین پانچ نام لئے گئے ہین، اُن کے اس مشن کا نتیجہ خود ان کے انجام سے ظاہر ہے، ان مین سے دو تو بغیر کسی کامیابی کے مارے گئے، دو مسلمان ہو گئے، اور پانچوان اپنی معمولی حالت پر آگیا،

(۱) مسیلمہ یمامہ کا رہنے والا تھا، جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام مین پیغمبری کا دعویٰ کیا، اُس نے مدینہ آنے اور اسلام قبول کرنے کے بعد یہ ڈھونگ رچایا، اس سے اس کا مقصد بادشاہت کا حصول تھا، چنانچہ اُس نے آنحضرت صلعم کی خدمت مین صلح کی یہ شرط پیش کی، کہ آپ اس کو اپنا شریک بنا لین یا اپنا جانشین مقرر کر دین، اس کا یہ دعویٰ تھا کہ رحمان نامی فرشتہ اس پر قرآن لایا تھا، جس مین فصلین اور

جملے تھے، اس کا دعویٰ تھا کہ منصب پیغمبری بھی کہانت کا جزو ہے، اس لئے اس کا کلام کاہنوں کی سجع کے مشابہ تھا، اس کا نمونہ یہ ہے:-

الفیل ما الفیل وما ادراک ما الفیل	(یعنی ہاتھی! ہاتھی کیا ہے، اور تم نے یہ کیسے
لہ ذنب وبیل وخرطوم طویل	جانا کہ ہاتھی کیا ہے، اس کے ایک سخت دم ہے
	اور لمبی سونڈ)،

اس نمونے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا کلام احمقانہ اور ذلیل خیالات سے بھرا ہوا تھا، اس کے انجام نے ثابت کر دیا کہ نہ وہ پیغمبر تھا اور نہ اس کا کلام وحی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلیفہ اول نے ایک بہت بڑی فوج بھیجکر اس کا خاتمہ کرایا، اس نے اپنا کوئی نام لیوا نہ چھوڑا، جو اس کا ذکر زندہ رکھتا اور صرف مسلمانوں کی تاریخوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔

(۲) اسود عنسی، اس کا نام ابہلہ تھا، یمن کا رہنے والا تھا، اپنی فصاحت و بلاغت، خطابت، شاعری، سجع اور کہانت میں مشہور تھا، اس نے آنحضرت صلعم کے آخری عہد میں دعویٰ کیا کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے لیکن اس وحی کے قرآن ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، جب مفروضہ وحی اس پر نازل ہوتی تو وہ اپنے سر جھکا لیتا، اور تھوڑی دیر بعد اپنے سر کو اٹھا کر کہتا، وہ (خدا) مجھ سے یہ باتیں کہتا ہے، یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چوبیس گھنٹے قبل مارا گیا،

(۳) طلیحہ بن خویلد قبیلہ اسد کا آدمی تھا، اور عرب کے بہادروں میں گنا جاتا تھا، وہ اپنے قبیلے کے وفد کے ساتھ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، اس کے پورے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا، جن میں وہ بھی تھا، جب وہ وطن واپس آگیا، تو پیغمبری کا دعویٰ کر بیٹھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اپنے قبیلہ میں بڑا مرتبہ حاصل کر لیا، اس کا دعویٰ تھا کہ کوئی ذوالنون نامی اس پر وحی لاتا تھا، لیکن اس نے بھی اس کو قرآن نہیں کہا، اس کے ساتھ کچھ فصیح لوگ تھے، جو اس کا اتباع

محض فرقہ بندی کے جذبہ اور بادشاہت حاصل کرنے کی غرض سے کرنے لگے، اس کی صرف ایک وحی یاقوت نے نقل کی ہے، خلیفہ اوّل نے اس کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی، فریقین مین جنگ ہوئی، اور انجام کار طلیحہ شکست کھا کر ملک شام کو بھاگ گیا، اس کے بعد پھر مسلمان ہوگیا، اور جنگ قادسیہ میں بڑی شجاعت دکھلائی،

(۴) قبیلہ تمیم کی ایک عورت سجاح بنت حارث اپنے نانہالی خاندان بنو تغلب مین رہتی تھی، یہ قبیلہ عیسائی تھا، سجاح نے اُن کے مذہبی گیت یاد کرکے آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد پیغمبری کا دعوی کر دیا، قبیلہ کے چند لوگون نے اس کی پیروی کی، ان کو ساتھ لے کر اس نے خلیفہ اوّل کا مقابلہ کیا، راستہ مین بعض قبیلون سے لڑی اور بعض سے صلح کی، اسی زمانہ مین مسیلمہ کی قوت بھی بڑھ رہی تھی، وہ سجاح کے اس پروپیگنڈے کا حال سُن کر خوفزدہ ہوا، اور اس سے مل کر شادی کا پیام دیا، سجاح نے منظور کرلیا، اور دونون کی شادی ہوگئی، سجاح نے بھی اپنی وحی کے قرآن ہونے کا دعویٰ نہین کیا بلکہ اسود اور طلیحہ کی طرح اس کا صرف یہ عقیدہ تھا کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے، اور کچھ مسجع عبارت بھی تیار کرلیتی تھی، مسیلمہ کے قتل کے بعد اس نے اپنا دعویٰ ترک کر دیا، اور دوسری مرتبہ اسلام مین داخل ہوکر اپنی بقیہ زندگی ایک مسلمان کی حیثیت سے گذار دی،

(۵) مشہور شاعر احمد بن الحسین متنبی نے جو ۳۵۴ھ مین مارا گیا، اپنی زندگی کے ابتدائی ایام مین پیغمبری، اور اپنے اوپر ایک قرآن نازل ہونے کا دعوی کیا، کچھ لوگ اُس کے پیرو ہوگئے لیکن بعد مین وہ اس دعوی سے باز آگیا، اور اپنی بقیہ زندگی ایک معمولی انسان کی طرح گذار دی،

دوسری قسم کے لوگون مین چار نام بتائے گئے ہین :-

(۱) نضر بن حارث یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمعصر تھا، اس کی لڑائی کے اشعار حماسہ مین درج ہوئے ہین، اُس نے پیغمبری کا دعوی تو نہین کیا لیکن کچھ لوگون کا خیال تھا کہ اُس نے اہل عجم کی تاریخ اور ان

ایسے قصے بیان کرکے جن سے عرب بالکل واقف نہ تھے، قرآن کا مقابلہ کیا، اس دعویٰ کی حماقت کی بنا پر کسی مورخ نے اس کی عبارتوں کا نمونہ تک دینا گوارا نہیں کیا،

(۲) ابن مقفع اپنے زمانہ کا فصیح و بلیغ مصنف تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ عرصہ تک اپنے آپ کو قرآن کے مقابلہ کے لئے وقف کر دیا لیکن پھر جو کچھ لکھا تھا، چاک کر دیا، اور اس کو ظاہر کرنے میں بھی شرم محسوس کرنے لگا، دہریوں کا خیال ہے کہ اس کی الدرۃ الیتیمۃ قرآن کے مقابلہ میں لکھی گئی تھی، یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، جو متعدد بار چھپ چکا ہے لیکن اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے، کہ ابن مقفع نے کبھی قرآن کے مقابلہ کا دعویٰ کیا ہو، یہ محض دہریوں کی من گھڑت ہے کہ اس نے قرآن کا مقابلہ کیا تھا، اس کی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ مذہب کے بارہ میں متہم تھا،

(۳) راوندی موسوم بہ احمد بن یحییٰ ابو الحسین متوفی ۲۹۳ھ یہ بھی دہریہ تھا، اس نے مذہب کے خلاف بہت سی کتابیں لکھیں، اور کہا جاتا ہے کہ التاج لکھ کر قرآن کا مقابلہ بھی کیا، ابو الفداء کا بیان ہو کہ مسلمان علماء نے راوندی کے تمام دلائل کی تردید کی، خاص کر اس دعویٰ کی کہ اس نے قرآن کا مقابلہ کیا مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس نے قرآن کے مقابلہ کے لئے التاج لکھی تھی، قیاس یہ ہو کہ اس نے دوسری کتابوں کی طرح اس میں بھی اعجاز قرآنی کے خلاف دلائل پیش کئے ہوں گے، معری نے اپنی کتاب الغفران میں راوندی کی التاج کے بارے میں لکھا ہو:

واما التاجه فلا يصلح ان يكون نعلاً وهل تاجه الا كما قالت الكاهنة اُف وتُف:	رہی اس کی کتاب التاج تو وہ جوتی ہونے تک کے قابل نہیں، اس کی کتاب التاج کی کوئی حقیقت نہیں، بجز اس کے جیسا کہ کاہنہ نے اسے اف تف کیا ہے،

(۴) ابو العلاء معری متوفی ۴۴۹ھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے الفصول والغایات فی

فی مجاراۃ السور والآیات لکھ کر قرآن کا مقابلہ کیا لیکن معری پر دہریوں کا یہ ایک بے بنیاد الزام ہے، اس الزام کے خلاف ایک بین ثبوت بھی موجود ہے کہ خود معری نے اپنی کتاب الغفران مین اپنے خیالات کا یون اظہار کیا ہے،

واجمع ملحد ومھتد ان ھذا الکتاب	ملحد اور مومن سب ہی اس بات پر متفق ہین
الذی جاء بہ محمد صلی اللہ علیہ	کہ محمد کی لائی ہوئی کتاب اپنے معجزے کی وجہ
وسلم کتاب بھر بالاعجاز ولقی	سے سب پر چھاگئی، اور اپنے دشمن کا مقابلہ
عدوہ بالارجاز ماحذی علی	سزادہی کے ساتھ کیا، یہ کتاب کسی خاص
مثال ولا اشبہ غریب الامثال	نمونے پر تیار نہین کی گئی، غیر مانوس طرز بیان
ما ھو بالقصد الموزون ولا رجز	سے مشابہت نہین رکھتی، یہ نہ تو مقفی نظم ہے اور
ولا شاکل خطابۃ العرب ولا	نہ رجز، اسے نہ تو عربون کی خطابت سے کوئی
سجع الکھنۃ،	مشابہت ہے اور نہ کاہنون کی سجع سے"،

اس کے علاوہ جو کتاب قرآن کے مقابلہ مین پیش کی گئی ہے، اس کا نام الفصول والغایات ہے اور یہ الفاظ "فی مجاراۃ السور والآیات" محض تہمت کی بنیاد پر اضافہ کر لئے گئے ہین،

مصر کے ایک جدید رسالہ الزہرا جلد اول ص ۲۰۳، ۳۱۰، اور ۵۸۹ مین اس کتاب کا ذکر آیا ہے، اس مضمون کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا طرز قرآن شریف سے بالکل مختلف ہے، معری پر قرآن کے مقابلہ کا الزام لگانا بالکل غلط ہے، ذاتی اور ملحدانہ خیالات سے قطع نظر اُس نے قرآن کے بارے مین بڑی عمدہ راے دی ہے،

رحمت عالم

مُلّا خیر اللہ مُہندس کے چند نئے رسائل

از

سید سلیمان ندوی

استاد ملّا احمد معمار کے جس نے لال قلعہ، جامع مسجد دہلی اور تاج محل کی عمارتیں بنوائی تھیں، اور انکی فاضل و نامور اولاد کے احوال پر جو مقالہ مین نے کچھ سال پہلے ادارہ معارف اسلامیہ لاہور مین پیش کیا تھا، اور جو بعد کو معارف مین چھپ کر شائع ہوا، وہ بظاہر اس قدر مکمل تھا کہ اس مین اضافہ کی گنجایش نہ تھی لیکن چونکہ تلاش و تفحص برابر جاری رہی، اس لئے ان مین سے بعض کی مزید تصنیفات ہاتھ آتی رہین، جن کی بنا پر اُن کے متعلق معلومات کا اضافہ ہوتا رہا، چنانچہ مضمون مذکور کے چھپنے کے بعد ملّا لطف اللہ مہندس کی تصانیف مین ایک نیا رسالہ بیانیہ ندوہ کے کتب خانہ[1] مین ملا جو فصاحت و بلاغت کے فن مین فارسی مین شاہزادی زیب النساء کے لئے مصنف نے تصنیف کیا تھا، خیال آتا ہے کہ معارف مین اس پر ایک مختصر مضمون حوالۂ قلم ہو چکا ہو، ندوہ ہی کے کتب خانہ مین اتفاق وقت سے لطف اللہ کے بیٹے مرزا خیر اللہ مہندس کے رسالون کا ایک قلمی مجموعہ[2] کئی سال ہوئے، کہ نظر سے گذرا تھا، مین نے اس کی یادداشت لے لی تھی، لیکن اس کی تکمیل اس لئے نہ ہو سکی کہ دل و دماغ اب ان مباحث سے اُچاٹ ہو چکے ہین، اور اب کوئی اُٹھنگ طبیعت پر غالب ہے مگر ظاہر ہے کہ مدت کا چڑھا ہوا رنگ ایک دم زائل بھی نہین ہو سکتا، چنانچہ ابھی ایک صاحب نے "مضامین سید سلیمان ندوی"

---

[1] نواب صدیق حسن خان کی کتابون مین،

[2] واحد علی سندیلوی کی کتابون مین،

کے نام سے میرے مین پچیس مضمونون کا مجموعہ[1] چھپا ہے، اس مین یہ مقالہ نظر آیا، تو خیال ہوا کہ اس کا تتمہ بھی لکھ کر چھاپ دیا جائے کہ تحقیق کے میدان مین ایک قدم کی اور وسعت پیدا ہو جائے،

رصدخانہ محمد شاہی کے نگران ملا خیر اللہ مہندس کے رسائل کا یہ مجموعہ تین رسالون پر مشتمل ہے، پہلا طب مین ہے، دوسرا تصوف مین، اور تیسرا نجوم مین، اس سے یہ معلوم ہوا کہ مرزا موصوف نہ صرف ہندسہ اور تعمیر مین ید طولی رکھتے تھے، بلکہ وہ طبیب بھی تھے، صوفی بھی تھے اور منجم بھی، اب ذیل مین تینون رسالون کا تھوڑا تھوڑا حال لکھا جاتا ہے،

۱۔ پہلے رسالہ کا نام السبع الثوابت ہے یہ طب مین ہے اور عربی زبان مین ہے، دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے کسی معاصر طبیب نے السبع السیارات کے نام سے سات مسئلون کی تحقیق مین ایک رسالہ لکھا تھا اسی لئے اس کا نام السبع السیارات رکھا تھا، مرزا خیر اللہ نے اس کے جواب مین السبع الثوابت کے نام سے یہ رسالہ لکھا ہے، رسالہ مین جن سات مسئلون پر بحث ہے، وہ یہ ہین، (۱) دوا کی حقیقت، (۲) معتدل کے معنی، (۳) خلط کی تعریف، (۴) اخلاط کی تعداد، (۵) مرکب اور مفرد اعضاء کے بیان مین، (۶) کھوپڑیون کے کچھ حصہ مین کیا کھوکھلا پن ہے، (۷) آخیر عمر کی حقیقت،

رسالہ کی تالیف کی تاریخ ۱۱۰۹ھ مین لکھی ہے،

۲۔ دوسرے رسالہ کا نام الرسالۃ القدسیہ فی مذہب الصوفیۃ الحقیقیۃ ہے، یہ تصوف مین وحدۃ الوجود کی تحقیق مین ایک عربی رسالہ ہے، جس مین اس مسئلہ کے باب مین چند شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے، رسالہ کی تاریخ تالیف ۱۱۱۸ھ ہے،

۳۔ تیسرے رسالہ کا نام مُدخل ہے، یہ فارسی نظم مین نجوم کا رسالہ ہے، اس رسالہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا موصوف شاعر بھی تھے، اس رسالہ کے شروع مین اس رسالہ کے نظم کرنے کے سبب مین

---

[1] پتہ: شفیق احمد، سکونت کلان، بہار شریف پٹنہ اور محمد سلیمان اشرف ۱/۶ بتیا پوکھر روڈ کلکتہ ۱۴،

اپنے خاندان کا کچھ حال لکھا ہے، جو درج ذیل ہے،

فی سبب نظم الرسالہ

بندۂ ذرہ وار خیر اللہ	کہ ندارد بہ اہلِ دنیا راہ
لیکن از محض فضلِ لطف و عطا	شاہ والا نژاد بحر سخا
بانوے وار زمین و زمان	وارثِ حاکم مکین و مکان
مرشدِ فیض بخش، دین پرور	قبلۂ اہلِ حق بلند اختر

دوسرے شعر مین "لطف و عطا" مین ایک خاص لطف ہے، لطف اللہ مہندس اس کے باپ کا اور عطاء اللہ اس کے چچا کا نام تھا،

تیسرے اور چوتھے شعرون مین غالباً ولی عہد سلطنت یا کسی شہزادہ کے نام کی طرف اشارہ ہے، یہ نظم ۱۱۵۰ھ مین لکھی گئی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، یہ زمانہ محمد شاہ کا ہے، اس لئے اس کے شہزادون مین سے کسی کی طرف اشارہ ہوگا، اس وقت اس کے شہزادون کے نام پیش نظر نہین، اس لئے تعیین نہ کرسکا،

اس کے بعد ایک مختصر باب "فی معرفۃ اصل المؤلف و التاریخ" کے عنوان سے ہے، جس مین مؤلف نے اپنے بزرگون کا حال بتایا ہے،

بہ مہندس شہیر در افواہ	والد این فقیر لطف اللہ
کسب این علم از پدر فرمود	نادر العصر آن کہ احمد بود
ہست از علم این حقیر نحیف	در ریاضی رسالہ ہائے شریف
در ریاضی ہمین برادر من	چند تصنیف ہست در ہر فن
ہم ازین ذرہ وار تصنیفات	ہست گز رنج جہل واد نجات

در ہزار است و یکصد و پنجاہ   نظم این چند گوہر دل خواہ

پہلے شعر مین مصنف نے اپنے باپ لطف اللہ مہندس کا نام لیا ہے، دوسرے مین اپنے دادا نادر العصر احمد کا نام بتایا ہے، پھر اپنی اور اپنے بڑے بھائی کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے، بڑے بھائی کا نام نہین بتایا ہے، مگر مقالہ کے گذشتہ نمبر مین اس کا نام مذکور ہے، یعنی ملا امام الدین مؤلف تصریح الافلاک،

اس مجموعہ کے آخر مین ہے :-

"از تصانیف نادر العصر معلم عالمیان مرزا ابو الخیر عرف خیر اللہ غفر لہ ذنبہ تقبلہ"

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط اسی کے دست و قلم کا ہے،

کل تصنیفات کی تاریخون کے موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱۱۸ھ سے ۱۱۶۵ھ تک تقریباً چالیس برس تک اس کا قلم مختلف علوم و فنون کی کتابون کی تصنیف مین روان رہا ہے، چنانچہ ذیل مین اس کی تصنیفات کے سنین یکجا لکھ دیئے جاتے ہین،

۱- الرسالۃ القدسیۃ	۱۱۱۸ھ	۴- مدخل فی النجوم	۱۱۵۰ھ
۲- البیع الثوابت	۱۱۱۹ھ	۵- تقریب التحریر	۱۱۶۱ھ
۳- شرح زیج محمد شاہی	۱۱۴۰ھ کے بعد	۶- حاشیہ شرح بست باب	۱۱۶۵ھ

اب تک تو ہمین یہ معلوم تھا کہ یہ خاندان پہلے لاہور مین تھا، پھر یہ دہلی چلا آیا، لیکن اس مجموعہ مین مرزا خیر اللہ مہندس کے نام کے ساتھ بانگر مؤی لکھا ہے، بانگرمئو کانپور کے پاس موجودہ ضلع اناؤ کے حدود مین ایک بستی ہے، سمجھ مین نہین آتا کہ مرزا خیر اللہ کا تعلق بانگرمئو سے کیونکر پیدا ہوا، کیا یہ مان لیا جائے کہ دلی کے احمد شاہی یا نادر شاہی ہنگامہ سے گھبرا کر یہ پورب کے امن کے مقام مین چلا آیا تھا، مگر یہ بہت ہی مشکوک بات ہے،

امام الدین کا تمتہ امام الدین ریاضی بن ملا لطف اللہ مہندس بن ملا احمد معمار کی تصنیفات کے ذکر مین حاشیہ شرح چغمنی کا ذکر آیا ہے، امام الدین نے اپنی کتاب تصریح مین اپنے اس حاشیہ کا خود حوالہ دیا ہے، دیکھیے تصریح ص ۱۳، و ۲۴، مطبوعہ مجتبائی،

امام الدین نے تصریح مین (ص۱۵ مجتبائی) اپنے ایک اور رسالہ کا نام لیا ہے، جس کا ذکر گذشتہ مضمون مین نہین آیا ہے، اور وہ اضافہ کے قابل ہے، زمین کے کروی ہونے پر زمین کی سطح پر بڑے بڑے اونچے پہاڑون، اور گہرے غارون کی بنا پر اعتراض کیا گیا ہے، اُس کے جواب مین محقق طوسی اور قطب شیرازی نے کہا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے پہاڑ کی اونچائی کی نسبت زمین سے ایسی ہے، جیسے ایک ہاتھ کے کرے کے قطر کو جو کے عرض کے ساتوین حصہ سے، اس لئے وہ لحاظ کے قابل نہین محقق رومی نے شرح چغمنی کے حاشیہ مین اس جواب پر اعتراض کیا ہے، امام الدین نے اس کے جواب مین یہ رسالہ لکھا ہے،

باب التقریظ والانتقاد

طنز لطیف

از

از جناب وحید احمد صاحب پارلیمنٹری سکریٹری حکومت صوبہ متحدہ

راج رشی ٹنڈن جی نے چند دنون سے ہندو مسلمانون مین ازدواج کی تحریک شروع کی ہے، اس کی مصلحت جو بھی بیان کیجائے لیکن ٹنڈن جی کے خیالات کے پیش نظر اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہین ہو سکتا کہ شادی بیاہ کے ذریعہ مسلمانون کو ہندوؤن مین ضم کرلیا جائے یا کم از کم ان کا کلچر بدل کر ان کی امتیازی حیثیت ختم کر دیجائے، وحید احمد صاحب پارلیمنٹری سکریٹری نے بھی اس تحریک کے بارے مین پانیر مین اپنے خیالات ظاہر کئے تھے، جن سے بظاہر ٹنڈن جی کی تجویز کی تائید ہوتی تھی، اس لئے ہر طرف سے اس کی مخالفت ہوئی، حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے بھی اس کی مخالفت مین شذرات لکھے تھے، اب وحید احمد صاحب کا بیان ہے کہ ان کا مضمون طنزیہ و مزاحیہ تھا، اور اس مین انھون نے ٹنڈن جی کی تجویز کا مذاق اڑایا تھا، اس کو سنجیدگی پر محمول کرنا معترضین کا قصور فہم ہے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے یا معترضین کی بدذوقی کہ ان مین سے کسی کو بھی طنز اور سنجیدگی مین امتیاز نہ ہو سکا، اور سب نے اسے سنجیدگی پر محمول کرکے اس کی مخالفت مین مضامین لکھے، لیکن لکھنے والے کو اپنی تحریر کی تشریح کا زیادہ

حق ہے اس لئے ہم کو وحید احمد صاحب کے بیان کے ماننے مین تامل نہین ہے، اور اس سے مسرت ہوئی
کہ الحمد للہ اس مسئلہ مین وہ جمہور مسلمانون کے ہم عقیدہ ہین، وہ اپنا یہ جواب اخبارات مین بھی
شائع کرا چکے ہین، اس کے بعد **معارف** مین اس کی اشاعت کی ضرورت نہین تھی لیکن ان کا
اصرار ہے اس لئے شائع کیا جاتا ہے، باقی انھون نے مسلمانون کی جس ذہنیت اور احساس کمتری
کی جانب اشارہ کیا ہے اس کو وہ ہم سے بہتر سمجھتے ہین ع :-

این سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی

البتہ اس دعا مین ہم اُن کے ساتھ شریک ہین، کہ " اللہ تعالیٰ مسلمانون کو قوتِ ایمانی عطا فرمائے آمین "

"م"

جناب محترم ایڈیٹر صاحب رسالہ معارف :-

السلام علیکم،

رسالہ معارف مین "مختلف فرقون مین شادیان" و الابصیرت افروز نوٹ دیکھا، مسرت ہے کہ ایک
مغالطہ کی وجہ سے ایک خاص مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی زحمت آپنے گوارا فرمائی لیکن افسوس ہے کہ اس نوٹ
کی بنیاد میرے پانیر والے مضمون پر رکھی گئی ہے، اگر آپ اجازت دین، اور گستاخی معاف کردین تو مین
وثوق سے کہہ سکتا ہون کہ میری تحریر آپ کی نظر سے نہین گذری، بلکہ کسی اور صاحب نے آپ سے اس کا تذکرہ
کیا ہوگا، ورنہ نہ اس قدر مغالطہ پیدا ہوتا، ورنہ آپ کو سخت تکلیف پہنچتی، مین کہہ سکتا ہون کہ آپ کی
اس سخت تکلیف کے باعث وہ سخن فہم ہین جنھون نے آپ کو وہ مضمون سُنایا، اور مین نہین ہون، مگر باین ہمہ
مجھے سخت ایذا ہوئی، اور میری گردن شرم سے جھکی جارہی ہے، اس امر کی کہ باعثِ تکلیف مین نہین ہون
میرے مضمون کی وضاحت بہترین شہادت ہوسکتی ہے،

آپ کا آخری قیاس صحیح ہے جو آپنے میرے مضمون سے سمجھا کہ ٹنڈن جی کی یہ تحریک مسلمانون کی

امتیازی حیثیت کو ختم کرنے کے لئے تھی، یہی احساس تھا جس کے ماتحت وہ مضمون لکھا گیا تھا، میرے مضمون کی سرخی تھی Tandon ji The grand mughal یہ سرخی بولتی ہوئی تھی، اس کا ترجمہ "مغل اعظم ٹنڈن جی" نہیں ہو سکتا، بلکہ "ٹنڈن جی مغل اعظم کے بھیس میں"[1] ہو سکتا ہے، اردو میں میں نے اپنے اس مضمون کی سرخی "ٹنڈن جی کی اپج" رکھی تھی، اور یہ مضمون قومی آواز اور ذوالقرنین میں شائع ہوا تھا، مذاق سلیم اور فراست ان سرخیوں سے ثابت کر رہی ہیں کہ مجھے اکبر اعظم پر بھی اعتراض تھا، چہ جائیکہ ٹنڈن جی، اب میں اس کو کیا کروں کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ میں ٹنڈن جی کو اعزازی لقب اکبر کا دے رہا ہوں، میں نے اس مضمون میں مزاح اور طنز آمیز ظرافت سے کام لے کر ٹنڈن جی کو جواب دیا تھا کہ اکبر نے بھی یہی تحریک شروع کی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ہم مذہب اس سے خفا ہو گئے، مگر تاریخ میں اس کا نام محفوظ ہو گیا، اسی طرح ٹنڈن جی سے اُن کے ہم مذہب خفا ہو جائیں گے، اور راج رشی کا لقب چھین لیں گے، مگر تاریخ میں اُن کی خوبیاں یادگار رہیں گی، ابھی تک ٹنڈن جی زبان و کلچر پر طبع آزمائی فرما رہے تھے، اب اس نئی تحریک سے ان کے گذشتہ منصوبوں کی تردید خود بخود ہو جاتی ہے، کیونکہ مشترکہ شادی سے نئی زبان اور نئے کلچر اب وجود میں آئیں گے، لیکن مسرت ہے کہ غلط روی نے ٹنڈن جی کو صحیح راستہ پر لگا دیا، اور یہ نئی تحریک شروع کر دی، .... مسلمانوں کے یہاں اہل کتاب سے شادی کا جواز پہلے سے موجود ہے، اب مسلمان اگر کسی طرح یہ ثابت کر سکیں کہ ہندو اہل کتاب ہونے کے اہل ہو سکتے ہیں، تو ہم ان کی تحریک کو لبیک کہنے کو تیار ہو سکتے ہیں، ...... ہر قوم اور ہر زمانہ میں نبی بھیجے گئے ہیں، ہندوستان میں بھی کوئی نبی آیا ہو گا، ..... وغیرہ وغیرہ،

ملاحظہ ہو کہ باہمی شادی پر مسلمانوں کے متعلق کتنے بریک لگا کر میں نے بات کہی ہے، گویا اس امر میں میں مفتی و مفسر نہیں بنا ہوں، بلکہ مستفسر کے حدود میں رہا ہوں،

---

[1] معارف:- مذکورہ انگریزی فقرے کا یہ مفہوم صرف مضمون نگاری کے ذہن میں آ سکتا تھا،

یہ شگفتہ دلی میں نہیں سمجھ سکتا کہ متانت و سنجیدگی کا کبھی بھی پہلو اختیار کر سکتی ہے، اس اظہار کے بعد باعث مغالطہ ہونے کا مجھے اعتراف ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ مسلمان کی ذہنیت کو کیا ہو گیا ہے، احساس کمتری کی مثال اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ نظر قطعی بند ہو کر رہ گئی ہے، لہٰذا تمنا اور دعا ہے کہ خداوند کریم مسلمانوں کو اپنی رحمت سے قوت ایمانی مرحمت فرمائے، اور اُن کے صدقہ میں مجھ گنہگار کو، آمین،

مجھے امید ہے کہ میری اس معذرت اور وضاحت کا تذکرہ رسالہ معارف میں شائع فرما کر میری خفت و ندامت کو دور کرنے کی سعی فرمائیے گا،

نیاز مند:- "وحید احمد"

استفسار و جواب

تقویم الابدان

قاضی نورالدین حسین صاحب
رائچند دیپ چند لائبریری بھروچ بمبئی،

مکرمی جناب مدیر صاحب معارف اعظم گڈھ،

سلام مسنون

براہِ کرم ذیل کے استفسار کا جواب بذریعۂ معارف تحریر فرما کر مشکور فرمائیں، صوبہ گجرات کے ایک قصبۂ انکلیسر (ضلع بھروچ) میں ایک رئیس سید محمود علی بن سید غلام علی انعامدار صاحب کے کتب خانہ میں طب کی ایک عربی قلمی کتاب تقویم الابدان مصنفہ و مرتبہ یحییٰ بن عیسیٰ بن جزلہ (کتابت سنہ ۵۸۸ھ) کا نایاب نسخہ ہے حضرت قبلہ ... مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے مذکور کتاب کے متعلق نقوش سلیمانی میں اپنے سفرنامہ میں ذکر فرمایا ہے، اس راقم الحروف نے بھی معارف کے گذشتہ جولائی سنہ ۴۹ء کے پرچہ میں ضمیمہ گجرات کے کتب خانہ کے عنوان والے مضمون میں حکیم روح اللہ بھروچی جہانگیری کے کتب خانہ کی کتاب کے ذکر میں اس کا ذکر کیا ہے، لہٰذا اس کتاب کے کہاں کہاں نسخے موجود ہیں، اور آیا یہ کتاب طبع ہوئی ہے یا نہیں، وہ تحریر فرما کر مشکور و ممنون فرمائیں، مذکورہ کتاب حسب ذیل حصص میں منقسم معلوم ہوتی ہے، ۹ × ۱۵ اجلد دونوں میں واضح خط سے لکھی گئی ہے، کل صفحات ۲۰۲ ہیں،

(۱) تقویم الابدان (نقوش سلیمانی میں تقویم الادویہ مسطور ہے) صفحہ ۹۶،

(۲) مختصر لجالینوس فی علاج الامراض ومزاج الطبائع .... الخ صـ۱۲

(۳) تقویم الصحت بالاسباب " صـ۴۲

(۴) تقویم الادویہ المفردۃ والاغذیہ " صـ۵۳

کاتب (۱) حمد بن عمر بن جبار، ابتدا بسم اللہ کے بعد..... کتاب تقویم الابدان،

بمداواۃ الامراض المجتمعۃ فی ثلاثۃ اجناس متشابھۃ والیۃ

...... والازمنۃ والبلدان.....الخ

اختتام:- تم کتاب تقویۃ الابدان بعون اللہ تعالیٰ وحسن توفیق

علی ید الفقیر الی رحمۃ اللہ تعالیٰ وغفرانہ (۱) حمد بن عبد الجبّار

الورزقنی وقد وقع فراغ تحریرہ فی منتصف ذی القعدۃ سنہ ثمان

وثمانین خمسمایۃ والحمد للہ ربّ العالمین والصّلوٰۃ..... اجمعین،

معارف: تقویم الابدان کوئی نایاب کتاب نہیں ہے، اس کا ایک حصہ چھپ بھی چکا ہے،

اس کی تصحیح سلیمان الدخیل نے کی تھی، اور امیر بن الرشید امیر نجد کے ایجنٹ رشید پاشا نے ۱۳۳۲ھ میں

دمشق میں اس کو چھپوایا تھا، ہندوستان کے بہت سے کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے پائے جاتے

ہیں، پٹنہ لائبریری، کتب خانہ ریاست رامپور اور سبحان اللہ لائبریری مسلم یونیورسٹی میں اُس کے قلمی

نسخے موجود ہیں، اور کتب خانوں میں بھی ہوں گے، اس کتاب کا لاطینی ترجمہ ۱۵۳۲ء میں اسٹرا

برگ سے شائع ہو چکا ہے۔

لغات جدیدہ

چار ہزار جدید عربی الفاظ کی ڈکشنری مع ضمیمہ مسعود عالم صاحب ندوی۔

قیمت ۸ / ضخامت ۲۵۷ صفحے، "منیجر"

ادبیات

دورِ حاضر
اور
اسوۂ فاروقی

از جناب یحییٰ اعظمی

بنا عدل و اخوت کی جہان مین جس نے محکم کی
وہ جس نے زندہ سنت کی شہنشاہِ دو عالم کی

تمنا سرورِ دین کو تھی جس کے خیر مقدم کی
ضرورت ہے جہان کو پھر اُسی فاروقِ اعظم کی

کہ ظلمت ہر طرف چھائی ہے پھر باطل پرستی کی
مگر حد ہو گئی ہے نوعِ انسانی کی پستی کی

کوئی بھی انتہا ہے اس کے اخلاقِ ذمائم کی
کہ انسان سے کہین بہتر ہے اب حالت بہائم کی

کرے شرح آہ کوئی کس طرح اسکے عزائم کی
کہ آغشتہ بخون ہے داستان اس کے جرائم کی

کیا ہے تازہ اُس نے عصرِ نو مین دورِ چنگیزی
ہے کھیل اس کا یتیمون اور معصومون کی خونریزی

صف آرا ہین گھٹائین نیر حق کے مقابل مین
نہ جانے کا وشین کب کی بھری ہین قلبِ باطل مین

تشتت رونما ہے ملتِ بیضا کی محفل مین
پریشانی سی ہے ہر بندۂ توحید کے دل مین

عزیمت ہے نہ وہ عہدِ سلف کی شان باقی ہے
نہ اس کا نعِ لاتحزن پہ اب ایمان باقی ہے

جہاں میں کیا یہی مسلم کے جینے کا قرینہ ہے کہ خودداری کا اس کی چور چور آبگینہ ہو

پڑا موج بلا میں آکے اُمت کا سفینہ ہے نشیمن خوف غیر اللہ کا مومن کا سینہ ہو

اکھڑتا جارہا ہے پائے عزم استوار اس کا

کہ شیوہ بن گیا ہے رزم ہستی سے فرار اس کا

نہیں کیا یاد اسے لَا تَقْنَطُوْا کی نصِ قرآنی نہیں کیا یاد اُسے کَمْ مِنْ فِئَة کا عہدِ ربانی

بتائے کوئی پھر ہم کس لئے یہ ضعف ایمانی رہی ہے اس سے پہلے کیا یہی شانِ مسلمانی

ملیں گے تم کو ایک ایک حرف سے اس کے سبق اب بھی

کتب خانوں میں ہیں تاریخ ماضی کے ورق اب بھی

مسلماں کے لئے یہ دور، دورِ سرفرازی ہے کہ رنج وابتلا مومن کی شانِ امتیازی ہے

حقیقت میں اسی کا سب یہ فیض کارسازی ہے کہ دنیا میں ابھی تک سرخرو دین حجازی ہے

ملا ہے بہرہ اس کو روے گلگوں شہادت سے

کہ تاریخ اس کی ہے تابندہ تر خونِ شہادت سے

ہمارے کارناموں سے ہے دہر اب تک پر آوازہ حنین و بدر کی ہے داستانِ فخر ابھی تازہ

زمانہ کو ہو پھر زورِ ید اللّٰہی کا اندازہ خداوندا مرتب کردے پھر ملت کا شیرازہ

ہمارے بازوؤں میں پھر وہی اگلی سی قوت دے

وہی جوش شجاعت دے وہی ذوقِ عزیمت دے

اٹھادے پھر کوئی فاروق پیدا عصر حاضر سے جہاں میں کردے بزم عدل و صدق آراستہ پھر سے

نہیں کچھ بھی یہ مشکل تیری قدرت کے مظاہر سے خداوندا سبھی ممکن ہے تیرے دستِ قادر سے

عمر جیسا جلیل القدر پھر دنیا میں پیدا کر

جلالِ عہد فاروقی جہاں میں پھر ہویدا کر

سکھا دی جو جہانِ نو کو آئینِ جہانبانی
بتا دے جو زمانہ کو رموزِ فقر و سلطانی

وہ جس کا شہرۂ آفاق دورِ عدلِ لاثانی
بلند اک بار پھر کر دے مقامِ نوعِ انسانی

ہو قلبِ دہر پر سکہ رواں اس کی جلالت کا
مساوات و اخوت کا صداقت کا عدالت کا

غزل

از جناب فضل اختر سیتاپوری

سما گیا ہے کچھ ایسا جمالِ جانانہ
مری نگاہ میں رقصاں ہے آئینہ خانہ

تری نگاہ وہی ہے اثر جداگانہ
کہ جس سے ہے کوئی دیوانہ کوئی فرزانہ

فروغِ سجدۂ اخلاص کا یہ عالم ہو
کہ بڑھ کے چومے قدم کعبہ ہو کہ بتخانہ

حیات اس پہ نہ ہنستی ہے اور نہ روتی ہے
نکل گیا حدِ فرزانگی سے دیوانہ

حیات و مرگ کے پھر اٹھ کھڑے ہوئے جھگڑے
یہی ہے حشر یہی حشر کا ہے افسانہ

اب اس مقام پہ ہے عشق کی جنوں خیزی
کہ حسنِ یار ہوا آپ اپنا دیوانہ

کبھی یہ سوچتا ہوں کاش وہ مرے ہوتے
کبھی یہ کہتا ہوں اچھا ہے جو ہیں بیگانہ

چراغ لے کے بڑھا رہنمائی کو شعلہ
قریب شمع دکھائی دیا جو پروانہ

سکون حسن کا اور بیقراریاں دل کی
ہر ایک چیز کا اسلوب ہے جداگانہ

میں رازِ عشق چھپاتا ہوں اور نہیں چھپتا
مرا سکوت بنا جا رہا ہے افسانہ

پیام یار تو دیتی ہیں دھڑکنیں دل کی
نگاہِ شوق سناتی ہے دل کا افسانہ

کرشمہ اس نگہِ مست کا ہے یہ اختر
چھلک رہا ہے جو چھلکا ہوا تھا پیمانہ

باب التقریظ والانتقاد

معین الارواح

یعنی

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک نئی سوانح عمری

از

سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے رفیق دار المصنفین

ہندوستان کے صوفیۂ کرام میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند ہے، ان ہی کے فیوض سے ہندوستان اسلام کے نور سے منور ہوا، اور ان کے وصال کو سات سو برس سے زیادہ گذرے، لیکن ان کی روحانی برکات کا سرچشمہ ابھی تک جاری ہے، مگر افسوس ہے کہ اب تک فارسی یا اردو زبان کی کسی کتاب میں ان کے مبسوط حالات زندگی نہیں ملتے، تذکروں میں زیادہ تر یا تو اُن کے کشف و کرامات یا اُن کے اوراد و وظائف کی تفصیلات ملتی ہیں، اب سے پہلے ان ہی چیزوں کی زیادہ تلاش رہتی تھی اسلئے تذکرہ نویس انہی کی تفصیل لکھکر اپنے ناظرین کی تشنگی بجھاتے تھے لیکن اب جب کہ زمانہ کا ذوق بدل گیا ہے، صوفیۂ کرام سے عقیدت رکھنے والا گروہ ان کی سیرت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جاننے کا زیادہ خواہاں ہوتا ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات زندگی پر اب تک جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ چند اوراق

لہ ملنے کا پتہ: - منیجر شعبۂ اشاعت معینی گدڑی شاہی انجمن جوالر و، اجمیر شریف : قیمت ۱- صر

سے زیادہ نہیں پھیل سکا ہے، معلومات کی کمی کی وجہ سے ایک اہل قلم اپنے کو چند اوراق ہی میں محدود کر دینے پر مجبور پاتا تھا، لیکن ہم جناب محمد خادم حسن زبیری صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے معین الارواح میں حضرت خواجہ صاحب کے مفصل اور مبسوط حالات لکھنے کی کوشش کی ہے،

کتاب کے شروع میں جناب ڈاکٹر ظہور الحسن شارب ام اے پی ، ایچ ڈی، ڈائرکٹر اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹرس کا طویل دیباچہ ہے، پھر فاضل مؤلف کا معروضہ ہے، جس میں ان کتابوں کا بھی ذکر ہے جن کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، جدید ذوق کے مطابق اگر ان ماخذوں کے مصنفین کے نام اور سنین تالیف بھی لکھ دیئے جاتے، تو بہتر تھا، فاضل مؤلف نے اپنی محققانہ کتاب میں مسالک السالکین کا حوالہ کثرت سے دیا ہے، لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس کی تصنیف ہے، اور کس زمانہ میں لکھی گئی ہے، شاید یہ تیرہویں صدی ہجری ہی کی تصنیف ہو، حضرت خواجہ کی سوانح عمری لکھنے میں.... حال کی کسی تصنیف کو بکثرت استعمال کرنا احتیاط کے خلاف ہے،

ماخذوں کے سلسلہ میں فاضل مؤلف نے ان کتابوں کی بھی فہرست دی ہے، جو ان کو دستیاب نہیں ہو سکیں، ان میں خیر المجالس، مونس الارواح، مراۃ الاسرار، تاریخ فیروز شاہی (شاید ضیاء الدین برنی اور شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی مراد ہو) . . . .

. . . . اور اکبر نامہ اور سیر العارفین کے نام بھی ہیں، یہ کتابیں تو ایسی ہیں کہ تھوڑی سی تلاش اور جستجو کے بعد ہر اچھے کتب خانہ میں مل سکتی تھیں،

حاشیہ میں ماخذوں کا حوالہ دیتے وقت صفحوں کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، صرف کتابوں کے نام لکھ دیئے گئے ہیں، آج کل کی تحقیق و تدقیق میں صفحوں کا حوالہ دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، فاضل مؤلف اگر صفحوں کا بھی حوالہ دیدیتے، تو ان کی تحقیق میں وزن پیدا ہو جاتا،

پوری کتاب چھ حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں سوانح مبارکہ، دوسرے میں سیرۃ مقدسہ تیسرے

مین حلقۂ ارادت، چوتھے مین آپ کی درگاہ اور مراسم، پانچوین مین آپکے دربار اور چھٹے مین تاریخ اجمیر درج ہے،

پہلے حصہ مین حضرت خواجہ کے سوانح حیات سنہ وار لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، جو آج تک حضرت خواجہ کے کسی سوانح نگار نے نہین کی، گو ان سنین کے تعین کرنے مین فاضل مؤلف نے زیادہ تر قیاسات ہی سے کام لیا ہے، جو ممکن ہے کہ صحیح ہون، اور اگر ان مین تسامح بھی ہو گیا ہو، تو آیندہ جب کوئی اہل قلم حضرت خواجہ کی سوانح عمری لکھنے کی کوشش کرے گا، تو ان سنین سے اس کو واقعات قلمبند کرنے مین بڑی مدد ملے گی،

کتاب کے مطالعہ سے حضرت خواجہ کی سیاحت کا بہت ہی واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے، فاضل مؤلف کی تحقیق ہے کہ حضرت خواجہ اپنی سیاحت کے دوران مین چار بار ہندوستان آئے، ممکن ہے یہ صحیح ہو کہا جاتا ہے کہ وہ ۵۶۱ھ مین ہندوستان تشریف لائے، اور ان کا وصال ۶۳۲ھ مین ہوا، اکہتر برس کے طویل وقفہ مین بہت ممکن ہے کہ وہ ہندوستان سے کئی بار باہر تشریف لے گئے ہون، اور پھر واپس آئے ہون، اُن کے بارہ مین تو مشہور ہے جیسا کہ فاضل مؤلف نے بھی لکھا ہے کہ وہ اجمیر سے ہر سال حج کے لئے جاتے تھے (ص ۵۶) حج سے واپسی مین بلاد اسلامیہ کی سیاحت بھی کرتے ہون، اس لئے اس سے انکار نہین کیا جاتا کہ وہ چار بار ہندوستان نہین تشریف لائے ہون گے، لیکن اس سلسلہ مین فاضل مؤلف نے جو دلائل دیئے مین وہ اطمینان بخش نہین،

حضرت خواجہ کے پہلی بار ہندوستان آنے کے ذکر کے سلسلہ مین لکھتے ہین،

"غزنین سے روانہ ہو کر آپ پہلی بار بروایت متواتر بتاریخ ۱۰ ماہ محرم الحرام ۵۶۱ھ ہندوستان مین تشریف فرما ہوئے، اس وقت خسرو ملک بن خسرو شاہ غزنوی (جو بہرام شاہ کا پوتا تھا) لاہور مین حکمران تھا، (ماخوذ از تاریخ فرشتہ وغیرہ)

مگر اس ۵۶۱ھ مین چونکہ رونق اسلام صرف لاہور اور ملتان تک تھی، اور یہی ہر دو مقامات شمالی ممالک سے آنے والے کے لئے قیام و سیر کے قابل تھے، اس لئے قرین قیاس ہے کہ اس

درود ہند کے موقع پر آپ صرف لاہور و ملتان تک ہی تشریف لائے؟

(ماخوذ از تاریخ فرشتہ)

مذکورہ بالا دعوی کی تائید تاریخ فرشتہ سے نہیں ہوتی، تاریخ فرشتہ میں جو کچھ ہے وہ یہ ہے:-

"وخود بغزنین آمد و شمس العارفین عبدالواحد را کہ پیر شیخ نظام الدین ابوالموید ست دریافتہ بلاہور آمد و از آنجا بدہلی تشریف آورد، چون اژدحام خاص و عام از حد گذشت و آن بزرگوار ازان متنفر بود، بہر آئینہ از آنجا نیز متوجہ بلدۂ اجمیر شد، دوہم ماہ محرم سنہ ۵۶۱ھ احدی وستین وخمسائۃ سایہ وصول بر آن خطہ انداخت و سید السادات سید حسین المشہور بخنگ سوار کہ شیعہ مذہب بود و بصلاح و تقوی آراستہ در سلک اولیاء اللہ انتظام داشت و سلطان قطب الدین ایبک او را داروغۂ آن بلدہ ساختہ بود قدوم شیخ را با عزاز و اکرام تلقی فرمود، چون از علم و تصوف و اصطلاحات صوفیہ بہرۂ تمام داشت صحبت خواجہ را نعمت غیر مترقبہ دانستہ اکثر اوقات مجلس شریف حاضر می شد و بسیارے از کفار اجمیر، ببرکت انفاس آن پیر طریقت بشرف ایمان مشرف گشتند و آنانکہ ایمان نیاوردند، محبت خواجہ را در دل جائے دادہ پیوستہ فتوح بے حد و حصر بحضرت او می فرستاد و خواجہ در عہد شمس الدین التتمش دو مرتبہ جہت دیدن مرید خود قطب الدین بختیار کاکی، بدہلی تشریف برد" (جلد دوم ص ۳۷۷)

فرشتہ کے مذکورہ بالا اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت خواجہ غزنین سے لاہور اور لاہور سے دہلی آئے، یہاں لوگوں کا ہجوم بڑھا، تو اس جگہ سے متنفر ہو کر اجمیر کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں بتاریخ ۱۰ محرم سنہ ۵۶۱ھ پہنچے، پھر فرشتہ یہاں ایک سید حسین مشہدی کا ذکر کرتا ہے، جن کو سلطان قطب الدین ایبک نے اجمیر کا داروغہ مقرر کیا تھا، سلطان قطب الدین سنہ ۶۰۲ھ میں تخت نشین ہوا، فرشتہ نے اکتالیس برس کے وقفہ کے حالات کو صرف ایک سطر میں قلمبند کر دیا ہے، لیکن مذکورہ بالا اقتباس سے

معین الارواح کے فاضل مؤلف کا یہ دعوی ثابت نہیں ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ میں ہندوستان تشریف لائے تو لاہور اور ملتان تک آکر پھر مراجعت فرمائی، فرشتہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور اور دہلی ہوتے ہوئے اجمیر میں آکر قیام پذیر ہو گئے،

حضرت خواجہ کے دوسری بار ورود ہند کے سلسلہ میں فاضل مؤلف رقمطراز ہیں،

"حسب دلیل العارفین آپ کے ورود ہند کے وقت اجمیر ہندوؤں کی ملکیت تھی، اور جب سالکات لکین و تاریخ فرشتہ وغیرہ اجمیر میں پرتھوی راج کی حکومت تھی، اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج پر آخری بار حملہ کر کے اجمیر فتح کیا اور پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کیا چونکہ یہ واقعہ بالاتفاق ۵۸۸ھ میں ہوا ہو اس لئے آپ کا دوسری بار ورود ہند ۵۸۸ھ میں ثابت ہے"

حضرت خواجہ ۵۶۱ھ یا ۵۸۸ھ میں اجمیر آئے، تو دونوں سنہ میں اجمیر ہندوؤں ہی کی ملکیت تھی لیکن اجمیر کا ہندوؤں کی ملکیت ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ حضرت خواجہ دوسری بار ہندوستان آئے،

ورود ہند بار سوئم" کے بارہ میں فاضل مؤلف تحریر فرماتے ہیں،

"صاحب سیر العارفین کا بیان ہے کہ جب معز الدین سام غزنی جاتے ہوئے ۶۰۲ھ میں واصل بحق ہوا اس زمانہ میں آپ وارد لاہور ہوئے"

فاضل مؤلف نے اپنے معروضہ میں لکھا ہے کہ ان کو سیر العارفین دستیاب نہیں ہو سکی، (ص، د) اس لئے خیال ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا بیان سیر العارفین کے دیکھے بغیر قلمبند کیا گیا ہے، عاجز راقم کے پیش نظر اس وقت سیر العارفین کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۹۰۱ء میں شمس المطابع سے چھپ کر شائع ہوا ہے، اس میں حضرت خواجہ کے اجمیر شریف میں نزول اجلال کا ذکر ان الفاظ میں ہے :-

"بعدہ خواجہ صاحب شہر غزنی کی طرف متوجہ ہوئے اور شیخ عبد الواحد غزنوی پیر شیخ

نظام الدین ابوالموید کے ہیں وہ اس جگہ موجود تھے، اُن سے ملاقات کی، پھر وہان سے روانہ ہوکر
لاہور مین آئے، اس ایام مین پیر علی ہجویری قدس سرہٗ ......کا انتقال ہوچکا تھا لیکن شیخ
حسین زنجانی کہ پیر شیخ سعدالدین حمویہ قدس سرہٗ کے ہین، زندہ تھے، اُن سے اور خواجہ صاحب سے
بے حد دوستی اور محبت ہوگئی، کچھ دنون تک وہان قیام فرماکر پھر وہان سے متوجہ دارالخلافہ
دہلی کے ہوئے، جب اس مقام مبارک پر پہنچے، چند عرصہ تک وہان قیام فرمایا، وثاق متبرکہ
جناب خواجہ صاحب کا اس مقام پر پہنچا جہان کہ قبر شیخ رشید مکی کی ہے، اور آج تک اس
زمانہ کی نشانیون مین سے اُن کی مسجد کی محراب اب تک قائم ہے، غرضکہ دہلی مین ہجوم خاص
وعام اہلِ اسلام کا خواجہ صاحب کے گرد بہت ہوا، تب آپنے طرف دارالخیر اجمیر کے سفر کیا
اگرچہ اس زمانہ مین اجمیر شریف مین اہلِ اسلام کی رونق شروع ہوگئی تھی لیکن غلبہ کفار
نابکار کا آس پاس اجمیر شریف کے بہت تھا، اس زمانہ کے خلیفہ وقت سلطان قطب الدین
ایبک نے سیادت پناہ میر سید حسین مشہدی کو اجمیر شریف مین داروغگی کی خدمت پر ممتاز
فرمایا تھا، (حصۂ اول ص ۱۲)

سیر العارفین کے مندرجۂ بالا اقتباس سے کہین ثابت نہین ہوتا کہ حضرت خواجہ اس وقت لاہور وارد
ہوئے جب معزالدین سام غزنی جاتے ہوئے (سنہ ۵۸۷ھ) مین داصل بحق ہوا،

درودِ ہند بار چہارم کے بارہ مین فاضل مؤلف ارقام فرماتے ہین،

حسب خزینۃ الاصفیا بموجب ارشاد حضرت قطب صاحب جب آپ خراسان سے ہندوستان
وارد ہوئے، اس وقت قباچہ بیگ اور کفار مغلون کے درمیان جنگ شعلہ زن تھی، اور قطب
صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی استعانت باطنی سے قباچہ بیگ نے فتح پائی، چونکہ حسب منتخب التواریخ
یہ جنگ قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد قباچہ بیگ اور کفار مغلون سے سنہ ۶۱۱ھ مین ہوئی

لہذا غریب نواز کا چوتھی بار وارد ہندوستان ہونے کا سال بھی یہی ہے"

مذکورۂ بالا بیان خزینۃ الاصفیار کی حسب ذیل روایت سے مرتب کیا گیا ہی جو حضرت خواجہ بختیار کاکی کے ذکر مین درج ہے،

"نقل است کہ وقتیکہ خواجہ معین الحق والدین از خراسان وارد ہندوستان شد، خواجہ قطب الدین بختیار و شیخ جلال الدین تبریزی باتفاق ہم دیگر باشتیاق ملاقات شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی در ملتان تشریف بردند، روزے ہر سہ بزرگوار در یک مجلس تشریف می داشتند کہ قباچہ بیگ حاکم ملتان بخدمت حاضر آمدہ عرض کرد کہ لشکر کفار مغل برائے تسخیر ملتان آمدہ اند، و لشکر بے شمار دارند، و مرا طاقت مقابلہ و مجادلہ بایشان نیست برائے خدا امداد فرمائید، اتفاقاً خواجہ قطب الدین دران وقت تیرے بدست خود داشت حوالہ حاکم ملتان کرد و فرمود کہ این تیر بوقت شب در لشکر دشمن بیندازد و فارغ بنشین، قباچہ ہمچنان بعمل آورد در لشکر دشمن متنفسے نماند کہ زخم سر با و نرسیدہ باشد، و ہمہ کفار فرار نہادند" (ج ا ص ۲۶۰)

خزینۃ الاصفیا کی مندرجۂ بالا روایت غالباً سیر الاقطاب (ص ۱۴۹) سے لی گئی ہے، سیر الاقطاب کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت بختیار کاکی اپنے مرشد کے ساتھ ہندوستان نہین آئے، انھون نے یہ خبر سُنی کہ حضرت خواجہ خراسان سے ہندوستان جا رہے ہین، تو مرشد کے شوق ملاقات مین وہ بھی ہندوستان روانہ ہوگئے، ملتان پہونچے اور وہان سے دہلی آئے، اور دہلی سے مرشد کی خدمت مین حاضر ہونے کی اجازت مانگی لیکن اُن کو حکم ملا کہ وہ وہین قیام کرین، لیکن دلیل العارفین (مجموعۂ ملفوظات حضرت خواجہ معین الدینؒ) کے بیان کے مطابق حضرت خواجہ قطب الدین ہندوستان اور پھر اجمیر اپنے مرشد کی معیت مین آئے، دلیل العارفین کی مجلس یازدہم مین ہے،

"چو خواجہ درین خواہد رسید چشم پر آب کرد، فرمود مسافری شدم، جائیکہ مدفن ما خواہد بود

یعنی در اجمیر می روم ہر کسے را وداع کردہ دعا گوبر در راہ بودیم، بعد ازان در اجمیر رسیدیم و آن روز اجمیر رسیدیم و آن روز اجمیر از ان ہند و آن معمورہ و آباد و مسلمانی چنان نبود، چون قدم مبارک خواجہ انجا رسید، چندان اسلام ظاہر شد، کہ ان را حد نبود" (ص ۵۵ - ۵۴)

اب سمجھ مین نہین آتا کہ دلیل العارفین کی روایت کو یا سیر الاقطاب اور خزینۃ الاصفیاء کے بیانات کو قابل قبول سمجھا جائے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ذکر مین خزینۃ الاصفیا کا ایک بہت ہی واضح بیان ہی جس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہو کہ حضرت خواجہ ۱۰ محرم ۵۶۱ھ مین اجمیر وارد ہوئے، اور وہین مستقل قیام فرما کر رشد و ہدایت اور اشاعت اسلام کا سلسلہ شروع کر دیا، وہ بیان ملاحظہ ہو:

"من بعد حضرت خواجہ از بلخ بغزنین آمد و بعد حصول صحبت شمس العارفین کہ ذکر آن سابق مذکور شد فائز لاہور شد تا دو ماہ مزار پر انوار مخدوم علی علوی ہجویری لاہوری قدس سرہ معتکف ماند بعد حصول فوائد باطنی از لاہور روانہ دہلی گشت و چندے در دہلی قیام پذیر ماندہ بتاریخ دہم ماہ محرم سال پانصد و شصت و یک رونق افزائے دار الخیر اجمیر گشت و در آنجا اول شخصی کہ تشرف ارادت آنحضرتؒ مشرف شد میر سید حسین خنگ سوار بود کہ اول ازان مذہب شیعہ داشت و بعد ازان تائب شدہ مرید گشت و بمراتب اعلیٰ رسید، و من بعد ہزار در ہزار از صغار و کبار بجذبہ محبت آن محبوب کردگار حاضر شدہ مشرف بشرف اسلام و ارادت آنحضرت شدند بحدیکہ چراغ اسلام در ہندوستان بطفیل این خاندان عالی شان روشن گشت" (ج ۱ ص ۲۵۹)

عاجز راقم کے ان معروضات سے معین الارواح کے لائق مؤلف کو یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ انھون نے حضرت خواجہ کے چار بار ہندوستان آنے کے سلسلہ مین جو دلائل پیش کئے ہین وہ صحیح نہین ہین،

(باقی)

مطبوعات جدیدہ

ہزار سال پہلے از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی تقطیع اوسط ضخامت ۲۲۰ صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد للعہ ریتہ :- انجمن ثمرۃ التربیۃ دارالعلوم دیوبند،

مسلمانوں کے دور عروج میں اُن کو علمی تلاش و تحقیق اور نئے نئے اکتشافات اور اس کے لئے سیر سیاحت کا شوق اتنا غالب تھا کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب سفر میں بڑی دشواریاں تھیں زمین کا چپہ چپہ چھان مارا، اور اس زمانہ کی معلوم دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں اُن کے قدم نہ پہنچے ہوں یورپ کے برف پوش پہاڑ افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا، اور ایشیا کے مرغزار یکساں اُن کی جولانگاہ تھے، ان میں سے بہت سے اہلِ علم و قلم سیاحوں نے اپنے سفر کے مشاہدات و نتائج کتابی شکل میں قلمبند کئے، ان میں سلیمان تاجر، بزرگ بن شہریار، ابن بطوطہ، ناصر خسرو کے سفرنامے، ابوجعفر خوارزمی، ابن رستہ، ابن خردادبہ، ابن الفقیہ ہمدانی، ابن حوقل اصطخری بشاری مقدسی اور ادریسی وغیرہ کے جغرافیے چھپ کے شائع ہو چکے ہیں جو اس زمانہ کے جغرافی اور تمدنی حالات کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں، فاضل مصنف نے جن کا ہمہ گیر ذوق نئے نئے رنگ میں اپنا جلوہ دکھاتا رہتا ہے، قدیم سفرناموں اور جغرافیہ کی کتابوں کی مدد سے آج سے ہزار سال پہلے کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون لکھا تھا، جو غالباً رسالہ دارالعلوم میں شائع ہوا تھا، اسی کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، اس میں ہزار سال پہلے کے ہندوستان، چین، عراق، ایران، ترکستان اور شمالی افریقہ کے بعض علاقوں کے مذہبی، معاشرتی، تمدنی اور علمی حالات اور دوسرے عجائب و نوادر کی جھلک دکھائی گئی ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی لیکن غالباً

مضامین کی تحریر کے وقت کتاب کی شکل میں اُن کی اشاعت کا خیال نہیں تھا، اس لئے اس موضوع سے متعلق معلومات کا پورا استقصار اور مضامین میں ترتیب نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کو دوران مطالعہ میں جو معلومات حاصل ہوتے گئے، ان کو قلم برداشتہ لکھتے گئے، اور ناشرین نے اسی طرح انکو شائع کر دیا، ورنہ مصنف جیسے وسیع النظر کے قلم سے یہ کتاب اس سے زیادہ جامع اور مرتب شکل میں ہوتی لیکن موجودہ شکل میں بھی وہ بہت مفید اور دلچسپ ہے،

اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں | مرتبہ جناب اصغر علی صاحب عابدی تقطیع اوسط ضخامت ۲۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد سے پتہ مکتبہ نشأۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن،

کمیونسٹ، اشتراکی نظام کو دنیا کے سارے سیاسی و معاشی مشکلات کا حل حریت و آزادی عالمگیر انسانی و معاشی مساوات کا سب بڑا علمبردار اور مادی پہلو سے انسانیت کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، ممکن ہے کارل مارکس، انجلس اور لینن کی متخیلہ اشتراکیت میں یہ خوبیاں رہی ہوں لیکن سوویٹ حکومت میں جو اشتراکیت عملاً قائم ہے، اس میں سرمایہ داری نظام سے بھی زیادہ خرابیاں ہیں، جس کا اعتراف بہت کمیونسٹوں تک کو ہے، اور اس کے متعلق انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں بہت سے مضامین لکھے گئے ہیں، مرتب نے اُن کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، ان میں دلائل و شواہد سے دکھایا گیا ہے کہ موجودہ روسی اشتراکی نظام سیاست و معاشیات اور اخلاق و معاشرت ہر پہلو سے بدترین استبدادی نظام ہے، اس میں کسی قسم کی مساوات کا وجود نہیں بلکہ شخصی آزادی تک مفقود ہے، اور وہ ساری اخلاقی قدریں ختم کر دی گئی ہیں جن کو دنیا اب تک مانتی چلی آتی ہے، اور خود اس کے نظام اخلاق کی بنیاد تمام تر جبر و استبداد، مکر و فریب اور حیوانیت پر ہے، اس کتاب سے روس کی اشتراکیت کی پوری قلعی کھل جاتی ہے، اور وہ خصوصیت کے ساتھ ان نوجوانوں کے مطالعہ کے لائق ہے، جو اشتراکیت کے سراب کو چشمۂ حیوان سمجھتے ہیں،

کلیل بین غلیل از جناب ناطق گلاوٹھوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ ار پتہ :- کوثر بک ڈپو معسکر بنگلور ۱

عرصہ ہوا رسالہ خیام لاہور میں یہ بحث چھڑی تھی کہ حالی کے اس شعر

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں — بس اتباع مصحفی و میر کر چکے

میں پیروی مغربی سے کیا مراد ہے یورپ کے خیالات کی تقلید یا مغربی شاعر کی، اس بارہ میں ادیبوں اور سخن سنجوں کی رائیں مختلف تھیں، جناب ناطق کے نزدیک یورپ کے خیالات کی تقلید مراد تھی، اور اس صورت میں مغربی کی "ی" کو مولانا حالی کی غلطی پر محمول کرنا ناگزیر تھا، لیکن اس سلسلہ میں انھوں نے اُن کی شاعرانہ حیثیت اور شاعری پر بھی تنقید کر ڈالی تھی اور مسدس کی مخالفت کے زمانہ کی یہ روایت بھی نقل کر دی کہ وہ مولانا آسی کی تصنیف ہے، اس پر اعتراضات ہوئے، اس کے جواب میں انھوں نے جو خطوط اڈیٹر خیام کے نام لکھا تھا، اس کو کلیل بین غلیل کے فصیح نام سے شائع کیا ہے، اس میں حالی اور دور جدید کے دوسرے شعراء ادیبوں اور نقادوں کی نااہلیت، پارٹی بندی، رشک و رقابت، پروپیگنڈے اور اس قبیل کے دوسرے مسائل پر جو مذکورۂ بالا امور سے متعلق ہو سکتے ہیں، اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں، اور اس لپیٹ میں بعض پرانے اساتذہ تک آگئے ہیں، شعر و ادب میں مصنف کے صاحب نظر ہونے میں کلام نہیں، انھوں نے موجودہ زمانہ کے معیار علم و شاعری کے متعلق بہت سی باتیں صحیح لکھی ہیں، اگر وہ سنجیدگی سے ان مسائل پر بحث کرتے، تو اُن کی یہ تحریر وقیع اور غور و توجہ کی مستحق ہوتی، لیکن غیر سنجیدہ اور حریفانہ انداز تحریر، دوسروں کی تنقیص کے ساتھ خود اپنے قلم سے اپنے کمالات کے اظہار کی بنا پر یہ کتاب بھی پارٹی بندی اور پروپیگنڈے کے دائرے میں آگئی ہے، مصنف نے ایک دلچسپ روایت یہ بھی نقل کی ہے، کہ "مسدس حالی کی تصنیف میں سرسید کی محنت اور کاوش کو زیادہ دخل تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسدس اُن کی تصنیف ہے، یا کم از کم اس پر اُن کی اتنی اصلاح ہے کہ گویا ان کی

تصنیف سمجھنا چاہئے، جن لوگون کو سرسید اور حالی سے واقفیت ہے، وہ اس قسم کا تصور بھی نہین
لا سکتے، سرسید کو شعر و شاعری سے کیا علاقہ، اور اگر یہ مراد ہے کہ مسدس کے خیالات سرسید کے ہین، تو یہ
بھی صحیح نہین، مولانا حالی مسلمانون کے تدوجزر اور ان کی ترقی و تنزل کی تاریخ سے سرسید سے کم واقف
اور ان کی زبون حالی سے ان سے کم متاثر نہین تھے کہ مسدس کے خیالات کو سرسید کا القا سمجھا جائے، یہ
اور بات ہے کہ مسدس سرسید کی تحریک سے لکھی گئی ہو یا اسکی تصنیف کے دوران مین مولانا حالی سرسید سے بھی صلاح
و مشورہ کرتے رہے ہون، لیکن اس سے مسدس کو سرسید کی جانب منسوب نہین کیا جا سکتا، اس قسم کا
علمی افادہ و استفادہ اہل علم مین عام ہے، بہر حال یہ کتاب لطف و دلچسپی سے خالی نہین ہے، نام کی
جدت و فصاحت خصوصیت کیساتھ حسن ذوق کا نمونہ ہے،

جمہوریۂ ہند کے دستورِ اساسی کا خاکہ | ازجناب محمد ہاشم صاحب قدوائی ایم اے لکچرار شعبۂ پولیٹیکل سائنس مسلم یونیورسٹی تقطیع اوسط ضخامت ۲، صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ:- ایجوکیشنل ہاؤس سول لائن شمشاد بلڈنگ علی گڈھ،

جمہوریہ ہند کے دستور کا متن خاصہ ضخیم ہے، اور غالباً ابھی اردو مین اس کا ترجمہ نہین ہوا ہے، لائق
مرتب نے اردو مین اس کا خلاصہ لکھا ہے، اس مین دستور کی مختصر تاریخ اس کی خصوصیات، شہریت،
اس کے حقوق و فرائض، ملکی پالیسی کے اصول، ہندیونین کے اجزاء اور اس کا نظام، مرکزی حکومت،
پارلیمنٹ، ریاستون، ریاستی مجالس قانون ساز، عدلیہ، ہائیکورٹ، ماتحت عدالتون، پبلک سروس
کمیشن وغیرہ سے متعلق دستور کے تمام آئین و قوانین کا پورا خاکہ آگیا ہے، زبان صاف اور سلیس ہے
یہ کتاب مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے، لیکن عام اردو خوانون
کے مطالعہ کے لائق بھی ہے،

حبیبؐ خدا، چاند ستارے اور مہاجرینؓ و انصار، ازجناب الیاس احمد صاحب مجیبی

تقطیع اوسط، ضخامت علی الترتیب ۱۹۲، ۱۶۰، ۱۶۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت عار

عیر، عیر، پتہ :- اردو گھر ۶ مارٹن روڈ کراچی،

بچکانی کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے مجیبی صاحب کو خاص شہرت حاصل ہے، انھون نے مسلمان بچون کی اخلاقی تعلیم و تربیت کے لئے دارالمصنفین کی کتابون کی مدد سے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاے راشدین اور صحابۂ کرام کی سیرت پر متعدد مختصر اور مفید کتابین لکھی ہین، جو بہت مقبول ہوئین مذکورۂ بالا تینون کتابین اُن کے نئے اڈیشن ہین، اس مین مصنف نے بہت سے مفید اور نئے اضافے کئے ہین، جیسا کہ ان کتابون کے نام سے ظاہر ہے، پہلی کتاب سیرت نبوی پر ہے، دوسری خلفاے راشدین اور تیسری اکابر مہاجر و انصار صحابہ کے حالات ہین، ان مین ان بزرگون کے سوانح کے ساتھ اُن کی زندگی کے اخلاقی پہلوون اور اُسوۂ حسنہ کو خصوصیت کے ساتھ نمایان کیا گیا ہے، زبان بہت صاف، سادہ اور آسان اور انداز بیان بچون کے ذوق کے مطابق، یہ پورا سلسلہ مسلمان بچون کے پڑھانے کے لائق ہے،

زندگی کے سایے، مترجم بلال احمد مرحوم، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عار، پتہ :- لاجپت راے اینڈ سنز اردو بازار دہلی،

امریکہ کی مشہور افسانہ و ناول نگار خاتون پرل بک کو چین سے بڑی دلچسپی ہے، وہ وہان رہ بھی چکی ہین، اور چینی زندگی کے مختلف پہلوؤن پر انھون نے بہت سے افسانے لکھے ہین، زندگی کے سایے اُن کے سات افسانون کا ترجمہ ہے، ایک افسانہ اطالوی افسانہ نگار اگینیز یو سلونے کا ہے، یہ سب افسانے دلچسپ اور خصوصیت کے ساتھ ان لوگون کے پڑھنے کے لائق ہین، جن کو چین مین امریکہ کی سیاست سے دلچسپی ہو، کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم مترجم نے کل ۱۹ سال کی عمر پائی جس مین عموماً قلم پکڑنا بھی نہین آتا، ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے، تو ادبی صنف مین نمایان جگہ حاصل کرتے لیکن موت نے اس کا موقع نہین دیا،

"م"

جلد ۶۶ ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۵۰ء عدد ۴

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

کانگریس کی صدارت مین ٹنڈن جی کی کامیابی کو فرقہ پرستون نے اپنی فتح سمجھا اور بڑی خوشیان منائین کہ اب کانگریس پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا، قوم پرستون کو تشویش پیدا ہوئی کہ دیکھین فرقہ وارانہ مسائل مین کانگریس کی پالیسی پر اس کا کیا اثر پڑتا ہی، لیکن ہندوستان کی فلاح کا صرف ایک راستہ ہی، سیکلر حکومت تمام فرقون کے حقوق مین قانونی اور عملی یکسانیت، قومی اتحاد و یکجہتی، اور پاکستان و ہندوستان کے تعلقات مین خوشگواری، اسکے علاوہ جو راستہ بھی اختیار کیا جائیگا وہ ملک کو ہلاکت اور بربادی کیطرف لیجائیگا، اسلیے اگر ٹنڈن جی ملک کے سچے بہی خواہ ہین تو انکو بھی اپنا نقطۂ نظر بدلنا پڑے گا۔

کانگریس کی صدارت کے بعد اگرچہ انکا اب وہ لہجہ بدل چلا ہی اور ادھر انھون نے جو تقریرین کی ہین ان مین وہ محض فرقہ پرست، مسلم آزار اور پراچین بھارت کے نمایندے نہین معلوم ہوتے، بلکہ انکی زبان سے غیر مذہبی حکومت، مختلف فرقون کے حقوق مین مساوات، مسلمانون کے تحفظ اور ہندو مسلم اتحاد کے نعرے بھی نکلنے لگے ہین، بلکہ بعض تقریرون مین تو اپنے محبوب مشن کلچر کے متعلق یہانتک کہا ہی کہ "ہندوستانی کلچر ہندو مسلمانون نے مل کر بنایا ہی، اور انکا اور انکے وطن الہ آباد کے مسلمانون کا کلچر ایک ہی"، اگر وہ بھی اسکو مانتے ہین تو پھر انکے اور مسلمانون کے نقطۂ نظر مین کوئی اختلاف نہین رہ جاتا، مسلمان بھی یہی کہتے ہین کہ ہندوستانی کلچر وہی ہے جو ہندو مسلمانون کے میل جول سے بنا ہے، اور جسمین دونون کے اثرات ہین اور اسی کو ہندوستان کا مشترک کلچر ہونا چاہیے، لیکن ٹنڈن جی کی زبان سے ہندو کلچر کا نعرہ بھی نکل جاتا ہی، اس نعرہ کیساتھ ہندو مسلم اتحاد کی اپیل بے معنی ہی، اگر وہ حقیقۃً اتحاد چاہتے ہین تو یہ نعرہ چھوڑ دینا چاہیے، اتحاد کے معنی ہندون مین ضم ہوجانے کے نہین ہین، اس کے بغیر بھی اتحاد ہوسکتا ہی اور ہوکر رہے گا، ٹنڈن جی کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ مسلمان ہندوستان ہی مین رہینگے، اور پورے اتحاد قومی کے ساتھ اپنا مستقل وجود بھی قائم رکھین گے،

ٹنڈن جی کو ہندوستان کی سب سے بڑی قومی جماعت کی قیادت سپرد کیگئی ہے، انھین اپنے کو اسکا اہل ثابت کرنا چاہیے اور اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتین چھوڑ دینی چاہئین، کانگریس تمام فرقون کی نمایندہ جماعت کہی جاتی ہے، اور مسلمان اب بھی ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہین، اسکے علاوہ صدارت کی کامیابی مین ٹنڈن جی کو مسلمانون کے ووٹون سے بھی مدد ملی ہے، اسلیے انکی نمایندگی بھی کرنا انکا قانونی اور اخلاقی فرض ہے، غلط نقطۂ نظر ہمیشہ نہین چل سکتا، یا اسکو صحیح کرنا ہوگا یا ملک کو تباہی کے حوالہ کرنا ہوگا، ٹنڈن جی کے محب وطن ہونے مین شبہہ نہین، اسلیے کیا عجب ہے کہ صدارت کی ذمہ داری انکے خیالات کی تصحیح کردے، حق و صداقت مین بڑی طاقت ہے، اگر ہمت و جرأت سے مقابلہ کیا جائے تو باطل اسکو مغلوب نہین کر سکتا اور بالآخر فتح حق ہی کی ہوگی، ناسک کانگریس کے فیصلے اس کے شاہد ہین، ٹنڈن جی کو بھی ان فیصلون کی پابندی کا عملی ثبوت دینا چاہیے،

گائے اور زبان کے بارہ مین بھی ان کے خیالات مین اصلاح کی ضرورت ہے، ہندی کے حکومت کی زبان ہونے کے معنی یہ نہین ہین کہ اردو کو مٹا دیا جائے، اسکے بعد بھی ملکی زبان کی حیثیت سے اسکو زندہ رہنے کا حق ہے، اسلیے اگر ٹنڈن جی اردو دشمنی چھوڑ دین تو انکا کیا حرج ہے، گائے کی اقتصادی اہمیت سے انکار نہین، ہندوستان ایک زرعی ملک ہے، یہان گائے کی نسل کو ترقی دینے کی ضرورت ہے، اسی بنا پر اسکو قدیم ہندوستان مین مذہبی تقدس کا درجہ دیا گیا تھا، لیکن اس اہمیت کو اسکی حد کے اندر رکھنا چاہیے، اسکو ملکی مفاد پر ترجیح نہ دینا چاہیے، ایک طرف ٹنڈن جی کی عقل پرستی کا یہ حال ہے کہ وہ اس ترقی کے دور مین الہامی اور مذہبی کتابون کی ہدایات ماننے کیلیے تیار نہین ہین، دوسری طرف انکی قدامت پرستی یہ ہے کہ گائے کے تقدس کو ٹھیس لگانا گوارا نہین اور اسکے لیے وہ ربڑ اور کرمچ کے جوتے اور نواڑ کے بستربند استعمال کرنے کے بجائے کروڑون روپیہ کا اقتصادی نقصان برداشت کرنے کیلیے آمادہ ہین، اپنی ذات کیلیے تو وہ اس سے بھی زیادہ سادگی اختیار کر سکتے ہین، ربڑ کے جوتے کے بجائے لکڑی کی کھڑاوین، رسّی کے بستربند اور کھاروے کے تھیلے استعمال کرین، لیکن ملکی بلکہ فوجی ضروریات کو تو وہ گائے کے لیے قربان نہین کر سکتے، کیا فوجی سپاہیون کو بھی وہ ربڑ اور کینوس کے جوتے پہنا کر انکی کمرین نواڑ کی پٹیان باندھ کر میدان جنگ مین بھیجین گے، ان کے اسلحہ سوت کی ڈوری سے کسے اور کینوس کے تھیلون مین رکھے جائین گے، ان کے گھوڑون کی لگامین، رسی کی یا چار جامے نمدے کے اور ساز نواڑ کا ہوگا، یہ فوج کیا ہوگی عجوبہ روزگار ہوگی،

اس کے علاوہ چمڑا تو ضروریات زندگی مین ہے، اور اس زمانہ مین تو اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہو ہزارون لاکھون بوڑھے بیل اور ناکارہ گائین کہان جائین گی، ان کے چارہ کا کیا انتظام ہوگا، مسلمان تو وہ خود ہی گاؤکشی چھوڑ چکے ہین اس لیے اب ٹنڈن جی کو ان کے بجائے ہندوون کو روکنا چاہیے، جو بوڑھی گائین قصابون کے ہاتھ خفیہ بیچ دیتے ہین،

صوبہ بمبئی اگرچہ اردو زبان کے مرکز یو، پی اور دہلی سے دور ہے، اور وہان کی صوبائی زبانین گجراتی اور مرہٹی ہین لیکن ہر زمانہ مین وہان اردو زبان و ادب کا چرچا اور شعر و شاعری کا مذاق رہا ہے اردو کے بہت سے اخبارات و رسالے نکلتے ہین، اردو کی خدمت کے لیے متعدد ادبی ادارے قائم ہین، ان مین مشہور انجمن اسلام کی خدمات خصوصیت کے ساتھ اہم ہین، اسی سلسلہ مین ڈاکٹر بدل الرحمٰن صاحب مرحوم پرنسپل اسمٰعیل کالج بمبئی نے ۱۹۴۷ء مین اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، اس کا مقصد گجرات کے قدیم اردو ادب کی تحقیقات، وہان کے کتب خانون مین اس کے قلمی نوادر کی تلاش اور ان کی فہرست کی ترتیب، اردو کے ریسرچ اسکالرون کی علمی اعانت ہے، یہ ادارہ وقتاً فوقتاً اردو کے فضلاء سے مقالات بھی پڑھاتا رہتا ہے، اسکے لائق کارکنون نے گذشتہ جنوری سے ایک سہ ماہی رسالہ نوائے ادب کے نام سے جاری کیا ہے، اسکا مقصد تقریباً وہی ہے جو پرانی انجمن ترقی اردو کے رسالے کا تھا، اس وقت تک اس کے تین نمبر نکل چکے ہین، اور ہر نمبر اردو زبان و ادب سے متعلق مفید مضامین و معلومات پر مشتمل ہے، اسکے مرتب دو ہمارے پرانے رفیق پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی اور ڈاکٹر محمد ابراہیم صاحب ڈار ہین، امید ہے کہ ان دونون صاحب ذوق فضلاء کی نگرانی مین یہ رسالہ ترقی کریگا، اور یہ رسالہ اردو کے پاکستان منتقل ہوجانے سے جو کمی ہوگئی ہے وہ پوری ہوجائے گی۔

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیت

از

مولانا عبد السلام ندوی

"کلام مجید لفظی اور معنوی دونون حیثیتون سے معجزہ ہے، اس کے لفظی اور ظاہری اعجاز پر گذشتہ مہینہ مولانا سید بدرالدین صاحب علوی کا مفید مضمون شائع ہو چکا ہے لیکن ارباب بصیرت کی نگاہ مین اس کا اصلی اعجاز معنوی ہے جس نے دلون کی کایا پلٹ دی اس لئے اس مہینہ اعجاز القرآن کے اس پہلو پر مولانا عبد السلام صاحب ندوی کا فاضلانہ مقالہ شائع کیا جاتا ہے تاکہ دونون پہلو سامنے آجائین، "م"

اعجاز قرآنی کے ثابت کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اعجاز قرآنی کی نوعیت کیا ہے؟ معجزہ چونکہ دلیل نبوت ہے اور دلیل کی قسمین اور اُن کے آثار و نتائج مختلف ہوتے ہین، اس لئے معجزہ کی بھی مختلف قسمین ہین،

۱- بعض دلیلین ایسی ہوتی ہین جن سے صرف مدلول علیہ کا علم ہو جاتا ہے لیکن اُن سے دل مین ترغیب و ترہیب یا دوسرے قسم کا اور کوئی جذبہ نہین پیدا ہوتا،

مثلاً اگر ایک شخص سے یہ کہا جائے کہ فلان مقام پر کچھ لوگ موجود ہین جن سے اُس کا کوئی تعلق نہین

تو اس سے اس مقام پر اُن لوگون کے موجود ہونے کا علم تو اس کو ہو جائے گا، لیکن اس کے دل مین اُن لوگون کے بغض و محبت کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہوگا، پیغمبرون کے عام مادی معجزے اسی قسم مین داخل ہین کہ اُن سے صرف اُن کی صداقت کا علم ہوتا ہے، اگرچہ اُن کی صداقت کے تسلیم کر لینے کے بعد اُن کے اوامر و نواہی اور وعد و وعید کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ اُن کے معجزات کا بالذات نہین، بلکہ بالواسطہ اثر ہے، خود ان معجزات مین ترغیب و ترہیب کا کوئی عنصر شامل نہین،

۲- اس کے بخلاف بعض دلیلین ایسی ہوتی ہین، جو مدلول علیہ کے علم کے ساتھ ترغیب و ترہیب اور بغض و محبت کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہین، مثلاً اگر کسی شخص سے یہ کہا جائے کہ فلان مقام پر تمھارے دوست واحباب، اعزۂ و اقارب اور اہل و عیال موجود ہین تو اس کو اس مقام پر صرف اُن کی موجودگی ہی کا علم نہ ہوگا، بلکہ اس کے ساتھ اس کے دل مین اُن کی محبت کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ بے اختیار ان سے ملنے کا مشتاق ہوگا،

اسی طرح اگر اس سے یہ کہا جائے کہ فلان مقام پر تمھارے دشمن یا ڈاکو موجود ہین، جو تم کو مار ڈالینگے یا تمھارا مال لوٹ لینگے، تو اس کو صرف دشمنون اور ڈاکوؤن کی موجودگی ہی کا علم نہ ہوگا، بلکہ اس کے دل مین خوف کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ وہان سے بھاگنے کی کوشش کرے گا،

قرآن مجید اسی قسم کا معجزہ ہے اور اس حیثیت سے اس کو تمام گذشتہ پیغمبرون کے معجزات پر فضیلت حاصل ہو کہ وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ہی پر دلالت نہین کرتا، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا نے پیغمبرون کے پیرؤون کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اُن کی کیونکر مدد کی؟ اُن کو دشمنون سے کیونکر بچایا؟ دنیا مین کیونکر اُن کا بول بالا کیا؟ اور آخرت مین اُن کو کس طرح سرفراز کیا؟ اُس کے بخلاف جن لوگون نے پیغمبرون کی تکذیب کی، وہ کیونکر تباہ و برباد کئے گئے؟ اور دین و دنیا مین مستوجب لعنت ہوئے؟ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا، کہ جن لوگون کے سامنے اس قسم

کا معجزہ پیش کیا جائے گا، اُن کے دل میں پیغمبر کی صداقت کے یقین کے ساتھ ترغیب و ترہیب کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ اس کے اوامر و نواہی کی پابندی کی طرف خود بخود مائل ہوں گے۔

علامہ ابن تیمیہ ان دونوں قسم کی دلیلوں کا فرق بیان کرنے کے بعد دوسری قسم کی دلیل کے متعلق لکھتے ہیں :-

وَهٰذِهِ الطَّرِيق اكمل وابلغ	مقصد کے حاصل کرنے کا یہ کامل ترین اور
فی حصول المقصود فَاِنَّهَا	موثر ترین طریقہ ہے، کیونکہ وہ پیغمبروں
تفيد العلم بصدقهم	کی صداقت کے علم کے ساتھ اُن کی پیروی
الرَّغبة فی اتباعهم والرهبة	کی رغبت دلاتا ہے، اور ان کی مخالفت
من خلافهم،	سے ڈراتا ہے،

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے بڑے مجمعوں مثلاً عیدین میں سورۂ قاف اور سورۂ اقْتَرَبَتِ السَّاعَة اور جمعہ میں سورۂ قاف پڑھتے تھے، کیونکہ ان سورتوں میں توحید، اصولِ دین اور نبوت اور معاد کے اثبات کے ساتھ پیغمبروں کے پیروؤں اور اُن کے مخالفین کا حال بھی بیان کیا گیا ہے[۱]،

اس لئے قدرتی طور پر ان واقعات کا اثر پڑتا ہے، اور لوگوں کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے کے ساتھ ترغیب و ترہیب کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ دوسری قسم کی یہ دلیل جس کی بہترین مثال قرآن مجید ہے پہلی دلیل کی طرح بالکل سادہ نہیں ہوتی، بلکہ اس میں ترغیب و ترہیب کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں، اس لئے یہ دلیل جس قدر زیادہ موثر ہوگی، اُسی قدر اُس کی معجزانہ حیثیت زیادہ نمایاں ہوگی، اور قرآن مجید اس حیثیت

---

[۱] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴ ص ۲۰۲، ۲۰۴،

سے حد اعجاز تک پہونچ گیا ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ خود کہتا ہے،

وَلَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی	اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل
جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا	کرتے، تو تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف
مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر-۳)	سے دب جاتا اور پھٹ جاتا،

اگرچہ قساوت قلبی کی وجہ سے کفار نے اس کے معجزانہ اثر کو قبول نہین کیا، تاہم اُن کو یہ یقین تھا کہ یہ ایک موثر کلام ہے، اس لئے اُس کے اثر کے روکنے کے لئے بعض سفیہانہ تدبیرین اختیار کین، مثلاً

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا	اور یہ کافر لوگ کہتے ہین کہ اس قرآن
لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ	کو سنو ہی مت، اور اُس کے بیچ مین غل
تَغْلِبُوْنَ (حم السجدہ-۴)	مچا دیا کرو، شاید تم ہی غالب رہو،

امام رازی اس آیت کی تفسیر مین لکھتے ہین کہ "کفار کو یہ معلوم تھا کہ قرآن مجید لفظاً و معنًی دونون حیثیتون سے کامل ہے، اور جو شخص اس کو سنے گا، وہ اُس کے الفاظ کی جزالت سے واقف ہوجائیگا، اور اس کی عقل اس کے معانی کا احاطہ کرے گی، اور وہ یہ فیصلہ کر دے گی کہ یہ کلام حق ہے اور اسکا قبول کرنا ضروری ہے، اس لئے انھون نے لوگون کو اُس کے سننے سے روکنے کے لئے یہ تدبیر نکالی کہ آپس مین یہ کہنے لگے کہ اس قرآن کو نہ سنو اور جب وہ پڑھا جائے تو شور و غل کرو، اشعار پڑھو اور دوسرے قسم کے خرافات بکو تاکہ قاری کی قرأت مین گڑبڑی پیدا ہو جائے، قریش باہم ایک دوسرے کو یہی سمجھاتے تھے، اور اس کا مقصد یہ تھا، کہ اس طریقہ سے لوگ قرآن کا مطلب نہ سمجھ سکین"،

قرآن مجید کے اس معجزانہ اثر کے متعلق متعدد شہادتین موجود ہین، مثلاً کفار و مشرکین پر تو اس کا یہ اثر پڑتا تھا کہ وہ قرآن مجید کی آیتون کو سُن کر اسلام کی طرف مائل ہوتے تھے، اور اُن کے دلون مین اسلام کے قبول کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، چنانچہ صحیح بخاری باب الہجرۃ مین ہے کہ

جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کرنی چاہی، اور مقام برک الغماد تک پہنچ گئے، تو راستے مین ابن الدغنہ جو عرب کے ایک بڑے قبیلہ کا سردار تھا، مل گیا، اور پوچھا کہ "کہان کا قصد ہے"، انھون نے کہا کہ "مجھکو میری قوم نے گھر سے نکال دیا ہے، اب دنیا مین گھوم پھر کر اپنے خدا کی عبادت کرون گا"، لیکن ابن الدغنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اخلاقی فضائل گنا کر کہا کہ "تم جیسا شخص گھر بار سے نکالا نہین جا سکتا، مین تمھارا ضامن ہوتا ہون، واپس چلو اور اپنے شہر مین اپنے خدا کی عبادت کرو"،

چنانچہ ابن الدغنہ نے سرداران قریش کو اس پر راضی کر لیا، اور انھون نے اس کی ضمانت کو اس شرط پر منظور کر لیا، کہ "وہ اپنے گھر ہی مین اپنے خدا کی عبادت کرین اور قرآن اور نماز پڑھین، لیکن اس کا اعلان نہ کرین، کیونکہ ہم کو خوف ہے کہ ہماری عورتین اور ہمارے بچّے اسلام کی طرف مائل ہو جائینگے" اس شرط پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چند روز تک عمل کیا، لیکن اس کے بعد اپنے گھر کے صحن مین انھون نے ایک مسجد بنائی، جس مین نماز پڑھتے تھے، اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے، جس کا یہ اثر ہوتا تھا کہ مشرکین کی عورتین اور اُن کے بچے اُن کے اوپر ٹوٹے پڑتے تھے، اور ان کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس منظر کو دیکھ کر کفار گھبرا گئے، اور ابن الدغنہ کو بلا کر کہا کہ "ہم نے ابو بکر کو صرف اس شرط پر پناہ دی تھی کہ وہ اپنے گھر مین خدا کی عبادت کرین لیکن انھون نے اس حد سے آگے قدم بڑھایا ہے، اور اپنے گھر کے صحن مین ایک مسجد بنالی ہے، اور کھلم کھلا اس مین نماز ادا کرتے ہین، اور قرآن پڑھتے ہین، ہم کو خوف ہے کہ ہماری عورتین اور ہمارے بچے اسلام کی طرف نہ مائل ہو جائین، تم اُن کو منع کر دو، اگر وہ صرف اپنے گھر مین عبادت کرنے پر اکتفا کرنا چاہین تو کر سکتے ہین لیکن اگر وہ علانیہ عبادت کرنا چاہتے ہین تو تمھاری ضمانت کو منسوخ کر دین"، ابن الدغنہ نے اُن کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا، تو انھون نے اس کو نامنظور کر دیا، اور اُس کی ضمانت منسوخ کر دی،

لیکن باوجود اس شور و غل اور روک تھام کے قرآن مجید کے اثر کا کلیۃً ازالہ نہ ہو سکا، اور متعدد لوگ قرآن مجید کے اثر سے اسلام کی طرف مائل ہوئے، اور متعدد لوگون نے اس کے اثر سے اسلام قبول کیا، مثلاً:-

حضرت عثمان بن مظعونؓ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت اُتری،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ، (نحل-۱۳)	خدا عدل و احسان اور قرابتدارون کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے، اور بدکاری برائی اور ظلم سے روکتا ہے، وہ اس لئے یہ نصیحتین کرتا ہے کہ شاید تم لوگ اس کو قبول کر لو،

تو اس کے سننے کے ساتھ ہی ایمان اُن کے دل مین گھر کر گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اون کو محبوب[1] ہو گئے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز مین سورۂ طور پڑھ رہے تھے، جب اس آیت تک پہنچے،

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخَالِقُوْنَ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَا یُوْقِنُوْنَ اَمْ عِنْدَھُمْ خَزَائِنُ رَبِّکَ اَمْ ھُمُ الْمُصَیْطِرُوْنَ، (طور-۲)	کیا یہ لوگ خود بخود پیدا ہو گئے؟ یا یہ لوگ خود پیدا کرنے والے ہین؟ کیا آسمان اور زمین کو انھی لوگون نے پیدا کیا ہے؟ سچ یہ ہے کہ اُن کے دل مین ایمان نہین، کیا اُن کے پاس خدا کے خزانے ہین؟ کیا یہ لوگ سربراہ کار ہین؟

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۳۱۸،

اور حضرت جبیر بن مطعم رضؓ نے اُس کو سنا تو اُن کا دل اڑنے لگا، اور وہ اسلام کی طرف مائل ہوگئے،[ل۵]

حضرت طفیل بن عمرو الدوسی رضؓ شاعر اور اپنی قوم کے سردار تھے، وہ مکہ مین آئے، اور سرداران قریش سے ملے، تو اُن لوگون نے کہا کہ تم شاعر اور اپنی قوم کے سردار ہو، اس لئے ہم کو خوف ہے کہ یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم سے ملے، اسکی بعض باتین تم کو متاثر کردین، کیونکہ اوس کی باتین جادو کا اثر رکھتی ہین، اور وہ اُن کے ذریعہ سے باپ، بیٹے، اور میان بی بی مین جدائی ڈال دیتا ہے، سرداران قریش نے بار بار اس پر اصرار کیا، تو انھون نے دل مین ٹھان لیا کہ مین مسجد مین داخل ہون گا، تو کان بند کر لونگا، چنانچہ انھون نے کان مین کپڑا ٹھونس لیا، اور مسجد کے اندر گئے، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، وہ آپکے قریب کھڑے ہوگئے، اور بے ساختہ قرآن مجید کی بعض آیتین سن لین تو دل مین کہا کہ مین ہوشیار آدمی ہون، اور بُرے اور بھلے مین امتیاز کرسکتا ہون، مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتین ضرور سنون گا، اگر وہ اچھی ہین تو اُن کو قبول کرلون گا، ورنہ اُن سے احتراز کرون گا، اب کان سے کپڑا نکال کر پھینک دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآن مجید سننے لگے، ان کا بیان ہے کہ مین نے کبھی اس سے بہتر کلام نہین سُنا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پلٹے تو وہ بھی ساتھ ہولئے، اور آپ کے گھر کے اندر گئے، اور قریش کی ممانعت کا پورا واقعہ سنا کر کہا باوجود اس ممانعت کے مین نے بے ساختہ آپ کی بات سُن لی اور مجھے یقین ہوگیا کہ وہ حق ہے، میرے سامنے اپنا دین اور اپنے اوامر و نواہی پیش کیجئے، آپ نے ان کو دعوتِ اسلام دی اور وہ مسلمان ہوگئے،[ل۶]

اسلام لانے سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کے لئے نکلے لیکن مسجد مین آپ کی زبان مبارک سے چند آیتین سنین اور اُن سے متاثر ہوئے، پہلے تو اُن کے دل مین چند شکوک پیدا ہوئے، اور قریش کی طرح دل مین یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ شاعر ہین، کاہن ہین، لیکن جب آپ

ل۵ صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۂ طور مع فتح الباری ل۶ استیعاب تذکرہ حضرت طفیل بن عمرو الدوسی رضؓ

سورہ ختم کر چکے، تو یہ تمام شکوک دور ہوگئے، اور اسلام ان کے دل میں پوری طرح جاگزین ہوگیا،[1]

نجاشی کے دربار مین حضرت جعفرؓ نے جب سورہ کھیعص کی ابتدائی آیتین پڑھ کر سنائین تو وہ رو پڑا اور اس کی داڑھی تر ہوگئی، پھر کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور توراۃ ایک ہی چراغ کے پرتو ہین[2]،

اشخاص سے الگ کفار کی جماعت کی جماعت قرآن مجید کے اثر سے متاثر ہو کر اسلام لائی حبش مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا چرچا ہوا، تو بیس عیسائی آپ کی خدمت مین حاضر ہوئے آپ نے اُن کو دعوتِ اسلام دی اور اُن کو قرآن مجید پڑھ کر سنایا، تو اُن کی آنکھون سے آنسو جاری ہوگئے، اور اسی وقت اسلام قبول کر لیا[3]،

حضرت ابو عبیدہ بن حارث، حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسدؓ، حضرت ارقم بن ابی الارقمؓ اور حضرت عثمان بن مظعون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوئے، اور آپ نے اُن کو دعوتِ اسلام دی اور قرآن مجید کی آیتین پڑھ کر سنائین، تو اُن لوگون نے فوراً اسلام قبول کر لیا[4]، لیکن مسلمانون پر قرآن مجید کا اثر اس سے بھی زیادہ سخت ہوتا تھا، خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے،

تقشعر منہ جلود الذین یخشون	جس سے ان لوگون کے جو اپنے رب
ربھم ثم تلین جلودھم و	سے ڈرتے ہین، بدن کانپ اٹھتے ہین،
قلوبھم الی ذکر اللہ،	پھر اُن کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے
(زمر-۳)	ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہین،

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے اپنی دادی سے پوچھا کہ صحابۂ کرام جب قرآن مجید پڑھتے تھے تو اُن کا کیا حال ہوتا تھا؟ بولین وہی جس کو خدا نے اُن کا وصف قرار دیا ہے یعنی اُن کی آنکھین

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۔ [2] ایضاً جلد ۱ صفحہ ۲۰۳ [3] ابن ہشام مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۲۱۲، [4] اسد الغابہ تذکرہ ابو سلمہ بن عبد الاسد،

اشکبار ہو جاتی تھیں، اور اُن کے بدن کانپ اٹھتے تھے،

اس اثر پذیری کا نتیجہ یہ تھا کہ قرآن مجید نے صحابۂ کرام کے دلوں میں خوف خشیت کا ایک مستقل جذبہ پیدا کر دیا تھا، اس لئے وہ ہر وقت اس کے خوف سے کانپتے رہتے تھے، حضرت عبداللہ رضہ ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ عہد نبوت میں ہم لوگ اس خوف کے مارے عورتوں سے ہنسی خوشی کی باتیں نہیں کرتے تھے کہ مبادا اس بارے میں کوئی آیت نازل نہ ہو جائے،

صلح حدیبیہ میں حضرت عمرؓ نے بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سوال کیا جواب نہ ملا تو آگے نکل گئے اور دل میں خوف پیدا ہوا کہ کہیں انکے بارے میں کوئی آیت نہ نازل ہو جائے ایک دن رسول اللہ صلعم خانہ کعبہ کی دیوار کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابو ذر غفاریؓ آگئے، تو آپ نے اُن کو دیکھ کر فرمایا ھُمُ الخاسرون یعنی وہ لوگ گھاٹے میں ہیں، وہ گھبرا گئے کہ میرے بارے میں کوئی آیت تو نازل نہیں ہوئی،

بالخصوص جن آیتوں میں کسی فعل پر عذاب کی دھمکی دی جاتی تھی، صحابۂ کرام اُن سے اور بھی زیادہ خوف زدہ ہوتے تھے، چنانچہ جب یہ آیت نازل ہوئی،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ	جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں، اور
الْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ	ان کو خدا کی راہ میں صرف نہیں کرتے ان
اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ	کو سخت عذاب کی بشارت دو،

تو تمام صحابہ پر گویا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی آیت کی تلاوت فرما رہے تھے، حضرت مالک بن ثعلبہؓ کا جو ایک دولتمند صحابی تھے، گذر ہوا، تو آیت کو سُن کر اُن پر غشی طاری ہو گئی، ہوش میں آئے، تو خدمتِ مبارک میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا یہ آیت اُن لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے، جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں، ارشاد ہوا، ہاں" بولے شام تک مالک کے پاس ایک درہم اور ایک دینار بھی نہ ہوگا، چنانچہ

شام تک انھون نے اپنی کل دولت خیرات کر دی، قرآن مجید کا یہی اثر ہے جس کو خطابی نے قرآن مجید کی ایک وجہ اعجاز قرار دیا ہے، اور اس نکتہ آفرینی پر اُن کو ناز ہے، چنانچہ فرماتے ہین کہ مین قرآن مجید کے وجہ اعجاز کے متعلق ایک بات کہتا ہون جس سے اور لوگون نے غفلت برتی ہے، اور وہ اس کا وہ اثر ہے جو قلب و روح پر پڑتا ہے، کیونکہ قرآن کے علاوہ کوئی کلام خواہ وہ نظم مین ہو یا نثر مین باوجود خوف و ہیبت پیدا کرنے کے دل مین لذت و حلاوت کی وہ کیفیت نہین پیدا کرتا، جو قرآن مجید پیدا کرتا ہے[1] خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :-

"لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَرَأَيْتَهٗ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ" - اللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ"[2]

اس کے بخلاف اور انبیاء کے بعض معجزے تو بالکل بے اثر تھے مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کے یہ معجزے :-

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِأَمْرِهٖٓ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ (انبیاء - ۶)

اور ہم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا زور کی ہوا کو تابع بنا دیا تھا کہ وہ اُن کے حکم سے اوس سرزمین کی طرف چلتی تھی، جس مین ہم نے برکت کر رکھی ہے، (مراد ملک شام سے) اور ہم ہر چیز کو جانتے ہین اور بعضے بعضے شیاطین ایسے تھے کہ سلیمان کے لئے (دریاؤن مین) غوطہ لگاتے تھے (تاکہ موتی نکال کر دین) اور وہ اور اور کام بھی اس کے علاوہ کیا کرتے تھے اور ان کے سنبھالنے والے ہم تھے۔

[1] اتقان ج ۲ ص ۱۲۱

وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّھَا شَھْرٌ وَّرَوَاحُھَا شَھْرٌ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ الْقِطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ وَجِفَانٍ کَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ (سباء - ۲)

اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کے لئے ہوا کو
مسخر کر دیا کہ اُس کی صبح کی منزل ایک
مہینہ بھر کی اور اس کی شام کی منزل ایک
مہینہ بھر کی ہوتی اور ہم نے اُن کے لئے
تانبے کا چشمہ بہا دیا، اور جنات میں بعضے
وہ تھے، جو اُن کے آگے کام کرتے تھے اُن
کے رب کے حکم سے اور ... وہ جنات اُن کے لئے
وہ چیزیں بناتے تھے جو اُن کو منظور ہوتا،
بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن جیسے
حوض اور دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں
اے داؤد کے خاندان والو تم سب شکریہ
میں نیک کام کیا کرو، اور میرے بندوں
میں شکر گذار کم ہی ہوتے ہیں

وَالشَّیٰطِیْنَ کُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ وَّاٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ (ص - ۳)

اور جنات کو بھی اُن کا تابع کر دیا، یعنی تعمیر
بنانے والوں کو بھی اور غوطہ خوروں کو بھی
اور دوسرے جنات کو بھی جو زنجیروں میں
جکڑے رہتے تھے،

تابع اور متبوع دونوں کے قالب روح میں کوئی مذہبی اور اخلاقی اثر نہیں پیدا کرتے، بلکہ سرے سے اُن کو منصب نبوت ہی سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ جن وشیاطین کی یہ اطاعت پیغمبرانہ اطاعت نہ تھی، بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے شاہانہ اقتدار کا نتیجہ تھی، اور وہ اُن سے اسی طرح کام لیتے تھے

جس طرح غزوات میں گرفتار ہونے کے بعد کافر قیدیوں سے لیا جاتا ہے[۵۱]،

البتہ جن وشیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی جو اطاعت کرتے تھے، وہ اس اطاعت سے مختلف تھی، جو وہ کاہنوں اور جادوگروں کی کرتے تھے، کیونکہ کاہنوں اور جادوگروں کو جن وشیاطین ناجائز کاموں میں مدد دیتے تھے،

لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام اُن سے جائز اور مباح کام لیتے تھے، اس لئے یہ ایک دنیوی احسان تھا جس پر خدا کا شکر گذار ہونا چاہئے[۵۲]

غرض معجزہ کی یہ وہ قسم ہے جو شرعاً نہ محمود ہے نہ مذموم، اس سے اگر کوئی جائز فائدہ حاصل ہو جاتا ہے، تو وہ ایک احسان کی صورت اختیار کر لیتا ہے، ورنہ ایک فعل عبث اور تماشا بن جاتا ہے[۵۳] مثلاً اگر کوئی شخص بلا ضرورت شیر کے اوپر سوار ہوتا ہے، یا پل کے موجود ہوتے ہوئے پانی کے اوپر چلتا ہے، تو یہ ایک فعل عبث اور محض تماشا ہے[۵۴]،

لیکن معجزہ کی ایک قسم اور ہے، جو اُس سے اعلیٰ واشرف ہے، اور وہ صاحب معجزہ اور اسکے پیروؤں کو نیکی اور پرہیزگاری پر آمادہ کرتی ہے،

معجزہ کی یہی قسم منصب نبوت سے براہ راست تعلق رکھتی ہے، اور قرآن مجید اسی قسم کا معجزہ ہے، جنات نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی بھی اطاعت قبول کی تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی مطیع ہوئے تھے، لیکن دونوں اطاعتوں کے نتائج مختلف تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام کی شاہانہ اطاعت سے ان کو ذلت وخواری کے سوا کچھ نہیں ملا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ اطاعت کا جو نتیجہ ہوا اس کو قرآن مجید نے خود انہی کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے،

---

[۵۱] کتاب النبوات لابن تیمیہ، صفحہ ۲۱۱،

[۵۲] کتاب المعجزات والکرامات لابن تیمیہ، صفحہ ۲، [۵۳] ایضاً صفحہ ۴، [۵۴] ایضاً صفحہ ۱۲

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ
الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا
یَّهْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ
وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا،

(جن - ۱)

آپ کہئے کہ میرے پاس اس بات کی وحی
آئی ہے، کہ جنات میں سے ایک جماعت نے
قرآن سنا، پھر انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک
عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست بتلاتا
ہے، تو ہم تو اس پر ایمان لے آئے، اور
ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک
نہ ٹھہرائیں گے

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ
یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ، فَلَمَّا حَضَرُوْهُ
قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی
قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ، قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ
اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی
مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْٓ
اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ،
یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا
بِهٖ یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ
یُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ،

(احقاف - ۴)

اور جب ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ
کی طرف لے آئے جو قرآن سنتے تھے، غرض
جب وہ لوگ قرآن کے پاس آپہنچے تو
کہنے لگے کہ خاموش رہو، پھر جب قرآن
پڑھا جا چکا تو وہ لوگ اپنی قوم کے پاس خبر
پہنچانے کے واسطے واپس گئے، کہنے لگے
کہ اے بھائیو! ہم ایک کتاب سن کر
آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے،
جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی
ہے، حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی
کرتی ہے، اے بھائیو! تم اللہ کی طرف
بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر
ایمان لاؤ، اللہ تعالیٰ تمھارے گناہ
معاف کر دیگا اور تم کو عذاب دردناک سے محفوظ رکھیگا

ان دونون اطاعتون کا مقابلہ کرکے علامہ ابن تیمیہ کتاب النبوات مین ایک موقع پر لکھتے ہین، کہ جن وانس کے ساتھ ہمارے پیغمبر کا معاملہ حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ کے معاملہ سے زیادہ مکمل ہے، کیونکہ یہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اطاعت شاہانہ اقتدار کی وجہ سے کرتے تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پیغمبرانہ اطاعت تھی[1] دوسرے موقع پر لکھتے ہین کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جنون کو فرمانبردار بنا کر اُن سے چند مباح کام لیتے تھے لیکن ہمارے پیغمبر اُن کو خدا پر ایمان لانے اور اس کی عبادت کرنے کی دعوت دیتے تھے، اس لئے آپ کی پیروی کرکے وہ سعادت مند ہوگئے تھے، اور یہ پیغمبر کے لئے اور ان کے لئے زیادہ کامل ترین طریقہ ہے[2] لیکن بہت سے معجزے ایسے بھی ہوتے ہین، جن کا اثر خود صاحب معجزہ پر بھی پڑتا ہے، اور دوسرون پر بھی وہ اثر ڈالتے ہین لیکن بااین ہمہ قرآن مجید کے روحانی اثر کے مقابلہ مین اُن کا درجہ بہت کم ہے، علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہین کہ خداوند تعالیٰ کے کلمات کی دو قسمین ہین

۱- ایک کلمات کونیہ جن مین تمام کائنات داخل ہے، انبیاء کے مادّی معجزے ان ہی مین شامل ہین،

۲- دوسرے کلمات دینیہ جن مین قرآن، خدا کی شریعت اور اس کے اوامر و نواہی شامل ہین، اور بندہ کا کام یہ ہے کہ اس کا علم حاصل کرے، اور اس پر عامل ہو جس طرح کلمات کونیہ کے متعلق بندہ کا کام یہ ہے، کہ تکوینی امور کا علم حاصل کرے، اور اُن پر اثر ڈالے،

پہلی قسم کے معجزات سے تکوینی امور کا اور دوسری قسم کے معجزات سے شرعی امور کا علم حاصل ہوتا ہے، اور پہلی قسم کے معجزات مادیات پر اثر کرتے ہین، اور دوسری قسم کے معجزات شرعیات پر، اور جس طرح پہلی قسم کے معجزات کا خود صاحب معجزہ پر تو یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ پانی پر چل سکتا ہے ہوا مین اُڑ سکتا ہے، آگ کے اندر گھس سکتا ہے، اور دوسرون پر وہ اُن کے ذریعہ سے یہ اثر

---

[1] کتاب النبوات ص ۲۱۲ [2] ایضاً ص ۱۰

ڈال سکتا ہے کہ ان کو بیمار کرسکتا ہے، اُن کو تندرست بنا سکتا ہے، اُن کو مار ڈال سکتا ہے اور اُن کو محتاج اور دولت مند بنا سکتا ہے، اسی طرح دوسری قسم کے معجزات کا صاحب معجزہ پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ خود خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، اور کتاب وسنت کا پابند ہو جاتا ہے، پھر دوسروں پر وہ یہ اثر ڈالتا ہے کہ اُن کو خدا اور اُس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیتا ہے، اور لوگ شرعی حیثیت سے اس کی اطاعت کرنے لگتے ہیں، لیکن معجزات کا تعلق جہاں تک علم وقدرت سے ہے، اگر وہ موجود نہ ہوں، تو اس سے کسی مسلمان کو کوئی دینی نقصان نہیں پہنچتا، اگر ایک شخص کو غیبی امور کا علم حاصل نہ ہو، اور مادیات اس کے زیر اثر نہ ہوں، تو اس سے خدا کے نزدیک اس کا درجہ کم نہیں ہو سکتا، لیکن اگر کوئی شخص امور دینیہ کا پابند نہ ہو، تو اس سے اس میں ایک ایسا نقص پیدا ہو جائیگا جس سے یا تو وہ عذاب کا مستحق ہوگا یا ثواب سے محروم رہے گا، کیونکہ دین کا علم حاصل کرنا اور اس کی تعلیم اور اس کی پابندی کا حکم دینا ایسی چیز ہے جس سے آدمی کو خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور وہ اُس کے ثواب کا مستحق ہوتا ہے، لیکن کائنات کا علم حاصل کرنا، اور اس پر اثر ڈالنا، تو اس سے یہ چیزیں اسی وقت حاصل ہوتی ہیں، جب وہ دین میں شامل ہوں، ورنہ کبھی کبھی اس سے آدمی گنہگار بھی ہو جاتا ہے[۱]،

معجزات پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اُن سے پیغمبروں کا دعوائے نبوت ثابت نہیں ہوتا، مثلاً جو شخص دعوائے نبوت کرتا ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ میں معاش ومعاد کا سیدھا راستہ دکھاتا ہوں لیکن وہ اس کی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ میں لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں، تو یہ دلیل گو کتنی ہی عجیب وغریب ہو، لیکن اس کو دعویٰ کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ اس کا یہ دعویٰ تو صرف اسی وقت ثابت ہو سکتا ہے، جب وہ معاش ومعاد کی تمام اصلاحی صورتیں بتائے اور

---

[۱] المعجزات والکرامات ص ۹۰،

لوگون کوان کا پابند بنائے، لیکن یہ اعتراض کلمات کونیہ یعنی مادی معجزات پر ہوتا ہے، کلمات دینیہ یعنی قرآن مجید پر نہین ہوتا، کیونکہ وہ نہایت تفصیل کے ساتھ معاش و معاد کی تمام اصلاحی صورتین بتاتا ہے اور لوگون کوان کا پابند بناتا ہے، اس لئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی نبوت کے ساتھ نہایت گہرا ربط وتعلق رکھتا ہے، بلکہ وہی آپ کا دعویٰ بھی ہے، اور دلیل بھی؛

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہین کہ قرآن مجید جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کرآئے وہی خداوند تعالیٰ کی شریعت اور اس کے دینی کلمات ہین، اور وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل بھی ہے، دعوت بھی ہے، اور معجزہ بھی ہے[1]،

بہرحال قرآن مجید ایک معجزۂ ناطق ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی شہادت دیتا ہے وہ زبانِ قال ہے لیکن اور انبیا کے مادی معجزے صرف زبان حال ہین، زبان قال نہین، وہ پانی کے اوپر چلنے، ہوا مین اڑنے اور آگ مین گھسنے کی طاقت تو نہین پیدا کرتا، لیکن نیک کامون پر عمل کرنے کی طاقت پیدا کرتا ہے، جو دین و دنیا دونون مین مفید ہین، مثلاً جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی،

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ (آل عمران - ۱۰۰)	تم لوگ جب تک اپنی محبوب ترین چیزون کو نہ صرف کروگے نیکی کو ہرگز نہین پاسکتے،

توحضرت ابوطلحہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوئے، اور کہا کہ "خدا ہمارا مال مانگتا ہے آپ گواہ رہئے کہ اریحا مین میری جو زمین ہے مین اس کے نام ہبہ وقف کرتا ہون"، زمانہ جاہلیت مین عرب کی عورتین نہایت بے پروائی کے ساتھ ڈوپٹہ اوڑھتی تھین، اس لئے سینہ اور سر وغیرہ کھلا رہتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَلۡیَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوۡبِهِنَّ	عورتون کو چاہئے کہ اپنے ڈوپٹون کو سینے پر ڈال لین

---

[1] المعجزات والکرامات ص ۱۰،

اس کا یہ اثر ہوا کہ عورتوں نے اپنے تہ بند اور متفرق کپڑوں کو پھاڑ کر دوپٹے بنائے اور اپنے آپ کو سیاہ چادروں سے اس طرح ڈھانپ لیا کہ حضرت عائشہؓ کے قول کے موافق یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے سروں کے آشیانے بن گئے ہیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو لوگ ناپ جوکھ میں سخت خیانت کرتے تھے، اس پر سورہ ویل للمطففین نازل ہوئی، اور لوگ دیانت سے کام لینے لگے،

اصحاب صفہ کی معاش کا بہت کچھ دارومدار انصار کی فیاضی پر تھا، یہ لوگ کھجور کے خوشے لاکر مسجد میں لٹکا دیتے تھے، اصحاب صفہ آتے تھے، اور چھڑی سے اُن کو ہلاتے تھے، جو کھجوریں ٹپک پڑتی تھیں اُن کو کھا لیتے تھے، لیکن انصار میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو سڑے گلے خوشے لاکر لٹکا دیتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِنَ الْاَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْہُ تُنْفِقُوْنَ، (بقرہ)	مسلمانو! اپنی بہترین کمائی اور بہترین پیداوار سے صدقہ دو، بُرے مال کو خیرات نہ کرو،

اس کے بعد دفعۃً اس حالت میں انقلاب پیدا ہو گیا، اور تمام لوگ بہترین کھجوریں لانے لگے،

اسلام کے فرائض و اعمال میں جہاد سب سے خطرناک کام ہے لیکن صحابہ کرام کو قرآن مجید ہی کے اثر نے جہاد پر آمادہ کیا تھا، اور اسی اثر کی بدولت وہ سخت سے سخت جنگی خطرات میں ثابت قدم رہتے تھے، ایک بار قسطنطنیہ میں رومیوں سے مسلمانوں کا مقابلہ ہوا، رومی بالکل قسطنطنیہ کی دیوار کے متصل صف زن تھے، ایک مسلمان نے جرأت کرکے حملہ شروع کیا، تو لوگ پکار اُٹھے "ہاں ہاں اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتے ہو" حضرت ابوایوب انصاریؓ ساتھ تھے، بولے "یہ آیت تو ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جب اسلام نے قوت حاصل کرلی تو ہم لوگ اپنی معاش کے کام

دھندے مین مشغول ہو گئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَانفِقُوا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ وَلَا تُلقُوا بِاَیدِیکُم اِلَی التَّھلُکَۃِ (بقرہ - ۲۴) — اور خدا کی راہ مین خرچ کرو اور اپنی جانون کو ہلاکت مین نہ ڈالو،

اس لئے اصلی ہلاکت یہ ہے کہ ہم معاش کے کاروبار مین مشغول ہو جائین، اور جہاد کو چھوڑ دین، راوی کا بیان ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی، حضرت ابو ایوب انصاری ہمیشہ مصروف جہاد رہے، یہان تک کہ قسطنطنیہ مین وفات پا کر مدفون ہوئے، جنگ یمامہ مین جب حضرت سالمؓ کو علم عطا کیا گیا، تو ایک شخص نے کہا کہ ہم کو آپ کی جان کا خوف ہے، اس لئے جھنڈا دوسرے کے ہاتھ مین دینا چاہتے ہین، بولے تو مین اس حالت مین قرآن مجید کا بدترین حامل ہون گا، چنانچہ انھون نے علم کو داہنے ہاتھ مین لیا، جب وہ کٹ گیا، تو بائین ہاتھ مین لیا، وہ بھی کٹ گیا، تو علم کو سینے سے چمٹا لیا، اور یہ آیت پڑھنے لگے،

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُولٌ ... وَکَاَیِّن مِّن نَّبِیٍّ قٰتَلَ مَعَہٗ رِبِّیُّونَ کَثِیرٌ، (آل عمران - ۱۵) — محمد صرف ایک پیغمبر ہین ... اور بہت سے پیغمبر گذرے ہین جن کے ساتھ ہو کر بہت سے علماء نے جنگ کی ہے،

(باقی)

اجتماعیت کا قرآنی تصور

از

جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی

کائنات ہستی فطرت کی عجوبہ زایون اور جدت طرازیون کی آماجگاہ ہے اور اس جہان رنگ و بو کی ہر چیز کچھ اس طرح کی حسین و پرکشش واقع ہوئی ہے کہ اس مین نظر حقیقت شناس کو زندگی کی لطیف تر حقیقتین اُبھری اور نکھری ہوئی دکھائی دیتی ہین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی حسن جلوہ طراز اور ایک ہی نور جہان تاب ہی جو پوری کائنات کو اپنے جلو مین لئے ہوئے ہی صحن گلشن کا حسین منظر ہو یا لق و دق صحرا کی تا بحد نظر وسعت، شہری زندگی کی ہنگامہ پرور اور رنگین محفلین ہون، یا دشت وحشت خیز کی خاموش، اور پرسکون خلوتین، صبح حیات کی مسکراہٹین ہون، یا شام زندگی کی وحشتناکیان، آبشارون کا سمع نواز ترنم ہو یا رعد و برق کی خوفناک کڑک، بزم طرب شادی کے نغمہ ہاے مسرت ہون، یا مجلس تعزیت کی دلفگار آہین، یہ سب کچھ دل خود آگاہ و حقیقت شناس کی نظر مین ایک ہی سلسلۂ وجود کی مختلف کڑیان ہین، ایک ہی نور مطلق پر اُن کی انتہا ہوتی ہے،

وفی الارض آیات للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون، (الذاریات)	زمین اور خود تمھارے وجود مین اہل یقین کے لئے نشانیان ہین، کیا تم دیکھتے نہین ہو؟
ان فی ذلک لذکری لمن کان له	بلاشبہہ اس مین نصیحت و عبرت ہے اس انسان کیلئے

قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ — جو اپنے پہلو میں حساس دل رکھتا ہے،

(ق) — یا پوری طرح متوجہ ہو کر کان ... لگاتا ہو

ارض وسما کی یہ کائنات جو روز مرہ ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے، اس کی ہر چیز بظاہر منفرد اور تنہا وجود رکھتی ہے اور اپنے کام اور وظائف طبعی کے لحاظ سے دوسری اشیائے عالم سے بالکل الگ تھلگ محسوس ہوتی ہے مگر پردۂ مجاز کو سامنے سے ہٹا کر حقیقت پر نگاہ ڈالئے تو چشم بینا ایک وسیع تر اور آفاق گیر نظام کائنات کا مشاہدہ کرتی ہے، اور ہر وجود شخص دراصل اس کائناتی نظام کا ایک جزو لاینفک ہے، عالم لاہوتی ہو یا کائنات ناسوتی محفل انجم ہو، یا جہان نباتات ارضی نظام سحاب و باد و باران ہو، یا سلسلۂ کوہ و بیابان غرض اس عالم کی ہر چیز ہمہ گیر نظام کائنات کی ایک کڑی ہے یا دنیا کے اس عظیم ترین کارخانہ کا ایک پرزہ ہے جس کا وجود وبقا کارخانہ کے وجود وبقا پر موقوف ہے،

قرآن کریم بار بار عناصر کائنات کی ماہیت اور ان کی اجتماعی تاثیر وافادیت میں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے عالم افلاک، عالم جو سما اور ہمارے جہان رنگ و بو کے اہم عناصر کو ایک ساتھ ذکر کرتا ہے جس سے ان اشیاء کے معنوی اور افادی تعلق وربط کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ بیشتر مقامات میں قرآن خود ہی اشیائے عالم کے باہم افادی تعلقات کو اپنے مخصوص اسلوب بیان میں ذکر کرتا ہے،

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ	کیا آپ نے اپنے رب کی طرف نہیں دیکھا کہ اس
شَاءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ	نے سایہ کو کیسے پھیلایا، اگر وہ چاہتا تو اسکو
عَلَيْهِ دَلِيْلًا ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا	ٹھہرا دیتا، پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل
قَبْضًا يَّسِيْرًا وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ	قرار دیا، پھر آہستگی سے ہم نے اس کو اپنی
الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ	طرف کھینچ لیا، خدا کی ذات نے تمہارے لئے
النَّهَارَ نُشُوْرًا وَهُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ	رات کو لباس اور نیند کو راحت بنایا،

الرِّیَاحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا لِنُحْیِیَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَنُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِیَّ كَثِیْرًا ،

(الفرقان - ۵)

اُسی نے زمین کے اندر پھیل جانے کی غرض سے دن بنایا، وہی ذات ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا، جو اس کی رحمت کی بشارت دینے والی ہیں، اور ہم نے آسمان سے پاکیزہ پانی اُتارا، تاکہ ہم اس کے ذریعہ مردہ بستیوں کو آباد کریں اور یہ پانی اپنی مخلوق میں سے چارپایوں، اور بہت سے لوگوں کو پلائیں ،

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَهٗ ثُمَّ یَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ یَّشَآءُ یَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ

(النور)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ بادلوں کو چلاتا ہے، پھر اُن کو جمع کرتا ہے پھر اُن کو تہ بہ تہ رکھتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اُن کے اندر سے بارش نکلتی ہے، اور پہاڑوں کی بلندی کی جانب سے برف (جو فضا میں ہوا سرد سے منجمد ہوتی ہے) اُتارتا ہے، پس یہ برف جس پر چاہتا ہے اُتارتا اور جس سے چاہتا ہے، پھیر لیتا ہو قریب ہے کہ بجلی (جو بادلوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہو) کی چمک آنکھوں کی بینائی اچک لے جائے

عالم ارض وسما کے اس وسیع تر نظام افادہ واشتراک اور اُس کے حسین وجمیل مناظر میں اہل بینش کے لئے جو چیز وجہ کشش ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز ایک فوق الفطرت طاقت کے زیر اثر اپنی منزل مقصو کی جانب رواں دواں ہے، پہاڑوں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ ذرہ سے لے کر پہاڑ

تک، آب جو سے لے کر سمندر تک، زمین کی پستی سے لے کر آسمان کی بلندی تک، عالم نباتات سے لے کر جمادات مہر و انجم تک کائنات کی ہر چیز اطاعت شعاری اور اثر پذیری کا عجیب و غریب مرقع ہے، گویا وہ کیف و مستی کے عالم میں مستانہ وار آستانۂ دوست کی جانب بڑھ رہی ہے،

وابرح مایکون الشوق یومًا

اذا دنت الخیام من الخیام

غلط کار لوگوں نے اسلام کو بس اتنا ہی سمجھ رکھا ہے کہ وہ چند آداب و مراسم کا مجموعہ ہے، یا دوسرے مذاہب کی طرح کا ایک مذہب ہے، جو صرف چند اخلاقی اصول و قوانین ہی کی پونجی اپنے پاس رکھتا ہے اور عصر حاضر کے کچھ حواس باختہ اور خود ساختہ مفسرین اسلام کو نازی ازم اور فیسی ازم کی طرح کا ایک خالص قوم پرستانہ نظام سیاست، اور قرآن کو محض سیاسی دستور اور بین الملی قوانین (انٹرنیشنل لاز) کا منشور تصور کرتے ہیں، لیکن قرآن حکیم کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام پوری کائنات کا مذہب ہے، ایک ہمہ گیر اور آفاقی نظام اطاعت ہے، کائناتی دستور حیات ہے اور عالم کون و مکان کا کوئی گوشہ اس کے تصرف سے باہر نہیں ہے،

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم	کیا وہ اللہ کے دین کو چھوڑ کر
من فی السمٰوٰت والارض طوعًا	دوسرا دین اختیار کرتے ہیں؟ حالانکہ آسمان
وکرھًا والیہ یرجعون،	اور زمین کی تمام چیزیں صرف اللہ کی اطاعت
(آل عمران)	گذار ہیں، اور ان کو بالآخر اسی کی طرف

درحقیقت اسی نظام اطاعت اور سررشتہ اجتماعیت سے اس عالم کا بناؤ سنگار اور حسن بہار آفرین قائم ہے، بلکہ سرے سے اس کا وجود و بقا ہی اس کا رہین احسان ہے، اور جو چیز اس آفاقی گیر نظام سے کٹ جاتی ہے اس کا انجام بہرحال خسران و نامرادی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے،

ومن یبتغ غیر الاسلام دینًا فلن	جو اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے دین کو تلاش

یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین ، (آل عمران)

کرے گا تو وہ بارگاہ خداوندی میں ہرگز قبول نہ ہوگا ، اور انجام کار وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا ،

بلکہ ایسی چیز کے لئے آغوش عدم کے سوا کوئی جگہ ہی نہیں ہے ، درخت کا پتہ جب تک اپنے نباتاتی نظام سے وابستہ ہے ، اس وقت تک وہ اپنے خوبصورت وجود کو قائم رکھ سکتا ہے ، لیکن جونہی وہ اس نظام سے کٹا پاؤں کی رگڑ سے ذرہ ہائے خاک میں تحلیل ہوا ، یا ہوائے تند و تیز اس کو اُڑا کر کہیں سے کہیں لے گئی دریا کی طوفانی موج اپنے اندر بے پناہ قوت رکھتی ہے لیکن کب تک ؟ جب تک کہ وہ اپنے مرکز وجود سے کمک حاصل کر رہی ہے لیکن اس سے کٹ کر وہ اپنے وجود ہی کو باقی نہیں رکھ سکتی ،

غرض اسلام اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے پوری کائنات کا ضابطہ و دستور اور نظام اطاعت ہے اور کائنات کی ہر چیز اس نظام کے زیر اثر جہان کی تعمیر اور ممکنات حیات کو اجاگر کرنے میں مصروف کار ہے

خلافت آدم کا مفہوم | نوع انسانی اسی عظیم الشان کارخانہ قدرت کا ایک فعال اور موثر عنصر ہے ، عالم امکان کے پے بہ پے ہنگامے ایجاد و تخلیق کی نوبہ نو حسن آفرینیاں اور جہان رنگ و بو کے رنگارنگ نقش و نگار انسان ہی کے وجود موثر کے حیرت زا کرشمے ہیں ، اگر اور سب کچھ ہوتا اور انسان نہ ہوتا تو نہ جانے یہ دنیا کس طرح کی بے ڈھنگی اور وحشت انگیز ہوتی ، آخر یہ حضرت انسان ہی تو ہیں جس کی پیدائش پر دیار عشق میں ہنگامہ و شور اٹھا ، جہان حسن میں تہلکہ بپا ہوا ، اور فطرت نے ممکنات وجود کی تمام راہیں اس کے لئے واکر دیں ،

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد   حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور   خود گرے خود شکنے خود نگرے پیدا شد

یہ سچ ہے کہ عالم وجود کی زیب و زینت اور سوز و ساز انسان ہی کے دم سے ہے لیکن خود انسان کیا ہے اور عالم امکان میں اسکا مقام و موقف کیا ہے ؟ یہی وہ اہم مسئلہ ہے جس کے حل ہو جانے سے انسانی تصور اجتماع

کی حقیقت خود بخود ہی منکشف ہو کر سامنے آجائے گی،

قادر مطلق نے جب کائنات کو پیدا کیا، تو ایک ایسی ہستی کا پیدا کرنا بھی ضروری ہوا جو اپنی طبعی اور فطری قوت تخلیق سے انواع کائنات میں تصرف کر سکے، اس کا آہنی عزم ویرانوں کو آباد کرے، دریاؤں سے نہریں نکال کر خشک زمینوں کو شاداب کرے، سورج کی تمازت سے دہکتے ہوئے دشت و صحرا کو گشت گل و لالہ میں تبدیل کرے، خوش منظر اور بارونق شہروں کی بنا ڈالے اور اس کا علمی و تحقیقی جوہر اشیاء کی صلاحیتوں کو اجاگر کرے، موالید و عناصر کی مدد سے نئے نئے اکتشافات کو منظر عام پر لائے، سمندر کی تلاطم خیز موجوں کو مسخر کرے، ہوا پر اپنا تسلط جمائے، یہاں تک کہ ارض و سما کی ناپیدار کنار وسعتیں اس کے لئے سمٹ جائیں اور وہ اپنے علم و عمل سے کائنات پر حکمرانی کرے، اسرار فطرت کی آگہی کیساتھ عالم وجود کی ہر شئے کو منشائے قدرت کے مطابق کام میں لائے، اور اس میں کوئی ایسا تصرف نہ کرے جو نظم کائنات کے فساد و اختلال کا باعث ہو، بلکہ وہ ایسا تصرف کرے جس سے کائنات کے حسن ذاتی میں پہلے سے زیادہ چمک دمک پیدا ہو اور کوہ و بیابان اس کی بہار آفرینیوں سے مہک اٹھیں،

حاصل یہ ہو کہ خلاق عالم نے اس کائنات کو ایک خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے، اور اس کے ارتقاء کے لئے کچھ قوانین طبعی بنا دیئے ہیں تاکہ ان کے زیر اثر کائنات کی مختلف انواع اپنے نوعی وجود و تشخص کی حفاظت و صیانت میں مصروف کار رہیں، لیکن ان انواع کی ترکیب سے کارخانہ فطرت میں حسن و دلکشی پیدا کرنے، ان کو خلاق عالم کے منشاء کے مطابق وسعت عطا کرنے اور زیادہ سے زیادہ منفعت بخش بنانے کے لئے ایک باشعور اور صاحب ارادہ ہستی کی ضرورت تھی، اور اس مقصد کے لئے خداوند عالم نے انسانوں کو پیدا کیا،

تو شب آفریدی چراغ آفریدم	سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی	خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم   من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم   (اقبالؒ)

اس لئے انسان کا نصب العین حیات صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اسرار فطرت کی ٹوہ لگائے اور حقائق کائنات کی تلاش جستجو میں اپنی علمی اور عملی قوتیں صرف کرے، بلکہ اس کا مقصد وجود یہ ہے کہ وہ اسرار فطرت کی دریافت اور حقائق اشیاء کے انکشاف سے، اپنے لئے ایک ایسی راہ پیدا کرے جس سے اشیائے عالم اور قوانین فطرت میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا ہو، اور تعلق عالم کے زیر اثرات علم و عمل کا کام میں [illegible] اطاعت آدم کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے تو اس نے انسان کو یہ حق دیا ہے، کہ وہ اپنے شخصی [illegible] علم و عمل [illegible] طور پر حق مطلق انسان کو حاصل ہے کسی خاص گروہ یا انسان سے مخصوص نہیں ہے لیکن یہ مسلمہ ہے کہ کوئی بات کسی اس کے زمانہ میں حق یونہی نفت [illegible] میں ضروری قرار دی گئی ہیں، [illegible] کے مطابق ہوتے ہیں،

مثلاً یوں سمجھئے کہ خدا نے ہر انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے اور زیادہ سے زیادہ دولت کمائے لیکن اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس حق سے محروم ہیں محض اس لئے کہ اس مقصد کے لئے جس طرز کی کوشش و سعی کی ضرورت ہوا کرتی ہے اس کو وہ کام میں نہیں لاتے، بالکل یہی حال خلافت کا ہے کہ اس منصب کو حاصل کرنے کی راہیں تمام انسانوں کے لئے یکسان وا کر دی گئی ہیں لیکن اس کو علم و عمل کی صلاحیتوں سے مشروط کر دیا گیا ہے، چنانچہ قرآن حکیم نے ایک جگہ ذکر خلافت کے بعد علم کا ذکر کیا ہے،

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا   خدا نے آدم کو حقائق اشیاء کا علم
(بقرہ)   عطا کیا،

اور ایک دوسرے مقام پر خلافت کو عمل سے مشروط کیا گیا ہے،

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ	پھر ہم نے دوسری قوموں کے بعد تم کو زمین
مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ	میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل
(سورۂ یونس)	کرتے ہو

زمانہ حال کے خود ساختہ شارحین اسلام کے نزدیک خلافت، حکومت و اقتدار کی ہم معنی ہے اور وہ ہر جگہ خلافت کا یہی مفہوم لیتے ہیں لیکن یہ اُن کی تنگ نظری ہے، خلافت دراصل ایک اعلیٰ و برتر مقام بندگی ہے، شرفِ انسانیت کی معراج ہے، علم و عمل اور فضائل اخلاق کی وہ پاکیزہ تر منزل ہے، جو عصرِ حاضر کے کوتاہ نظر اور ہوا پرست انسان کے تصور میں بھی نہیں آسکتی، ے

با تو چہ گویم کہ تو مجنون تنی!

یعنی خلافت آدم کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان کو ابتدائے آفرینش سے یہ قوت عطا ہوئی ہے کہ وہ خدائی صفاتِ کمال کا مظہرِ اتم بن کر کائناتِ ارض کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لے اور زندگی کے پورے کاروبار کو منشائے خداوندی کے مطابق چلائے،

نائبِ حق در جہان بودن خوش است   بر عناصر حکمران بودن خوش است

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است   ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است

از رموزِ جزو و کل آگاہ بود   در جہان قائم بامر اللہ بود

ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم است   از جلالِ او نجاتِ عالم است

زندگی را می کند تفسیرِ نو

می دہد این خواب را تعبیرِ نو

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ نیابت کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ نائب فرائض مفوضہ کو اس طرح

انجام دے جس طرح اُس کے منسوب عنہ نے اس کو ہدایت کی ہے، اور اس ہدایت نامہ سے سرمو انحراف نہ کرے، اگر وہ اس سے انحراف کرتا ہے تو وہ اصولاً اپنے منصب نیابت کا اہل نہیں رہتا، کیونکہ یہ حق مشروط ہے اور انتفاء شرط انتفاء مشروط کو مستلزم ہے،

لہذا خلافت دراصل حکومت و اقتدار کی ہم معنی نہیں ہے، البتہ حکومت و اقتدار کو مستلزم ہے لیکن حکومت و اقتدار خلافت کو مستلزم نہیں ہے، یعنی جس گروہ انسانی کو منصب خلافت عطا ہوگا، حکومت و اقتدار کی مسند بھی اُسے حاصل ہوگی لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جس قوم کو حکومتی اقتدار حاصل ہو، وہ منصب خلافت سے بھی سرفراز ہو، گویا خلافت ایک عظیم القدر مقام حریت ہے، جو اس عالم رنگ و بو میں نہیں سما سکتا، بلکہ وہ سپہر نیلگون اور جہان انفس و آفاق کو محیط ہے،

نکتہ می گویمت روشن چو دُر تا شناسی امتیاز عبد و حر

عبد گردد یاوہ در لیل و نہار در دل حُر یاوہ گردد روزگار (اقبال)

آج اہل مغرب میں بہت کم سہی لیکن کچھ لوگ اس رمز سے آشنا ہو چکے ہیں کہ سیاست و اجتماع، حکومت و اقتدار کی بنیادیں جب تک ہمہ گیر انسانی بلکہ کائناتی قدروں پر نہ اٹھائی جائیں گی، عالم انسانیت کو امن و فراغت کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہو سکتا، چنانچہ پروفیسر جوڈ اور یہودی النسل فلسفی اسکونٹ سمو ئل اور دیگر کئی علماء و مفکرین نے بارہا اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ زندگی کے روحانی اور مستقل عقائد و افکار ہی انسانی زندگی کو صحیح راہ پر ڈال سکتے ہیں، اور اس طرح اس مادی زندگی میں ایک خوشگوار اور پُرامن انقلاب رونما ہو سکتا ہے، لیکن جس حقیقت کو ہم خلافت کی مقدس اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں، دراصل اسی طرح کے عالمی، آفاقی اور ہمہ گیر تصورات پر مبنی ہے، اور خلافت کا حقیقی منصب یہ ہے کہ اس کی نظر میں کسی ایک انسانی طبقہ یا کسی ایک خطہ ارضی کی فلاح و بہبود اور اصلاح و تعمیر کوئی نہیں ہے، بلکہ وہ ہر انسان اور ہر ملک کی فلاح چاہتی ہے، جہاں بھی اس کو بگاڑ نظر آتا ہے،

اس کو سنوارتی ہے، جہاں فساد کا ظہور ہوتا ہے اسکی اصلاح کرتی ہے، جہاں ظلم و قہر سے انسانیت مظلوم ہوتی ہے، وہاں اس کا دامن عدل و انصاف وا ہوتا ہے، اور جہاں فسق و بہیمیت کی وبا پھوٹتی ہے، وہاں وہ تقویٰ و صلاح کا تریاق مہیا کرتی ہے، غرض خلافت کیا ہے؟ سراپا برکت و خیر، سراسر عدل و انصاف اور بہ ہمہ وجوہ اصلاح و تعمیر کی پیامبر،

اجتماع انسانی کا قرآنی تصور

ان تصریحات کے بعد ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں، کہ انسانی اجتماعیت کا حقیقی موقف کیا ہے، اور یہ کس طرح کے فکری عناصر سے ترکیب پاتی ہے؟ دراصل قرآن عزیز کے نزدیک مجتمع انسانی کی فکری اساس کائنات کے وہی ہمہ گیر اور غیر متزلزل قوانین ہیں، جو انسان کے علاوہ جہان ارض و سما میں ہر لمحہ جاری و ساری ہیں، اس لئے یہ اصول اجتماعیت ازلی و ابدی ہیں، لیکن ان کی خارجی اور عملی تشکیل کی ابتدا حضرت آدم کی پیدائش سے ہوتی ہے، جب کہ ان کو پیدا کرنے کے بعد منصب خلافت سے نوازا گیا، یعنی حضرت آدم کو خلافت کا جلیل القدر منصب عطا ہونا سلسلۂ اجتماعیت کی پہلی کڑی ہے اور خلافت کا مفہوم ہی اس خاص نوعیت کے تصور اجتماع کی نشان دہی کر رہا ہے، کیونکہ خلافت کا لفظ انسانوں کی سیاسی و تمدنی اور اجتماعی ہیئت وحدانی پر دلالت کرتا ہے [illegible] پہلے پہل انسان میں اجتماعیت کا شعور ہی موجود نہ تھا اور وہ بیابانوں کے غاروں میں تنہا زندگی کے دن یونہی کاٹ کر گذارا کرتا تھا، قرآن حکیم جو اس کائنات میں آخری صحیفۂ فطرت ہے اس کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان اول ہی کو اجتماعیت کے بنیادی اصول بتائے گئے تھے، اور پھر تاریخ کے ہر دور میں ان ہمہ گیر اصول اجتماع میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی، اور ان کی خارجی تشکیلات بڑھتی پھیلتی اور بدلتی رہی ہیں،

غرض قرآن حکیم کے نزدیک وحدت انسانیت یا اجتماعیت کی اساس ایک ایسا پاکیزہ اور مقدس اخلاقی نصب العین ہے، جو [illegible] ہے، اور وہ اس تصور و اجتماع کی بنیادوں پر انسانی سوسائٹی کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور یہی وہ تصور حیات ہے جس سے انسان کو پہلے دن ہی آگاہ

کر دیا گیا تھا، لیکن جہان تک کہ مادی نظریہ ہائے اجتماع کا تعلق ہے، وہ انسانون کی عقل خود بین کی جدت کوشیون اور مفاد پرستیون کی پیداوار ہین، اور سرا سر غیر فطری ہین، لیکن سطور بالا مین جس تصور اجتماع کا ذکر ہوا ہے وہ دینی تصور اجتماع ہے، اور اسکی اساس عالمگیر اور محیط کل اصول حیات ہین جو کسی مخصوص نسل و قبیلہ یا قوم و وطن سے اختصاص نہین رکھتے اور اس کے برعکس انسانی تصورات اجتماع قبیلہ و نسب اور قوم و وطن کی حدبندی پر مبنی ہین اور نسل انسانی کو بے شمار چھوٹے چھوٹے نسلی طبقون اور وطنی قومیتون مین تقسیم کر دینے والے ہین،

یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہو کہ اجتماعیت کا احساس انسان کا طبعی اور نفسیاتی احساس ہے، اور کارگہ عالم مین انسان کو زندگی کے مرحلہ اول پر ہی اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے یعنی جب وہ شکم مادر سے باہر آتا ہے، تو اسی وقت سے اجتماعیت کا جذبہ اپنا کام شروع کر دیتا ہے، اور پھر وہ جس قدر نشو و نما کے مرحلے طے کرتا چلا جاتا ہے، اسی قدر اس کے علائق مین توسیع ہوتی چلی جاتی ہے، یہان تک کہ وہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو ایک وسیع تر حلقہ علائق مین جکڑا ہوا پاتا ہے، اور یہان پہنچکر اس کو گردو پیش کے اجتماعی اور تمدنی تصورات سے سابقہ پڑتا ہے، اور وہ یا تو ایک ہمہ گیر رشتہ اخوت دینی مین منسلک ہو جاتا ہے یا وہ محدود اور وطنی علائق کے تنگ دائرہ مین سمٹ کر رہ جاتا ہے،

انسانون کے بنائے ہوئے تصور اجتماع کو مختلف ارتقائی مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، چنانچہ پہلے پہل انسان نے دینی تصور اجتماع کے علی الرغم قبیلہ و نسب کو اجتماعی تعلقات کا محور قرار دیا، اور رفتہ رفتہ تعلقات مین وسعت پیدا ہوتی گئی، اور پھر انسان نے وطن اور وطنی قومیت (نیشنلزم) کو اپنا منتہائے مقصود بنالیا، اور یہان پہنچ کر اس کی حرکت رک گئی ہو اور آج وطنی قومیت نے اس کے دل و دماغ پر اس طرح تسلط جما لیا ہے کہ اس کی نظر مین انسانیت کا مقدس رشتہ کوئی حقیقت ہی نہین رکھتا، ایک قوم دوسری قوم پر درندون کی طرح چل پڑتی ہے، اس کے گوشت سے شکم پر کرتی، اس کی ہڈیون سے اپنے مستقبل کی سر بفلک عمارت تعمیر کرتی اور اس کے خون سے اس عمارت کے گل بوٹے اور نقش و نگار بناتی ہے، غرض اس جذبہ نا ارجمند

کے ہاتھوں آج انسانیت بستر مرگ پر کراہ رہی ہے،

فکر انسان بت پرستے بت گرے ہر زمان در جستجوے پیکرے

باز طرح آذری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است

کاید از خون ریختن اندر طرب نام او رنگ است و ہم ملک و نسب

آدمیت کشتہ شد چون گوسفند پیش پائے این بت نا ارجمند

مغرب کی نشأۃ ثانیہ نے جب مذہب کے خلاف محاذ قائم کیا، اور مذہب کو ہمیشہ کے لئے خارج البلد قرار دے دیا، تو یہ ناگزیر ہوا کہ اس خلا کو کسی دوسرے تصور زندگی سے پُر کیا جائے، یعنی کوئی ایسا تصور زندگی ڈھونڈھ نکالا جائے، جو قوم کے سیاسی اور معاشی ارتقار کے لئے ایک قوی تر اور مضبوط تر محرک کا کام دے سکے، لیکن اس کا انسانی ذہن گرد و پیش کے جن مخصوص طبعی حالات سے گذر رہا تھا، ان کے تقاضون نے انسان کو تہذیب حاضر کے نو تراشیدہ بت (ملک و وطن) کے آگے سرنگون کر دیا، یہ زمانہ اٹھارہوین صدی کے اوائل کا زمانہ تھا، جب کہ وطنیت ایک سیاسی عقیدہ اور مستقل تصور مملکت کی حیثیت سے منظر ظہور پر آئی، اور اس نے ماضی کے تمام اجتماعی تصورات کو کالعدم قرار دیا، اس وقت سے آج تک وطنیت کا زہر ناک تصور اقوام حاضرہ کی سیاست ذہنیت کی روح روان ہے اور وطنی قومیتون کی سرفرازی کا مضبوط محرک بنا ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ اس نے انسانی قدرون کو جس طرح رسوا کیا ہے، اس کی چند مثالین گذشتہ عالمگیر جنگون اور تقسیم ہند کے بعد کی وحشتناکیون مین دیکھی جا سکتی ہین،

دراصل وطن سے انسان کو ایک نسبت ہوتی ہے اور وہ نفسیاتی طور پر اس سے محبت کرتا ہے اسکے ریگزارون، بیابانون، کہسارون، دریاؤن اور چمنستانون مین اس کے لئے ایک مخصوص کشش ہوتی ہے، لیکن انسان کی پاکیزہ اور آزاد فطرت اس بات سے ابا کرتی ہے کہ وہ زمین کے کسی خطہ کو جو محض اسکی رہائش اور تمتع کے لئے بنایا گیا ہے، اپنا کعبۂ مقصود بنا لے، آخر انسان کو اسی لئے تو نہین پیدا کیا گیا کہ وہ

بستیون مین اپنے آپ کو گم کر دے ؟ حضرتِ اقبال نے اس ضمن مین کیا خوب نکتہ بیان کیا ہے:

یا وطن اہلِ وطن را نسبتے است | زانکہ از خاکش طلوع ملتے است
اندرین نسبت اگر داری نظر | نکتہ بینی ز مو باریک تر
گرچہ از مشرق بر آید آفتاب | با تجلیہاے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوز درون | تا ز قید شرق و غرب آید برون
بر دمد از مشرق خود جلوہ مست | تا ہمہ آفاق را آرد بدست

فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روے نسبت خاوری است

جدید تصور | اس نئی وطنی شریعت مین قوم اور مملکت ایک ہی معنون کے دو عنوان ہین یعنی ملک مین بسنے والے انسان ایک سیاسی وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہین، تو اُن کی اس ہیئت مملکت کا نام دیا جاتا ہے، اور دوسری حیثیت سے اسی کو قوم (نیشن) بھی کہا جاتا ہے گویا ہو یا قوم اس کا بنیادی اور حقیقی محرک وجہ وطنیت کا تصور ہے، اور عہد حاضر مین افراد انسانی اشتراک و تعاون کی بہترین صورت یہ ہے کہ قومیت اور اسٹیٹ کا مصداق الگ الگ نہ ہو، کے رہنے والے لوگ خواہ عقیدہ و مسلک کے لحاظ سے کتنے ہی گروہون مین بٹے ہوئے ہون لحاظ سے کہ وہ ایک آزاد خطہ زمین مین اپنی جداگانہ سیاسی تنظیم رکھتے ہین، اُن کی اس ہیئت اجتماعیہ مملکت (اسٹیٹ) سے موسوم کیا جاتا ہے، اور چونکہ ان مین اتحاد وطن کا رشتہ موجود ہے اس لئے قل اور جداگانہ قوم ہین، رہا عقیدہ اور مسلک کا معاملہ تو وہ ان کی پرائیوٹ زندگی سے تعلق رکھتا ن کی قومیت پر قطعًا اثر انداز نہین ہوتا، گویا مملکت کا جدید تصور مذہب اور اخلاق کو نہ صرف ثانوی ہے بلکہ انسانون کی اجتماعی زندگی کے ہنگامون سے دور اور گھر کی چار دیواری یا عبادت گاہون

میں محدود رکھنا چاہتا ہے، اور جہاں تک ریاست و مملکت کا تعلق ہے وہ ایک باقاعدہ اور منظم سیاسی ادارہ
ہے جس کی ترکیب و تشکیل میں [illegible] اور اخلاق [illegible] کا کوئی دخل نہیں ہے اس لئے اس کو [illegible]
کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ [illegible] ایک [illegible] جس چیز کو [illegible] سمجھے وہ صواب اور جس کو
وہ خطا کہے وہ خطا ہے۔

یورپ میں ریاست اور مذہب کی علیحدگی کا آغاز اگرچہ جدید تصور ہے [illegible] بہت پہلے سولہویں صدی میں
منظر عام پر آچکی تھی [illegible] مشہور فلسفی میکیاولی [illegible] اس نظریہ کو پیش کیا کہ مملکت کو مذہب
و اخلاق کی گرفت سے آزاد کیا اور اس نے ایک نئے تصور مملکت کی طرح ڈالی [illegible] اس کا مقصد [illegible]
مملکت کا عروج و اقتدار اور اس کی خوشحالی ہے اس راہ میں جو چیز بھی حائل ہو اس کو ہٹا دینا چاہیے
خواہ وہ مذہب ہو یا اخلاق [illegible] ہاں اگر مذہب و اخلاق سے مملکت کی [illegible]
کے حصول میں مدد مل سکتی ہو [illegible] اس غرض کے [illegible] ان سے استفادہ کیا [illegible]
ایک فریب کارانہ نقطۂ نظر (جس کو سیاسی حکمت عملی (پولیٹکل سٹنٹ) کے طور پر ہی ہونا چاہئے [illegible]
بالذات مملکت ہی کو تصور کیا جائے، بلکہ اس کے نزدیک سیاسی مقصد کے حصول کے لئے بڑے سے بڑا جرم
بڑی سے بڑی بداخلاقی بھی عین ثواب ہے، جب کہ اس سے مملکت کو کسی طرح کا فائدہ پہنچ سکتا ہو، اور جہاں
کسی اخلاقی مقصد کی خاطر مملکت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، وہاں یہ اخلاقی مقصد اس کے نزدیک ناقابل
معافی گناہ ہے۔

مغرب کی تاریک فضا میں جب یہ نئی آواز گونجی تو جو لوگ اہل کلیسا کی کارستانیوں، غرض پرستیوں
اور اوہام طرازیوں سے سخت نالاں تھے، اور کلیسا و شاہی کے باہمی تصادم سے خطرناک ذہنی کشمکش میں مبتلا
تھے، انھوں نے میکیاولی کے اس نئے دین کو بہت آسانی سے قبول کر لیا، بالخصوص وقت کے بادشاہوں
نے اس سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا، اور کلیسا کا رہا سہا اقتدار بھی ختم ہونے لگا، مگر کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرنے

پایا تھا کہ مطلق العنان حکمرانوں کے مظالم کا ردِ عمل عوامی طبقون کی ذہنی بیداری اور سیاسی شعور کی صورت مین نمودار ہوا، اور اب مغرب کے انقلاب پسندون نے ایک جدید سیاسی جمہوری اور صنعتی انقلاب بپا کرنے کی ٹھان لی، بیشتر مغربی ممالک مین انقلابی تحریکین اٹھیں، ہنگامے بپا ہوئے، اور عوامی طبقون اور حکمرانون مین شدید تصادم رونما ہوا، بالآخر عوامی طاقت کے آگے مطلق العنان حکمرانون کو سرنگون ہونا پڑا، اور انھون نے ہٹ ہٹا کر مسندِ اقتدار عوام کے حوالے کر دی، یہ دور اہلِ مغرب کی نشاۃ ثانیہ کا تابناک اور انقلاب انگیز دور تصور کیا گیا ہے، جب کہ مغرب مین جمہوری اور پارلیمانی طرز کی حکومتین قائم ہوئین، اور قدیم ملکی اور سیاسی تصورات کی جگہ نئے نئے سیاسی اور معاشی نظریون (تھیوریز) نے جنم لیا، چنانچہ وطنی قومیت اور مملکت کا جدید تصور اسی عہد کی پیداوار ہے، مگر اس انقلاب نے اہلِ مغرب کو جو کچھ دیا، وہ اتنا ہی ہے کہ انھون نے ملک و وطن کی بنیادون پر جدید فلسفۂ اجتماع (سوشل فلاسفی) کی داغ بیل ڈالی، اور اس طرح ہمہ گیر رشتۂ اخوتِ انسانی کو تار تار کر کے رکھ دیا، چنانچہ اب وطن ہی ان کا دین و ایمان بن گیا، اور اُن کے جینے مرنے صلح و جنگ اور تمام اعمالِ زندگی کا یہی آخری مقصد پایا،

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد زیر گردون رسم لادینی نہاد

یعنی جہان تک مذہب و اخلاق کا تعلق ہے، اس مین میکیاولی کا تصور ہی کارفرما تھا، چنانچہ عہد جدید کے یورپ مین جو علما، و مفکرین پیدا ہوئے، ان مین سے بیشتر حضرات نے اس لادینی تصورِ مملکت کو سراہا، بلکہ اُن کے جدید نظریون نے اس کو اور زیادہ تقویت دی، اور اصولِ انسانیت کا احترام پہلے سے بھی کم ہوتا گیا، چنانچہ جرمنی کا مایۂ ناز فلسفی ہیگل مملکت کا اتنا دلدادہ تھا، کہ اُس نے اسٹیٹ کو ایک مقدس اور معصوم سیاسی ادارہ قرار دیا، یعنی اس نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ریاست ہر چیز سے بالاتر ہے یہان تک کہ مذہب پر بھی حاوی ہے، اور اخلاق کے لئے ماخذ و منبع ہے، گویا مملکت کسی چیز کی تابع نہین ہو، اور باقی تمام چیزین مملکت کی تابع ہین،

ہیگل کے تصورِ مملکت نے مذہب و اخلاق کی روحانی برتری پر چوٹ لگائی تھی، وہی کیا کم تھی کہ ڈارون کے نظریۂ کائنات نے اس کے جسدِ نیم جان پر ایسی ضرب رسید کی کہ مغرب میں مذہب و خدا کا تصور محض عجوبۂ روزگار یا دگار بن کے رہ گیا، اور اس کے بعد اس جدید مملکتی تصور نے ہمہ گیر نوعیت اختیار کر لی، چنانچہ کارل مارکس اور اینجلز جو دنیائے جدید کے خالق مانے جاتے ہیں، ہیگل اور ڈارون کے نظریات (تھیوریز) کی بنیادوں پر ہی اشتراکی فلسفۂ اجتماع کی عمارت کھڑی کی یعنی مارکس کا نظریۂ تاریخ دراصل ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا غماز ہے، اور اس کا نظریۂ مادی جدلیت درحقیقت ہیگل کی جدلیت ہی کی مسخ شدہ صورت ہے، لیکن تعجب ہے کہ جس شخص نے تمامتر دوسروں کے دماغی کارناموں سے استفادہ کرکے ایک عجیب و غریب فلسفۂ زندگی مرتب کر ڈالا، آج اس کو دنیائے انسانیت کا خدا تصور کیا جا رہا ہے، اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ غریب تو خود دوسروں کے آستانۂ علم و دانش کا بھکاری ہے،

بہرحال فلسفۂ اشتراکیت کا ذہنی پس منظر یہی رہی ہے جس کی ابتدا سولھویں صدی میں ہوئی تھی لیکن اس نے اشتراکی سوسائٹی اور مملکت کی عظمت و تقدس کو اور بھی چار چاند لگا دیئے، اور خدا و مذہب کو اشتراکی مملکت سے ہمیشہ کے لئے جلاوطن کر دیا، چنانچہ کارل مارکس کے نزدیک مذہب و خدا کا تصور محض ایک فریب ہے، سرمایہ دارانہ ذہن کی اُپج ہے، جس کو عوامی طبقوں کی دولت و عزت کا شکار کرنے کے لئے بطور ہتھکنڈے کے استعمال کیا جا رہا ہے، اور اخلاق اس کے نزدیک کوئی مستقل بالذات حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ہر لحظہ بدلنے والی چیز ہیں، خیر و شر اور صواب و خطا کا معیار اُن کے نزدیک یہ ہے کہ جو چیز اشتراکی ریاست و سوسائٹی کی فلاح و تعمیر پر منتج ہو، وہ خیر اور صواب ہے، اور جو اسکی تخریب و فساد پر منتج ہو وہ شر اور خطا ہے،

لینن کہتا ہے کہ ہماری سوسائٹی کسی ایسے نظامِ اخلاق کو نہیں مانتی جو معاشرہ سے باہر کسی فوق الفطر طاقت کا بنایا ہوا ہو، اشتراکیت کے نزدیک ایسا نظامِ فکر و اخلاق سراسر فریب ہے،

نیز وہ کہتا ہے کہ قدیم اجتماعی نظام کے استیصال اور محنت کش طبقوں کی تنظیم کی راہ میں ہر چیز اخلاقاً درست ہے، ہم جب سرمایہ دار سے لڑین گے، تو اس جنگ مین جھوٹ اور مکر و فریب کے ہتھیار استعمال کرنا ضروری ہین،

غرض زمانۂ حال کا جدید تصورِ ملکت اور نظریۂ اجتماع جن فکری عناصر سے ترکیب پاتا ہے، ان کے سرسری تجزیہ سے آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اقوام حاضرہ آج جس راستہ پر گامزن ہین، وہ اُن کو خلفشار و اضطراب اور ہلاکت و بربادی کے اُس اتھاہ سمندر کی پہنائیون کی طرف لئے جارہا ہے، جہان سے اُن کے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہین ہے،

خود ہی انصاف کیجئے کہ جہان ہمہ گیر اصول انسانیت اور آفاق گیر اقدار حیات کو اوہام و خرافات تصور کیا جاتا ہو، جہان احترام آدمیت کا معصوم جذبہ قطعی ناپید ہو، جہان ملک و وطن کے بُت کو خوش کرنے کے لئے ہزارون ناکردہ گناہ انسانون کے خون ناحق سے ہولی کھیلی جارہی ہو، جہان وحشت و درندگی کو ناقابلِ فخر کارنامہ، اور معصوم بچون، ضعیفون اور عورتون تک کو انتہائی بےدردی سے ذبح کرنے کو عین ثواب تصور کیا جاتا ہو، کیا وہان انسانیت کو امن و عافیت کا ایک لمحہ بھی میسّر آسکتا ہے؟

بس یہ ہے کہ عالم انسانی کی روز افزون خلفشار اور زمانۂ حاضر کے درندہ صفت انسانون کی وحشت و بہیمیت نے ہمارے اس یقین و ایمان کو محکم تر بنا دیا ہے کہ مستقل اور دوامی اقدار حیات اور ہمہ گیر اخوتِ انسانی کے گہرے اور پائدار احساس کے سوا انسانیت کی فلاح و نجات کی کوئی دوسری صورت ممکن ہی نہین ہے،

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا	جو لوگ ایمان لائے اور انھون
اِیۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓئِكَ	نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ
لَهُمُ الۡاَمۡنُ وَهُمۡ	نہین کیا، اُن کے لئے ہی امن

مُهۡتَدُوۡنَ ه کی زندگی ہے، اور وہی لوگ ہدایت

(الانعام) پانے والے ہیں،

ان ہمہ گیر اصولِ انسانیت کے سوا جو کچھ ہے، وہ ظن و تخمین اور ہوائے نفس کی تخلیق ہے، اور اس

کار حیات کی الجھنیں کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی جائیں گی، ؎

ع :- راہبر ہو ظن و تخمین تو زبون کار حیات

دار المصنفین کی نئی کتاب

امام رازی

امام فخر الدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضا تھا کہ اُن پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے، اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس میں اُن کے سوانح و حالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ، فلسفہ و علم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل سے متعلق اُن کے نظریات و خیالات کی تشریح کی گئی ہے، جو لوگ قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور و فکر کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے یہ کتاب مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہے،

ضخامت ۳۹۰ صفحے،

قیمت ؎ روپے،

(مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی)

"منیجر"

مولانا عبدالملک بنبانی محدث

از

ڈاکٹر سید باقر علی صاحب ترمذی استاذ شعبۂ عربی اسمٰعیل کالج بمبئی

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے عرصہ ہوا ہندوستان کے محدثین کرام کے تذکرہ کا سلسلہ شروع کیا تھا، لیکن چند کڑیوں کے بعد یہ اہم سلسلہ کسی وجہ سے جاری نہ رکھا جا سکا، اس کے بعد معارف میں ہندوستان کے محدثین پر چند اور مضامین شائع ہوئے، ذیل کی سطریں اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں،

ہندوستان میں گجرات وہ خوش قسمت صوبہ ہے جہاں علم حدیث کی اشاعت سب سے پہلے ہوئی، عام طور سے ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت کی ابتدا حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی طرف منسوب کی جاتی ہے، حضرت موصوف کی جلالت شان اور حدیث نبوی کی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن تاریخی اعتبار سے ہندوستان میں یہ علم شریف پہلے پہل صوبۂ گجرات میں اشاعت پذیر ہوا، چنانچہ علامہ سخاوی کے دو شاگرد شیخ وجیہ الدین محمد بن محمد المالکی (متوفی ۹۲۹ھ) اور شیخ جمال الدین محمد بحرق (متوفی ۹۳۰ھ) شیخ الاسلام زین الدین زکریا انصاری کے دو شاگرد شیخ عبدالمعطی بن الحسن باکثیر المکی (متوفی ۹۸۳ھ) اور شیخ شہاب الدین احمد العباسی المصری (متوفی ۹۹۲ھ) علامہ ابن حجر کے دو شاگرد شیخ محمد ابن عبداللہ الفاکہی الحنبلی اور شیخ سعید شافعی اور دیگر کئی محدثین کرام نے صوبۂ گجرات کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا، اور احمد آباد میں مدارس کھولے، اس کے علاوہ خود گجرات کے بے شمار علماء کو احادیث نبویہ کا بڑا ذوق تھا، حضرات صوفیہ نے اس کی تحصیل میں والہانہ انہماک کا ثبوت دیا، اور دربار کے اعلیٰ

عہدہ داروں نے اس علم شریف کے حصول کے لئے بوریا نشینوں کا تلمذ اپنے لئے باعثِ نجات سمجھا، علم حدیث کی خدمت میں بعض خاندانوں نے نمایاں حصہ لیا، ان میں سے ایک بنبانیوں کا خاندان ہے، اس خاندان نے بہت سے علماء پیدا کئے، جو آسمانِ علم کے درخشاں ستارے ثابت ہوئے، اور افتا و قضا کے جلیل القدر مناصب پشتوں تک اُن کے خاندان میں رہے، اور اس خاندان کے باکمال فرزندوں نے نہ صرف ملکی انتظام میں نام پیدا کیا، بلکہ علوم و فنون کی سرپرستی، علماء کی قدردانی صلحاء و اتقیاء سے عقیدت و نیازمندی اور اپنے ذاتی علمی کمالات کا نقش تاریخ کے صفحات میں چھوڑا، بنبانیوں کی اصل کے متعلق جمعات شاہیہ جلد چہارم (قلمی) میں اس طرح لکھا ہے:-

"بنبان ولایتی ست مابین خراسان و ملتان و این جماعت کہ بہ ملک گجرات بہ بنبانیان مشہور اند از آنجا آمدہ اند و ایشان از حضرت عبد اللہ بن عباس اند"

ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس خاندان کے بزرگوں نے کس زمانہ سے گجرات میں سکونت اختیار کی لیکن اس کے علماء میں شیخ صدر الدین کا زمانہ سب سے مقدم معلوم ہوتا ہے، شیخ صدر الدین نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن کو انھوں نے شاہانِ گجرات کے نام سے معنون کیا، شیخ مذکور کو عربی ادب اور صرف و نحو سے خاص لگاؤ تھا،

قصیدۃ البردہ، قصیدہ کعب ابن زہیر، قصیدہ لامیہ (قاضی عبد المقتدر) وغیرہ پر انھوں نے حواشی لکھے ہیں، نحو کی مشہور کتاب الوافی کی شرح الکافی انھی کی ہے، ہندوستان میں غالباً اس کتاب کی سب سے پہلی شرح یہی ہے، شیخ نے قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی لکھی جس کا نام تفسیر بحر المعانی رکھا وہ غالباً آٹھویں صدی کے آخر اور نویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں بقید حیات تھے۔

شیخ منہاج الدین بنبانی غالباً شیخ صدر الدین کے بیٹے تھے، انھیں علم حدیث، تصوف اور صرف و نحو سے بہت دلچسپی تھی، علم النحو میں اُن کے مرتبہ کا اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ

ری عالم شیخ بدرالدین دمامینی احمد آباد مین قیام پذیر تھے، اس وقت ان مین اور شیخ منہاج
مسلون کے متعلق بحث چھڑ گئی، اور دمامینی کو اُن کے رد مین ایک کتاب الفتح الربانی
لبنانی لکھنی پڑی، اُن کی تصانیف کی تعداد ۳۰ سے متجاوز تھی، لیکن حدیث کی تالیفات
، بخاری اور مسلم کی شرحون کے نام ہم تک پہنچے ہین،
فیض اللہ بن زین العابدین بنبانی کا ہمین شکر گذار ہونا چاہئے کہ اُنکی مجمع النوادر سے اکثر
ہین، شیخ فیض اللہ گجرات کے مشہور سلطان محمود بیگڑے (۸۶۳ تا ۹۱۷ھ) کے خزانچی تھے
ن مجید کی تفسیر دستور الحفاظ اسی سلطان کے نام سے معنون کی ہے،
ں کے علاوہ اُن کی تاریخ صدر جہان اور مجمع النوادر نہایت مفید تصانیف ہین، اتفاق سے
ور دست وبرد زمانہ کے ہاتھون برباد ہونے سے بچ گئے ہین،
ی خاندان کی ایک مایۂ ناز ہستی شیخ عبد العزیز المعروف بہ عبدالملک بنبانی ہے، ان کا سلسلہ نسب
ہ اللہ بن عباس سے ملتا ہے، جس کی چند کڑیان حسب ذیل ہین،
خ عبدالملک بن شیخ محمود بن شیخ خضر بن شیخ نصیرالدین بن شیخ برہان الدین بن شیخ خضر بن شیخ
خ حسن بن شیخ ایاس،
خ عبدالملک زین البلاد احمد آباد مین پیدا ہوئے، اور وہین ۹۷۰ھ کے قریب انتقال
ران کے اور بزرگون کی طرح شیخ عبدالملک بھی خانوادۂ سہروردیہ سے منسلک تھے، غالبًا
انقاہ مین تعلیم پائی ہوگی، حدیث اپنے بڑے بھائی شیخ قطب الدین بنبانی سے پڑھی جن کو

ٹ کے لئے دیکھو روئداد کل ہند تاریخ کانفرنس اجلاس بمبئی گجرات کی چند تاریخی کتابون کی تعین
تاب پر پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے ایک پرمغز مقالہ سپرد قلم کیا ہے، جو لاہور کے اورنٹیل کالج
بت اگست ۱۹۳۵ء مین شائع ہوا ہے،

مشہور مصری عالم شیخ شمس الدین سخاوی سے سند حاصل تھی، حدیث مین مولانا عبد الملک کے ممتاز شاگردون مین مولانا کمال محمد عباسی (مفتی اجین مالوہ) کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، شیخ عبد الملک نے تفسیر و حدیث مین کمال حاصل کیا، اور استاذ نا کے رتبۂ عالی پر فائز ہوئے، انھین صحیح بخاری ازبر تھی، ہمیشہ مسجد اور حجرے مین ورد اوراد مین مشغول رہتے، توکل اور تجرید مین آپ کی مثال نہ تھی تمام علوم کا زبانی درس دیا کرتے تھے! افسوس ہے کہ مولانا جیسے باکمال محدث کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہین، اُن کے ایک فرزند شیخ عبد اللطیف (متوفی ۹۱۵ھ) نے مشارق الانوار کی شرح مبارق الازہار لکھی ہے، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بھروچ کے قاضی صاحب سید نور الدین احمد حسین کے ذاتی کتب خانہ مین موجود تھا،[۱] شیخ خلیل محمد عباسی شیخ عبد اللطیف کے صاحبزادے ہین، والد سے علم حدیث حاصل کیا، احمد آباد کے بخاریون کے ایک مشہور عالم اور صوفی سید محمد مقبول عالم[۲] انہی سے روایت کرتے ہین، چنانچہ علامہ نور الدین (متوفی ۱۱۵۵ھ) نور القاری فی شرح البخاری مین فرماتے ہین :-

" وبہ قال مولانا مقبول عالمؒ حدثنی مولانا خلیل محمد العباسی البنانی حدثنی والدی عبد اللطیف حدثنی والدی عبد الملک حدثنی محمد العمد عن بجار اللہ عن والدہ الخ

ذیل مین ہم شیخ عبد الملک بنبانی محدث گجراتی کی اسناد حدیث پیش کرتے ہین، یہ اسناد شیخ رشید الدین حسینی کی کتاب مجمع الاولیاء سے لی گئی ہین، اس کتاب کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی

---

[۱] ہم قاضی سید نور الدین صاحب کے تہ دل سے شکر گذار ہین، انھون نے ازراہِ کرم مبارق الازہار اور نور القاری کے چند اقتباسات نقل کر کے ارسال فرمائے

[۲] مختصر ترجمہ کے لئے دیکھو مرأت احمدی خاتمہ ص ۲۰، طبع بمبئی،

کے کتب خانہ مین موجود ہے، چونکہ سلسلہ اسناد مین زیادہ تر نام ہی ہین، اس لئے ہم عربی متن کے نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہین،

صحیح بخاری | انہ یروی من الشیخ محمد المذکور بجار اللہ عن والدہ عز الدین عبد العزیز عن شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن حجر عن محمد بن محمد الہاشمی عن قاضی القضاۃ محب الدین محمد بن محمد بن محمد الطبری عن الشیخ ابی الفتح المراغی عن شہاب الدین ابی العباس احمد بن ابی طالب بن ابی نعیم نعمہ بن حسن بن علی بن بیان بن شحمۃ الحجازی الدمشقی الصالحی عن سراج الدین ابی عبد اللہ الحسین بن المبارک بن محمد بن یحیی الزبیدی عن ابی الوقت عبد الاول بن عیسی بن شعیب بن اسحاق بن ابراہیم الصوفی السجزی ثم الہروی عن جمال الاسلام ابی الحسن عبد الرحمن بن محمد بن المظفر بن محمد بن داؤد بن احمد بن معاذ بن اسہل بن الحکم الداؤدی عن ابی محمد عبد اللہ بن احمد بن حمویہ بن احمد بن یوسف بن اعین الحموی السرخسی عن ابی عبد اللہ محمد بن یوسف بن مطر بن صالح بن بشر بن ابراہیم البخاری العزیزی عن محمد بن اسمٰعیل البخاری رحمہم اللہ،

صحیح مسلم | انہ یروی من محمد المذکور بجار اللہ عن ابی العباس احمد بن ابی طالب الصالحی المذکور فی سند صحیح البخاری وانہ یروی عن محمد بن ابی السعادۃ الحامی قال اخبرنا الحافظ ابو القاسم عبد الرحمن بن محمد بن اسحٰق بن مندۃ الاصفہانی عن الحافظ ابی بکر محمد بن عبد اللہ الجوزقی قال ابو حاتم المکی بن عبد اللہ التمیمی قال اخبرنا الامام ابو الحسین مسلم رحمہ اللہ،

سنن ابی داؤد | انہ یروی من محمد المدعو بجار اللہ قال اخبرنی والدی عز الدین بن عبد العزیز سماعاً قال اخبرنا ابو العباس بن ابی بکر الواسطی و ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن کامل الترمذی عن الخطیب ابی الفتح محمد بن محمد المنذری قال اخبرنا ابو الفضل عبد الرحمٰن بن یوسف بن یحییٰ الموصلی سماعاً قال اخبرنا ابو الفتح المفلح الدین بن احمد الدومی و ابو النصر ابراهیم بن محمد الکرخی سماعاً عن المسند ابی طاهر محمد بن محمد بن عبد اللطیف قال انبأتنا ام عبد زینب ابنة احمد بن عبد الرحیم المقدسی عن ابی القاسم بن الحاسب قال حدثنی الحافظ ابو الطاهر احمد بن محمد السلفی اذنا قال کتب ابو جعفر العبادانی من البصرة قال اخبرنی القاضی ابو عمر القاسم بن جعفر بن عبد الواحد الهاشمی قال اخبرنا ابو علی محمد بن احمد بن عمر اللؤلؤی، قال اخبرنا الامام ابو داؤد السجستانی رحمهم اللہ تعالیٰ

سنن الترمذی | انہ یروی من الشیخ محمد المدعو بجار اللہ عن والدہ عز الدین عبد العزیز قال اخبرنی شیخ الحنفیہ امین الدین یحییٰ بن محمد القاهری قال اخبرتنا الاصیلیہ ام محمد سارة ابنة عمر الحموی قال انبأنا الصلاح عمر بن الحسین المراغی قال اخبرنا الفخر ابو الحسن علی بن احمد البخاری المقدسی قال اخبرنا ابو الفتح عبد الملک بن عبد اللہ الکرخی سماعاً قال اخبرنا ابو عامر محمود بن قاسم الأزدی قال اخبرنا ابو العباس احمد بن محمد بن احمد بن محبوب المحبوبی قال اخبرنا الامام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی رحمهم اللہ،

سنن نسائی | انہ یروی من محمد المدعوا بجار اللہ عن والدہ عز الدین عبد العزیز قال اخبرنا الحافظ تقی الدین محمد بن علوی المالکی اذنا قال اخبرنا قاضی القضاة ابن زین الدین ابی بکر بن الحسین المراغی المدنی قال اخبرنا المسند برهان الدین

ابراهیم بن محمد الدمشقی المؤذن سماعاً قال اخبرنا مسند الدنیا شهاب ابو العباس احمد بن ابی طالب، قال أخبرنا ابو طالب عبد اللطیف بن محمد قال اخبرنی ابو ذرعہ طاهر بن محمد بن طاهر المقدسی سماعاً قال اخبرنا محمد عبد الرحمن سماعاً قال أخبرنا ابو النصر احمد بن الحسین بن محمد الدینوری قال حدثنی ابو بکر احمد بن محمد بن السحق السنی قال حدثنی ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب بن علی النسائی،

سنن ابن ماجہ | انہ یروی محمد المدعو بجار اللہ عن والدہ عز الدین عبد العزیز قال أخبرنا الشیخان الحافظان تقی الدین محمد علوی المکی وقاضی القضاة شہاب الدین احمد بن علی بن حجر إذناً قال البرهان ابراهیم بن صدیق الدمشقی سماعاً، قال اخبرنا رحلة الدنیا ابو العباس احمد بن ابی طالب الصالحی إذناً قال اخبرنا ابو محمد عبد اللطیف بن محمد بن علی قال اخبرنا ابو منصور محمد بن الحسین القزوینی سماعاً قال اخبرنا ابو طلحة القاسم بن المنذر الخطیب قال اخبرنا ابو الحسن علی بن ابراهیم بن العطار قال اخبرنا الامام ابو عبد اللہ محمد بن یزید القزوینی المعروف بابن ماجہ۔

موطا امام مالک | یرویہ بن محمد المدعو بجار اللہ عن والدہ عز الدین عبد العزیز عن شہاب الدین ابی الفضل احمد بن علی بن حجر قال اخبرنا العلامہ برهان ابراهیم بن احمد بن الواحد قال أخبرنا المسند ابو عبد اللہ محمد بن جابر بن محمد بن القاسم وادی آشی تونسی قال اخبرنا ابو محمد ..... عبد اللہ بن هارون القرطبی انطائی سماعاً قال اخبرنا القاضی ابو القاسم

احمد بن زید بن عبد الرحمن بن تقی قال اخبرنا ابو عبد اللہ بن فرخ الفقیہ
مولی محمد بن الطلاع قال اخبرنا ابو ولید یونس بن عبد اللہ بن مغیث
عن ابی عیسیٰ یحییٰ بن عبد اللہ عن ابیہ عبید اللہ بن یحییٰ عن ابیہ الامام
یحییٰ بن یحییٰ اللیثی عن الامام مالک۔

ہماری بادشاہی

ہمارے چھوٹے بچون کے نصاب مین کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو اُن کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ
سے باخبر کر سکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، اس کی زبان بچون کے لائق دلچسپ
اور پسندیدہ ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتون کی مختصر اور آسان تاریخ ہے، جو گذشتہ صدیون مین
مسلمانون نے دنیا کے مختلف حصون مین قائم کین قیمت :- ۶ر

ہندوستان کی کہانی

ہندوستان کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا رسالہ نہایت آسان اور سہل زبان مین لکھا گیا ہے تاکہ ہمارے
مکتبون اور ابتدائی مدرسون کے بچے اس کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکین، ضرورت ہے کہ رسالے
چھوٹے بچون کے نصاب مین شامل کیا جائے تاکہ اُن کو معلوم ہو کہ وہ کون تھے، اور اب کیا ہین۔
ضخامت ۶۰ صفحے قیمت :- ۴ر

(از مولوی عبدالسلام قدوائی ندوی)

تاریخ یمن کا ایک ورق

از

مولانا ابو الجلال صاحب ندوی

بسلسلۂ ماہ مئی سنہ ۳۰ء

فارسٹر نے جس کتبہ میں اپنے زورِ تحریف سے حضرت ہودؑ کا نام پڑھکر اس میں نصرانیت کے جراثیم دکھانے کی کوشش کی ہے، اس کا چربہ دیکھئے۔

میری قرأت کے مطابق یہ ایک نظم[1] ہے جو حسب ذیل ہے،

سَمِیْقَ . السَّسَ ... وذْ یَیْن ...

وَشَرح ذاکَلَۃَ یُصَعِلا .

اکَرْ ذَوِیَ .. قَراذْ نَدِ لَ

حَیت بَرْحَوسیلْ ھِتاکل

نَوَ .. ذِ یَیتَ شَنْہِ .. لَدْنَ مَا ... مَثْلَتَہْ ... شُرُ قُنا .. حَبِ مَا .. یَیَنِ ..

لَیسَرِ مَا .. بِرِزَعُ .. مُکر ذ مَا ...

تھِمَا .. ذزشِیَنا .. یلِلْ ذو ..

لِیمُنی .. یصلٰذِ ءُ .. لِذْ حمیَ ..

یَدْ .. یَنَا .. کُرُدُنا .. رَمیَنا ..

لِرَدُ نا .. قذ لَنا .. شر لیا .. ذَنِی وَلحَو .. شَنْش .. ذَحَرَ .. وَ .. خَلتا .

شَلھَنا .. سَلقَنا .. ذْ یُقَتِہَ ..

رَنحَمَا .. رَکفَنا .. مِطلَنِ نا

سکا کلنا .. زکُرُدا .. کَدَ .. ولا ..

مصرلوس ین لون نصقا سطر.

وذْ نا مر رَندُ نوُ ذِ رَنا مرُ ..

یتوکث .. ذ ٨ . ولِنُشَّتِہ ..

وخلقہ .. و مُسْلَلَتِہ ..

---

[1] اس نظم کی صورت دیگر پڑھنے میں کاتب حروف اپنی محترم دوست مولوی اقبال احمد صاحب سہیل کے مشورون کا ممنون ہے ،

ومنقل.. کستہ صبن.. وذہ..

وکل ذک

وذ نوش رضا حبشنا .. پشیی

وشلہ ذ شن وذ دق تنو ذکو ذ وخمیر ما کہرل،

وملث وخمیر ما .. شق .. لہ .. وشح مرنو .. شرح ذو .. رخث..

وغل تنو ذ وشر ذ .. یا ..

ستا مرشتو وخرق تحر،

اس کو نظم کی صورت مین لکھنے کی غرض سے ہم نے سطر سطر کا اتباع نہین کیا، اصل کتبہ کی سطر جس لفظ سے شروع ہوتی ہے، اس پر نمبر لگا دیا گیا ہے، قرأت مین کوئی نقش محذوف نہین ہی، تشدید، تنوین اور تطویل حرکت کے علاوہ کوئی حرف زائد نہین ہے، فارسٹر اور رودیگر دونون کی قرأت کے برخلاف یہ قرأت حذف و اضافہ سے پاک ہے،

وزن و قافیہ | یہ نظم ۲۸ مصرعون کا مجموعہ ہے جن مین سے ۲۷ مصرعے تو فعولن فعولن فعولن فعو کے وزن پر ہین، اکیسوان مصرعہ فعولن فعو کے وزن پر ہے، یہ حیرتناک امر ہے، قوافی کا عجب انداز ہے

مصرعہ نمبر ۱ و نمبر ۲
مصرعہ نمبر ۳ و نمبر ۴
مصرعہ نمبر ۷ و نمبر ۹
مصرعہ نمبر ۱۸ و نمبر ۱۹ و نمبر ۲۰
مصرعہ نمبر ۲۵ و نمبر ۲۶ و ۲۷

} ہم قافیہ ہین، باقی مصرعون مین قافیہ کی پابندی نہین کی گئی ہے،

زبان کتبہ | اس کتبہ کے اکثر الفاظ متداول عربی کی کتب لغت مین ملین گے، اس لئے زبان کتبہ

عربی سمجھنا چاہئے، عبارت کو متداول عربی کے قواعد پر ڈھال کے ہم نے پڑھا ہے، مگر چند مقامات پر عربی نحو کے خلاف جانا پڑا،

(۱) ...ین مصرعہ مین لیمنا اور لذ حما کے الفاظ مین عربی قاعدہ سے لیمن اور لذ حم ہونا چاہئے، عربی کی نحو سے ...ین کی غرض سے ہم نے ان دونون لفظون کے آخری الفون کو ی سے لکھا، عربی مین ایسے الفاظ کی بکثرت مثالین ہین؛

(۲) گیارھوین مصرعہ مین ثمر لیا کا لفظ ہے، جسے قاعدہ سے ثمر لئے ہونا چاہئے لیکن ہمدانی نے اکلیل مین لکھا ہو کہ اہل حمیر خذ بعیریک کی جگہ خذ بعیراك کہتے تھے،

(۳) مصرعہ دوم مین عربی قاعدہ سے اکملا نہین تو کملان ہونا چاہئے، مگر ضرورت شعری یا زمانۂ کتبہ کے جواز نے اسے کملا کر دیا،

لغات | کتبہ کے اکثر الفاظ لغت کی متداول کتابون مین ملتے ہین جن الفاظ کو عام ناظرین بآسانی تلاش کر سکتے ہین، اُن کو چھوڑ کر باقی الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے،

مکرذما، ذحمی، ذحم، ذنی، ذنون اور ثمر ذ مین ذال کو دال بنا دینے پر یہ الفاظ لغت مین مل جائین گے، وذہ کو ودہ پڑھکر استیدہ کا مرادف قرار دیا جا سکتا ہے، اسی طرح ذیل کے الفاظ کو بھی ذرا تغیر کے ساتھ ناظرین لغت مین پا سکتے ہین،

۱- حَیت = حوت (منڈلانا) سے فِعل کے وزن پر

۲- ذیت شنہ = ذات سنتہٖ

۳- بصند = یصادی (مقابلہ کرتا ہے)

۴- یَنَاءَ = ونی (عربی کی مثال واوی عبری مین مثال یائی ہوتا ہے اور ہمزہ آخر بکثرت ی سے بدل جاتا ہے)

(۵) نصقاسطر = نسقاسطر = قاف کے پہلے کی سین عموماً صاد سے بدل جاتی ہے تاج العروس مین

ہو کہ ابن عباد نے کہا

"نسقان فلکہ کے قریب دو ستارے ہین، ایک یمانی ہے، ایک شامی (ن س ق) فلکہ چند

دائرہ نما تارے ہین، سماک رامح کے پیچھے بنات النعش کے سامنے جن کو بچے قصعۃ المساکین

کہتے ہین (ف ک ک)"

لفظ نسقا کی سطر کی طرف اضافت بتاتی ہے، سطر سے مراد ستارون کی وہ جھرمٹ مراد ہے جس مین

نسقان واقع ہین،

(۶) ذکی = ذکی، ذہین، تیز فہم،

ذیل کے الفاظ کا ترجمہ عبرانی لغت کی مدد سے کیا گیا ہے

(۷) کلہ = تباہ کاری

(۸) کزز = سخت دلی

(۹) ثملھنا = ہم نے نکال دیا،

(۱۰) نحل = فرمان روا ہوا،

(۱۱) کستہ = عرش

ذیل کے الفاظ نہ عربی لغت مین ملے، نہ عبرانی لغت مین، مگر اُن کے مطالب قرینہ سے معلوم ہوتے ہین

(۱۲) اکر = ذوی کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ لفظ نباتات سے متعلق ہے، مواکرت کے معنی

ہین مزارعت' اکر بمعنی زراعت،

(۱۳) ہتاکل = اکال وصول کیا، عربی مین اس چیز کو اکال کہتے تھے، جو امرا، اور حکام کو رعایا

سے ملتا تھا، عربی افتعل عبرانی مین تفعل اور ھتفعل ہو،

۱۴۔ ذزة: غالباً ایرانی فذ (قلعہ)

۱۵۔ لرونا: غالباً لرونیا (ہماری سنگ اندازی سے)

۱۶۔ شمرلیا: سابق لفظ قذن بتاتا ہے کہ یہ قذالین کا مرادف ہے، پشت سر کے بیچ ویسا کو قذالین کہتے ہیں،

۱۷۔ مطلق: م = من، طلن = دیار } محض قیاساً

۱۸۔ سکاکل: دشمن محض قیاساً

۱۹۔ یتوکت: ؟؟؟

۲۰۔ شسی: خادم بن گیا، (مصری "حرشستو" کا ترجمہ کیا جاتا ہے (اتباع حوم)

۲۱۔ ہرل: ؟؟؟

۲۲۔ سشام: غالباً مجرم

ترجمۂ نظم| ان الفاظ کے علاوہ اور جتنے الفاظ ہیں، یا تو اسماء و القاب ہیں یا ذرا سی توجہ پر ناظرین ان کو کتب لغت میں تلاش کر لیں گے، اس لئے اب ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے،

سمیق نے بنیاد ڈالی اور ذو نین نے،

اور ذو شرح نے تباہ کاری کی حد کر دی

کھیتی مرجھا گئی اور گاؤں بن گیا کینہ

منڈلانے والا گدھ لسیل محصول لینے کو

ارادہ کیا اوس نے ایک بھولی بھالی کا پانی کے پاس، اس کی ناک اور کان کاٹ لئے ہماری آفتاب

وشون نے، کیا... خوب ہے یمن کا پانی،

یسار آفیتین ڈھانے لگا کیجا کر کے

قلعہ سینا کے نہات کو۔ یالل دو

یمن کی طرف سے مقابلہ کرنے لگا، مدافعت سے

ایک بازو عاجز ہو گیا، ہماری سنگ دلی بڑھ گئی

اپنی سنگ اندازی سے کمینہ کی پشتِ سر ہم نے زخمی کر دی، شاس اور حالکہ کے بافندہ نے

مدافعت کی،

ہم نے نکال دیا، اذیت دی، ذو یقنہ

ریاح کو ہم نے لاتین مار کر اپنے دیار سے بھگا دیا

ہمارے دشمن ہماری کے تھیلے بن گئے ایسا دیکھ کر

بہادر ہرہ فکہ کے دونوں ستاروں تک پہنچے

اور زندنوذ کے مغنی نے ترانہ گایا،

... یہ شخص اور اپنی ورزہ بازی

اور طور طریقہ اور شمشیر بازی

اور صین کی حکومت کے نکل جانے سے مغلوب ہو گیا،

اور عاجز ہو گیا تیز فہم

اور ذونوش نے حبش کو راضی کیا، وہ خدمت گار بن گئے،

اور صورت بگڑ گئی، بدحال کرنے والے کی اور نیزے مارے کرذ کے تنوذ نے اور حمیر... جیسا ہو گیا،

اور بادشاہ اور حمیر کو اس کا دکھ ہوا

و شیع سوئت اور ذوشرح کمزور ہو گیا۔

اور تمود حاکم ہوا، اور خدا نے پراگندہ کیا،

بد زبانی کے مجرم کو اور پاش پاش کر دیا، -

اماکن | اس نظم میں نام اماکن کے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

صین | عربی روایات میں کئی کہانیاں ہیں جن میں تبابعہ یمن کو صین پر حکمران بتایا گ

تبابعہ میں سے ایک شمر الصباح تھا، جس کی بابت شاعر کہتا ہے کہ

من بعد ملک الصین اصبح هالکا

اکرم به من هالک محتاج

عام طور پر اس صین کو چین کا معرب سمجھا جاتا ہے، بعض کہانیاں بھی اس کی تائید

ایک صین وہ ہے جس کی بابت شمر دل بن شریک نے کہا،

حیث یقال للریاح اسفین	ہواؤں کو بہنے کا حکم ہوتا ہے، تو ز
ہوج یصبحن فلا ینبین،	زور سے بہنے لگتی ہیں، اور ہر سمت ب
وکل وجہہ للسری یسرین	لگتی ہیں، یبرین اور حضر موت سے
بلغن اقصی الرمل من یبرین	کر ریگ زار کی حد اور صین تک
وحضر موت و بلغن الصین	پہونچتی ہیں،

(جزیرۃ العرب ہمدانی ص ۳۰۲)

ان اشعار کے صین کو بھی چین ہی سمجھا جاتا ہے لیکن شاعر صریحاً اس ہوا کا ذکر کرتا ہے

اور حضر موت سے شمال کو روانہ ہوتی، اور ریگ زار عرب کی آخری حد اور صین تک پہنچ جا

توراۃ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ کوہ طور کے مشرق میں جو علاقہ ہے، توراۃ میں اس کا نام سین

ہے، اور اس کے مغرب میں مصر سے ملا ہوا جو علاقہ ہے، اس کا نام دشت سین ہے، اسی سین ک

سے ایک قصاص شاعر ایک تبع کی زبان سے یون فخر کرتا ہے کہ

وعلی بنی حام غدوت بطوله   بالصين حتى بدد واتبديد

صین مین بنو حام پر مین نے حملہ کیا، اور اُن کو پراگندہ کردیا، زبور مین ارض حام مصر کا نام ہے

توراۃ مین حام کو مصر و کنعان اور کوش و فوط کا مورث بتایا گیا، ہٰذا اس کتبہ کے اندر صین کے نام سے اسی

علاقہ بنو حام کا ذکر ہے، جو طور و مصر کے درمیان ہے، اس کتبہ کے مطابق اس کے اندر مذکور واقعہ سے پہلے

تک صین پر ملوک مین کی حکومت تھی، مگر انہی دنون وہ وہان سے محروم اور بے دخل ہوگئے،

شیا | مراد سینا طور سے مشرق کا علاقہ

حاکہ | معجم البلدان مین ہے کہ حاکہ بلاد عذرہ کی ایک وادی کا نام ہے، بنو عذرہ کی شان مین

نابغہ نے کہا،

عظام اللهى ابناء عذرة انهم   لهاميم يستلهونها فى الحناجر

هم منعوا وادى القرى من عدوهم   بجمع شديد للعدا والمكابر

(یعنی)

"بنو عذرہ بڑے کھاؤ بیر ہین، انھون نے اپنے دشمن سے وادی القریٰ کی حفاظت کی تھی"

"بلاد عذرہ وادی القریٰ مین تھے، اس سے حاکہ بھی وادی القریٰ کے اندر واقع تھا"

شش | شش سے مراد ایک مقام شاس ہے، "ابن موسیٰ نے کہا کہ یہ مدینہ اور خیبر کے درمیان ایک

راستہ کا نام ہے، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ خیبر کو چلے، تو شاس کی راہ چھوڑ کر مرحب کی

راہ سے چلے (معجم البلدان)

یین | مدینہ منورہ سے ایک برید کے فاصلہ پر صاحک اور صویحک نام دو پہاڑون کے درمیان ایک وادی

کا نام یین ہے، حضرت اہبانؓ الاسلمی یہین کے باشندہ تھے، یہان بنو خزاعہ کی ایک شاخ بنو اسلم رہتی تھی،

سیرت ابن ہشام میں جو بابلیہ کا ذکر آیا ہے، غزوۂ بدر کے سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تربان، ملل، غمیس الحمام اور مرمین ہوتے ہوئے صخیرات الیمام سے گذرے اور غزوۂ بنو لحیان کے سفر میں غراب، جبل مخیض، البتراء پھر یمن ہوتے ہوتے صخیرات الیمام سے گذرے،

یمنی | یمن کے مقام میں سیل نام ایک سرکاری محصل کی توہین کی گئی، یسار نام ایک حاکم نہات کی فوج نے کرسینا سے انتقام کو چلا جس کا مقابلہ حاکہ اور شاس دا اون نے کیا، یمن کی طرف سے ذو بابیل نے یمن پر چڑھائی کی، اس لئے سینا، حاکہ اور شاس کے ساتھ کتبہ میں یمن کا ذکر بھی آیا ہے،

حبش | اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ یمن والے غالب رہے، یسار اور ذو بابیل کی فوج نے شکست کھائی، مجبوراً ذونوش نے جو غالباً ان دونوں یمن کا بادشاہ ہوگا، اہل حبش کو خوشامد کرکے اپنی فوج میں داخل کیا، اس حیثیت سے کتبہ کے اندر حبش کا ذکر آیا ہے، (باقی)

دار المصنفین کی دوسری نئی کتاب

تاریخ اندلس

اندلس پر اردو میں بکثرت مضامین اور کتابیں لکھی گئیں، اور بکثرت عربی و انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا گیا لیکن پھر بھی ایک محققانہ اور مستند کتاب کی ضرورت باقی تھی، اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جو درحقیقت دار المصنفین کے پیش نظر سلسلۂ تاریخ اسلام کی ایک اہم کڑی ہے، اس کی متعدد جلدیں ہیں، جو بتدریج شائع ہونگی، اس جلد میں شروع میں اندلس کے طبعی و تاریخی جغرافیہ اسکی قدیم تاریخ وہاں کے باشندوں اور مختلف حکومتوں کی تفصیل، پھر فاتح اندلس طارق بن زیاد (۹۲ھ/۷۱۱ء - ۹۳ھ/۷۱۲ء) سے لیکر عبد الرحمن اوسط (۲۰۶ھ - ۲۳۸ھ) تک وہاں کی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ قلم بند کی گئی ہے،

(مرتبہ سید ریاست علی صاحب ندوی) "منیجر"

تلخیص وتبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے جو آج کل ہمارے جمہوریہ ہند کے صدر ہین، ۱۹۴۶ء عیسوی مین ایک کتاب "India Divided" لکھی تھی، جو بہت مقبول ہوئی، اب تک اس کے تین اڈیشن نکل چکے ہین، اس کے ابتدائی حصہ مین ہندوستان کے مسلمان حکمرانون کی مذہبی، سیاسی اور علمی رواداری پر بھی تبصرہ ہے جس کے خاص خاص حصے ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہین، آج جب کہ ایک خاص حلقہ مین یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندوستان مین مسلمانون کی حکومت بہت ہی جابرانہ اور متعصبانہ تھی، ذیل کی تحریر پڑھنے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ اس قسم کی باتین عدم واقفیت اور محض تعصب کا نتیجہ ہین،

ڈاکٹر راجندر پرشاد رقمطراز ہین :

"عملی طور پر ایسی بہت سی مثالین ملین گی کہ مسلمان بادشاہون نے مندرون اور مٹھون کیلئے جائدادین وقف کین، اور عبادت گذار اور صاحب علم و کمال پنڈتون کو جاگیرین دین، یہ بہت کچھ دکھایا جا چکا ہے کہ مسلمان بادشاہون نے ہندوؤن کے کتنے مندرون اور عبادت گاہون کو مسمار کیا، لیکن اگر کوئی محقق ان کثیر التعداد اوقاف اور جاگیرون کی فہرست تیار کر دے، جو مسلمان حکمرانون

کی طرف سے ہندوؤن کی عبادت گاہون کو دی گئی ہین، تو یہ بڑا مفید کام ہوگا جنوبی ہند کی تاریخ کے طلبہ کو ایسی مثالیں بہت ملین گی کہ عادل شاہی، قطب شاہی اور آصف شاہی بادشاہون نے برہمنون کے لئے بہت سی جاگیرین وقف کین، بودھ گیا کے مہنت کی زمینداری کی سالانہ آمدنی لاکھون روپیے ہے، یہ زمینداری دہلی کے مغل بادشاہ محمد شاہ کا عطیہ ہے، جسے اُس نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ سے مہنت لال گیر کو مستی پور تارا ڈیہہ کا پورا علاقہ عطا کیا، مہاراجہ دربھنگہ کا علاقہ ہندوستان کی سب سے بڑی زمینداری ہے، یہ اکبر نے موجودہ مہاراجہ دربھنگہ کے مورث اعلیٰ کو دی تھی، جو زہد و فضل مین نمایان حیثیت رکھتے تھے، شیرشاہ نے ہندو رعایا کی تعلیم کے لئے جاگیرین وقف کین، ان جاگیرون کا انتظام خود ہندو ہی آزادانہ طریقہ پر کرتے تھے، شیرشاہ اپنی رواداری کی وجہ سے ہر فرقہ مین مقبول تھا، کشمیر کا حکمران سلطان زین العابدین امرناتھ اور شاردا دیوی کے مندرون مین گیا، تو وہان کے زائرین کے آرام و آسائش کے لئے مکانات تعمیر کرائے، ۱۸۰۰ء مین ہردوار نجیب آباد کے پٹھانون کے زیرنگین تھا، نجیب آباد کے نواب نے ہردوار کے جاتریون کے لئے بڑے بڑے مکانات بنوائے، جو آج تک موجود اور ہندوؤن کے قبضہ مین ہین،

عالمگیر کے عہد کا مورخ منشی سجان رائے خلاصۃ التواریخ مین لکھتا ہے کہ دیپالپور مین جو کالا نور کے پاس واقع ہے شاہ شمس الدین دریائی کا مزار ہے، ہندوؤن اور مسلمانون دونون کو اُن سے بڑی عقیدت تھی لیکن ایک ہندو کی عقیدت اتنی زیادہ تھی کہ ان کی وفات کے بعد اسی ہندو کو مسلمانون اور ہندوؤن نے مل کر اُن کے مزار کا متولی بنایا، چند سال کے بعد کچھ مسلمانون نے شورش کرکے مذہبی بہانے سے ہندو کو تولیت سے محروم کردینا چاہا، لیکن عالمگیری حکومت نے اس شورش کو کامیاب نہین ہونے دیا، اور جب کہ یہ کتاب (یعنی خلاصۃ التواریخ) لکھی جارہی ہے، عالمگیر کی حکومت کا تیسرا سال ہے لیکن اس مزار کی تولیت بدستور ہندوؤن ہی کے ہاتھ مین ہے"۔

حیدرآباد دکن مین ایک مشہور درگاہ کی تولیت کا سلسلہ ایک برہمن خاندان مین چلا آتا ہے، نظام

حیدرآباد نے اس درگاہ کے لئے ایک بڑی جاگیر وقف کی ہے بعض مسلمانون نے ہندو متولی کو علٰحدہ کرنا چاہا، مگر نظام نے نہین ہونے دیا، حیدرآباد شہر کے اندر سیتارام کا ایک مندر ہے ایک اور مندر ماہور (عادل آباد) مین ہے ان دونون مندرون کے لئے حکومتِ نظام کی طرف سے جائداد وقف ہے جس کی سالانہ آمدنی پچاس ساٹھ ہزار سے زائد ہے، ناندیر مین سکھون کے ایک گردوارے کے لئے بھی نظام نے ایک جاگیر عطا کی ہے جسکی سالانہ آمدنی بیس ہزار ہے،

۱۱۶۷ھ مین احمد شاہ بہادر غازی نے ایک سند عطا کی تھی جس کا ترجمہ یہ ہے:-

ضلع اکبرآباد کے قصبہ اچھنیرا کے زمینداروں اور کاشتکارون کو معلوم ہو کہ شیتل داس بیراگی کو پنیارتہ کے طور پر شری ٹھاکر جی کے بھوگ اور نوید کے لئے سترہ بگھے کھیت کی معافی دیجاتی ہے تاکہ اُن کی آمدنی سے شری ٹھاکر جی کے اخراجات پورے ہوسکین اور پوجا پاٹ ہوتا رہے، اچھنیرا کے بازار کے چودھری کو معلوم ہو کہ وہ شری ٹھاکر جی کے لئے بیس سیر غلہ ادا کرے، بیراگی کو اس حق سے محروم نہ کیا جائے، تاریخ ۴ رمضان ۱۱۳۹ھ ف

ایک اور سند شہاب الدین خان کی ہے جو اُس نے چنچواد کے مشہور گنیش مندر کے اخراجات کے لئے عطا کی تھی اس سند کے لئے قول نامہ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے وہ یہ ہے:-

"یہ قول نامہ چنچواد کسبہ ریہ گوشائین کے لئے پرگنہ پونا کے بارہ مین ہے جس کے لئے خان حکمت نہاد خان نے اطلاع دے کر جاگیر کے ایک قول کی درخواست کی ہے، اس لئے یہ تحریر دیجاتی ہے کہ وہ اس گاؤن کے لوگون کے ساتھ رہے، اور اسکی زمین کو زرخیز اور بہتر بنائے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کو کوئی ضرر یا دبیب اٹھانی پڑیگی اس تولیت نامہ کی تاریخ ۱۱ ذیقعدہ ۱۱۲۶ھ ہے"،

الہ آباد مین اسی طرح کے دو فرامین ہین، ایک مشہور مندر مہیشور ناتھ کے پجاریون کے نام ہے جسکو اورنگزیب نے گیا تھا

اورنگزیب نے جنگبون کے لڑکے گردھر ساکن موضع بستی، ضلع بنارس جدو مشرا ساکن ہیش پور پرگنہ حویلی اور پنڈت بلبھدر مصرا، کو بھی جاگیرین دین، یہ سب کے سب مندرون کے پجاری تھے، اورنگزیب نے ملتان کے مندر توت لامی کے لئے مشرا کلیان داس کو سو روپیے کا وظیفہ عطا کیا، یہ مندر اب تک موجود ہے،

سلطان محمد مراد بخش نے ۱۰۶۵ھ مین حکم دیا کہ اوجین کے گدام سے مہاکل کے مندر کی روشنی کے لئے چار سیر گھی روزانہ دیا جائے،

بہت سے مسلمان حکمران علوم و فنون کے سرپرست رہے ہین جنھون نے صرف فارسی اور عربی زبان کو فروغ دیا، بلکہ سنسکرت زبان اور ہندوستان کے لٹریچر اور سائنس کی بھی سرپرستی کی، انھون نے ہندوستان مین علوم و فنون کو جو ترقی دی، اُن کو یہان مختصراً بھی لکھنا ممکن نہین، شاہانہ سرپرستی مین سنسکرت کی متعدد کتابین فارسی اور عربی زبانون مین ترجمہ کی گئین، بہت سے مسلمان حکمرانون نے خود سنسکرت زبان کی تحصیل اور اُن مین سے بعض نے سنسکرت کی کتابون کو ترجمہ بھی اس غرض سے کیا کہ ہندوؤن کے علوم کے خزانے مسلمانون تک بھی پہنچ جائین، انھون نے دوسرون کو اس زبان کی تحصیل کی ترغیب دی، ہندو طلبہ کے تعلیمی نصاب مین سنسکرت زبان بھی ہوتی تھی، غرض سنسکرت زبان کی سرپرستی ہر ممکن طریقہ سے کی گئی، ڈاکٹر جیمز اچ کرینس نے اسلامی ہند مین تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ

مسلمان بادشاہ اور شہزادے ہندو کلچر کا بھی دلچسپی سے مطالعہ کیا کرتے تھے، مسلمانون کی تعلیم مین ہندو ادب کا اختلاط اسی طرح ہو گیا تھا جس طرح مغل مصوری راجپوتون کی مصوری سے مل جل گئی تھی ہندوؤن کے ادب العالیہ کا فارسی مین ترجمہ کیا گیا، اور رفتہ رفتہ فارسی کلچر سے ہندو کلچر متاثر ہوتا گیا،

پرتگالی مورخ فاریا سوزا لکھتا ہے کہ

"ہندو مسلمان ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے تھے مسلمان بادشاہ ہندوؤن کو بڑے بڑے عہدون

پر مامور کرتے اور ان کو اعلیٰ منصب عطا کرتے تھے" اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی، ہندو اپنے مذہبی فرائض اور مراسم کو ادا کرنے میں بالکل آزاد تھے اور مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا بڑا احترام کرتے تھے،

سرالفرڈ لائل ایشیاٹک اسٹڈیز میں رقمطراز ہیں کہ مسلمان حکمران ہندوستان کو اپنے مذہب کے مطابق بنانے کے تخیل سے اتنے دور تھے کہ کبھی مسلمانوں نے بھی اسکی کوشش نہیں کی کہ ملکی نظم و نسق کے بڑے بڑے عہدے صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص رہیں،

اورنگزیب نے بہت سے لائق ہندوؤں کی ملازمت کے لئے شاہجہان کے پاس سفارش لکھی، جب بیجاپور کے دیوان کی جگہ خالی ہوئی، تو اورنگزیب نے ایک راجپوت عہدیدار رام کرن کی سفارش کی، بعض اسباب کی بنا پر شاہ جہان نے اس سفارش کو قبول نہیں کیا، تو اورنگزیب نے پھر شاہجہان کو لکھا کہ اس جگہ کے لئے کوئی اس سے بہتر آدمی مل نہیں سکتا، اورنگزیب کی سفارشوں کی اور مثالیں بھی رقعات عالمگیری اور آداب عالمگیری میں مل سکتی ہیں،

عام طور سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ اورنگزیب نے ہندوؤں سے زبردستی اسلام قبول کرایا لیکن ہم یہاں پر ایک عجیب و غریب واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جس سے اورنگزیب کے رجحانات کا اندازہ ہوگا، شاہجہان نے ونڈھیرا کے راجہ اندرامن کو حدود حکمی کی بنا پر قید کر دیا، جب اورنگزیب دکن کا صوبیدار مقرر ہوا تو اس نے راجہ کی رہائی کے لئے شاہجہان سے سفارش کی لیکن شاہجہان اندرامن سے بہت زیادہ برہم اور ناخوش تھا، اس لئے اورنگزیب کی سفارش قبول نہیں کی اور اس کو لکھ بھیجا کہ اندرامن نے بار بار تکلیف پہنچائی ہے وہ صرف اس شرط پر رہا کیا جا سکتا ہے کہ اسلام قبول کرے، اس پر اورنگزیب نے سخت احتجاج کیا اور شاہجہان کو لکھا کہ اس شرط پر عمل نہیں کیا جا سکتا، یہ بہت ہی غیر مدبرانہ اور کوتاہ اندیشانہ فعل ہوگا، اسکی رہائی خود اسی کے شرائط کے مطابق ہونی چاہئے، اس سلسلہ میں اس نے شاہجہان کے وزیر اعظم کو ایک رقعہ لکھا جو آداب عالمگیری میں موجود ہے،

" ص ع "

ادبیات

فطرت اور مومن

از

جناب شہ زور کاشمیری

لحد کے خواب کا ہے سلسلہ اسکی گران خوابی
جو فطرت کے تقاضون سے کرے دانستہ سرتابی

ہے فطرت ایک مجموعہ قوانینِ الٰہی کا
ازل سے جن کا پیرو ہے جہانِ خاکی و آبی

بصارت ہے تو فطرت کا صحیفہ پڑھ کبھی تو بھی
بصیرت کے لئے کافی ہے اک جگنو کی شب تابی

صلاحیت ہے ہر ذرہ مین صحراون پہ چھا جانے کی
ہر اک قطرے کی فطرت مین ہے طغیانی و سیلابی

دلِ ظلمت مین پوشیدہ ہین صدہا چاند اور سورج
نہان ہر خار کے دامن مین ہے جنت کی شادابی

کتابِ فطرتِ رنگین کے اوراق پریشان ہین
دلِ رومی، دماغِ طوسی و چشمانِ فارابی

ہے فطرت ایک دستور العمل مردِ مجاہد کا
ہے جس کا مقصدِ ہستی جہانبانی جہانتابی

ہے فطرت کی سی گیرائی نگاہِ مردِ مومن مین
ملی ہے اُس کے دل کو فطرۃً تقدیرِ سیمابی

ہے گر نغمات سے معمور اک سازِ ازل فطرت
تو مومن کی نظر اُس کے لئے ہے ضربِ مضرابی

ہے مومن ایک بحرِ بیکران رحمتِ یزدان
مسلمانی ہے صلح و امن کے کشتون کی سیرابی

بجز علم الیقین ممکن نہین ادراک فطرت کا
انھی انوار کی ہو تیرے دل مین بھی ضیا تابی

بجھا نے دی یقین کو عقل کی افسردہ شمعیں سب طلوع مہر کا مژدہ ہی تارون کی تنک تابی

تری تخئیل پر ہو باز در اسرار فطرت کا

عطا تجھکو کرے خالق دل مومن کی بے تابی

غزل

از

جناب سید شاہ ولی الرحمن و آلی ڈپٹی کلکٹر آرہ

عقل الجھ کے رہگئی وہم کے تار و پود مین
حسن کی دیکھ لی جھلک عشق نے ہر وجود مین

کعبہ ہو یا کہ بتکدہ جھک گئی خود جبین شوق
کس کو دماغ امتیاز بے خودی سجود مین

ڈھونڈھ چکا ہون جو بجو دشت بدشت کو بکو
ایک بھی ہم نفس نہین کارگہ وجود مین

جن کے ہین دل جنون بدوش کان ہین جنکے حق نیوش
پاتے ہین کیف سرمدی نغمۂ چنگ و عود مین

کافر عشق کے لئے عین حرم ہے دیر بھی
گو ہے در بتان پہ سر محو ہی دل درود مین

کاکل عطر بیز کی دوش پہ چھا گئی گھٹا
ڈوب گئی فضاے جان نکہت مشک و عود مین

جان ہو وقف جستجو دل ہو شہید آرزو
امن و سکون نہ کر تلاش معرکۂ وجود مین

کعبۂ آرزو ہوا ہر نفس حیات عشق
مل گیا نافۂ مراد کاکل مشک سود مین

مرگ بھی عین زیست ہی گرم سفر ہی گر حیات
زیست بھی عین مرگ ہی منزل نفث و بود مین

عشق ہی حسن کا جواب حسن ہی عشق کا جواب
حسن ازل کی ہی نمود عشق کی ہر نمود مین

مسلک عشق مین وآلی یاس و امید ہے حرام

دل کو رہین غم نہ کر فکر زیان و سود مین

باب التقریظ والانتقاد

معینُ الارواح

یعنی

حضرت خواجہ معینُ الدین چشتی کی ایک نئی سوانح عمری

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے علیگ رفیق دارالمصنفین

(۲)

اب ایک علٰحدہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام تذکرہ نویسوں کے لکھنے کے بموجب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ میں ہندوستان تشریف لائے تو اس وقت ان کا سن شریف کیا تھا؟

معین الارواح کے فاضل مولف نے حضرت خواجہ کا سال ولادت ۵۳۰ھ قرار دیا ہے لیکن اس سنہ کو صحیح تسلیم کرنے میں کچھ تامل اس لئے ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے حضرت خواجہ کے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا سال ولادت ۵۲۶ھ لکھا ہے، (خزینۃ الاصفیا ص ۲۵۷ جلد اول) گمان ہوتا ہے کہ مرشد و مرید میں سن و سال کا تفاوت کچھ اور زیادہ ہوگا، فاضل مولف لکھتے ہیں کہ اکثر مورخین نے حضرت خواجہ کا سال ولادت ۵۳۷ھ لکھا ہے، (ص ۵) اگر حضرت خواجہ عثمان ہارونی کی تاریخ ولادت ۵۲۶ھ صحیح تسلیم کر لی جائے، تو اُن کے مرید حضرت خواجہ کا سال ولادت

۵۳۰ھ تسلیم کرنے مین زیادہ تامل نہین ہوتا ہے اب اگر ہم حضرت خواجہ کی ولادت باسعادت کی تاریخ ۵۳۰ھ قرار دیتے ہین، تو ۵۶۱ھ مین ہندوستان آنیکے وقت اُن کی عمر اکتیس سال کی ہوتی ہے اور اور اگر ۵۳۷ھ کو صحیح سمجھتے ہین، تو ہندوستان مین اُن نے ورود مسعود کے وقت ان کی عمر چوبیس سال کی ہوتی ہے، قیاس کہتا ہے کہ اکتیس یا چوبیس سال کی اتنی کم عمری مین ہندوستان آکر مستقل سکونت اختیار نہ فرمائی ہو، خصوصاً جب یہ معلوم ہو کہ مرشد کی خدمت اور پھر سیاحت مین کافی مدت گذاری، ایک اور چیز یہ بھی قابلِ غور ہے کہ وہ اگر ۵۶۱ھ مین اجمیر آئے، تو گویا اجمیر کے ہندو حکمران سے ۵۸۸ھ یعنی شہاب الدین غوری کے حملہ تک متصادم رہے، بعض تذکرہ نویسون نے لکھا ہو ۵۶۱ھ مین اجمیر آئے تو پرتھوی راج کو اجمیر مین اُن کا قیام گران گذرا، لیکن یہ صحیح نہین معلوم ہوتا کیونکہ تاریخون مین پرتھوی راج کی تخت نشینی کی تاریخ ۵۷۱ھ ہے[1] اور تھوڑی دیر کیلئے اگر تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت خواجہ کے اجمیر مین آنے کے دس برس کے بعد پرتھوی راج گدی پر بیٹھا اور اپنی تخت نشینی کے بعد سے حضرت خواجہ کے قیام مین مزاحمت شروع کی، تو اس کی مطلق العنانی سے یہ توقع نہین ہوسکتی تھی کہ ۵۷۱ھ سے ۵۸۸ھ یعنی سترہ برس تک اُن کے تصادم کو اپنی راجدھانی مین برداشت کرتا رہا

---

[1] عاجز راقم نے اپنی حقیر تالیف بزم صوفیہ مین تذکرہ نویسون پر بھروسہ کرکے یہ لکھدیا ہے کہ

"دہلی سے اجمیر گئے، جہان دسوین محرم ۵۶۱ھ مین نزول اجلال فرمایا، اور یہین آخر وقت تک قیام رہا۔ اس زمانہ مین اجمیر اور دہلی کا حکمران چوہان خاندان کا مشہور راجپوت راجہ پتھورا تھا"

اب مزید تحقیقات کے بعد یہ بیان نظر ثانی کا محتاج ہوگیا ہے، بزم صوفیہ مین ایک اور تسامح ہوگیا ہے، ص ۱۱۴ پر محمد یادگار کو اصفہان کا حاکم لکھدیا گیا ہے، اس سلسلہ مین بھی تذکرہ نویسون مین کچھ اختلاف ہو خزینۃ الاصفیاء (جلد اص ۲۵۸) مین ہو کہ محمد یادگار ہرات کا حاکم تھا، لیکن زیادہ تر تذکرہ نویسون نے اسکو سبزوار کا حاکم بتایا ہو اور یہی صحیح ہے،

اب یا تو ہم یہ تسلیم کر لیں کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ میں اجمیر آکر پھر لوٹ گئے، لیکن جب اس کے لئے کوئی قطعی شہادت نہیں ملتی ہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ۵۶۱ھ کی تاریخ غلط لکھی ہے، انھوں نے شہاب الدین غوری کے حملہ سے کچھ ہی پہلے یعنی ۵۸۷ھ میں اجمیر میں نزول اجلال فرمایا ہو، پتھورا راج نے اُن کو تکلیف پہنچائی تو اُن کی دعاؤں سے شہاب الدین غوری ۵۸۸ھ میں حملہ آور ہوا، اس خیال کو تقویت اس سے بھی پہنچتی ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کی تاریخ خود معین الارواح کے فاضل مؤلف نے ۵۸۶ھ بتائی ہے، ابھی ذکر آچکا ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین اپنے مرشد کے ساتھ اجمیر آئے،

اب یہ مان لیا جائے کہ حضرت خواجہ اجمیر پہلی دفعہ ۵۸۰ھ میں آئے تو اُن کے ۵۳۰ھ کے سنہ پیدائش کے مطابق ان کی عمر اس وقت پچاس سال کی ہوتی ہے، لیکن تذکرہ نویس لکھتے ہیں، حضرت خواجہ کو جب اپنے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی سے خرقۂ خلافت ملا تو اس وقت ان کا سن شریف باون برس کا تھا، تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۵۶۱ھ میں اجمیر آکر پھر اپنے مرشد کے پاس گئے، لیکن ابھی بحث ہو چکی ہے کہ یہ ایک متنازعہ واقعہ ہے، اب اگر حضرت خواجہ کی ولادت باسعادت کی تاریخ ۵۳۰ھ میں مان لیں تو ۵۸۷ھ میں اجمیر آنے کے وقت ان کی عمر ستاون برس کی ہوتی ہے، یعنی وہ اپنے مرشد سے خرقۂ خلافت لے کر اجمیر تشریف لائے،

لیکن یہ ساری بحث گنجلک ہوتی جا رہی ہے، اور ہم کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے قاصر ہیں، حضرت خواجہ کے حالات قلمبند کرنے میں تذکرہ نویسوں نے کچھ ایسی مبہم، غیر واضح مختلف اور متضاد باتیں لکھی ہیں کہ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے، تو ایک لا متناہی بحث چھڑ جاتی ہے، اور کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلتا ہے

ایک آدھ مثال اور ملاحظہ ہو، سلطان شمس الدین التمش کو کسی تذکرہ نویس نے حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید لکھا ہے، اور کسی نے حضرت خواجہ معین الدین کا اور کسی نے حضرت خواجہ بختیار کاکی کا مرید بتایا ہے

ہارونی کا مرید لکھا ہے، اور کسی نے حضرت خواجہ معین الدین اور کسی نے حضرت خواجہ بختیار کاکی کا مرید بتایا ہے، حضرت خواجہ بختیار کاکی کے ملفوظات فوائد السالکین میں سلطان التمش کا ذکر بار بار آتا ہے، اور اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان کو حضرت بختیار کاکی سے ارادت تھی، چنانچہ ایک موقع پر حضرت بختیار کاکی فرماتے ہیں :-

"ایک رات وہ یعنی التمش میرے پاس آیا اور میرا پاؤں پکڑ لیا، میں نے کہا کہ مجھکو کب تک تکلیف پہنچاتے رہوگے، جو ضرورت ہو بیان کرو، اس نے کہا رب العزت مجھ کو مملکت تو دی ہے لیکن قیامت کے روز جب مجھ سے اس کی بازپرس ہوگی اور اس کا حساب دینا ہوگا، تو اس وقت بھی آپ مجھے نہ چھوڑیں، وہ اس وقت تک واپس نہ گیا جب تک کہ میں نے اس کی بات قبول نہ کرلی۔ (فوائد السالکین ص ۲۹)

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سلطان التمش حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید تھا تو چشتیہ سلسلہ کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ گمان نہیں ہوتا کہ سلطان التمش کو اپنے مرشد کے مرید سے والہانہ عقیدت ہوئی تھی، خزینۃ الاصفیا کے مؤلف نے واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ

"او نیز یعنی سلطان التمش رحم دل و عادل و سلطان کامل و مکمل از خلفائے نامدار و مریدان باوقار خواجہ قطب الدین بختیار است" (جلد اول ص ۲۷۶)

لیکن ہمارے فاضل مؤلف جناب محمد خادم حسن زبیری صاحب نے حضرت خواجہ معین الدین کی ایک تصنیف کنج اسرار کی سند پر سلطان التمش کو حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید بتایا ہے (ص ۶۰) مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کنج اسرار یا اور دوسری کتابیں جن کو فاضل مؤلف نے حضرت خواجہ کی طرف منسوب کیا ہے، ان کی تصانیف تسلیم بھی کی جاسکتی ہیں ؟

خواجگان چشت کی تصانیف کے متعلق حضرت خواجہ نصیر الدین کا بیان خیر المجالس میں اس طرح ہے :-

"میرے حضرت پیر و مرشد جناب سلطان الاولیاء قدس سرہ العزیز فرماتے تھے میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی، اس واسطے کہ خدمت شیخ الاسلام حضرت فرید الدین اور شیخ الاسلام حضرت مولینا قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور باقی خواجگان چشت وغیرہ مشائخ جو داخل ہمارے شجرہ میں ہیں کسی نے کوئی تصنیف نہیں کی ہے میں (یعنی مرتب خیر المجالس) نے عرض کی کہ فوائد الفواد میں ہے کہ ایک شخص نے جناب سلطان الاولیاء قدس سرہ العزیز کی خدمت میں عرض کی میں نے ایک معتبر سے سنا ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے آپ کی تصنیف سے ایک کتاب دیکھی ہے، حضرت سلطان الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس نے غلطی کی، میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے، اس واسطے کہ ہمارے خواجگان نے کوئی تصنیف نہیں کی، یہ سن کر حضرت خواجہ ذکرہ اللہ تعالیٰ بالخیر نے ارشاد کیا کہ واقعی ہمارے حضرت سلطان الاولیاء نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی، پھر میں (یعنی مرتب خیر المجالس) نے عرض کی کہ یہ جو رسالے اس وقت میں دستیاب ہوئے ہیں، ملفوظات حضرت شیخ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور ملفوظات حضرت شیخ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے حضرت کے وقت میں ظاہر نہ ہوئے تھے، خواجہ ذکرہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہ تھے، اگر ان حضرات کی تصنیف سے ہوتے، تو بڑے حضرت ذکر اُن کا فرماتے، اور دستیاب ہوتے"

(اردو ترجمہ سیر المجالس ص ۴۳-۳۵، ترجمہ کی عبارت ہو بہو نقل کر دی گئی ہے)

خیر المجالس کی مذکورۂ بالا روایت ہمارے فاضل مؤلف جناب محمد خادم حسن صاحب زبیری کی نظر سے گذری ہے لیکن ان کو اس بیان کے صحیح تسلیم کرنے میں تامل ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"ہر چند کہ ان ملفوظات سے مولانا حمید قلندر نے انکار کیا ہے، اور خیر المجالس (ملفوظات حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی مرتبہ مولانا حمید قلندر) میں صاف لکھا ہے کہ یہ ملفوظات آنحضرت کے نہیں ہیں، کیونکہ اُن میں بہت سی ایسی باتیں ہیں، جو آنحضرت کے علم وارشاد

کے مناسب نہیں ہیں، نیز ان حضرات کی کوئی تصنیف نہیں، مگر افضل الفوائد (جس میں حضرت
سلطان المشائخ کے ملفوظات مرتبہ حضرت امیر خسرو) میں مرقوم ہے کہ خواجہ بزرگ اور حضرت
سلطان المشائخ جو کچھ اپنے پیرو مرشد سے سنتے تھے، وہ لکھ لیتے تھے، ان دونوں روایات
کے اختلاف میں اس طرح تطبیق ہو جاتی ہے کہ سلطان المشائخ کے زمانہ تک یہ رسالے بہ شکل
رسالہ جات ظاہر نہیں ہوئے تھے، بلکہ تبرکاً شجرہ کے ساتھ تھے، اور جزو شجرہ سمجھے جاتے تھے،
نہ کہ رسالہ جات، علاوہ ازیں کسی دوسرے شخص کو ان حضرات کے ملفوظات مرتب کرنے کی
کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوئی، غیر متعلق شخص اتنی محنت کر کے یہ رسالے کیوں مرتب کرتا،
نیز حضرت امیر خسرو کے بیان کو کسی طرح غیر معتبر نہیں کہا جا سکتا، (صفحہ ۲۴)

عاجز راقم کے سامنے اس وقت افضل الفوائد نہیں، فاضل مؤلف اگر امیر خسرو کی وہ فارسی عبارت
نقل کر دیتے جس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ اپنے مرشد کے ملفوظات لکھ لیتے
تھے، تو بہتر ہوتا، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ حضرت سلطان المشائخ کے جانشین تھے، اس لئے انکے
قول کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس کے علاوہ حضرت امیر خسرو کی رائے تو صرف اپنے مرشد کے
متعلق ہے، اُس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کے مرشد اور دوسرے خواجگان
چشت نے کتابیں لکھیں اور ان کی جو متعدد تصانیف بازاروں میں بکتی ہیں، وہ انہی کی ہیں،

فاضل مؤلف نے گنج اسرار کے علاوہ حضرت خواجہ کی تصانیف میں حدیث المعارف اور رسالہ
موجودیہ (شاید رسالہ وجودیہ مراد ہو) کا ذکر کیا ہے، یہ دونوں کتابیں کسی کی نظر سے نہیں گذریں،
صرف اُن کے نام سے منسوب ہیں، علمی دنیا میں ایسی مثالیں سینکڑوں ملیں گی کہ ایک تصنیف مالی
فوائد اور دنیاوی اغراض کی خاطر دوسرے کے نام سے منسوب کر دی گئی ہے، حضرت خواجہ کی عظیم المرتبت
شخصیت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مجاوروں نے کوئی تصنیف اُن کے نام سے منسوب کر دی ہو تو

کوئی تعجب انگیز بات نہیں ،"

فاضل مؤلف کا یہ بھی خیال ہے کہ دیوان معین جو عام طور سے بازاروں میں بکتا ہے ، وہ حضرت خواجہ ہی کا دیوان ہے ، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ

"ہر چند کہ ایک گروہ دیوان معین کو معین الدین کاشفی کی تصنیف کہتا ہے آپ کا نتیجۂ فکر نہیں مانتا ، مگر شوکتِ کلام زبان حال سے کہہ رہی ہے یہ معمولی عارف کا کلام نہیں ، بلکہ اس میں جن اعلیٰ مقامات معرفت نکات تصوف اور فنائے تامہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ آپ ہی جیسے عالی مرتبت اہل اللہ فرما سکتے ہیں" (ص ۹۵)

آگے چل کر پھر رقمطراز ہیں :-

"ہماری رائے میں موجودہ دیوان آپ ہی کے جذباتِ صادقہ ، فکر بلند اور اعلیٰ ترین سیر جبروتی و ملکوتی اور لاہوتی کا نتیجہ مبارکہ ہے ، منکرینِ دیوان نے بلا کسی دلیل کے صرف آپ کا ہمنام ہونے کی وجہ سے اس دیوان کو معین الدین کاشفی کا دیوان بتایا ہے ، مگر اسکی تائید میں کوئی قابلِ قبول ثبوت کسی کتاب میں ہماری نظر سے نہیں گذرا ، اس لئے ہم اس دیوان کو غریب نواز کی نسبت سے محروم نہیں کر سکتے" (صفحہ ۹۵)

شاید فاضل مؤلف کی نظر سے پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کا مقالہ "دیوان حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی چشتی اجمیری" جو رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا نہیں گذرا ۔ اگر یہ محققانہ اور مدلل مضمون اُن کی نظر سے گذرا ہوتا ، تو وہ ہرگز یہ تحریر نہ فرماتے کہ کوئی قابلِ قبول ثبوت میری نظر سے نہیں گذرا ، ابھی چند سال پہلے پروفیسر عبد الغنی کی ایک انگریزی کتاب "پری مغل پرشین اِن ہندوستان" شائع ہوئی ہے ، اس میں پروفیسر موصوف نے غالباً حضرت خواجہ معین الدین کی ذات سے غایت عقیدتمندی کے اظہار میں دیوان معین کو انہی کا دیوان سمجھ کر اُن کو حافظ سے زیادہ بہتر اور

زیادہ شیرین کلام شاعر ثابت کیا تھا، پروفیسر موصوف کی اس کتاب پر پروفیسر شیرانی مرحوم نے رسالہ اردو کے شمارہ جنوری ۱۹۲۳ء میں بڑی سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ تمام دنیا کے برخلاف نہ صرف خواجہ صاحب کو شاعر ہی ثابت کر دیا، بلکہ پورے جوش و خروش کے ساتھ ان کی شاعری کو حافظ سے بھی بڑھا دیا ہے ع

آرزو خوب است اما این قدر ہا خوب نیست

پروفیسر عبد الغنی نے اس تنقید کا جواب دینے کی کوشش کی، اور اپنا جواب ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا، جس کے ٹائٹل پر انھوں نے بعض غلط فہمیوں کی بنیاد پر "ضمیمہ رسالہ معارف" لکھدیا ہے حالانکہ ان کا یہ لکھنا بالکل درست نہ تھا، اس رسالہ میں انھوں نے حضرت خواجہ کو بعض تذکرہ نویسوں کے حوالہ سے شاعر تو ثابت کر دیا، لیکن اُن کے صاحبِ دیوان ہونے پر اصرار نہیں کیا ہے، اس رسالہ کا جواب لجواب اورینٹل کالج میگزین کے ۴۹ء و ۵۰ء کے مختلف شماروں میں پروفیسر ابراہیم ڈار اسماعیل کالج بمبئی نے دیا، اور ابھی اگست ۵۰ء کے رسالہ اردو میں بھی ان کا ایک مقالہ "دیوان خواجہ معین الدین چشتیؒ" کے عنوان سے شائع ہوا، ہے، پروفیسر محمود شیرانی مرحوم اور پروفیسر ابراہیم ڈار نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا معین الدین فراہی (کاشفی نہیں) کی تصانیف معارج النبوۃ اور تفسیر سورۂ فاتحہ میں بہت سی ایسی غزلیں ہیں، جو دیوان معین میں پائی جاتی ہیں، اس لئے دیوان معین درصل مولانا معین الدین فراہی کے کلام کا انتخاب ہے معین الارواح کے فاضل مؤلف اگر ان تحقیقات سے باخبر ہوتے تو دیوان معین کو حضرت خواجہ کا دیوان تسلیم کرنے پر اصرار نہ کرتے، اور یہ اصرار اس لئے بھی بے جا ہے کہ حضرت خواجہ کا صاحب دیوان ہونا ان کا کوئی وصف یا کمال نہیں، اور نہ اُن کی شاعری اُن کے لئے وجہ امتیاز ہے،

معین الارواح کے حصۂ دوم میں سیرۃ مقدسہ کے عنوان سے حضرت خواجہ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ان کی تعلیمات کو بھی واضح طور پر پیش کیا گیا ہے، یہ تعلیمات حضرت خواجہ کے ملفوظات سے مرتب کی گئی ہیں، لیکن فاضل مؤلف نے جس تلاش و جستجو سے اپنی کتاب لکھی ہے، اسی محنت و کاوش

کے ساتھ یہ بھی دکھانے کی کوشش کرتے کہ ان ملفوظات میں سے کون صحیح اور کون الحاقی ہے تو یہ ان کا بڑا علمی کارنامہ ہوتا، کیونکہ خواجگان چشت کے ملفوظات کے مجموعوں کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ بعض ملفوظات ان بزرگان دین کے ہرگز نہیں ہو سکتے، مثال کے طور پر حسب ذیل ملفوظ ملاحظہ ہو جس کو فاضل مؤلف نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۶ پر نقل کیا ہے،

"حضرت قطب الاقطابؒ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں شیخ الاسلام حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہٗ کی خدمت اقدس میں حاضر تھا، اور اہل صفہ بھی موجود تھے، اولیاء اللہ کا تذکرہ ہو رہا تھا، اس درمیان میں ایک شخص بیعت ہونے کے لئے حاضر خدمت ہوا، اور آپ کے قدموں پر سر رکھا، غریب نواز نے فرمایا بیٹھو، اس نے کہا میں مرید ہونے کے لئے حاضر ہوا ہوں آپ اس وقت اپنے حال میں تھے، فرمایا اس شرط پر مرید ہو سکتے ہو کہ ایک مرتبہ کہو لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ چونکہ وہ راسخ العقیدۃ تھا، اس نے فوراً اس طرح کہا، غریب نواز نے اس کو مرید کرنے کیلئے ہاتھ بڑھایا، اور خلعت خاص سے سرفراز فرمایا،

یہ روایت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مجموعہ ملفوظات فوائد السالکین سے لی گئی ہے لیکن یہ روایت کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتی، گو فاضل مؤلف نے اس کی مدافعت میں یہ تاویل کی ہے، کہ

"اگرچہ سرسری نظر سے دیکھنے میں مذکورہ بالا الفاظ شرعاً قابل اعتراض معلوم ہوتے ہیں، مگر لغوی معنی کے پیش نظر ہرگز قابل اعتراض نہیں، نیز صاحبان حال نے اس قسم کے کلمات اکثر فرمائے ہیں، چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید البغدادی اور حضرت بایزید بسطامی وغیرہ کے حالات میں بھی ایسے واقعات موجود ہیں، بلکہ خود سرور عالمؐ نے بھی طواف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سرگوشی کرنے کے موقعہ پر ارشاد فرمایا، "میں نے ان سے سرگوشی نہیں کی، بلکہ خدا نے کی"، نیز ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے کہ "جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کو دیکھا"

اس تاویل کی حیثیت عذر گناہ بدتر از گناہ سے زیادہ نہین، اگر ہم مذکورہ بالا ملفوظات کو الحاقی سمجھ لین، تو پھر کسی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہین رہتی، اسی قسم کے ملفوظات کے متعلق سیر العارفین مین ہے،

ایک شخص نے حضرت نصیر الدین محمود دہلی سے عرض کیا کہ مین نے خواجہ قطب الحق والدین قدس سرہٗ کے ملفوظات مین ایسا کچھ لکھا ہوا دیکھا ہے آپنے جواب مین فرمایا کہ بالکل غلط ہے، مین نے بچشم خود دیکھا ہے، حاشا للہ یہ کلام ان کا نہین ہے، اکثر غلط غلط کلمات الحاقی ہین جو مجاوروں نے بڑھا دئے ہین کسی طرح قطب صاحب قدس سرہٗ کے حالی و اعمال کے موافق نہین ہین، (جلد ۲ ص ۶۲)

اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کے بعض ملفوظات الحاقی ہین، جو اُن کی علمی اور نظری تعلیمات کے بالکل منافی ہین،

کتاب کے حصہ سوم مین حضرت خواجہ کی درگاہ اور اُن کے عُرس کے مراسم کی تفصیلات درج ہین، حصہ چہارم مین حلقۂ ارادت کے عنوان سے گذشتہ اور موجودہ عہد کے ان اکابر کا ذکر ہے جس کو حضرت خواجہ سے عقیدت رہی، حصہ پنجم مین حضرت خواجہ کی درگاہ شریف کے گذشتہ اور موجودہ درباریون کا ذکر ہے حصہ ششم مین اجمیر کی مختصر تاریخ ہے، کتاب کے آخری تین حصے اجمیر شریف کے زائرین کے مطالعہ کے لئے مفید ہین

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب بڑی قابلِ قدر ہے کہ اس مین حضرت خواجہ سے متعلق زیادہ سے زیادہ لٹریچر اکٹھا کر دیا گیا ہے، اور آیندہ جب کوئی اہلِ قلم حضرت خواجہ کی سوانحعمری سلیقہ سے مرتب کرنے کی کوشش کریگا تو یہ کتاب بلاشبہہ بہت مفید اور معاون ہوگی،

مطبوعات جدید

یادِ ایام از نواب سر حافظ محمد احمد سعید خان رئیس چھتاری تقطیع بڑی ضخامت ۲۵۰ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت چار روپے پتہ غالباً راحت منزل علی گڑھ سے ملے گی،

ہمارے صوبہ کے رؤسا میں خاندانی امارت و وجاہت، ذاتی قابلیت و صلاحیت، تدبر و ہوشمندی، اخلاق و سیرت اور دینداری میں نواب سر محمد احمد سعید خان رئیس چھتاری کا ممتاز درجہ ہے، اُن کی صلاحیت و سلامت روی کی بدولت کونسل کی ممبری سے لے کر وزارت، ہوم ممبری، گورنری اور ریاست حیدرآباد کی وزارتِ عظمیٰ تک کے اعزاز ان کو حاصل ہوئے، قومی اور سیاسی کاموں میں بھی ان کا حصہ رہا ہے، جس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے، زیرِ نظر کتاب سے اُن کی نئی تصنیفی صلاحیت کا علم ہوا، آپ بیتی بڑی سبق آموز ہوتی ہے، لیکن اردو میں خود نوشت سوانح عمریوں کا بالکل رواج نہیں ہے، اور سر سید رضا علی مرحوم کے اعمال نامہ کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر خود نوشت سوانح عمری موجود نہیں ہے، یادِ ایام اردو میں دوسری کتاب ہے، اس کے دو پہلو یا دو حصے ہیں، ایک صاحب سوانح کے نجی اور ذاتی حالات دوسرے اُن کی قومی و سیاسی زندگی، ذاتی حالات میں خاندان، بچپن، تعلیم و تربیت، انتظامِ ریاست اور حکام کے تعلقات وغیرہ کے حالات ہیں، جو اگرچہ مختصر ہیں لیکن دلچسپی سے خالی نہیں، اور اُن سے اس دور کے رؤسا کی سوسائٹی اور ان کے مذاق و مشاغل پر روشنی پڑتی ہے، کتاب کا اصل حصہ مصنف کی سیاسی و قومی زندگی کا ہے، اُن کی سیاسی زندگی چیمسفورڈ اصلاحات کے زمانہ یعنی

سنہ ۱۹۱۹ء سے شروع ہوتی ہے اور کانگریس کی وزارتون کے قیام کے زمانہ سنہ ۱۹۳۶ء تک قائم رہتی ہے، اس درمیان مین کونسل کے ممبر، صوبے کے وزیر، ہوم ممبر اور گورنر ہوئے، اور وقتاً فوقتاً قومی معاملات مین بھی حصہ لیتے رہے، اسلیے حکومت اور ملکی سیاست دونون سے انکا واسطہ رہا، یہی زمانہ ہندوستانی سیاست کے طوفان کا تھا، ہماری قومی، ملکی اور سیاسی مسائل اسی زمانہ مین پیدا ہوئے، اسی زمانہ مین کانگریس کی اور خلافت کی تحریکین شروع اور ختم ہوئین، گورنمنٹ کے ساتھ آئینی اور غیر آئینی معرکے ہوئے، سائمن کمیشن آیا، کانگریس اور لیگ کے اختلافات شروع ہوئے، ہندو مسلم مسائل نے شدت اختیار کی، زمیندارون اور کاشتکارون مین کشمکش پیدا ہوئی، غرض ایوان حکومت کے اندر اور باہر دونون جگہ بہت سے معاملات و مسائل چھڑے، مصنف کو چونکہ حکومت اور قومی سیاست دونون سے تعلق تھا اس لیے ان کو ان تمام معاملات سے سابقہ رہا، اس لیے اس کتاب مین مصنف کے سوانح کے سلسلہ مین اس دور کی عموماً اور صوبہ متحدہ کی خصوصاً پوری سیاسی سرگذشت آگئی ہے، یہ سارے واقعات ہم مین سے اکثرون کی نگاہون کے سامنے گذرے ہین، اس لیے اس کتاب کے مطالعہ سے وہ دور نگاہون کے سامنے آجاتا ہے، اور پڑھنے والا ان کو لطف و دلچسپی سے پڑھتا ہے، اس تاریخی سرگذشت کے ضمن مین اس دور کے ارکان حکومت اور قومی رہنماؤن کے حالات اور مختلف النوع دلچسپ واقعات بھی معرض تحریر مین آگئے ہین، غرض کتاب گوناگون معلومات اور دلچسپیون کا مجموعہ ہے، انداز تحریر دلکش اور شگفتہ ہے، کتاب بلکہ مصنف کا نمایان وصف جو اس کے صفحہ صفحہ سے نمایان ہے، انکی متانت و سنجیدگی، اعتدال و میانہ روی، اور تحریر کی شائستگی ہے، جس دور کے یہ حالات ہین وہ حکومت اور عوام کی کشمکش اور ہندو مسلم اختلاف کا دور تھا، اور بہت سے معاملات مین مصنف کی حیثیت فریق کی تھی، اس لیے اس کتاب مین جابجا اختلافی مسائل بھی آگئے ہین، لیکن ان کا قلم کہین بھی اعتدال و متانت کے جادہ سے نہین ہٹا ہے، اور مصنف کی شگفتگی تحریر، اور لطائف کی آمیزش نے ان خشک واقعات مین خاصی ادبی چاشنی پیدا کردی ہے، اس کے مطالعہ سے پہلے یہ خیال مین بھی نہ تھا کہ مصنف کا ادبی مذاق اتنا ستھرا ہے، اور وہ ایسی اچھی کتاب لکھ سکتے ہین، یہ کتاب اپنی گوناگون دلچسپیون کے لحاظ سے نہایت قابل قدر اور تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ

کے لائق ہے۔

دیارِ عرب میں چند ماہ از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۹۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت للعہ، پتہ مکتبہ چراغ راہ، نمبر ۹ لوٹیا بلڈنگ رام باغ روڈ، کراچی۔

مصنف نے اسلامی جماعت کی تبلیغ واشاعت کے لیے گذشتہ سال عراق ونجد وحجاز کا سفر کیا تھا، اور اس سلسلہ میں ان ملکوں کے تمام بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی، اور حج وزیارت سے بھی مشرف ہوئے مذکورہ بالا کتاب اس سفر کی علمی سوغات ہے، یہ سفر نامہ عام سفر ناموں سے کسی قدر مختلف ہے، مصنف کا ذوق خالص دینی اور علمی ہے، اور انھوں نے ایک مذہبی مقصد کے لیے سفر کیا تھا، اس لیے سیر وتفریح کے بجائے خصوصیت کے ساتھ وہ ہر مقام کے علما، اور دینی حلقہ سے زیادہ ملے، ان سے مذہبی معاملات ومسائل پر تبادلہ خیال کیا، مذہبی اور علمی اداروں کو دیکھا، مذہبی نقطہ نظر سے عقائد وخیالات واعمال کا جائزہ لیا، اسلیے اس سفر نامہ میں زیادہ تر ان ملکوں کے علمی ومذہبی حالات ہیں، اور مصنف نے بڑے درد لیکن بڑی سچائی اور جرأت کے ساتھ ان اسلامی ممالک کے مذہبی تساہل وتفریح پر تنقید کی ہے، اور جلالۃ الملک ملک حجاز کی شریعت پناہی کی حقیقت بھی پوری طرح واضح کی ہے، یہ اس سفر نامہ کا سب سے زیادہ قابل قدر پہلو ہے، اس سے ان ملکوں کی مذہبی وعلمی حالات کی تفصیل معلوم ہو جاتی ہے، ضمناً ان مقامات کے دوسرے حالات اور سفر کے مشاہدات وتجربات بھی آگئے ہیں، مصنف کا سنجیدہ علمی ومذہبی ذوق اور قلم کی پختگی پورے سفر نامہ میں نمایاں ہے، البتہ ان کے قدر شناسوں اور ہوا خواہوں میں انھی کے بقول ان کی "خشک وہابیت" ہمیشہ کھٹکی ہے، جو اس سفر نامہ میں بھی موجود ہے، لیکن ان میں دین کا سچا جذبہ ہے، اس لیے ان کا دل باطنی کیفیتوں سے خالی نہیں ہے، اور اس کے اثرات اس سفر نامے میں بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں، مثلاً مدینہ طیبہ کی حاضری کے سلسلہ میں لکھتے ہیں" وہابیت کی خشکی کے باوجود دل سینے رہتے" (ص ۳۰۵) اسی

سلسلہ مین آگے چل کر قصیدہ بردہ کے متعلق لکھتے ہین" بلا شبہ اس مین کہین کہین مقام نبوت سے تجاوز ہو گیا ہے لیکن اس کا ہر شعر درد و سوز مین ڈوبا ہے، راقم اپنی وہابیت کے باوجود اسے پڑھتا اور لطف اندوز ہوتا رہا" (ص ۱۳۸) مصنف مین دین کی سچی تڑپ ہے، اس لیے یقین ہے کہ انشاء اللہ آیندہ چلکر ان کی وہابیت کی خشکی مین محبت و روحانیت کی تری بھی پیدا ہو جائے گی، سفرنامہ اپنے مفید علمی و مذہبی معلومات کے لحاظ سے اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہے،

ملفوظات حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ | از جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تقطیع اوسط ضخامت ۱۶۸ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر،

قیمت: ۱۲ر، پتہ: کتب خانہ الفرقان گوین روڈ، لکھنؤ،

مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ہر لمحہ تبلیغ دین کے لیے وقف تھا، انکے تمام افکار و تصورات اور اعمال و اقوال کا مرکز تبلیغ تھا، ان کی کوئی مجلس اور کوئی گفتگو اس مقصد سے خالی نہ ہوتی تھی، اور انکی زبان فیض ترجمان سے ہر وقت مسلمانون مین دینی روح کی تجدید، اور اس کے احکام کی تبلیغ اس کے علمی و عملی طریقون اور اس کے جملہ متعلقات کا چشمۂ فیض جاری رہتا تھا، مولانا منظور صاحب نعمانی مولانا مرحوم کی زندگی ہی مین ان کی دینی دعوت کے سرگرم مبلغ تھے، اور اس سلسلہ مین ان کو وقتاً فوقتاً مولانا کی خدمت مین حاضری اور قیام کا اتفاق ہوتا تھا، اور وہ مسلمانون کی دینی تجدید اور دعوت و تبلیغ کے متعلق مولاناؒ کے ملفوظات قلم بند کرتے جاتے تھے، اب ان کو انھون نے افادۂ عام کی غرض سے شائع کر دیا ہے، ان ملفوظات مین اسلامی تعلیمات، اور اسلامی زندگی کے حصول کی پوری روح آگئی ہے، اور وہ اپنے گوناگون مذہبی و روحانی فوائد کے اعتبار سے مسلمانون کے ہر طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہین،

تردید حاضر و ناظر از مولانا عبد الرؤف خان صاحب رحمانی تقطیع بڑی ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ

کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۱۲ پتہ: مدرسہ جھنڈے نگر، بارمت گنج ضلع بستی،

بریلوی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علی الاطلاق حاضر و ناظر اور عالم الغیب مانتی ہے، مولوی عتیق الرحمن صاحب بریلوی نے اسکے اثبات میں کوئی رسالہ خیر الانبیاء لکھا تھا، مذکورہ بالا کتاب اس کی تردید میں لکھی گئی ہے، اس میں خیر الانبیاء کے تمام دلائل کا رد کیا گیا ہے، یہ جھگڑا بہت پرانا ہے، اس پر دونوں جانب سے ہزاروں صفحات لکھے جا چکے ہیں، اور اب اسکا کوئی پہلو تشنہ باقی نہیں ہے، اور اس پر کوئی نیا اضافہ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ان مسائل پر لکھنا محض اضاعت وقت ہے، اسکے علاوہ اب زمانہ کا مذاق بدل چکا ہے، نئے نئے سیاسی و معاشی کلامی مسائل درپیش ہیں، ہر طرف الحاد و دہریت کا طوفان بپا ہے، کفر و اسلام کا معرکہ چھڑا ہوا ہے، نام کے مسلمانوں کا ایک طبقہ سرے سے اسلام ہی سے منحرف ہو رہا ہے، ایسی حالت میں اسکو چھوڑ کر پرانے و قیاسی مسائل میں اپنی قوت اور وقت ضائع کرنا اسلام کی کوئی مفید خدمت نہیں ہے، افسوس ہے کہ ہمارے علماء کا ایک طبقہ خواہ بریلوی ہوں یا اہل حدیث، وقت کے ضروری اور اہم مسائل کو چھوڑ کر انہی غیر ضروری مسائل میں الجھا ہوا ہے، جنکی جانب اس زمانہ میں کسی کو توجہ کرنے کی بھی فرصت نہیں ہے، اس وقت ضرورت اسکی ہے کہ انکو چھوڑ کر سارا زور کفر و الحاد کے مقابلہ میں اسلام کی نصرت و حمایت میں صرف کیا جائے، تاہم مصنف کی نیت نیک اور انکا مقصد صحیح ہے، اسلیے انکا دینی جذبہ قابل قدر ہے، اور اس کا اجر انشاء اللہ ان کو ملے گا،

آسان قرآنی کورس کے بیس سبق از جناب مولوی عبد السبحان صاحب عظیمی ربانی منشی فاضل تقطیع بڑی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۹ر پتہ: بزم قرآن مسجد سعیدیہ کوچہ معروف اسپارکس کنٹھ، ہونٹ روڈ، مدراس۔

خاص قرآن مجید کی تعلیم و اس کا ترجمہ سمجھنے کیلیے اردو میں عربی قواعد کے متعدد قرآنی نصاب مرتب کیے گئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور و مفید ادارہ تعلیمات اسلامی لکھنو کا نصاب ہے، مصنف نے بھی اسی مقصد کے لیے یہ نیا رسالہ لکھا ہے، اس میں ادارہ تعلیمات اسلامی کی کتابوں سے بھی انھوں نے فائدہ اٹھایا ہے، اور اپنے تجربہ سے نئے اضافے بھی کیے ہیں، اس رسالہ میں بیس سبق ہیں، اور قرآن مجید کے ترجمہ کی مشق کے لیے مفید ہیں

"م"

جلد ۶۶ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۳۷۰ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۵۰ء عدد ۵

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

ہندوستان کے فرقہ پرستوں کی تنگ دلی اور تنگ نظری اب اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ وہ ہر اُن چیز کے دشمن بن گئے ہیں جس کو مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی نسبت ہو، وہ اُن کی کسی یادگار کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے اور ہندوستان میں اُن کی ہزار سالہ تاریخ کا ایک ایک نشان مٹا دینا چاہتے ہیں، جو ایک متمدن قوم کی شان سے فروتر ہے، اُس کا فرض تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ علم و فن کی ہر متاع اور تہذیب و تمدن کے ہر نقش کو خواہ اس کا تعلق کسی فرقہ یا قوم سے ہو باقی رکھکر اپنی تعمیر و ترقی میں اُس سے مدد لے، اور جدید ہندوستان اور ہندو مسلمانوں کی مشترکہ قومیت کی تعمیر کے لئے تو یہ اور بھی زیادہ ضروری ہے،

اس بارہ میں ہم کو یورپ کی قوموں سے سبق حاصل کرنا چاہئے، عیسائی دنیا مسلمانوں کی پُرانی حریف ہے، ان دونوں میں بڑے سخت مذہبی اختلافات اور سیاسی معرکے برپا رہ چکے ہیں، مسلمانوں نے اُن کے مذہبی مرکز بیت المقدس پر جو مسلمانوں کا بھی مقدس شہر اور اُن کا قبلہ رہ چکا تھا حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ میں قبضہ کر لیا تھا، پھر ایک صدی کے اندر اُن کے سارے مشرقی مقبوضات چھین لئے، اور خود یورپ کے ملکوں میں اسپین، سسلی، یونان، قسطنطنیہ، بلقانی ریاستوں، بحر روم کے بڑے بڑے جزیروں، اور فرانس، پرتگال اور اٹلی کے بعض حصوں پر قبضہ کر لیا، اور صدیوں یہاں کے حکمران رہے، دونوں میں مدتوں جنگ صلیبی کا خونریز سلسلہ جاری رہا جس میں سارا یورپ مسلمانوں کے خلاف صف آرا تھا غرض مذہبی و سیاسی دونوں حیثیتوں سے مخالفت اور دشمنی کا کوئی دقیقہ باقی نہیں رہا، لیکن مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں اپنے تمام مقبوضہ ملکوں کو تہذیب و تمدن کے زیور سے آراستہ کیا

علم و فن کی روشنی سے منور کیا تھا، یورپین قومیں اپنے دورِ جہالت تک تو اُن کی دشمنی پر قائم رہیں لیکن علم کی روشنی پھیلنے کے بعد جب اُن کی آنکھوں سے تعصب کا پردہ ہٹا اور اُن کو مشرقی دنیا اور خود اپنے ملکوں میں مسلمانوں کے علمی تمدنی اور اخلاقی کارنامے نظر آئے تو انھوں نے اُس کا پورا اعتراف اور احساس شناسی کا حق ادا کیا گو استعماری اغراض کی بنا پر ان کا ایک طبقہ مسلمانوں کے خلاف زہر بھی اگلتا رہا لیکن اُس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے مداحوں اور حامیوں کی جماعت ہر دور میں زیادہ رہی اور یورپ کے ہر ملک کے علما و محققین نے مسلمانوں کے علمی تمدنی اور اخلاقی کارناموں پر سیکڑوں کتابیں لکھیں، چنانچہ آج یورپ کی کوئی علمی اور بڑی زبان اس قسم کی تصانیف سے خالی نہیں ہے اس کے ساتھ انھوں نے اسلامی علوم و فنون کو زندہ کیا اور عربی و فارسی کی ہر فن کی سیکڑوں نادر و نایاب کتابوں کو تلاش کر کے بڑی محنت و قابلیت سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا، اور اپنی اپنی زبانوں میں بہت سی اہم کتابوں کے ترجمے کئے اور آج مسلمانوں کے قدیم علمی ذخیرہ کا بڑا حصہ انہی کی بدولت زندہ ہے اس کے علاوہ طب، طبعیات، نباتات، حساب، ہندسہ، ہیئت و جغرافیہ وغیرہ کی مسلمان مصنفین کی کتابیں اور ان کے لاطینی ترجمے کئی صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل رہے، یورپ کے قرونِ مظلمہ میں ان کے ہاتھوں مسلمانوں کے جو آثار مٹ چکے تھے وہ مٹ چکے تھے لیکن جو باقی رہ گئے تھے، اُن کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جس کا مشاہدہ آج بھی اسپین میں کیا جا سکتا ہے غرض یورپین قوموں نے علم و روشنی کے دور میں مذہبی و سیاسی اختلاف کی بنا پر مسلمانوں کے آثار کو مٹایا نہیں بلکہ اُن کو زندہ رکھکر اُن سے فائدہ اٹھایا، ورنہ وہ آج تک جہالت کی تاریکی میں بھٹکتی رہتیں، یا کم از کم ترقی کی منزلیں اتنی جلد طے نہ کرتیں،

اس کے مقابلہ میں ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ اتحاد و یگانگت کا تعلق رہا، گو مسلمان ہندوستان کے حاکم تھے لیکن وہ اجنبی حکمرانوں کی طرح نہیں رہے، بلکہ انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا، اور یہیں شادی بیاہ کر کے رہ بس گئے، یہاں کی بہتیری رسمیں تک اختیار کر لیں، اور مسلمانوں اور یورپین قوموں کے مقابلہ میں ہندو مسلمان مختلف حیثیتوں سے ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں، دونوں مشرقی ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی تعداد نسلاً بھی ایک ہے، انہیں

بہت سے تہذیبی اور کلچرل پہلو مشترک ہیں، ہندوستان کی ترقی میں دونوں کا حصہ ہے چنانچہ اسلامی ہند کے بہت سے علمی و تمدنی کارنامے دونوں کے مشترکہ ہیں لیکن اس کے باوجود محض اس جرم میں کہ وہ اسلامی دور کی یادگار ہیں، فرقہ پرست ان کو برداشت نہیں کر سکتے، اور ان کا نام و نشان مٹا کر ہندوستان کی تاریخ سے اسلامی عہد کا باب ہی خارج کر دینا چاہتے ہیں جو ایک مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کی شان سے بعید ہے اسے تو ان یادگاروں کو نہ صرف زندہ رکھنا چاہئے بلکہ ان کے جو نقش دھندلے ہوگئے ہوں، انکو اجاگر کرنا چاہئے کہ درحقیقت وہ دونوں کے مشترک کارنامے دونوں کے لئے باعثِ فخر اور ہندوستان کی تمدنی عظمت کا نشان ہیں، ع :- یہ ٹوٹے آئینے ہیں زیب و زینت ان کی محفل کے

اس لئے ان کا جو نقش بھی مٹے گا وہ تنہا اسلامی عہد کا نہیں بلکہ ہندوستان کی عظمت کا ایک نشان مٹ جائے گا،

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما ۔۔۔ گلستان میرد اگر میریم ما

ان حالات میں یہ سن کر حیرت کے ساتھ مسرت ہوئی کہ نولکشور پریس نے جس نے اسلامی علوم و فنون اور عربی فارسی اور اردو زبان کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دی ہے، اپنی پرانی روایات و خصوصیات کو قائم رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس مطبع سے حسبِ دستور تینوں زبانوں کی کتابوں کی طبع و اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا، فرقہ پرستی کے اس دور میں یہ فیصلہ قابلِ ستائش اور یہ نمونہ قابلِ تقلید ہے درحقیقت علم و فن کی خدمت کو مذہب و فرقہ کی قید سے بلند رکھنا چاہئے ورنہ ساری ترقیاں مسدود ہو جائیں گی اگر مطبع کے کارکن اودھ اخبار کو بھی دوبارہ جاری کر دیتے تو ایک پرانی یادگار زندہ ہو جاتی،

مسلمانوں میں زبانی تو اردو زبان کی محبت کا بڑا دعویٰ اور ہندوستان میں اسکے زوال کا بڑا ماتم ہے لیکن اسکی جانب سے ان کی غفلت و بے توجہی کا حال یہ ہے کہ وہ اردو کے اہم اور ضروری اخباروں اور رسالوں کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتے، یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ صدق جیسا اہم اور مفید اخبار جس کی قیمت بھی بہت کم ہے، مالی دقتوں کی بنا پر چند دنوں سے بند ہو گیا تھا، اس کے فاضل اڈیٹر مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ نے دوبارہ اس کو جاری کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور آیندہ مہینہ سے وہ نکلنے لگے گا، اگر مسلمانوں میں کچھ بھی احساس باقی ہے تو ان کو صدق کا خریدار بن کر اس کی زندگی کا سامان فراہم کرنا چاہئے،

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیّت

از

مولانا عبدالسلام ندوی

(۲)

گذشتہ نمبر مین معجزۂ قرآنی کی جو خصوصیات بیان کی گئین اُن سے ثابت ہو گیا کہ وہ کوئی دنیوی احسان یا مادی طاقت نہین ہے، بلکہ خالص روحانی طاقت ہے، جو جن وانس دونون کو نیک کامون کے کرنے پر آمادہ کرتی ہے، اب اس نمبر مین یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہ روحانی طاقت کوئی وقتی چیز نہین تھی، بلکہ ایک ابدی دولت ہے جو مسلمانون کے دینی خزانے مین ہمیشہ محفوظ رہیگی اور ان پر قیامت تک اپنا اثر ڈالتی رہیگی کیونکہ

معجزات کی دو قسمین ہین حسّی اور عقلی، حسّی معجزات کا اثر محدود ہوتا ہے، کیونکہ وہ آنکھون سے دیکھے جاتے ہین، اس لئے جو لوگ اُن کو دیکھتے ہین، صرف انہی پر ان کا اثر پڑتا ہے، اور جب انکا زمانہ ختم ہو جاتا ہے، تو یہ معجزات بھی ختم ہو جاتے ہین، اور ان کا اثر بھی زائل ہو جاتا ہے لیکن عقلی معجزات کی حالت اُن سے مختلف ہوتی ہے، وہ دل کی آنکھون سے دیکھے جاتے ہین، اس لئے جب تک دنیا مین صاحبِ عقل و صاحبِ بصیرت لوگ موجود ہین، اُن کا معجزانہ اثر باقی رہتا ہے اور وہ ہر زمانہ مین پیغمبر کی صداقت

کی شہادت دیتے ہین، انبیاؑ بنی اسرائیل کے اکثر معجزے حسّی ہوتے تھے جن کا اثر اُن کے زمانہ تک محدود تھا، اور اب ان معجزات کا نہ وجود ہے، اور نہ اُن کا اثر باقی ہے، اب عصاے موسیٰ اور لحن داؤد، دم عیسیٰ اور ناقۂ صالح کا نہ وجود ہے، اور نہ ان کے دیکھنے والے موجود ہین، اس کے علاوہ اس قسم کے معجزے ان انبیاء کے لئے موزون ہوتے ہین جن کی شریعت خود دائمی اور ابدی نہین ہوتی، بلکہ اس کا تعلق ایک محدود زمانے کے ساتھ ہوتا ہے، اس لئے جو پیغمبر اس قسم کی محدود الوقت شریعت کو لے کر آتے ہین، اُن کو اسی قسم کے محدود الوقت معجزے بھی عطا کئے جاتے ہین،

لیکن اسلام ایک ابدی مذہب تھا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کی صورت مین ایک عقلی معجزہ عطا کیا گیا، جو اب تک موجود ہے، اور ہر صاحب عقل و بصیرت کو اسلام کی دعوت دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ما من الانبیاء نبی الا اعطی من	ہر پیغمبر کو ایسے معجزات دیئے گئے جن
الآیات ما مثلہ آمن علیہ	پر لوگ ایمان لائے لیکن مجھ کو جو
البشر وانما کان الذی اوتیتہ	معجزہ دیا گیا وہ وحی ہے، اس لئے
وحیا اوحاہ اللہ الی فارجوان اکون	مجھے توقع ہے کہ قیامت کے دن
اکثرھم تابعا یوم القیامۃ،	میرے پیرو اور پیغمبرون سے زیادہ
(صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن	ہون گے،
باب کیف نزل الوحی واول ما نزل)	

اس حدیث کی شرح مین حافظ ابن حجر فتح الباری مین لکھتے ہین کہ اور انبیاء کے معجزے ان کے زمانہ کے ساتھ ختم ہوگئے، اور ان کو انہی لوگون نے دیکھا جو اس وقت موجود تھے، لیکن قرآن مجید کا معجزہ قیامت تک موجود رہے گا، اور اسلوب بیان، بلاغت، اور غیبی خبرون کے دینے کی وجہ سے اس کی

معجزانہ حیثیت قائم رہے گی، اس لئے کوئی زمانہ ایسا نہین آئے گا جس مین کوئی واقعہ جس کے ہونے کی خبر قرآن مجید نے دی ہے ظاہر نہ ہو، اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی صحت کی دلیل نہ ہو، اس حدیث کے ایک معنی یہ بھی ہوسکتے ہین کہ گذشتہ پیغمبرون کے معجزات حسی ہوتے تھے، جو آنکھون سے دیکھے جاتے تھے، جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، لیکن قرآن مجید کا معجزہ چشم بصیرت سے نظر آتا ہے، اس لئے آپ کے پیرو اور پیغمبرون سے زیادہ ہون گے، کیونکہ جو معجزہ آنکھ سے دیکھا جاتا ہے، وہ دیکھنے والون کے فنا ہونے کے ساتھ ہی فنا ہوجاتا ہے، اور جو معجزہ عقل کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے، وہ باقی رہتا ہے، اور یکے بعد دیگرے اس کو لوگ ہمیشہ دیکھتے رہتے ہین،

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ہمیشہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے،

افلا یتدبرون القرآن، (نساء - ۱۱)	تو کیا یہ لوگ قرآن مین غور نہین کرتے،

اور یہی وجہ ہے کہ دورِ نبوت مین جو لوگ صاحب فہم و بصیرت تھے، قرآن مجید کا اثر ان پر سب سے زیادہ پڑتا تھا، اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت جبیر بن مطعمؓ نے جب سورہ طور کی یہ آیتین ام خلقوا من غیر شئ ام ہم الخالقون سنین تو ان کا دل اڑنے لگا، لیکن یہ اثر صرف ان کے فہم و بصیرت کا نتیجہ تھا، چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح مین لکھتے ہین،

قال الخطابی کانہ انزعج عند سماع ھذہ الآیۃ لفھمہ معناھا و معرفتہ بما تضمنتہ ففھم الحجۃ	خطابی کہتے ہین کہ چونکہ وہ اس آیت کے معنی اور مفہوم کو سمجھ گئے، اس لئے اس کو سُن کر بیساختہ متاثر ہوگئے، غرض انھون نے اس دلیل کو سمجھ لیا

فاستدرکھا بلطیف طبعہ اور اپنی طبیعت کی لطافت کی وجہ سے اس کو پا گئے،

حضرت انیسؓ خود شاعر تھے، وہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور واپس جاکر اپنے بھائی حضرت ابوذر غفاریؓ کو اس کی اطلاع دی، تو انھوں نے پوچھا کہ لوگ آپ کے بارے میں کیا کہتے ہیں"؟ انھوں نے جواب دیا کہ لوگ آپ کو شاعر، کاہن اور جادوگر کہتے ہیں"؟ لیکن میں نے کاہنوں کی باتیں سُنی ہیں، لیکن محمد جو کچھ کہتے ہیں وہ کاہنوں کی بولی نہیں، میں نے اُن کی باتوں کو اوزان واصناف شعر کے مقابلہ میں رکھا تو وہ شعر بھی نہیں، خدا کی قسم آپ سچے اور لوگ جھوٹے ہیں[۱]

اس قسم کے اور بھی متعدد واقعات احادیث وسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں، جن کو ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں،

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن مجید کو گذشتہ انبیاء کے مادی معجزات پر ہر حیثیت سے تفوق اور فضیلت حاصل ہے، لیکن اس موقع پر سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کے مقابلہ میں تورات وانجیل کا کیا درجہ ہے؟ ہمارے علماء نے چونکہ قرآن مجید کو فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے معجزہ مانا ہے اور تورات وانجیل میں یہ فصاحت وبلاغت موجود نہیں ہے، اس لئے وہ ان دونوں کتابوں کو معجزہ تسلیم نہیں کرتے، چنانچہ تمہید ابو شکور سالمی میں جہاں اعجاز قرآنی پر بحث کی ہے، لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید صرف اپنے الفاظ کی وجہ سے معجزہ ہے، اور بعض لوگ اس کو معنی کی بنا پر معجزہ کہتے ہیں لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ وہ لفظاً ومعنیً دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، کیونکہ اگر ہم اس کو صرف معنی کی وجہ سے معجزہ تسلیم کریں تو اس سے گذشتہ انبیاء کی کتابوں کو بھی معجزہ تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ صحیح نہیں ہے، اور اگر صرف لفظ کی وجہ سے معجزہ تسلیم کریں تو ایسی حالت میں اگر الفاظ معنی سے

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الفضائل باب اسلام ابی ذرؓ

خالی ہون، تو وہ ایک لغو کلام ٹھہرے گا اور یہ محال ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید لفظاً اور معنی دونون حیثیتون سے معجزہ ہے، آگے چل کر ایک خاص عنوان یہ قائم کیا ہے کہ گذشتہ کتابین معجزہ تھین یا نہین ؟ اور اس عنوان کے تحت مین لکھا ہے کہ گذشتہ کتابین اس معنی مین معجزہ تھین کہ وہ خدا کا کلام ہین، اور قرآن مجید بھی خدا کا کلام ہے، تو جب اس حیثیت سے قرآن مجید معجزہ ہے، تو اور کتابین اور صحیفے بھی لازمی طور پر معجزہ قرار پائین گے، لیکن صحیح یہ ہے کہ تمام گذشتہ کتابین اور صحیفے بھی اگرچہ خدا ہی کا کلام تھے لیکن وہ معجزہ نہین تھے، کیونکہ خود خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لوگ ان کتابون اور صحیفون مین تحریف کیا کرتے تھے، لیکن اگر وہ معجزہ ہوتین، تو اُن مین تحریف نہین کی جا سکتی تھی، اور تمام کتابین خدا کا کلام تو ضرور ہین لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ایک زمانہ مین اور ایک شخص کے لئے تو معجزہ ہو لیکن دوسرے زمانہ اور دوسرے شخص کے لئے معجزہ نہ ہو، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ان کے ہاتھ اور اُن کے زمانہ مین تو معجزہ تھا لیکن اُن کے زمانہ کے بعد معجزہ نہین رہا، یہی حالت اُن کی کتابون کی بھی ہے[۱]،

قاضی ابو بکر باقلانی اعجاز القرآن مین لکھتے ہین، اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید کے علاوہ کیا خداوند تعالیٰ کا دوسرا کلام مثلاً توراۃ انجیل اور صحیفے بھی تمھارے نزدیک معجزے ہین ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ان مین جو غیبی خبرین ہین، ان کے لحاظ سے وہ بھی قرآن مجید کی طرح معجزے ہین لیکن نظم و تالیف کے لحاظ سے ان مین کوئی کتاب معجزہ نہین، کیونکہ خداوند تعالیٰ نے ان مین کسی کتاب کے وہ اوصاف نہین بیان کئے، جو قرآن مجید کے بیان کئے ہین، نیز یہ کہ اُن کے متعلق تحدی نہین کی گئی ہے جیسا کہ قرآن مجید کے متعلق کی گئی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کتابون کی زبان مین فصاحت کے ایسے وجوہ نہین پائے جاتے، جن کی وجہ سے کلام مین مقابلۃً ایسے محاسن پیدا ہو جائین، جو حدِ اعجاز

---

[۱] تمہید ابو شکور سالمی ص۶۵ ، ۶۶،

تک پہنچ جائین، ان زبانون مین جو کلام موجود ہے، وہ تقریباً یکسان ہے، ہمارے اصحاب تمام زبانون کی یہی خصوصیت بیان کرتے ہین، اور کہتے ہین کہ ان مین باہم وہ فرق و امتیاز نہین پیدا ہو سکتا جو عجیب و غریب طریقہ پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیدے، اس کو یون بیان کیا جا سکتا ہے کہ جہان تک ہم کو ان زبانون کا علم ہے ان مین ایک چیز کے اس قدر متعدد نام نہین پائے جاتے جس قدر عربی زبان مین پائے جاتے ہین (یعنی ان مین مترادف الفاظ موجود نہین) اس طرح ان مین ایک لفظ بہت سے معانی پر دلالت نہین کرتا، جس طرح عربی زبان مین ایک ہی لفظ بہت سے معانی پر دلالت کرتا ہے (یعنی ان زبانون مین مشترک الفاظ موجود نہین) استعارات، اشارات اور استعمالات کے نادر طریقے بھی ان زبانون مین نہین پائے جاتے؛

اس کی دلیل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ عربی مبین کی زبان مین ہے، اس کی یہ خصوصیت بہت سے مقامات مین بیان کی ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ قرآن مجید کا درجہ اس سے بلند ہے کہ اس کو عجمی زبان مین نازل کیا جائے، اس لئے اگر اہل عجم کی زبان مین اسی قسم کی فصاحت پیدا ہو سکتی، تو خداوند تعالیٰ قرآن مجید کو اس سے بالاتر نہ سمجھتا اگرچہ عربی زبان مین قرآن مجید کے نازل کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اہل عرب اس کو خود سمجھ سکین، اور اس کی تفسیر مین دوسرون کے محتاج نہ ہون تاہم ہم نے جو فائدہ بیان کیا ہے وہ بھی ممکن ہے؛

بہت سے مسلمان جو عربی زبان کے ساتھ ان زبانون کے بھی ماہر ہین، اُن کے نزدیک ان زبانون مین وہ فرق و امتیاز اور وہ فصاحت نہین پائی جاتی جو عربی زبان مین پائی جاتی ہے؛ اس کے علاوہ وہ نہ تو خود توراۃ و انجیل کے ماننے والے اور نہ خود مسلمان ان کتابون کے معجز ہونے کا دعوی کرتے، اس سے معلوم ہوا کہ اعجاز قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہے؛[1]

---

[1] اعجاز القرآن بر حاشیہ اتقان جلد اول صفحہ ۴۸، ۴۹،

یہی وجہ ہے کہ گذشتہ قوموں کے جو واقعات قرآن مجید مین مذکور ہین، وہ بالمعنی بیان کئے گئے ہین یعنی خداوند تعالیٰ نے اُن کے معانی کو عربی زبان مین بیان کر دیا ہے، کیونکہ عجمی زبانون مین یہ فصاحت نہین پیدا ہو سکتی تھی،[ا]

لیکن خداوند تعالیٰ نے فصاحت و بلاغت کو کہین قرآن مجید کا وصف نہین قرار دیا ہے بلکہ اس کے یہ اوصاف بتائے ہین،

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِين، (بقرہ - ۱۲)	وہ رہنمائی کر رہا ہے اور خوشخبری سنا رہا ہے، ایمان والون کو،
يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُبِيْنًا، (نساء - ۲۴)	اے لوگو! یقیناً تمھارے پاس تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آچکی ہے، اور ہم نے تمھارے پاس ایک صاف نور بھیجا ہے،
فَقَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَة، (الانعام - ۲۰)	سو اب تمھارے پاس تمھارے رب کے پاس سے ایک کتاب واضح اور رہنمائی کا ذریعہ اور رحمت آچکی ہے،

اور قرآن مجید مین بعینہٖ یہی اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف توراۃ و انجیل کے بھی بیان کئے گئے ہین، مثلاً:-

وَاَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ، (آل عمران - ۱)	اور اسی طرح بھیجا تھا توریت و انجیل کو اسکے قبل کے لوگون کی ہدایت کے واسطے

[ا] اتقان جلد دوم صفحہ ۱۲۵،

انا انزلنا التوراة فيها هدى و نور۔ (مائدہ ۷...)

ہم نے توراۃ نازل فرمائی تھی جس میں ہدایت تھی اور وضوح تھا،

وقفينا على آثارهم بعيسى ابن مريم مصدقا لما بين يديه من التوراة وآتيناه الانجيل فيه هدى ونور ومصدقا لما بين يديه من التورية وهدى وموعظة للمتقين (مائدہ ۷)

اور ہم نے اُن کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو اس حالت میں بھیجا کہ وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی تورات کی تصدیق فرماتے تھے، اور ہم نے اُن کو انجیل دی تھی جن میں ہدایت تھی اور وضوح تھا، اور وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق کرتی تھی اور وہ سراسر ہدایت اور نصیحت تھی خدا سے ڈرنے والوں کے لئے،

قل من انزل الكتب الذي جاء به موسى نورا وهدى (الانعام ۱۱)

آپ کہئے کہ وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ لائے تھے جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نور ہے اور لوگوں کے لئے ہدایت ہے،

ثم آتينا موسى الكتب تماما على الذي احسن وتفصيلا لكل شيء وهدى ورحمة، (الانعام ۲۰)

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی جس سے اچھی طرح عمل کرنے والوں پر نعمت پوری ہو، اور سب احکام کی تفصیل ہو جائے، اور رہنمائی ہو اور رحمت ہو،

ومن قبله كتب موسى اماما ورحمة (هود ۲)

اور ایک اس سے پہلے (یعنی) موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے، جو کہ احکام بتلانے کے اعتبار سے

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىٕرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ، (قصص - ۵)

اور ہم نے موسیٰ کو اگلی امتون کے ہلاک کئے پیچھے کتاب دی تھی، جو لوگون کے لئے دانشمندی کا سبب اور ہدایت اور رحمت تاکہ وہ نصیحت حاصل کرین،

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْكِتٰبَ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِی الْاَلْبَابِ، (مومن ۶)

اور ہم موسیٰ کو ہدایت نامہ دیکھے ہین، اور ہم نے وہ کتاب بنو اسرائیل کو پہنچائی تھی کہ وہ ہدایت اور نصیحت تھی اہل عقل کے لئے،

غرض قرآن مجید کے جس قدر اوصاف قرآن مجید مین مذکور ہین، بعینہ وہی اوصاف توراۃ و انجیل کے بھی مذکور ہین، اس لئے اگر ان اوصاف کی بنا پر جیسا کہ آگے تفصیل کے ساتھ آئے گا، قرآن مجید کو معجزہ تسلیم کیا جائے تو توراۃ و انجیل کو بھی معجزہ تسلیم کرنا پڑے گا، اور بعض محققین نے اس حیثیت سے ان کو معجزہ تسلیم بھی کیا ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہین کہ اگر یہ فرض کیا جائے کہ توراۃ یا انجیل یا زبور اس لئے معجزہ ہین کہ اُن مین علوم، غیبی خبرین اور امر و نہی وغیرہ موجود ہین، تو اس سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہین بلکہ یہ اُن پیغمبرون کی نبوت کی اور اس پیغمبر کی نبوت کی جس کی نبوت کی انھون نے خبر دی ہی، دلیل ہے لیکن جو لوگ یہ کہتے ہین کہ یہ کتابین معجزہ نہین ہین، اگر اُن کا مقصد یہ ہے کہ وہ قرآن کی طرح لفظاً و نظماً کی وجہ سے معجزہ نہین ہین، تو یہ ممکن ہے اور اس کا تعلق عبرانی زبان کے جاننے والون سے ہے لیکن معانی یعنی غیبی خبرون اور امر و نہی کی وجہ سے توراۃ کے معجزہ ہونے مین کوئی شک نہین ہے، اور انبیار کی کتابون کے معجزہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی آپ کی بعثت سے بہت پہلے خبر دی گئی ہے اور بغیر خداوند تعالیٰ کی اطلاع دینے کے اس کا علم نہین ہو سکتا،[1]

---

[1] کتاب النبوات ص ۱۱۳،

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہین کہ

"قرآن مجید کے معانی مین اُس کے الفاظ سے زیادہ اعجاز ہے، اور توراۃ وانجیل مین جو معانی ہین، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ قرآن مجید کے مثل ہین، تو اُس سے مقصد مین کوئی خلل واقع نہین ہوتا، کیونکہ وہ بھی خداوند تعالیٰ کی کتاب ہین، اور اگر ایک پیغمبر دوسرے پیغمبر کے معجزہ کے مثل کوئی معجزہ لائے تو یہ ناممکن نہین ہے[۵۱]"

توراۃ وانجیل کے ساتھ قرآن مجید کی طرح بے شبہہ تحدی نہین کی گئی، لیکن معجزات کے لئے تحدی کوئی ضروری چیز نہین ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہین کہ" دلائل نبوت کے لئے یہ شرط ضروری نہین ہے کہ وہ دعوی نبوت کے ساتھ ساتھ ہون، اُن کو بطور تحدی کے پیش کیا جائے، ان کے مثل لانے کی تحدی کیجائے، اور اس پر مخالفین کو آمادہ کیا جائے، اس قسم کی باتین بعض معجزات کے ساتھ تو ضرور پیش آتی ہین لیکن یہ ضروری نہین کہ جن معجزات کے ساتھ یہ باتین پیش نہ آئین، وہ معجزہ ہی نہ ہون، بلکہ اس سے انبیاء کے اکثر معجزات باطل ہو جائین گے، کیونکہ اُن مین یہ شرط موجود نہیں ہے، اور یہ ایک ایسی شرط ہے جس کی کوئی دلیل نہین ہے، کیونکہ دلیل کے معنی یہ ہین کہ اس کے ساتھ مدلول علیہ کا وجود لازمی طور پر پایا جائے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کوئی مساوی یا راجح دلیل اُس کی معارض نہ ہو، لیکن اگر کوئی دلیل ایسی موجود ہے، جس کی معارض کوئی مساوی اور راجح دلیل نہین ہے، تو اس کو دلیل ماننا پڑے گا، چاہے مستدل یہ کہے کہ اُس کے مثل پیش کرو "تم لوگ اُس کے مثل پیش کرنے کی قدرت نہین رکھتے" یا نہ کہے، کیونکہ جب وہ دلیل فی نفسہ ایسی ہو جس کے مثل لانے پر لوگ قادر نہین ہین، تو مستدل کا یہ کہنا، اور نہ کہنا برابر ہے، نہ اس کے کہنے سے وہ دلیل بن سکتی، اور نہ اُس کے نہ کہنے سے اس کی دلالت باطل ہوتی، دلیل بہرحال دلیل ہے، خواہ

---

[۵۱] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴ ص ۷۰

مستدل اس کے ساتھ استدلال کرے، یا نہ کرے، جو لوگ یہ کہتے ہین کہ نبوت کی دلیل اس وقت تک دلیل نہین ہوسکتی، جب تک دعوی نبوت کے ساتھ پیغمبر اس کے ساتھ استدلال نہ کرے یعنی جو لوگ دعوی نبوت، پیغمبر کے استدلال اور معارضہ کے مطالبہ سب کو دلیل کا جزو قرار دیتے ہین، وہ سخت غلطی پر ہین، بلکہ ان باتون سے سکوت اختیار کرنا بہتر ہے، اور ان باتون سے دلیل مین کوئی قوت نہین پیدا ہوتی خداوند تعالی نے

فلیاتوا بحدیث مثلہٖ، تو وہ لوگ بھی اس کے مثل ایسی ہی ایک بات بھی لائین،

اس وقت کہا جب کفار نے یہ دعوی کیا کہ قرآن مجید ایک بنائی ہوئی کتاب ہے، لیکن اس قول کو دلیل کی شرط قرار نہین دیا، بلکہ جب وہ اس کے معارضہ سے عاجز ہوگئے، تو اس سے یہ دلیل مکمل ہوگئی،[1]

دوسری جگہ لکھتے ہین کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام معجزات کے ساتھ تحدی نہین کی گئی، آپ نے قرآن مجید کے ساتھ بھی ابتداءً تحدی نہین کی، بلکہ اس وقت تحدی کی جب کفار نے کہا کہ یہ ایک جعلی کتاب ہے"[2]

اس بنا پر اگر توراۃ و انجیل کے ساتھ تحدی نہین کیگئی تو اس سے اُن کے معجزہ ہونے مین کوئی خلل واقع نہین ہوتا، لیکن اگر تحدی ضروری سمجھی جائے، تو گو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توراۃ کے ساتھ تحدی نہین کی تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے ساتھ توراۃ کو بھی تحدی مین شامل کرلیا ہے،

---

[1] کتاب النبوات ص ۱۴۲ [2] ایضاً ص ۱۹۶،

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ — آپ کہدیجئے کہ اچھا تو تم کوئی اور کتاب اللہ کے پاس سے آؤ

هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا (قصص - ۵) — جو ہدایت کرنے میں ان دونوں (توراۃ و قرآن) سے بہتر ہو

بہرحال قرآن مجید کی طرح توراۃ وانجیل بھی معجزہ ہیں، البتہ باوجود اس اشتراک کے اسلام کی تکمیلی شان یہاں بھی موجود ہے، توراۃ وانجیل صرف معنی کے اعتبار سے معجزہ ہیں لیکن قرآن مجید لفظی ومعنوی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، بلکہ معنوی حیثیت سے بھی اس کو توراۃ وانجیل پر تفوق حاصل ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ

"توراۃ وانجیل میں جو معنی ہیں، وہ حقیقت، کیفیت اور کمیت کسی حیثیت سے بھی قرآن مجید کے معانی کے مثل نہیں ہیں، بلکہ جس شخص نے قرآن مجید اور ان کتابوں میں غور کیا ہے اس کو دونوں میں فرق نظر آئے گا، اور اہل علم ومعرفت میں جس کو یہ باتیں معلوم ہو جائیں گی، اس پر اس حیثیت سے اس کا اعجاز ظاہر ہو جائے گا، لیکن جس شخص کو یہ باتیں معلوم نہ ہو سکیں، اس کے لئے صرف ظاہری باتیں کافی ہیں، مثلاً یہ کہ باوجود تحدی کے تمام دنیا اس کا جواب لانے سے عاجز تھی، کیونکہ یہ بات ہر شخص پر ظاہر ہے نبوت کے دلائل بھی ربوبیت کے دلائل کی طرح بعض تو بالکل ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً حیوانات، نباتات اور بادل وغیرہ کی پیدائش کی یہ چیزیں ہر شخص کو علانیہ نظر آتی ہیں، اور بعض اہل علم کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں، مثلاً علم تشریح کی باریک باتیں ستاروں کی مقدار اور اُن کی حرکات وغیرہ کہ اُس سے صرف اہل علم واقف ہو سکتے ہیں[1]۔

غرض قرآن مجید عالم وجاہل دونوں کے لئے یکساں طور پر معجزہ ہے، صرف

بزنگ اصحاب صورت را بہ بو ارباب معنی را

---

[1] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴ ص ۸۰۔

مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام[1]

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو معارف جون ۵۰ء)

اپنی مشہور عام متداول کتاب احیاء العلوم میں مفید و مضر علوم کی تفصیل کرتے ہوئے حجۃ الاسلام امام غزالی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"مسلمانوں کا کوئی شہر ہو یا آبادی، ہر ایک میں دیکھا جا رہا ہے کہ طبابت کا کام غیر مسلم اقوام کے افراد انجام دے رہے ہیں" (احیاء العلوم، ج ۱ ص ۱۱۱)

ہے تو یہ ایک اجمالی شہادت، لیکن ہم جب یہ سوچتے ہیں کہ غزالی کی عمر کا بڑا حصہ سیر و سیاحت میں بسر ہوا، خراسان و ایران تو ان کا وطن ہی تھا، اس کے سوا عراق و شام و مصر میں وہ مدتوں گھومتے رہے ہیں، یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا اطلاع غالباً ان کے ذاتی مشاہدات ہی پر مبنی ہے، امام غزالی چھٹی صدی ہجری کے امام ہیں یہ وہ زمانہ ہے جس میں سارے علوم و فنون جو غیر قوموں سے منتقل ہو کر مسلمانوں میں رائج پذیر ہوئے تھے اپنے عروج و ارتقاء کے آخری نقطہ تک پہنچ چکے تھے، طب ہی کے سلسلہ میں بڑی بڑی نامور ہستیاں چھٹی صدی ہجری سے پہلے پیدا ہو چکی تھیں، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ناواقفیت کی وجہ سے

[1] بعض فوری موثرات کے تحت خاکسار نے اپریل ۱۹۵۰ء ہی میں اس مضمون کی ایک قسط لکھ کر دفتر معارف میں بھیج دی تھی، گنجایش نہ نکلنے کی وجہ سے اپریل کا بھیجا ہوا یہ مضمون شاید جون ۵۰ء میں شائع ہوا، اس طویل وقفہ کا اثر "فوری تاثر" پر پڑا، تاہم جب پہلی قسط شائع ہو گئی، تو دوسری قسط لکھ کر دفتر میں روانہ کی، مگر معلوم ہوا کہ مضمون ڈاک میں ضائع ہو گیا دل بیٹھ گیا، معارف کے فاضل شریک مدیر مولانا شاہ معین الدین کے اصرار پر لکھے ہوئے مضمون کو دوبارہ قلم بند کرنے پر آمادہ ہوا تھا تو یہ ذرا سا کام کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے کیا لکھا تھا اور اب کیا لکھا گیا واللہ ولی التوفیق۔

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ (قصص - ۵) آپ کہدیجئے کہ اچھا تو تم کوئی اور کتاب اللہ کے پاس سے لے آؤ جو ہدایت کرنے میں ان دونوں (توراۃ و قرآن) سے بہتر ہو۔

بہرحال قرآن مجید کی طرح توراۃ و انجیل بھی معجزہ ہین، البتہ باوجود اس اشتراک کے اسلام کی تکمیلی شان یہان بھی موجود ہے، توراۃ و انجیل صرف معنی کے اعتبار سے معجزہ ہین، لیکن قرآن مجید لفظی و معنوی دونون حیثیتون سے معجزہ ہے، بلکہ معنوی حیثیت سے بھی اس کو توراۃ و انجیل پر تفوق حاصل ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہین کہ

"توراۃ و انجیل مین جو معنی ہین، وہ حقیقت، کیفیت اور کمیت کسی حیثیت سے بھی قرآن مجید کے معانی کے مثل نہین ہین، بلکہ جس شخص نے قرآن مجید اور ان کتابون مین غور کیا ہے، اس کو دونون مین فرق نظر آئے گا، اور اہل علم و معرفت مین جس کو یہ باتین معلوم ہو جائین گی، اس پر اس حیثیت سے اس کا اعجاز ظاہر ہو جائے گا، لیکن جس شخص کو یہ باتین معلوم نہ ہو سکین، اس کے لئے صرف ظاہری باتین کافی ہین، مثلاً یہ کہ باوجود تحدی کے تمام دنیا اس کا جواب لانے سے عاجز تھی، کیونکہ یہ بات ہر شخص پر ظاہر ہے نبوت کے دلائل بھی ربوبیت کے دلائل کی طرح بعض تو بالکل ظاہر ہوتے ہین مثلاً حیوانات، نباتات اور بادل وغیرہ کی پیدائش کی یہ چیزین ہر شخص کو علانیہ نظر آتی ہین، اور بعض اہل علم کے ساتھ مخصوص ہوتی ہین، مثلاً علم تشریح کی باریک باتین ستارون کی مقدار اور اُن کی حرکات وغیرہ کہ اُس سے صرف اہل علم واقف ہو سکتے ہین[1]"

غرض قرآن مجید عالم و جاہل دونون کے لئے یکسان طور پر معجزہ ہے، صرف

برنگ اصحاب صورت را بہ بوار باب معنی را

---

[1] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴، ۷۴۔

مسلمانون[1] کی حکومت مین غیر مسلم اقوام

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو معارف جون ۵۰ء)

اپنی مشہور عام متداول کتاب احیاء العلوم مین مفید و مضر علوم کی تفصیل کرتے ہوئے حجۃ الاسلام امام غزالی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"مسلمانون کا کوئی شہر ہو یا آبادی، ہر ایک مین دیکھا جا رہا ہے کہ طبابت کا کام غیر مسلم اقوام کے افراد انجام دے رہے ہین" (احیاء العلوم، ج ا ص ۱۱)

ہے تو یہ ایک اجمالی شہادت، لیکن ہم جب یہ سوچتے ہین کہ غزالی کی عمر کا بڑا حصہ سیر و سیاحت مین بسر ہوا، خراسان و ایران تو ان کا وطن ہی تھا، اس کے سوا عراق و شام و مصر مین وہ مدتون گھومتے رہے ہین، تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا اطلاع غالباً ان کے ذاتی مشاہدات ہی پر مبنی ہے، امام غزالی چھٹی صدی ہجری کے امام ہین یہ وہ زمانہ ہے جس مین سارے علوم و فنون جو غیر قومون سے منتقل ہو کر مسلمانون مین رواج پذیر ہوئے تھے اپنے عروج و ارتقاء کے آخری نقطہ تک پہنچ چکے تھے، طب ہی کے سلسلہ مین بڑی بڑی نامور ہستیان چھٹی صدی ہجری سے پہلے پیدا ہو چکی تھین، اس لیے نہین کہا جا سکتا کہ ناواقفیت کی وجہ سے

---

[1] بعض فوری موثرات کے تحت خاکسار نے اپریل ۱۹۵۰ء ہی مین اس مضمون کی ایک قسط لکھکر دفتر معارف مین بھیجدی تھی، لیکن گنجایش نہ نکلنے کی وجہ سے اپریل کا بھیجا ہوا یہ مضمون شاید جون ۵۰ء مین شائع ہوا، اس طویل وقفہ کا اثر فوری تاثر پر بھی پڑا، تاہم جب پہلی قسط شائع ہو گئی، تو دوسری قسط لکھکر دفتر مین روانہ کی، مگر معلوم ہوا کہ مضمون ڈاک مین ضائع ہو گیا دل بیٹھ گیا، دفتر معارف کے فاضل شریک مدیر مولانا شاہ معین الدین کے اصرار پر لکھے ہوئے مضمون کو دوبارہ قلم بند کرنے پر آمادہ ہوا تھا تو یہ ذرا دشوار کام کچھ نہین کہا جا سکتا کہ پہلے کیا لکھا تھا اور اب کیا لکھا گیا واللہ ولی التوفیق۔

مسلمان غیر مسلم اقوام کی طبی امداد کے محتاج اور دست نگر تھے، گویا یہ صورت حال اضطرار یا مجبوری کی رہین منت تھی، یقیناً یہ دعویٰ غلط ہوگا،

باقی یہ وسوسہ کہ مسلمانون کے دینی احساسات مین رفتہ رفتہ اضمحلال اور سستی کی جو کیفیت پیدا ہوتی چلی جارہی تھی، سواس کا نتیجہ بھی اس کو قرار دینا مشکل ہے

آخر مین پوچھتا ہون کہ غزالی مانا کہ چھٹی صدی ہجری کے آدمی ہین لیکن میں تو دیکھتا ہون کہ غزالی کو سینکڑون سال پہلے یعنی اسلام کی دوسری صدی ہی کے ثلث اول مین پیدا ہونے والے امام حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی کتابون مین یہ شہادت منسوب کی گئی ہے یعنی علم طب جسے امام شافعی علم کے تین حصون مین ایک مستقل حصہ قرار دیتے تھے[1]، اسی علم طب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے،

ثلث العلم وکلوہ الی الیھود و	علم کے تہائی حصہ کو مسلمانون نے یہود و
النصاریٰ (توالی التاسیس لابن حجر ص۶۶)	نصاریٰ کے سپرد کر رکھا ہے،

مان لیا جائے کہ چھٹی صدی ہجری تک پہنچتے ہوئے مسلمانون مین اپنے دین کے متعلق وہ جوش و خروش باقی نہ رہا ہو جو ان مین پہلے پایا جاتا تھا، لیکن دوسری صدی ہجری مین بھی اگر اس سے وہ خالی ہی تھے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ جن دینی گرم جوشیون کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ نرے ایک افسانے کے سوا اور کچھ نہین ہے، مالکم کیف تحکمون۔

---

[1] بظاہر اس کا مطلب اس زمانہ کے مذاق کے مطابق جس مین امام شافعی تھے، یہی معلوم ہوتا ہے کہ علم الادیان، علم الابدان، علم اللسان یعنی ادب و لغت، ان ہی تین علوم کو اہمیت دیجاتی تھی، خود امام شافعیؒ نے علم کی ان تینون قسمون مین کمال پیدا کیا تھا، علم الادیان اور علم اللسان مین ان کا جو پایہ تھا اس سے تو دنیا واقف ہے، لیکن طب کے ساتھ امام کے تعلق کو گو یا عام شہرت نہین ہے، مگر لکھا ہے کہ اس علم مین بھی ان کی غیر معمولی دستگاہ کا یہ عالم تھا کہ مصر جب پہنچے تو بقراط کی کتابیں مصر کے بعض اطبا نے ان سے پڑھنے کی خواہش کی، (دیکھو توالی التاسیس ص۶۶)

اور سچی بات تو یہ ہے کہ مسلمانون کے جس دین کی طرف تنگ نظریون، کوتاہ فکریون کو منسوب کرنے والے آج منسوب کر رہے ہین، کاش واقعات کا صحیح علم ان کو ہوتا تو برعکس اس کے شاید وہ اس یقین پر مجبور ہوتے کہ غیر قومون کے ساتھ ساری فراخ چشمیان اور رواداریاں جن کا ذکر مسلمانون کی تاریخ مین کیا جاتا ہے، ان کی ضمانت خود مسلمانون کے دین اور دین کے عطا کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیع طرز عمل مین پوشیدہ ہے،

اس قسم کے چھوٹے موٹے، ناقابل توجہ واقعات مثلاً جب مشہور ایرانی بزرگ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوئے، اور ایرانی نژاد ہونے کیوجہ سے عربی زبان مین جیسی کہ چاہیے گفتگو نہین کر سکتے تھے، تو تاریخ خمیس وغیرہ مین لکھا ہے کہ

طلب النبی صلی اللہ علیہ وسلم	تلاش کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک
ترجمانا وکان فی المدینۃ یھودی	ترجمان کو مدینہ مین ایک یہودی تھا، جو عربی
عارفا بالعربی والفارسی (ج ۱ ص ۳۵۲ خمیس)	اور فارسی زبان سے واقف تھا،

غرض اسی یہودی کو بلایا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترجمانی کا کام اسی یہودی سے لیا، [۱]

---

[۱] غیر قومون کے ساتھ میل جول کے ان ہی نمونون کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام جب عرب سے باہر نکلے تو اس علاقے کی زبانون کو بھی انھون نے سیکھا، اور ان کے مفید رسم و رواج کو اختیار کیا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو صحابہ مین امام المحدثین سمجھے جاتے ہین، خطیب نے تاریخ بغداد مین مشہور محدث ابراہیم حربی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ کان ابو ھریرۃ یکلم صبیانہ واھلہ بالنبطیہ (ص ۲۰۶ ج ۵) یعنی ابو ہریرۃ اپنے بچون اور اپنے گھر کے لوگون سے نبطی زبان مین گفتگو کرتے تھے، عراق کے سواد دیہاتی علاقہ مین جو زبان بولی جاتی تھی اور فارسی و عربی کی کچھ ملی جلی شکل تھی، اس زبان کا نام نبطی تھا، اس سلسلہ مین صحابہ کے متعلق دلچسپ معلومات کتابون مین ملتے ہین، بلکہ تاریخ خمیس کی مندرجۂ بالا روایت مین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبرئیل نے فارسی زبان سکھائی ۱۲

اور بھی اسی نوعیت کے غیر اہم واقعات کے سوا کون نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر مبارک کا سب سے بڑا واقعہ جس نے سچ پوچھیے تو عرب یا مشرق ہی نہیں بلکہ اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانیت کی تاریخ کا رخ پلٹ دیا، یعنی سفر ہجرت میں بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بالکل پروانہ کی کہ اس اہم تر دینی اقدام میں راستہ دکھانے کے لیے ایک غیر مسلم آدمی کی امداد کیوں حاصل کی جائے؟ بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں میں ہے کہ

استاجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے
وابوبکر رجلا من بنی الدیل ھادیا	قبیلہ بنی الدیل کے ایک شخص کو ملازم رکھا کہ (مدینہ کا)
خریتا وھو علی دین قریش	راستہ بتائے گا، اور یہ شخص قریش کے دین پر تھا (یعنی
(بخاری ج ا ص ۳۰۱)	مسلمان نہ تھا۔

اور بقول امام بخاری غیر مسلم آدمی کے خدمات سے استفادہ کا یہ واقعہ کوئی استثنائی یا انفرادی واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہی لکھتے ہیں

عامل النبی صلی اللہ علیہ وسلم	خیبر کے یہودیوں سے (بٹائی) کا معاملہ رسول اللہ
یھود خیبر	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ظاہر ہے کہ خیبر کے جن یہودیوں سے معاملہ کیا گیا تھا، ان کی تعداد ایک دو میں محدود نہ تھی، دراصل یہ اور اسی قسم کے نبوی نمونوں کو پیش نظر رکھکر جیسا کہ شارح بخاری ابن بطال کے حوالہ سے نقل کیا جاتا ہے کہ

الفقھاء یجیزون استیجارھم	علمائے اسلام نے غیر مسلم لوگوں کے خدمات سے معاوضہ
عند الضرورۃ وغیرھا	دے کر کام لینے کی عام اجازت دی ہے، خواہ
(حاشیہ بخاری)	ضرورت ہو یا نہ ہو،

ضرورت ہو یا نہ ہو، اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کام کے انجام دینے کے لیے مسلمان آدمی مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو، ہر حال میں مسلمانوں کو اجازت ہے کہ غیر مسلم اقوام کے افراد سے اس قسم کا معاملہ کر سکتے ہیں،

اور یہ تو خیر عام معاملات کے قصے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ غیر مسلم طبیبوں سے طبی امداد حاصل کرنے کا براہ راست نمونہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود تھا،

میرا مطلب یہ ہے کہ عرب کا مشہور طبیب جس کا نام حارث بن کلدہ تھا، طائف کا رہنے والا تھا، ظہور اسلام سے پہلے اپنے وطن طائف سے دو یمن پہنچا، جہاں اس زمانہ میں ایرانیوں کی حکومت قائم تھی، لکھا ہے کہ کچھ دستگاہ علم طب میں حارث نے یمن ہی میں حاصل کی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں سے ملنے جلنے کی وجہ سے اس کو خود ایرانی علاقہ کی مشہور طبی درسگاہ جندیسابور میں باضابطہ علاج و معالجہ میں مذاقت پیدا کرنے کا موقع مل گیا، طبی معلومات، اور کمالات کے ساتھ وطن واپس ہوا، اور عرب ہی میں عوام و خواص کے علاج و معالجہ کا مرکز و مرجع بن گیا،

عمر اس نے کافی طویل پائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھا، لیکن جیسا کہ ابن ابی حاتم کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے اصابہ میں نقل کیا ہے :

لا یصح اسلامہ (ص ۲۰۲ ج ۱) حارث کا مسلمان ہونا درست نہیں ہے،

جس کا مطلب یہی ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس نے اسلام قبول نہیں کیا، در میدیا کہ طبقات الاطباء میں لکھا ہے :

حارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی تھا، اور آیندہ ابوبکر و عمر و عثمان و علی و معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ تک زندہ رہا (ص ۱۱۰ ج ۱)

اس نے چاروں راشدین خلفا، اور امیر معاویہ کی حکومت کا زمانہ بھی پایا، مگر آزادی کے ساتھ باوجود غیر مسلم ہونے کے عرب کی مقدس سرزمین اور اس کے شہر طائف میں بلکہ ایام حج میں مکہ معظمہ پہنچکر علاج و

معالجہ کا کام اس نے جاری رکھا، اور کیون جاری نہ رکھتا معمولی تاریخی کتابون مین نہین بلکہ حدیث کی مستند کتابون میں ہم پڑھتے ہین کہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فتح مکہ کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ آئے، اتفاقاً بیمار ہو گئے، تو ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سعد کو مشورہ دیا،

ایت الحارث بن کلدہ اخا ثقیف فانہ متطبب (ابوداؤد)

ثقیف قبیلہ والے حارث بن کلدہ کیطرف رجوع کرو کیونکہ وہ معالج ہے،

اور دوسری طرف جیسا کہ حافظ ابن حجر نے ابن مندہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ خود حارث بن کلدہ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ

عالج سعدا امابہ (اصابہ ج ۱ ص ۳۰۲)

سعد جس مرض مین مبتلا ہین تم اسکا علاج کرو،

کیا اس کے بعد یہ دریافت کرنے کی چیز رہ جاتی ہے کہ غیر مسلم اطباء سے علاج و معالجہ کا جو تعلق مسلمانون نے آیندہ مسلسل قائم رکھا، ان مین خود ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کو دخل نہ تھا، جو حارث کے ساتھ قائم کرکے صحابہؓ کو آپ نے دکھلایا تھا،

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر چاہتے تو مسلمانون کے مقدس ترین شہر مکہ سے اس غیر مسلم طبیب کو نکل جانے کا حکم بآسانی دے سکتے تھے، خصوصاً جب مکہ معظمہ اس کا وطن بھی نہ تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطب کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً عرب کے اس مرکزی شہر مین بھی وہ آتا جاتا رہتا تھا لیکن بجائے اس کے اپنے عزیز صحابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم دینا کہ حارث سے علاج کراؤ، اور حارث سے فرمانا کہ تم میرے صحابی کا علاج کرو، کیا اس کے بعد اب بھی شک کی گنجایش اس مسئلہ مین باقی رہتی ہے کہ آیندہ غیر مسلم اطباء کے ساتھ مسلمانون کے جو تعلقات قائم ہوئے ان کا منشاء خود مسلمانون کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا براہ راست طرز عمل اور آپ کا عملی نمونہ تھا،

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرز عمل کی بنیاد پر اسی عمارت کو جو مواقع خلافت راشدہ اور حضرت امیر معاویہ رض کے عہد حکومت مین حاصل ہوئے، کتابون مین لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ حارث سے بسا اوقات طبی مسائل مین گفتگو بھی فرماتے، اور یہی طریقہ امیر معاویہ کا بھی تھا، سوچا جا سکتا ہے کہ قدرۃً ان واقعات کا مسلمانون پر کیا اثر مرتب ہو سکتا تھا،

سچی بات تو یہ ہے کہ عرب سے باہر نکلنے کے بعد مصر و شام، عراق و ایران وغیرہ ممالک مین مسلمان جب پہنچے، اور ان کے سامنے پیغمبر کے براہ راست صحبت یافتون کی طرف سے ایسے نمونے پیش ہوتے رہے کہ مثلاً کہتے ہین کہ عمرو بن عاص صحابی جب حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی طرف سے مصر کے والی مقرر ہوئے تو مصر پہنچکر عمرو بن عاص کو خبر ملی کہ مشہور عیسائی طبیب جس کا اصلی نام اتوشیوس یا تاسطیوس[ا] تھا، لیکن مسلمانون مین یحیی نحوی کے نام سے مشہور رہا، علاوہ طب و فلسفہ و ادب کے دین مسیحی مین اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا، قسطنطنیہ کے عیسائی دربار مین بڑا رسوخ اسے حاصل تھا، اور زمانہ تک اس مسیحی پایہ تخت مین رہا تھا، قیصر کے دربار سے جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے، اس کو فیلوبنوس کا علمی و دینی خطاب بھی ملا تھا، لکھا ہے کہ رومی زبان مین فیلوبنوس مجتہد کو کہتے ہین، خالکدونیہ نامی مقام مین صلیبی دین کے اہم مسائل پر بحث و مباحثہ کے لیے علماے دین مسیحی کی جو مجلسین ہوتی رہین، تو بیان کیا جاتا ہے کہ چوتھی مجلس جسمین (۶۳۰) اسقف یعنی پادریون نے نمایندگی کی تھی، اس مجلس کا ایک ممتاز رکن اتوشیوس بھی تھا،

مگر باوجود ان تمام باتون کے حضرت عمرو بن عاص کے کان تک اس کے علم و فضل کی شہرت جب پہنچی تو جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اس کو حضرت عمرو بن عاص نے بلایا،

واکرمہ ورای لہ موضعا اور اس کی عزت کی اور خاص حیثیت اسکی

[ا] ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا مین پہلے نام کا اور تاریخ الحکما مین قفطی نے دوسرے نام کا ذکر کیا ہے، غیر عربی نامون کے متعلق عربون مین اس قسم کا اختلاف پیدا ہوجانا محل تعجب نہین ہوسکتا، مسلمانون کے نام کو یورپ والے کن شکلون مین بگاڑ رہے ہین اسی پر قیاس کر لیجیے۔

(ص ۱۰۴) ان کی نظر میں قائم ہوگئی،

قفطی نے اسی واقعہ کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

فلازمہ و کان لا یکاد یفارقہ — اور اسکو عمرو بن عاصؓ نے اپنے ساتھ رکھ لیا اور مشکل ہی سے وہ اس سے الگ ہونا چاہتے تھے،

(ص ۲۳۲)

پھر دونوں کے تعلقات کی تفصیل کی ہے،

اور عمرو بن عاصؓ تو پھر بھی ایک ملک کے والی اور گورنر تھے، امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو وقت کے سب سے بڑے حکمران اور ان کے زمانہ میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے، وہی مرکز وحید تھے اور اسی کے ساتھ صحابیت کا شرف بھی رکھتے تھے، ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کے دوسرے صیغوں اور محکموں کے سوا ان کے دربار میں بھی طبی سررشتہ کا تعلق عیسائیوں یعنی غیر مسلم اطبار کے ہاتھوں میں ہے جن میں ابن آثال اور دوسرے عیسائی طبیب جس کا اصلی نام معلوم نہیں، مگر مسلمانوں میں ابوالحکم کے نام سے مشہور ہے، ان دونوں کے تذکروں اور ان کے قصوں سے کتابیں معمور ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن آثال تو علاج ومعالجہ میں مشہور تھا، اور ابوالحکم دواسازی میں امتیاز رکھتا تھا، طبقات الاطباء میں ابن آثال کے متعلق لکھا ہے کہ

جب حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی حکومت کا اعلان دمشق میں کیا تو ابن آثال کو اپنا معالج خاص مقرر کیا، اس کے ساتھ وہ بہت سلوک کرتے تھے، اور اس کے بہت معتقد تھے، صبح و شام اس سے گفتگو کرتے۔" (ص ۱۱۶ ج ۱)

اسی طرح ابوالحکم کے متعلق یہ لکھکر کہ کان طبیبا نصرانیا یعنی وہ ایک عیسائی طبیب تھا لکھا ہے کہ

طبی امداد امیر معاویہؓ اس سے بھی حاصل کرتے تھے، اور دواؤں کی ترکیب میں اس پر بھروسہ کرتے تھے (ص ۱۱۹)

جب گورنروں اور گورنروں سے بھی آگے بڑھکر خود وقت کے حکمران کے درباروں میں غیر مسلم اطباء کی اسلام

کے عہد آغاز یعنی عہد صحابہ ہی میں یہ آؤ بھگت ہو رہی تھی تو عام مسلمانوں میں ان غیر مسلم طبیبوں کی مقبولیت کی کوئی حد ہو سکتی تھی،

دوسری صدی کے امام، امام شافعی سے لیکر عہد غزالی تک تقریباً پانچ ساڑھے پانچ صدیوں کی اجمالی شہادت آپ کے سامنے جو گذری کہ مسلمانوں کے عام علاقے غیر مسلم طبیبوں سے بھرے ہوئے تھے، کیا مذکورہ بالا معلومات کے بعد بھی کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ دین سے بُعد یا طول امد کی قدرتی افسردگی کا یہ نتیجہ تھا،

میں تو کہتا ہوں کہ تاریخوں میں یہ واقعہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ امیر معاویہؓ کے دربار کا یہی عیسائی طبیب یا دواساز ابوالحکم ان کے حکم سے یزید کے ساتھ حج کے موسم میں مکہ معظمہ آیا، اور ساتھ ساتھ رہا، یا عباسیوں کے زمانہ میں اسی ابوالحکم کو جس نے کافی عمر پائی تھی۔ کہ کے عباسی گورنر عبد الصمد بن علی نے اپنے علاج کیلیے مکہ بلوایا[۱]، اور مسلمانوں کی طرف سے کوئی اعتراض اس پر نہیں ہوا، تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حارث بن کلدہ مکہ معظمہ میں مسلمانوں کے علاج و معالجہ کا کام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انجام دے چکا تھا،

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ پہلی صدی ہجری کا وہ واقعہ ہے جس کا ذکر ابن سعد نے اپنی طبقات میں کیا ہے۔ یعنی شام کے ایک عیسائی طبیب جس کا نام عبد الرحمٰن تھا، لکھا ہے کہ کسی وجہ سے شام چھوڑ کر وہ مکہ معظمہ پہنچا اور وہیں اس نے مطب قائم کیا، طبقات کے الفاظ یہ ہیں کہ

كان عبد الرحمٰن ابو داؤد نصرانيا	عبد الرحمٰن جس کی کنیت ابو داؤد تھی ایک عیسائی تھا،
وكان رجلا من اهل الشام وكان	شام کا باشندہ تھا اور طبابت کرتا تھا، پھر مکہ
يتطبب فقدم مكة فنزلها (ج ۵ ص ۳۶۵)	آیا، اور وہیں رہ پڑا،

قابل توجہ اور خاص طور پر جو چیز عبد الرحمٰن الطبیب النصرانی کے تذکرہ میں اہمیت رکھتی ہو وہ یہ ہے

---

[۱] دیکھیے طبقات الاطباء ج ا ص ۱۱۹

کہ مکہ معظمہ مین اپنا مطب اس عیسائی طبیب نے کہان قائم کیا تھا، ابن سعد کا بیان ہے کہ

عبد الرحمن یجلس فی اصل منارة	کوہ صفا کی طرف مسجد حرام یعنی کعبہ کا جو منارہ
المسجد الحرام من قبل الصفا (۲)	تھا عبد الرحمن اسی منارہ کے نیچے بیٹھا کرتا تھا،

جیسا کہ مین نے عرض کیا یہ واقعہ پہلی صدی ہجری کا ہے، ذرا اندازہ کیجیے مسلمانون کی دینی فراخ دلی کا کہ ایک غیر مسلم طبیب ان کے اس شہر مین آکر قیام کرتا ہے، جہان ان کی نماز دن کا قبلہ اور بیت اللہ ہے جس کا وہ حج کرتے ہین، اور اسی بیت اللہ کی مسجد کے منارے کے پایہ کے پاس مطب کھولتا ہے، لیکن کسی کو اس پر اعتراض تو کیا ہوتا ہے، بلکہ لکھا ہے کہ شرفاے قریش مین آل جبیر کا جو ممتاز خاندان تھا، اسی خاندان کی سرپرستی اس عیسائی طبیب کو حاصل تھی، ابن سعد ہی مین ہے

ووالی آل جبیر بن مطعم بن	موالات کا تعلق جبیر بن مطعم بن عدی کے
عدی	خاندان والون سے عبد الرحمن نے قائم کیا تھا،

آج دنیا مین ایسے کتنے ممالک اور علاقے ہین، جہان اس لیے کہ مسلمانون کی آبادی اتفاقاً قلیت کے داغ سے داغدار ہو گئی ہے، اکثریت والون نے ان کی زندگی کو دوبھر بنا رکھا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اپنے عہد اقتدار مین غیر قومون کے ساتھ موجودہ مسلمانون کے باپ دادون نے جو سلوک کیا تھا یہ اسی کا انتقام ہے۔

اس بے بنیاد دعوے کے مقابلہ مین تاریخ کی شہادتین کیا ہین ؟ یا جرم کی سزا ان لوگون کو دینی جنھون نے خود کوئی جرم نہین کیا ہے، مگر یہ الزام لگا کر کہ تم نے نہ سہی تمھارے باپ دادون نے تو جرم کا ارتکاب کیا تھا، قانوناً و عقلاً کس حد تک غیر مجرمون سے بدلہ لینا درست ہو سکتا ہے، ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے مین صرف اسی ایک جزئی واقعہ کو پیش کرتا ہون، اور پوچھتا ہون کہ مسلمانون کے ان ہی باپ دادون کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے، جو اپنے مقدس ترین شہر مین بھی اپنی سب سے

بڑی مرکزی مسجد کے زیر سایہ غیر مسلم آدمی کو پناہ دینے سے بھی دل میں تنگی نہیں محسوس کرتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے گذشتہ آباء و اجداد جن پر تنگ نظری اور قومی و ملی عصبیت کے مریض طبائع کی طرف سے طرح طرح کے الزام تراشے جاتے ہیں، کاش! اپنی کوتاہ بینی کے عوارض سے پاک ہو کر مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے، تو ان کو شاید یہ ماننے پر مجبور ہونا پڑے گا، کہ جن گذرے ہوئے بزرگوں کو طعن و تشنیع کا آج نشانہ بنایا جا رہا ہے، ان کے سینے اتنے کشادہ اور نگاہیں اتنی وسیع تھیں، اور اسی بنا پر ایسی باتیں وہ کر گذرتے تھے، کہ جن کو کرنا تو کرنا شاید عہد جدید کے مسلمان اس کے سننے کی تاب بھی نہیں لاسکتے،

دور کیوں جائیے، اسی طب و طبابت کے قصہ میں ابن ابی اصیبعہ نے مشہور غیر مسلم عیسائی طبیب جبیر بن بختیشوع کے تذکرے میں یہ قصہ جو نقل کیا ہے کہ ایک دن ہارون عباسی خلیفہ دربار میں بیٹھا ہوا تھا، جبرئیل بھی حاضر تھا، ہارون نے جبرئیل کی طرف خطاب کرکے کہا کہ

"تم جانتے ہو میرے دل میں تمھاری کتنی جگہ ہے"

پھر خود ہی ہارون نے مسلمانوں سے بھرے ہوئے دربار میں کہنا شروع کیا کہ

"خدا کی قسم موقف (یعنی میدان عرفات جہاں کے قیام کے بغیر حاجی کا حج پورا نہیں ہوتا اسی موقف میں) ہے، جبرئیل میں نے تیرے لیے دعائیں کیں، اور بہت زیادہ دعائیں کیں" (طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۲۰)

موقف یعنی عرفات کے میدان کی دینی اہمیت مسلمانوں میں جتنی ہے، جو اس سے ناواقف ہیں، وہ شاید صحیح طور پر اندازہ نہیں کرسکتے کہ ہارون اس وقت کیا کہہ رہا تھا، اور غیر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری کی کتنی غیر معمولی مثال پیش کر رہا تھا، جذبۂ احسان شناسی کی یہ ایک تاریخی نظیر ہے، جسے عمل کرکے ہارون نے دکھایا، مسلمانوں پر جنھوں نے احسان کیا ان کو وہ کہیں نہیں

بھولتے، حرم میں جگہ دیتے ہیں، حرم کی مسجد کے نیچے اسے خود بٹھاتے ہیں، اور حد یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ جس کے لیے دعائیں کر رہا ہوں وہ مسلمان نہیں ہے، وہ اس خاص مقام پر دعا کرتے ہیں، جس کے متعلق کم از کم ان کا یہ دینی اذعان، اور ایمانی ایقان ہے کہ وہاں کی دعا نامقبول نہیں ہوتی، دربار سے بعضوں نے ہارون سے پوچھا بھی، جواب میں اس نے کہا تھا کہ

"میں مسلمانوں کے حقوق کا محافظ ہوں اور جبرئیل میری جسمانی صحت کا محافظ ہے،

اس لیے دراصل جبرئیل کا وجود مسلمانوں کا محافظ ہے"

راوی کا بیان ہے کہ ہارون کے اس جواب کو سن کر دربار والوں نے کہا

صدقت یا امیرالمومنین (ر ر) آپ نے سچ فرمایا اے مسلمانوں کے امیر

میں نہیں جانتا کہ اس صدقت (سچ کہا آپ نے) کی تصدیق پر اس زمانے کے مسلمان آمادہ بھی ہوں گے یا نہیں؟ مگر اتنی بات کے لیے تو کسی تلاش و جستجو کی بھی ضرورت نہیں، آپ کے سامنے زمین کے اسی کرہ پر حبشہ (ابی سینیا) کی عیسائی حکومت تیرہ سو سال سے قائم ہے، اپنے جغرافی محل وقوع کے لحاظ سے کوئی نہیں جانتا کہ اگر چاہا جاتا تو اپنے محروسہ مقبوضہ علاقہ میں بآسانی اس علاقے کو بھی شریک کر لے سکتے تھے، مگر اسی جذبۂ امتنان و تشکر کا یہ نتیجہ ہے کہ کشور کشائیوں کے سلسلے میں مسلمان دنیا کے دور دراز علاقوں میں گھستے چلے گئے، لیکن حبشہ والوں نے بڑے نازک وقت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی مختصر تعداد کو چونکہ پناہ دی تھی، اس لیے نگاہ غلط انداز بھی ان کی حبشیوں کی اس سرزمین پر نہیں پڑی، حالانکہ جس وقت حبشہ والوں نے ان صحابیوں کو پناہ دی تھی اس وقت بھی ان کی اکثریت دین مسیحی ہی پر قائم ہے،

کچھ بھی ہو، میرا جو خیال ہے وہ یہی ہے کہ مسلمان حکمرانوں اور عام مسلمانوں نے بغیر کسی تنگ دلی کے غیر مسلم اطباء کے خدمات سے استفادہ کے سلسلہ کو زندہ جو جاری رکھا، اس کی حوصلہ افزائی عہد نبوت

و خلافت راشدہ کے روایات ہی سے ہو رہی تھی،

اور شاید یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ الخلیفہ نے بھی اپنے زمانہ میں اطبا کے ساتھ مردانی حکمرانوں کے جو تعلقات تھے، ان میں صرف یہی نہیں کہ کسی قسم کی ترمیم و اصلاح نہ فرمائی، بلکہ کتابوں میں لکھا ہے کہ اہرن بن اعین القس کی کتاب کناشہ (یا قرابادین) کا ترجمہ سریانی زبان سے بنی امیہ کے عہد کے یہودی طبیب ماسرجویہ نے عربی زبان میں جو کیا تھا، اور علاوہ شرح کے مزید دو مقالوں کا بھی اضافہ اس کتاب میں اس کی طرف سے عمل میں آیا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے چالیس دن تک، اس کتاب کو اپنی عبادت گاہ کے کمرہ میں رکھا، اور اس کے بعد حکم دیا کہ عام مسلمانوں میں یہ کتاب پھیلا دی جائے، (طبقات الاطبا، ص ۱۶۳ ج ۱)

زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی جس اصلاحی خدمت کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ عام طور پر اس زمانے میں یہودی اور عیسائی اطبا تریاق کے نام سے جو چیز تیار کرتے تھے، اس میں سانپ بھی نسخہ کا ایک جز تھا، ابن سعد نے طبقات میں ابن لہیعہ محدث کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے صوبہ کے عامل کو لکھا تھا کہ تریاق میں بجائے مردہ سانپ کے نہ ڈالا جائے،

الا حیۃ ذکیۃ (ص ۲۸۰ ج ۵) مگر ذبح کیا ہوا سانپ،

حالانکہ سانپ خواہ میتۃ (مردہ) ہو، یا ذکیہ (ذبح کیا ہوا) ہر حال میں حرام ہے، مگر طبی ضرورت سے ایسا معلوم ہوتا ہو کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا خیال بھی وہی تھا، جو بہت سے دوسرے ائمہ اسلام کا ہے کہ دواءً حرام چیزوں کا استعمال بھی جائز ہوتا ہے[۵]، میں خود طبیب نہیں ہوں، مجھے معلوم نہیں ہے کہ تریاق میں

---

[۵] حرام چیزوں سے دواءً استفادہ یا ان کا کھانا جائز ہے یا نہیں، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ اس باب میں یہ نقل کیا جاتا ہے کہ جب تک اطبا صحت کو اسی دوا کے استعمال کے ساتھ محدود نہ کریں، اس وقت تک ان کا استعمال

سانپ کو لوگ کس طرح شریک کرتے تھے، آج کل کے اطباء کا اس کے متعلق کیا خیال ہے، عہد جدید کی ڈاکٹری دواؤں میں مسلمانوں کے لیے عام ابتلا کی جو صورت پیش آگئی ہے، ارباب علم و فتویٰ چاہیں تو حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کے اس "اثر" سے سہولت کی راہ پا سکتے ہیں،

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنی امیہ کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار آیا، تو ایک طرف جیسا کہ عام طور پر لوگ جانتے ہیں، قدیم عربی حمیت کے بجھے ہوئے شعلے ان کے زمانہ میں بھڑک اُٹھے تھے، جس اسلامی نظام میں ایران کا نومسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کا رکن بن جاتا تھا، خالص قریشی نژاد خلیفہ عمر فاروقؓ اپنی صاحبزادی کو اس کے عقد ازدواج میں دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں،[۱]

حبشی بلالؓ ان ہی عمر فاروقؓ کا سیدنا بن جاتا ہے، اسی اسلامی نظام میں بنی امیہ کے فرمانرواؤں نے عربی و عجمی موالی و غیر موالی کے سوال کو اٹھایا، اور جہاں تک ان کے امکان میں تھا، اس کلمہ منتنہ[۲] (بدبودار) سے نفع اٹھانے میں کمی نہ کی،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۹) جائز نہ ہوگا یعنی اس حرام کا بدل حلال دوا اگر مل سکتی ہے، تو اس وقت تک حرام دوا کو استعمال نہ کرنا چاہئے، لیکن دوسرے ائمہ کا فتویٰ ہے کہ بدل ملے یا نہ ملے، دوائے حرام چیزوں کا استعمال حرام ہی نہیں ہے تفصیل کے لئے فقہ کے مطولات کا مطالعہ کیا جائے، عجیب بات یہ ہے کہ امام شافعی کا نام بھی ثانی الذکر طبقہ میں لیا جاتا ہے یعنی دوائے حرام چیزوں کا استعمال جائز ہو جاتا ہے، مگر دمیری نے حیات الحیوان میں نقل کیا ہے کہ جس تریاق میں سانپ ملا لیا گیا ہو، امام شافعی اس کے کھانے کی اجازت اس وقت تک نہیں دیتے تھے، جب تک کہ اضطرار کی حالت نہ پیدا ہو جائے، جس میں قرآن نے مردار کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے (ج ا ص ۲۴۵ حیات الحیوان دمیری) ۱۲) [۱] میرا اشارہ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہے، ۱۲۔

[۲] عہد نبوت و رسالت میں نسلی وطنی سوالات کوئی اگر اٹھاتا تو آواز بلند ہوتی تھی، دعوہا فانہا کلمۃ منتنۃ (اسکو چھوڑو یہ بدبو بات ہے)

گر باوجود اس کے ہم اطبا کے لباس میں ان ہی اموی فرمانرواؤں کی شاہی خواب گاہوں میں یہودی اور عیسائی طبیبوں کو پاتے ہیں، ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے کہ یہ ہی مروانی حکمران عبد الملک جب مرض الموت میں مبتلا ہوا، تو وہی عیسائی طبیب جس کی کنیت مسلمانوں نے ابو الحکم رکھدی تھی، پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے کہ یزید کے ساتھ بطور اتالیق کے موسم حج میں امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو حجاز بھیجا تھا، اسی ابو الحکم کا بیان ہے کہ عبد الملک نے اس کو اپنے زمانہ میں بلا لیا، اسکی روایت کے الفاظ ہیں :-

فانی لجالس وعنده بناته (ج ۱ ص ۱۱۶) یعنی میں عبد الملک کے بستر علالت کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اور عبد الملک کی لڑکیاں بھی وہاں تھیں

واللہ اعلم درمیان میں کوئی پردہ تھا، یا برقع اوڑھکر باپ کے پاس عبدالملک کی یہ شہزادیاں آئی تھیں، میری غرض یہ ہے کہ قرب اور نزدیکی کا جو مقام غیر مسلم طبیبوں کو مروانی حکومت میں دیا گیا تھا، کیا اس کے بعد بھی کوئی مرتبہ سوچا جا سکتا ہے؟[۵۲]

---

[۵۱] آگے جو قصہ ابو الحکم نے بیان کیا ہے وہ بڑا دردناک ہے، لکھا ہے کہ اسی عرصہ میں عبد الملک کے ولی عہد ولید بھی اسی کمرے میں داخل ہوا، اور باپ سے حال پوچھنے لگا، مگر جس انداز سے مزاج پرسی کر رہا تھا، عبد الملک نے تاڑ لیا، یعنی اپنی بادشاہی کا خواب اس کے مرنے کے بعد دیکھ رہا ہے، عبد الملک کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر جاری ہوا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ

"ایک شخص میرا حال دریافت کر رہا ہے، اور چاہ رہا ہے کہ میں مرجاؤں، دوسری طرف کچھ عورتیں (لڑکیاں) مزاج پرسی کر رہی ہیں، اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں"

[۵۲] صرف قیاس سے میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں، طبقات الاطبا ہی میں ابو سہل نوبخت ایرانی طبیب کے ذکر میں لکھا ہے کہ خلیفہ منصور کے پاس پہلی دفعہ جب ابو سہل پیش ہوا، تو نام پوچھنے پر اس نے اپنا اصل ایرانی نام بتاتے ہوئے کہا کہ میرا نام "خرشاذ ماہ طیماذاہ مافرباذ خسرو ابہشاذ" ہے اس طویل لمبے نام کو سنکر منصور مسکرایا پھر کہا کہ تمھارے باپ نے تو عجب تماشا کیا ہے آپ دو ہی صورت ہیں، یا ان تمام الفاظ میں سے "طیماذاہ" کے لفظ کو میں چن لیتا ہوں اسی نام سے تم کو موسوم کیا جائیگا اور چاہو تو کنیت "ابو سہل"

حیرت ہوتی ہے کہ عربیت کے سب سے بڑے علمبردار اموی حکومت کے تاج کا جوہر تابدار اور مسلمانوں کا سب سے بڑا ظالم تھا، حجاج بن یوسف ثقفی جیسے آدمی کو بھی طبی کاروبار میں ہم کافی وسیع النظر پاتے ہیں جو اس کی جو کچھ بھی ہو، مان بھی لیا جائے کہ پرخوری کی عادت بد سے مجبور ہو کر وہ طبیبوں کا دست نگر ہو گیا تھا لیکن جس نے سارے ایرانی ممالک کے فارسی دفاتر کو عربی زبان میں بہ یک اشارۂ چشم بدل دیا تھا، اس کے لئے کیا دشوار تھا کہ عربی النسل اطباء کو اپنے ارد گرد جمع کر لیتا، خصوصًا بنی ثقیف جس سے حجاج کا خاندانی تعلق تھا، اسی قبیلہ میں پشتہا پشت سے عربی طبیبوں کا ایک سلسلہ اسلام سے پہلے بھی پایا جاتا تھا، اور بعد کو بھی اس خاندان کے اطباء کا ذکر لوگوں نے کیا ہے، یعنی وہی حارث بن کلدہ جو عہد نبوت میں حجاز کا سب سے بڑا طبیب شمار ہوتا تھا، اور اس کو بھی جانے دیجئے، حجاج کے لئے کیا دشوار تھا کہ اپنے علاقہ چند سال کی طبی درس گاہ میں عرب نوجوانوں کو بھیج کر اپنے لئے عربی النسل اطباء کا اسٹاف مہیا کر لیتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حجاج کے دربار کا بھی سب سے زیادہ دسترس پانے والا اور اس کا محبوب ترین چہیتا طبیب بھی عیسائی ہی تھا، نام اس کا لوگ تیا ذوق بتاتے ہیں، تلفظ کی صورت بتاتی ہے کہ کسی غیر معمولی عربی لفظ کی یہ عربی شکل ہے، واللہ اعلم بالصواب، ابن ابی اصیبعہ جس کی نظر سے ابراہیم بن القاسم الکاتب کی کتاب "اخبار الحجاج" گذر چکی تھی جس میں کافی بسط و تفصیل کے ساتھ حجاج کے حالات درج کئے گئے ہیں، اسی کتاب کے حوالہ سے بھی اور دوسری کتابوں سے بھی اخذ کر کے تیا ذوق کے بڑے دلچسپ قصے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں، اسی میں لکھا ہے کہ

کان یعتمد علیہ و یثق بمداواتہ	حجاج تیاذوق پر بھروسہ کرتا تھا، اور
وکان لہ منہ الجامکیۃ	اس کے علاج پر اعتماد کرتا تھا، حجاج

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۱) رکھ لو، ابوسہل نے دوسری صورت کو سہل قرار دیا، اور بعد کو "ابوسہل" کے نام سے مشہور ہوا، جس سے معلوم ہوا کہ عربی کنیت ان عیسائی یا یہودی طبیبوں کی مسلمانوں کی طرف سے رکھی جاتی تھی، ۱۲

الوافرۃ، والاقتصاد الکثیر | کے ہاں سے غیر معمولی تنخواہ بھی تیاذوق کو ملتی تھی، اور یوں بھی اس کی بہت زیادہ خبر گیری کرتا تھا،

(ص ۱۲۱ ج ۱)

یہ بھی لکھا ہے کہ جب تیاذوق مرض موت میں مبتلا ہوا تو حجاج عیادت کے لئے براہ راست اس کے گھر گیا خود کہتا تھا کہ

لما حضرتہ الوفاۃ دخلت علیہ اعودہ، (ص ۱۲۳) | جب تیاذوق مرض الموت میں مبتلا ہوا تو میں اس کے گھر گیا عیادت کرنے کے لئے،

آج ان الفاظ کے وزن کو ہم محسوس نہیں کر سکتے تھے لیکن حجاج جو اموی حکومت کے سارے ایشیائی علاقہ کا مطلق العنان والی و حاکم تھا، اور نخوت و کبر میں اس کا جو حال تھا، ان امور سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنا غیر معمولی واقعہ تھا، ممکن ہے کہ اس میں تیاذوق کی غیر معمولی حذاقت کو بھی دخل ہو، حجاج اپنے لڑکے محمد سے بیان کیا کرتا تھا کہ

"بقائے صحت کے متعلق تیاذوق کے طبی مشوروں کو میں نے اپنے تجربہ میں بالکل درست پایا، اور ہمیشہ ان پر عمل کرنے سے مجھے نفع پہنچا"[ا]

یا تیاذوق کی غیر معمولی حاضر جوابیوں سے حجاج کے دل میں غیر معمولی اثر اس کا جو قائم کر دیا تھا، اس کا نتیجہ ہو، حجاج اپنے بے پناہ مظالم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہمیشہ مشکلات میں گھرا پاتا تھا، تیاذوق جب آجاتا، تو اس کی گفتگو سے تھوڑی دیر کے لئے اس کا غم غلط ہو جاتا تھا، اس سلسلہ میں لوگوں نے تیاذوق کے متعدد لطیفوں کا ذکر کیا ہے جن میں اُس کے ذہنی انتقال کی بڑی اچھی مثال یہ ہے کہ حجاج کے سر

[ا] اگر یہ واقعہ ہے جیسا کہ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں نقل کیا ہے کہ بعضوں نے حجاج کو دسترخوان پر کھاتے ہوئے پایا جتنے لقمے اٹھاتا تھا، انھیں وہ گن رہے تھے، بیان کرتے تھے کہ مسلم ایک روٹی میں ایک کف دست

مین درد تھا، تیاذوق بلایا گیا، اُس نے حکم دیا کہ امیر کے پاؤن پر گرم پانی ڈالا جائے، اور تیل کی مالش کی جائے، ایک خواجہ سرا جو عموماً خصی ہوتے تھے، حجاج کے سامنے کھڑا تھا، بے ساختہ بول اٹھا کہ درد تو امیر کے سر مین ہی اور یہ عجیب طبیب ہے مشورہ دے رہا ہے کہ امیر کا پاؤن دھویا جائے، تیاذوق نے کہا کہ میرے دعوی کی دلیل تو تیرے چہرے پر ہے، خواجہ سرا نے کہا کہ وہ کیا، بولا کہ جو چیز تمھارے اندر سے نکالی گئی، وہ کہان تھی اور داڑھی تمھارے چہرے سے غائب ہوگئی، خواجہ سرا شرمندہ ہوگیا،

بہرحال عبد الملک اور حجاج جو غربت کی زندگی سے امارت و دولت تک پہونچے تھے، بداوت کے یادہ عادیت سے زیادہ دور نہین ہوئے تھے، جب اُن کے دربارون مین غیر مسلم اطباء کو عزت وجاہ کی اُن بلندیون پر ہم پا رہے ہین، تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آیندہ ان مروانی حکمرانون کے تعلقات کی نوعیت ان طبیبون کے ساتھ ترقی کے کس نقطہ تک پہونچ گئی ہوگی، جنھون نے شاہی خانوادہ مین پرورش پائی تھی اور پیدا ہونے کے ساتھ ناز و نعمت کی زندگی کے عادی تھے، ان ہی حکمرانون مین جب اس قسم کے لوگ پیدا ہو چکے تھے، جو فخر کرتے تھے کہ مین کسریٰ کا بیٹا ہون، اور مروان میرا باپ ہے، میرا نانا قیصر بھی ہے، اور

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۳) کھن بھرتا اور نگلتا جاتا تھا، اس طرح (۴۰) لقمے مین نے اس کے گنے غالباً تیاذوق کی دوا نے ہی اس کے معدے مین ہضم کی یہ غیر معمولی قوت پیدا کر دی تھی، (دیکھو ابن عساکر ج ۵ ص ۲) طبقات الاطباء مین ایک لطیفہ یہ نقل کیا ہے کہ تیاذوق سے حجاج نے کچھ ضعف معدہ کی شکایت کی، اس نے مشورہ دیا کہ بھنے ہوئے پستے سامنے رکھ لیجئے، اور ایک ایک دانہ توڑ توڑ کر بطور نقل کے استعمال کیجئے، حجاج نے درباریون سے کہا کہ بھنے ہوئے پستون کے استعمال کا مشورہ آج تیاذوق نے مجھے دیا ہے، کہتے ہین کہ مختلف درباریون کے گھر سے بھنے ہوئے پستون کے خوان نازل ہونے لگے، حجاج نے بھی مٹھیون مین بھر بھر کر پھانکنا شروع کیا، ...ا کھا گیا کہ بدہضمی ہوگئی، تیاذوق بلایا گیا، حجاج نے کہا کہ یہ کیا ہوا؟ بولا کہ اے امیر! مین نے تو عرض کیا تھا کہ دانہ دانہ کر کے اسے چکھئے گا، آپ نے تو پھانکنا شروع کیا، حجاج شرمندہ ہوگیا، پھر علاج معالجہ سے طبیعت درست ہوگئی

خاقان بھی[۵]،

سوچا جا سکتا ہے کہ اپنی ہم رشتہ قوموں کے افراد کے ساتھ حسن سلوک میں اگر اسے خالص عربی نژاد بزرگوں سے وہ آگے بڑھ گئے ہوں، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے،

افسوس ہو کہ مروانیوں کے اسی سال کے دور حکومت میں دربار سے جن جن اطبار کا تعلق رہا، لوگوں نے تفصیلی تذکرہ اپنی کتابوں میں نہیں کیا ہے مگر تیاذوق ہی کے متعلق ہم ان ہی میں پاتے ہیں کہ اس کا بیٹا بھی طبیب تھا، ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اسی بیٹے کے لئے تیاذوق نے "کناش کبیر" بھی لکھی تھی، اور کتاب الادویہ بھی جس میں بیان کیا ہے کہ

کیفیۃ دقہا وایقاعہا واذابتہا	دواؤں کے کوٹنے اور ان کے ڈالنے
وشی من تفسیر الادویۃ،	گھلانے وغیرہ کے طریقے بھی بیان کئے
	گئے تھے، اور بعض دواؤں کے نام کی
(صفحہ ۱۲۳)	بھی تشریح کی تھی،

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بعد تیاذوق نے شاگردوں کی بھی معقول تعداد چھوڑی تھی جن میں ایک یہودی طبیب فرات بن شحاثا کے متعلق طبقات الاطبار میں لکھا ہے کہ

کان تیاذوق المتطبب یقدمہ	تیاذوق طبیب اس کو (یعنی فرات بن
علی جمیع تلامذتہ،	شحاثا) کو اپنے تمام دوسرے شاگردوں

---

[۵] عام تاریخوں میں یزید بن الولید مروانی فرمانروا کی طرف عربی کا یہ شعر منسوب کیا گیا ہے، وہ کہا کرتا تھا،

انا ابن کسریٰ وابی مروان   وقیصر جدّی وجدی خاقان

مسعودی ص ۳، ابن کامل اسی کا ترجمہ درج کیا گیا ہے، کہتے ہیں کہ یزید بن الولید کی ماں جس کا نام شاہ آفرید بنت فیروز تھا، کہتے ہیں کہ اس میں واقعی ایران کے کسریٰ روم کے قیصر ترکوں کے خاقان کا خون شریک تھا، ۱۲،

(جلد ا صفہ ۱۶۱) پر ترجیح دیتا تھا،

اسی فرات بن شحاثا یہودی کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ

خدم الحجاج بن یوسف و هو حدث — اُس نے حجاج بن یوسف کی بھی اس زمانہ مین خدمت کی تھی، جب یہ یہودی طبیب جوان تھا،

(ج ا صفہ ۱۶۱)

فرات نے کافی عمر پائی، مروانیون کا دور جب ختم ہوگیا، اور ان کے جانشین عباسی ہوئے تو ان کے دربار مین فرات داخل ہوگیا، کوفہ کے عباسی گورنر عیسیٰ بن موسیٰ نے اس کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا تھا، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، عیسیٰ کا وہ صرف طبیب ہی نہین تھا، بلکہ سیاسی مشیر بھی، بعض سیاسی مشورے فرات نے جو اس کو دیئے تھے، فرات کی وفات کے بعد جب واقعات اسی کی سیاسی بصیرت کے مطابق پیش آتے، تو عیسیٰ کہا کرتا تھا کہ

فرات! تو کتنا صائب الرائے آدمی تھا، جو بات بھی تو کہتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقوع سے پہلے گویا بے نقاب ہوکر تیرے سامنے آجاتی تھی، جو واقعات آج میرے سامنے پیش آرہے ہین، تو ان کو گویا دیکھ رہا تھا، (صفہ ۱۶۳)

ابن ابی اصیبعہ نے فرات کے بعض سیاسی مشورون کا تذکرہ بھی کیا ہے، جو پڑھنے کے قابل ہین افسوس ہے کہ اُن کی تفصیل کا یہان موقع نہین ہے، اُن کے پڑھنے سے ایک طرف جہان اس کا پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ان طبیبون پر کتنا غیر معمولی اعتماد مسلمانون کے سلاطین و امراء کرتے تھے، تو دوسری طرف اس کا بھی انکار نہین کیا جا سکتا ہے کہ اپنے قدر شناسون کے ساتھ ان کے تعلقات بھی کتنے مخلصانہ اور سچی بہی خواہیون پر مبنی تھے،

جیسا کہ مین نے عرض کیا، مروانی حکمرانون کے دربار کے ان طبیبون کا تفصیلی تذکرہ کتابون مین

نہین پایا جاتا، لیکن جب عباسیون نے اپنے ہاتھ مین مسلمانون کی حکومت کی باگ لی، اس وقت جو تماشا اس سلسلہ مین پیش آیا، وہ دیکھنے کے قابل ہے،

عباسیون نے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہین زیادہ تر کامیابی غیر عربی عناصر کی امداد و معاونت سے حاصل کی تھی، قدرتًہ ان کا دربار عجمیون سے بھر گیا، عمومًا مالی کاروبار کا عباسیون کے زمانہ مین یہودی جہبذون یا موجودہ اصطلاح مین یہودی بنیک کارون سے تعلق تھا،

عباسیون کی تاریخ کا یہ ایک بڑا اہم باب ہے، میرے سامنے اس وقت صرف اطبار اور معالجین کا قصہ ہے، آیئے پہلے اس کو سُن لیجئے، پھر اگر توفیق رفیق ہوئی تو عہد عباسی کے "جہابذہ" کی داستان بھی سُنائی جائیگی اگر "اجل مسمیٰ" نے فرصت نہ دی تو مین دوسرے اربابِ علم وقلم سے درخواست کرتا ہون کہ آیندہ اس مضمون کی تکمیل فرما دین گے،

سچ پوچھئے تو غیر مسلم اطبار کے عروج و اقبال کا حقیقی زمانہ عباسیون ہی کا عہد ہے، ان کے دربار مین یہودی عیسائی، مجوسی، صابی اطبار کے سوا نیا عنصر ہندوستانی طبیبون کا بھی داخل ہو گیا تھا کہتے ہین کہ عباسیون کا دوسرا خلیفہ ابو جعفر منصور ضعف معدہ مین مبتلا تھا اچھا نہ ہوتا تھا، ایک ہندوستانی طبیب نے پھنکی بنا کر دی جس سے صحت حاصل ہوئی، اور اُس کے دل مین ہندی طریقۂ علاج کا وزن پیدا ہوا، نیز خالد برمکی کو ہند اور ہندی علوم سے جو تعلق تھا، اس کو بھی عباسیون کے دربار مین "ہندی طب" بلکہ دوسرے ہندی علوم وفنون کی روشناسی مین بہت دخل ہے، اب خواہ اسباب کچھ بھی ہون ہندوستانی اطبار کی کافی تعداد مختلف زمانہ مین بغداد پہنچی ہے، ہندی طب کی بے شمار کتابون کا ترجمہ عربی زبان مین کیا گیا، اردو زبان مین کافی مواد اس مسئلہ مین جمع ہو چکا ہے، ابن ابی اصیبعہ نے ہندی اطبار اور ہندی طب کی جو کتابین عربی مین ترجمہ ہوئین ان کی فہرست درج کی ہے، جس مین دلچسپ بات یہ ہے، کہ منجملہ اور

کتابون کے ایک کتاب ہندوستان سے بغداد پہنچی جس کا نام علاجات النساء تھا، یا اسی عنوان پر یہ کتاب لکھی گئی تھی، بہرحال دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ

کتاب روسی الھندیہ فی علاجات النساء، (ج ۲ صفحہ ۳۲)	روسی ہندی خاتون کی کتاب عورتون کے علاج کے متعلق ہے،

مین نہین جانتا کہ اس ہندوستانی مصنفہ کی اس خدمت کا جو اپنے جنس کی اُس نے انجام دی تھی، دوسرون نے بھی تذکرہ کیا ہے یا نہین، اور اس زمانے مین اُس کے متعلق لوگون کی تحقیق کیا ہے، کچھ بھی ہو طب جیسے اہم فن پر ہندوستان کی کسی خاتون نے کتاب لکھی ہے، اس کا پتہ تو اس تاریخی شہادت سے چلتا ہے، کاش اس فن سے تعلق رکھنے والون کی توجہ اس کتاب کی طرف مبذول ہو، سکو مسلمانون کی طب کی تاریخ پر کام کرنے والون کے حوالہ کرکے مین اپنے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہون،

سب سے پہلے تو اس سلسلہ مین دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دربار خلافت کے ساتھ تعلق رکھنے والے اطبار کی تعداد کیا ہوگی، جب ہم دیکھتے ہین کہ عباسی عہد کے امرار بھی اپنے ہان طبیبون کی ٹولیون کو ملازم رکھتے تھے، طبقات الاطبار مین مشہور عباسی امیر ابودلف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے،

کان مجلس ابی دلف مجمعًا للمتطببین،	ابودلف کی مجلس مین طبیبون کا مجمع رہتا تھا،

طبیبون کے اس مجمع مین جو لوگ شریک تھے، اُن مین بعضون کا نام بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ

کان معہ من المرتزقۃ جماعۃ منھم یوسف بن صلیبا وسلیمان بن داؤد بن بابان ویوسف القصیر ویونس بن حنون، (ج ۱ ص ۱۶۸)	امیر ابودلف کیساتھ تنخواہ یاب طبار کا ایک گروہ تھا جن مین یوسف بن صلیبا، سلیمان بن داؤد بن بابان، یوسف القصیر (کوتاہ قد) اور یونس بن حنون بھی تھے،

نام ونسب سے ہی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مسلمان نہین تھے، اسی کے بعد بیان کیا ہے، کہ مرتزقہ کے سوا

ربّما اجتمعوا فی مجلسه منهو	بسا اوقات (غیر تنخواہ دار اطبا گنج)
عشرون رجلاً	بیس بیس آدمی اس کی مجلس مین جمع
	ہو جاتے تھے،

افسوس ہے کہ لوگون نے مفصل فہرست ان طبیبون کی نہین دی ہے، جو مختلف عباسی خلفا کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اتفاقی طور پر دوسرے واقعات کے تذکرے کے ذیل مین ایسی چیزین مل جاتی ہین، مثلاً ابن ابی اصیبعہ نے مشہور عیسائی طبیب حنین بن اسحاق کے اس رسالہ کو نقل کیا ہے، جس مین اُس نے اپنی اور بختیشوع طبیب کی باہمی کش کش اور سازش کی داستان بیان کی ہے، اسی رسالہ مین حنین نے خلیفہ متوکل کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ہمارے مخالف اطبا جو ہمارے ہم مذہب یعنی عیسائی ہین، اور خلفار کی خدمت کا شرف سب کو حاصل ہے، ان کی تعداد،

ستة وخمسون رجلاً کلّهم	چھپن ہے، اور سب ہمارے ہم
من اهل المذهب، (ص۱۹۲)	مذہب ہین،

ظاہر ہے کہ دربار خلافت کے یہ چھپن طبیب اسی درجہ کے لوگ ہون گے، جو حنین سے ٹکر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے، نہین کہا جا سکتا کہ اُن کے مددگارون، دواسازون وغیرہ کی تعداد کیا ہو گی،

یہ اور اسی قسم کی دوسری شہادتون کی بنا پر یہ میرا خیال ہے کہ طب اور علاج ومعالجہ کی راہ سے عباسی دور مین غیر مسلم اقوام سے تعلق رکھنے والون نے اقتدار واثر حاصل کیا تھا، ان کی تعداد معمولی نہ ہو گی، ذرا ممالک محروسہ عباسیہ کی وسعت وفراخی کا تصور کیجئے، اور سوچئے کہ اس وسیع علاقے کے باشندون

کی طبی ضرورتون کی تکمیل کے لیے کتنے آدمیون کی ضرورت تھی، چونکہ اس پیشہ کو مسلمانون نے غیر مسلم اقوام ہی

کے سپرد کر رکھا تھا، اس لیے اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اگر عباسیون کے زمانہ مین طبابت کی راہ سے معاش،

حاصل کرنے والون کی تعداد لاکھون سے متجاوز ہو، یہ خیال بھی صحیح نہ ہوگا کہ اپنی قومی اور دینی خصوصیتون کو

ترک کرکے یا ان سے لاپروائی اختیار کرکے مسلمانون کے دلون مین ان لوگون نے جگہ پیدا کی تھی،

(باقی)

دارالمصنفین کی نئی کتاب

امام رازی

امام فخرالدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضا تھا کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے،

اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس مین ان کے سوانح و حالات اور تصنیفات کی تفصیل

کے ساتھ فلسفہ و علم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق ان کے نظریات و خیالات کی تشریح کی گئی ہے،

جو لوگ قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور و فکر کرنا چاہتے ہین، ان کے لیے یہ کتاب مشعلِ ہدایت

کا کام دے سکتی ہے، (مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی) قیمت:۔ ۲ روپیہ،

رقعات عالمگیر

اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانۂ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام

لکھے گئے ہین، اس جلد مین جمع کیے گئے ہین، اور ان سے علم ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیون

حقایق کا انکشاف ہوتا ہے، قیمت للعہ (جامع پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی)

"منیجر"

خدمتِ حدیث مین خواتین کا حصہ

از

حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی

اسلام سے پہلے زندگی کے دوسرے شعبون کی طرح علم وفن کے شعبہ مین بھی خواتین کے کارنامون کا بہت کم سُراغ ملتا ہے، خاص طور سے عرب مین تو اس صنف کی حالت اور زار و زبون تھی، پورے ملک مین مشکل سے دو چار عورتین پڑھی لکھی مل سکتی تھین لیکن یہ اسلام کی علم پروری کا فیض تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ مین مردون کی طرح عورتون مین بھی اُس نے ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ ان کی دنیا بدل گئی، اور زندگی کے مختلف شعبون کے ساتھ علم وفن مین بھی انھون نے اپنا ایک مقام پیدا کر لیا، اور اسلام کا یہ چشمۂ فیض عرب ہی تک محدود نہین رہا بلکہ ساری دنیا اس سے سیراب ہوئی،

لیکن سوء اتفاق سے عام طور پر یہ خیال قائم کر لیا گیا ہے کہ گذشتہ زمانہ مین پردہ کی وجہ سے مسلم خواتین زندگی کے کسی شعبہ اور خاص طور سے علم وفن مین کوئی خاص حصہ نہین لے سکین، اور نہ انھون نے کوئی قابلِ ذکر یادگار چھوڑی، اور اس زمانہ مین بھی اُن کی دنیا گھر کی چار دیواری تک محدود ہے، پھر اسی وہمِ خیال کے ماتحت یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ پردہ مین رہ کر مسلم خواتین کی ترقی ممکن نہین ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ان کو اس قید سے آزاد کر کے میدانِ عمل مین آنے کی اجازت دیجائے، کہ وہ بھی مردون کے دوش بدوش زندگی کی جد وجہد مین حصہ لے سکین، اس وقت اس پر بحث کرنا مقصود نہین ہے کہ ایک صالح معاشرہ کی تعمیر اور مسلم خواتین کی واقعی ترقی پردہ میں رہ کر ہو سکتی ہے، یا اس قید سے آزاد ہو کر، لیکن تاریخ سے مذکورۂ بالا خیال کی تائید نہین ہوتی،

بلکہ اس کے برعکس یہ پتہ چلتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے اس وقت تک سیکڑوں ہزاروں پردہ نشین مسلم خواتین نے حدود شریعت میں رہتے ہوئے گوشۂ علم و فن سے لیکر میدانِ جہاد تک ہر شعبۂ زندگی میں حصہ لیا، اور اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں اپنا پورا حق ادا کیا، اس مضمون میں صرف اُن کی علمی کوششوں کے ایک گوشہ یعنی علم حدیث کے سلسلہ میں ان کی خدمات کا تذکرہ مقصود ہے،

خواتین نے علم حدیث کی جو خدمات انجام دی ہیں، اُن کی سب سے پہلی نمائندگی صحابیات مطہرات کرتی ہیں، اس لئے سب سے پہلے انہی کے کارناموں کا اجمالی نقشہ پیش کیا جاتا ہے،

صحابہ کی طرح صحابیات بھی اپنے ذہن و دماغ کے لحاظ سے ایک درجہ اور مرتبہ کی نہیں تھیں، اور نہ سب کو یکساں طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی تھی اس لئے اُن کی خدمات بھی اسی کے اعتبار سے کم و بیش ہوں گی، کیونکہ حدیث کی خدمت کے لئے سب سے زیادہ ضرورت صحبت اور فہم و فراست ہی کی تھی، صحابیات میں ازواجِ مطہرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر لحاظ سے زیادہ خصوصیت حاصل تھی اس لیے اس سلسلہ میں ان کی خدمات سب سے زیادہ ہیں، اُن میں بھی حضرت عائشہؓ اور حضرت اُم سلمہؓ کے کارنامے سب سے زیادہ ہیں،

حضرت عائشہؓ مکثرین رواۃ صحابہ (یعنی وہ صحابہ جن کی روایات .... کثرت سے موجود ہیں) میں ہیں ان کی مرویات کی تعداد (۲۲۱۰) ہے جن میں ۲۸۶ حدیثیں بخاری و مسلم میں موجود ہیں، مرویات کی کثرت کے لحاظ سے صحابہ میں ان کا چھٹا نمبر ہے،

مرویات کی کثرت کے ساتھ احادیث سے استدلال اور استنباط مسائل اُن کے علل و اسباب کی تلاش و تحقیق میں بھی اُن کو خاص امتیاز حاصل تھا اور انکی اس صفت میں بہت کم صحابہ اُن کے شریک تھے، کتبِ حدیث میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک روایت متعدد صحابہ سے مروی ہوتی ہے، اور حضرت عائشہؓ بھی وہی روایت کرتی ہیں لیکن وہ اپنی روایت میں اس کی علت و حکمت کا بھی تذکرہ کر دیتی ہیں

جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات وہ عمل کے لئے زیادتی شوق کا سبب بنجاتی ہے، مثلاً غسل جمعہ کے سلسلہ میں حضرت ابو سعید خدریؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اس دن غسل کرنا چاہئے، اول الذکر دو صحابی صرف اتنا بیان کرتے ہیں کہ جمعہ کا غسل ضروری ہے، مگر حضرت عائشہؓ نے اپنی روایت میں اس کی علت و حکمت بھی بیان کر دی ہے، فرماتی ہیں،

کان الناس ینتابون من منازلھم	لوگ اپنے گھروں اور مدینہ کے باہر
والعوالی فیاتون فی الغبار تصیبھم	کی آبادیوں سے نماز کے لئے آتے تھے، وہ
الغبار والعرق فیخرج منھم العرق	گرد و غبار اور پسینہ میں تر ہوتے تھے
فاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان	ایک دفعہ ایک صاحب آپ کے پاس آئے
منھم وھو عندی فقال النبی صلی اللہ	وہ میرے قریب ہی بیٹھے تھے، آپ نے ان
علیہ وسلم لو انکم تطھرتم لیومکم ھذا	سے فرمایا کہ اگر تم آج کے دن غسل کر لیتے
(بخاری کتاب الجمعہ)	تو کیا بہتر ہوتا،

ایک سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ کھایا جائے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابو سعید خدریؓ نے اسے دائمی حکم سمجھا، حضرت عائشہؓ کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا، کہ یہ حکم واجب اور دائمی نہیں، بلکہ مستحب ہے، اس حکم سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ قربانی کا گوشت لوگ جمع نہ کریں، بلکہ دوسروں کو کھلا پلا دیا کریں[1]،

بعض مرتبہ راوی کو پوری حدیث محفوظ نہیں ہوتی تھی، صرف حدیث کا ایک ٹکڑا یاد رہ جاتا تھا یا روایت کے مغز سخن تک نہ پہنچنے کی وجہ سے جب وہ حدیث روایت کی جاتی تھی تو روایت کا پورا مفہوم سامنے نہیں آتا تھا، بلکہ بسا اوقات معنی بھی بدل جاتے تھے، حضرت عائشہؓ جب بھی ایسی حدیث سنتی تھیں، تو اس کی تصحیح یا

---

[1] سیرت عائشہ ص ۱۶۳

تردید کر دیتی تھین، اس سلسلہ مین انھون نے اکابر صحابہ تک سے اختلاف یا ان کی روایات پر استدراک کیا ہے، تقریباً ایسی چالیس احادیث ہین جن مین انھون نے صحابہ پر استدراک کیا ہے، امام سیوطیؒ نے ان روایات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اس رسالہ کا نام عین الاصابہ ہے، اس کے دیکھنے سے احادیث مین ان کی دقت نظر اور نکتہ سنجی کا اندازہ ہوتا ہے، توضیح کے لیے دو ایک مسئلے پیش کیے جاتے ہین، ایک مرتبہ لوگون نے حضرت عائشہؓ سے بیان کیا کہ حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہین کہ تین چیزون مین بدشگونی ہے، عورت مین، سواری مین، اور گھر مین، حضرت عائشہؓ نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ ابوہریرہ نے پوری حدیث نہین سنی، پوری حدیث یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے وہ کہتے ہین کہ بدشگونی تین چیزون مین ہے، عورت مین، گھوڑے مین اور گھر مین، ابوہریرہ نے حدیث کا آخری ٹکڑا تو سنا اور پہلا نہین سنا،[۱]

بعض صحابہ سے روایت ہے کہ "مردہ پر اس کے گھر والون کے رونے سے عذاب ہوتا ہے" حضرت عائشہؓ نے جب یہ روایت سنی تو فرمایا کہ آنحضرت صلعم نے کبھی یہ نہین فرمایا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ ایک دن ایک یہود کے جنازہ پر سے گذرے، اس کے گھر والے اس کا ماتم کر رہے تھے، آپ نے فرمایا یہ روتے ہین اور اس پر عذاب ہو رہا ہے" یعنی مقصود یہ ہے کہ یہ تو رو رہے ہین، اور مردہ اپنے اعمال کی سزا مین مبتلا ہے، پھر فرمایا کہ ہر شخص اپنے فعل کا جواب دہ ہے، اور استدلال مین یہ آیت تلاوت کی،

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی — اور کوئی کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہین اٹھائیگا،

عین الاصابہ مین اس کی اور بہت سی مثالین ہین، حضرت عائشہؓ سے جن بزرگون نے حدیث مین استفادہ کیا ہے، ان مین بہت سے صحابہ اور کبار تابعین ہین مثلاً عروہ بن زبیر، سعید بن المسیب، عبد اللہ ابن عامر، مسروق بن اجدع، عکرمہ، علقمہ، صفیہ بنت عبید، عطا بن یسار، یہ چند نام لکھ دیے گئے ہین، ورنہ ان

---

[۱] عین الاصابہ

روایت کرنے والوں کی تعداد تنو سے متجاوز ہے،

ازواج مطہرات مین حضرت عائشہؓ کے بعد ام سلمہؓ ممتاز نظر آتی ہین، محمود بن لبید کا قول ہے،

کان ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ازواج مطہرات کو کثرت سے احادیث یاد تھین،
یحفظن من حدیث النبی صلی اللہ علیہ	لیکن حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سب سے زیادہ
وسلم کثیراً ولا مثلاً لعائشۃ وام سلمۃ[1]	ممتاز تھین،

انھین حدیث سننے کا بیحد شوق تھا، ایک مرتبہ گھر مین بال گندھوا رہی تھین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے زبان مبارک سے جون ہی ایھا الناس (اے لوگو) نکلا آپ نے مشاطہ سے کہا کہ بال باندھ دو، اس نے کہا جلدی کیا ہے، ابھی تو آپ نے ایھا الناس ہی کہا ہے، بولین کیا خوب ہم آدمیون مین نہین ہین؟ اس کے بعد خود بال باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئین، اور پورا خطبہ سنا[2]،

حضرت عائشہؓ حدیث مین گو خود بلند درجہ رکھتی تھین لیکن بعض مرتبہ انھین بھی ام سلمہؓ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ عصر کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے تھے بعض لوگون نے اعتراض کیا، تو انھون نے حضرت عائشہؓ کے واسطے سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے، حضرت عائشہؓ کے پاس تصدیق کے لیے آدمی بھیجا گیا، تو انھون نے فرمایا کہ مجھے یہ حدیث ام سلمہؓ سے پہنچی ہے، حضرت ام سلمہؓ کے پاس آدمی گیا، اور قول نقل کیا، تو فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ عائشہ کی مغفرت کرے، انھون نے بات نہین سمجھی، کیا مین نے ان سے یہ نہین کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے[3]"۔

حضرت ام سلمہؓ کی مرویات کی تعداد (۳۷۸) ہے، ان کے فتاوے بھی کثرت سے ہین، علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین مین لکھا ہے کہ اگر ان کے فتاوے جمع کیے جائین تو ایک چھوٹا سا رسالہ تیار ہوسکتا ہے (ص ۱۳ ج ۱)

ان کا شمار محدثین کے تیسرے طبقہ مین ہے، حضرت ام سلمہؓ کے تلامذۂ حدیث مین بے شمار تابعین اور بعض

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۶ [2] مسند ج ۶ ص ۳۰۲ [3] بخاری ج ۲ ص ۶۲۷

صحابہ شامل ہین، چند مشاہیر کے نام یہ ہین :-

اسامہ بن زید، سلیمان بن یسار، سعید بن مسیب، عبداللہ بن رافع، نافع مولیٰ ابن عمر، عروہ بن زبیر، عکرمہ، ابو سلمہ، ابو عثمان النہدی ہند بنت الحارث، خیرۃ والدہ حسن بصری، زینب آپ کی صاحبزادی وغیرہ

حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے علاوہ دوسری ازواج مطہرات نے بھی حدیث کی روایت اور اشاعت مین حصہ لیا، حضرت حفصہؓ سے مسند مین (۶۰) حدیثین مروی ہین، حدیث مین ان سے بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ روایت کرتے ہین، حضرت ام حبیبہؓ سے ۶۵ حدیثین مروی ہین اور انکے تلامذۂ حدیث بھی کچھ کم نہین ہین مثلاً عروہ بن زبیر، زینب بنت ام سلمہ، ابو صالح السمان وغیرہ، حضرت میمونہؓ سے (۴۶) حدیثین منقول ہین، ان سے روایت کرنے والون مین حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبدالرحمٰن بن سائب، یزید بن عاصم، عطاء ابن یسار وغیرہ ہین، آنحضرت صلعم کی صاحبزادیون مین حضرت فاطمہؓ سے بھی متعدد روایتین مروی ہین ؛

عام صحابیات مین مشکل ہی سے کوئی صحابیہ ایسی ہونگی جن سے کوئی نہ کوئی روایت موجود نہ ہو، جن سے متعدد روایتین موجود ہین، ان کے نام مع تعداد حدیث یہ ہین،

حضرت ام الفضلؓ ان سے (۳۰) حدیثین مروی ہین، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت انس بن مالکؓ وغیرہ ان سے روایت کرتے ہین، حضرت ام رومانؓ اور ام سلیمؓ سے بھی چند حدیثین مروی ہین، ام سلیمؓ سے بڑے بڑے صحابہ مسائل دریافت کرتے تھے، ایک بار کسی مسئلہ مین حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ مین اختلاف ہوا، تو دونون بزرگون نے ان ہی کو حکم مانا[۱]، ان دونون بزرگون کے علاوہ متعدد صحابہ و تابعین نے ان سے روایت کی ہے، حضرت ام عمارہؓ اور حضرت ام عطیہؓ سے بھی متعدد روایتین منقول ہین حضرت ام عطیہؓ سے متعدد صحابہ و تابعین مثلاً حضرت انسؓ، محمد بن سیرین، حفصہ بنت سیرین وغیرہ نے روایت کی ہے، صحابہ و تابعین ان سے میت کے نہلانے کا طریقہ سیکھتے تھے[۲]، حضرت ربیع بنت مسعود

۱؎ مسند ج ۶ ص ۴۳۰ ۲؎ تہذیب ج ۱۲ ص ۴۵۵

سے (۱۱) حدیثیں حضرت مسند میں مروی ہیں، علمی اعتبار سے ان کا پایہ بہت بلند ہے، حضرت عبداللہ بن عباس اور امام زین العابدین ان سے مسائل دریافت کرتے تھے، ان بزرگوں کے علاوہ عائشہ بنت انس سلیمان ابن یسار، ابوسلمہ، نافع مولی ابن عمر وغیرہ ان کے رواۃ میں ہیں[۱] حضرت ام ہانی گو قدیم الاسلام نہیں تھیں، لیکن ان کی روایت سے (۴۶) حدیثیں مسند میں موجود ہیں، ان کے رواۃ کی تعداد ۲۰ بیس کے قریب ہے، ان میں عبداللہ بن عباس کے علاوہ متعدد کبار تابعین مثلاً امام شعبی، عروہ بن زبیر، مجاہد، ابن ابی لیلی، عطا بن یسار، کریب، محمد بن عقبہ وغیرہ ہیں،

خانوادہ صدیقی میں حضرت اسماء بنت عمیس حضرت صدیق کی زوجۂ مکرمہ، اور حضرت اسماء آپ کی صاحبزادی روایت حدیث میں ممتاز تھیں، بلکہ عام صحابیات میں کثرت روایت کے اعتبار سے ان کو سب پر فوقیت حاصل ہے، اسماء بنت عمیس سے (۶۰) حدیثیں اور حضرت اسماء بنت ابی بکر سے (۵۸) حدیثیں مروی ہیں، ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد بہت کافی ہے، جن میں حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر جیسے صحابہ اور سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر، فاطمہ بنت علی، ام عون، عبداللہ بن کیسان، صفیہ بنت شیبہ جیسے تابعین اور تابعات شامل ہیں، ان کے علاوہ فاطمہ بنت قیس، شفا بنت عبداللہ، زینب بنت ابی معاویہ، اسماء بنت یزید، زینب بنت ابی سلمہ[۲] و لبیبہ بنت الحارث وغیرہ بھی اس سلسلۃ الذہب میں شامل ہیں،

مسانید صحابیات صحابیات کی کثرت روایت اور ان کی خدمت حدیث کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے امام احمد بن حنبل نے ایک سو چھبیس[۳] صحابیات کی مسانید جمع کی ہیں، جن کی مجموعی ضخامت ۴۰۴ صفحات ہیں ان میں کئی ہزار حدیثیں ہیں، حافظ ابن عبد البر نے استیعاب میں ۳۹۰ صحابیات کا تذکرہ لکھا ہے، اسی طرح اسد الغابہ اور اصابہ میں ۵۰۰ سے زائد صحابیات کے تراجم موجود ہیں، اور مشکل ہی سے کوئی صحابیہ

---

[۱] اصابہ و مسند [۲] اسد الغابہ ج ۵ اور تہذیب ج ۱۲

ہوں گی جن سے کوئی روایت نہ موجود ہو، تہذیب میں ۳۳۳ عورتوں کا تذکرہ ہے، جن میں بیشتر صحابیات ہیں، اگر ان تمام صحابیات کی روایتیں جمع کی جائیں تو ان کی مسانید کے لیے کئی جلدیں درکار ہونگی، کاش اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی توفیق دیتا کہ وہ ان کی مسانید کتب احادیث سے چھانٹ کر ایک جگہ جمع کر دیتا، تو بڑا مبارک اور مفید کام انجام پا جاتا،

تابعات صحابیات کی صحبت میں جن خواتین نے پرورش پائی یا ان سے استفادہ کیا ان کو تابعات کہا جاتا ہے، صحابیات کی طرح تابعات نے بھی فن حدیث کی حفاظت و اشاعت اور اس کی روایت اور درس و تدریس میں کافی حصہ لیا، اور بعض نے تو اس فن میں اتنی مہارت بہم پہنچائی کہ بہت سے کبار تابعین نے ان سے اکتساب فیض کیا، چند مشہور تابعات کی خدمات کا تذکرہ کیا جاتا ہے،

حفصہ بنت سیرین، انھوں نے متعدد صحابہ اور تابعین سے روایت کی ہے، جن میں انس بن مالک، ام عطیہؓ، ام الرائح، خیرۃ ام الحسن البصری، ابو العالیہ، ربیع بن زیاد وغیرہ ہیں، ان سے روایت کرنے والوں میں ابن عون، خالد الحذاء، قتادہ، ہشام بن حسان وغیرہ تابعین شامل ہیں، جرح و تعدیل کے امام یحییٰ بن معین نے ان کو ثقۃ حجۃ فرمایا ہے[1] ایاس بن معاویہ فرماتے ہیں کہ ما ادرکت احدا افضلہ من حفصۃ میں نے حفصہ سے زیادہ فضل والا کسی کو نہیں پایا، ان کے اس فضل کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابن ابی داؤد فرماتے ہیں کہ بارہ برس کی عمر میں انھوں نے قرآن و حدیث پڑھ لیا تھا[1]،

امام بخاری اور ابو داؤد نے ان کا تذکرہ کیا ہے، ابن حبان نے ان کو ثقہ لکھا ہے[2]، سنہ ۱۰۱ھ میں وفات پائی، امام ذہبی نے انھیں حفاظ حدیث کے دوسرے طبقہ میں شامل کیا ہے[3]،

معاذہ بنت عبد اللہ۔ انھوں نے حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ اور ام عمرو سے اور ان سے ابو قلابہ، قتادہ، یزید الرشک، ابو عاصم حسن بصری کی والدہ وغیرہ نے روایت کی ہے، یحییٰ بن معین نے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۰۹ [2] ایضاً [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۰

ثقہ و حجۃ کہا ہے، ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے، جن احادیث کا انھیں علم تھا ان پر سختی سے عمل بھی کرتی تھیں،
ابو شیبہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کے پیٹ میں درد تھا، انھوں نے
مجھ سے درد کا حال بتایا، بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ کچے گھڑے میں رکھی ہوئی نبیذ ان کو استعمال کرائی جائے، اس میں
نشہ آجاتا ہے، چنانچہ میں نے ایک پیالہ نبیذ لا کر ان کے سامنے پیش کیا، انھوں نے نبیذ دیکھ کر مجھ سے مخاطب
ہو کر فرمایا، اللہ کی پناہ! تم کو معلوم نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلعم سے روایت کی ہے کہ آپ نے نبیذ جر
سے منع فرمایا ہے، خیر تم نے جو کچھ میرے لیے کیا وہ کافی ہے، خدا کی شان کہ وہ پیالہ الٹ گیا، اور نبیذ زمین پر
گر پڑی اور ان کو افاقہ بھی ہو گیا،[۱]

عائشہ بنت سعد بن ابی وقاص۔ مشہور صحابی حضرت سعدؓ کی صاحبزادی تھیں، چھ امہات المومنین
کو دیکھا تھا، اپنے والد حضرت سعد اور ام ذرؓ سے روایت کی ہے، ان سے روایت کرنے والوں میں
۸ تابعین ہیں، امام ذہبی نے ان کا شمار حفاظ حدیث میں کیا ہے، اور تابعین کے تیسرے طبقہ میں ان کو جگہ
دی ہے،[۲] یہ تنہا خاتون ہیں جن سے امام مالک نے روایت کی ہے،[۳] ابن حبان نے ان کو ثقہ لکھا ہے،
۱۱۷ھ میں وفات پائی،

صفیہ بنت عبید۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی اہلیہ تھیں، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت
ام سلمہؓ، قاسم بن محمد وغیرہ سے روایت کرتی ہیں، ان سے متعدد کبار تابعین مثلاً سالم بن عبد اللہ،
نافع، عبد اللہ بن صفوان وغیرہ نے روایت کی ہے، عجلی نے ان کو تابعیۃ ثقۃ لکھا ہے، ابن حبان
نے بھی توثیق کی ہے،[۵]

عائشہ بنت طلحہ۔ حضرت ابو بکرؓ کی نواسی تھیں، اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں،
ان سے اجلہ تابعین نے روایت کی ہے، ابن معین اور ابن حبان نے ان کی توثیق کی ہے، عجلی مدنیۃ تابعیۃ ثقۃ

[۱] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۰۴ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۳ [۳] ایضاً ج ۱۲ ص ۴۳۶ [۴] ایضاً ص ۴۳۰

ثقہ لکھتے ہیں، ابو زرعہ فرماتے ہیں کہ ان کے فضل کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے ان سے روایت کی ہے، اور اہل علم ان کا ادب کرتے تھے[1]۔

عمرۃ بنت عبد الرحمن۔ یہ حضرت عائشہؓ کی خاص تربیت یافتہ اور ان کی احادیث کی امین تھیں، ابن حبان کا قول ہے کہ کانت من اعلم الناس بحدیث عائشۃ (حضرت عائشہؓ کی احادیث کی سب سے بڑی جاننے والی تھیں) ابن المدینی فرماتے ہیں، حضرت عائشہؓ کی حدیثوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد احادیث عمرہ، قاسم اور عروہ کی ہیں، عمرہ کے بھائی محمد بن عبد الرحمن فرماتے ہیں کہ مجھ سے عمر بن عبد العزیز نے فرمایا کہ ما بقی احد اعلم بحدیث عائشۃ (اسوقت حضرت عائشہؓ کی احادیث کا ان سے بڑا جاننے والا کوئی موجود نہیں ہے) حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ابن حزم کو خاص طور سے لکھا تھا کہ عمرہ کی تمام احادیث ان کے لیے لکھ لیں، ابن سعد نے انکو "عالمۃ" لکھا ہے[2]، امام ذہبی نے ان کو تابعین کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے[3] اور ان کو "فقیہۃ" لکھا ہے، ابن معین نے انکی شان میں ثقۃ حجۃ اور عجلی نے تابعیۃ ثقۃ اور ابن المدینی نے احد الثقات العلماء[4] کے الفاظ استعمال کیے ہیں،

حضرت عائشہؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ سے بھی انھوں نے روایتیں کی ہیں، ان سے روایت کرنے والوں میں بہت سے زیادہ کبار تابعین ہیں، ۱۰۳ھ یا ۱۰۶ھ میں وفات پائی[5]،

فاطمہ بنت المنذر۔ حضرت زبیر بن العوامؓ کی پوتی مشہور تابعی ہشام بن عروہ کی بیوی تھیں، انھوں نے متعدد صحابیات و تابعیات مثلاً حضرت اسماء، حضرت ام سلمہؓ ام المومنین اور عمرۃ بنت عبد الرحمن وغیرہ سے روایت کی ہے، اپنے علم و فضل کے باعث ہشام بن عروہ نے ان سے روایت کی ہے، عجلی نے انکے بارے میں مدنیۃ تابعیۃ ثقۃ لکھا ہے، اور ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے[6]،

قمیر بنت عمرو۔ مشہور محدث مسروق بن الاجدع کی بیوی ہیں، انھوں نے حضرت عائشہؓ اور اپنے شوہر مسروق سے روایات کی

۱؎ تہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۷ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ۴؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴ ۵؎ تہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۸ ۶؎ ایضاً ص ۴۴۴

ان کے روایت کرنے والوں میں امام شعبی، محمد بن سیرین، مقدام بن شریح اور عبداللہ بن شبرمہ وغیرہ کبار تابعین ہیں، ابوداؤد اور نسائی میں ان کی روایات موجود ہیں عجلی نے تابعیہ ثقہ لکھا ہے۔[۱]

ام الدرداء صغریٰؓ۔ حضرت ابو درداؓ کی بیوی تھیں، اور عمر میں ان سے بہت چھوٹی تھیں، یہ یتیم تھیں حضرت ابو درداؓ نے ان کی پرورش کی تھی، اور وہ چھوٹی ہی عمر سے ہر وقت حضرت ابو درداؓ کے ساتھ رہتی تھیں، اور ان کے ساتھ صحابہ کی مجلسوں میں شریک ہوتی تھیں، ان ہی کی تربیت کا فیض تھا کہ تابعین کے دوسرے طبقہ میں شمار کی جاتی ہیں، انھوں نے حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوہریرہؓ فضالہ بن عبیدؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کے علاوہ ام الدرداء الکبریٰ صحابیہؓ سے کثرت سے روایت کرتی ہیں، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے،

وهی تروی عنها الحدیث الکثیر یہ ام الدرداء کبریٰ سے بہت کثرت سے حدیثیں روایت کرتی ہیں

(تہذیب ج ۱۲ ص ۴۶۷)

ان سے روایت کرنے والوں میں تقریباً بیس تابعین ہیں ۔۔۔ زید بن اسلم، مکحول الشامی، مرثد التیمی اور عون بن عبداللہ وغیرہ ہیں،

خیرۃ۔ حضرت حسن بصری کی والدہ ہیں، یہ حضرت ام سلمہؓ کی لونڈی تھیں، اور ان ہی سے استفادہ بیشتر بھی کیا تھا، حضرت عائشہؓ سے بھی روایت کرتی ہیں، ان سے ان کے دونوں صاحبزادے حسن اور سعید اور علی بن زید، حفصہ بنت سیرین وغیرہ روایت کرتے ہیں،

ان مذکورہ بالا تابعیات کے علاوہ بے شمار تابعیات ہیں، جنھوں نے اس فن کی ترقی واشاعت میں حصہ لیا ہے، چند نام یہاں درج کئے جاتے ہیں،

جبلہ بنت مصفح، جسرہ بنت دجاجہ، جمیلہ بنت داثلہ، ہیاہ بنت عجلان، حبیبہ بنت میسرہ،

---

[۱] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۶۴ [۲] ایضاً

حفصہ مخزومیہ، زینب بنت ابوسعید خدریؓ، صفیہ بنت الحارث، صفیہ بنت شیبہ، الرباب، حفصہ بنت عبد الرحمن بن ابی بکرؓ، زفرہ، رمیثہ، فاطمہ بنت حسین، فاطمہ بنت علی، ام بلال، کریمہ بنت الحسحاس وغیرہ، یہ وہ تابعات ہیں جنھون نے متعدد صحابہ سے روایتین کی ہین، اور ان سے صحاح مین روایات موجود ہین، اور ائمہ جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کی ہے،

ہم نے زیادہ تر ان تابعات کا تذکرہ کیا ہے جن کا تذکرہ تہذیب یا تذکرۃ الحفاظ مین ہے، ورنہ ان تابعات کی تعداد جنھون نے روایت حدیث مین حصہ لیا، اس سے بہت زیادہ ہے، صرف ابن سعد نے ۹۳ تابعات کا تذکرہ کیا ہے، اصابہ مین تیسری اور چوتھی قسم مین جن خواتین کا تذکرہ ہے تقریباً ان سب کا شمار تابعات مین ہے، اور ان کی مجموعی تعداد دو سو سے زیادہ ہے،

تابعات کے بعد دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی مین بھی بے شمار خواتین نے علم حدیث کی روایت اور اس کی ترقی و اشاعت مین حصہ لیا لیکن افسوس ہے کہ ان صدیون مین خواتین کے کارنامون کے سلسلہ مین جو کتابین لکھی گئین وہ سب ناپید ہین، مثلاً ابن مندہ متوفی ۲۹۵ھ، ابن عبد البر متوفی ۴۶۳ھ، ابوموسیٰ اصفہانی متوفی ۵۸۱ھ کی کتابین اور خصوصیت سے ابن اثیر جزری کی تاریخ النساء وغیرہ، تاہم جن کا تذکرہ متداول کتابون مین ملتا ہے ان کا ذکر کیا جاتا ہے،

دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی مین بھی جن خواتین نے علم حدیث کی روایت اور اسکی ترویج و اشاعت مین حصہ لیا ان کے نام اور کارنامے حسب ذیل ہین،

ام عمر۔ حسان بن زید تابعی کی صاحبزادی تھین، انھون نے اپنے والد اور اپنے شوہر یحییٰ بن سعید سے متعدد روایتین کی ہین، اور ان سے روایت کرنے والون مین امام احمد بن حنبل، ابو ابراہیم محمد بن الصباح، ابراہیم بن عبد اللہ، علی بن مسلم وغیرہ ہین، ان کے والد نے حضرت علیؓ کو دیکھا تھا، چنانچہ اس سلسلہ مین انھون نے اپنے والد کی روایت سے حضرت علیؓ کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ ایک دن

آپ خطبہ دے رہے تھے، اور بلند آواز سے لوگوں کو مخاطب کر کے کہہ رہے تھے کہ لوگو! تم نے میرے اور عثمان بن عفانؓ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور کر رکھی ہیں، لیکن ہمارا اور ان کا حال بالکل وہی ہے جو نقشہ قرآن نے اہلِ جنت کا کھینچا ہے، پھر یہ آیت پڑھی،

ونزعنا ما فی صدورھم من	اور ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ
غلٍ اخواناً علی سررٍ متقابلین[1]	سب دور کر دیں گے، اور سب بھائی بھائی
	کی طرح تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے،

امام جرح و تعدیل یحییٰ بن معین ام عمر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ دار معاذ میں میں نے اُن سے سماع کیا ہے، ان میں کوئی خاص بات نہیں ہو، مگر میرے بہت سے اصحاب اُن سے روایت کرتے ہیں[2]،

زینب بنت سلیمان الہاشمیہ:۔ یہ اس خانوادہ کی چشم و چراغ تھیں جس کے چشمۂ فیض سے ایک دنیا سیراب ہوئی یعنی ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی پرپوتی تھیں، اُن کے والد سلیمان کا شمار حفاظ حدیث میں تھا، انہی کی تربیت کا اثر تھا کہ زینب کو علم حدیث سے لگاؤ پیدا ہوا، ان سے متعدد اتباع تابعین نے روایت کی ہے، مثلاً قاضی جعفر بن عبداللہ، عاصم بن علی، احمد بن خلیل وغیرہ خطیب اُن کی روایت سے متعدد احادیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں،

من افاضل النساء (جلد ۱۴ ص ۴۳۴)	خواتین میں نہایت فاضلہ تھیں،

خلفاء تک ان کا احترام اور ان کی عظمت کرتے تھے، چنانچہ مامون جس کا معمول تھا کہ پردہ نشین خواتین کے اوٹ سے گفتگو کرتا تھا لیکن جب زینب پہنچتی تھیں تو پردہ ہٹا دیا جاتا تھا[3]،

اُن کے علاوہ اسی خانوادہ کی انہی کی ہم نام ایک دوسری زینب بھی تھیں جن سے کوئی مرفوع حدیث تو مروی نہیں ہے لیکن اپنے والد کی سند سے عبداللہ بن عباسؓ کے دو ایک اثر کی روایت کرتی ہیں،

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۱۴ ص ۴۳۴ [2] ایضاً ج ۱۴ ص ۴۳۴ [3] ایضاً ص ۴۳۴،

عبدہ بنت خالد بن معدان حمص کی رہنے والی تھیں، خالد بن معدان مشہور تابعی ہیں، یہ انہی کی صاحبزادی ہیں، اپنے والد سے روایت کرتی ہیں، افسوس ہے کہ اُن کے حالات متداول کتابوں میں نہیں ملتے، تہذیب میں اُن کے والد کے تذکرہ کے سلسلہ میں یہ واقعہ درج ہے کہ امام اوزاعی خالد بن معدان کا بڑا ادب واحترام کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے تلامذہ سے دریافت کیا کہ ان کی اولاد میں کوئی ہے؟ لوگوں نے عبدہ کا نام لیا، انھوں نے کہا کہ جاکر ان سے خالد کے حالات دریافت کرو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔[1]

عبدہ بنت عبدالرحمن بغدادیہ، ان کا نسبی تعلق ابوقتادہ انصاری کے خانوادہ سے تھا، یہ حضرت ابوقتادہ کی پرپوتی ہیں، اپنے والد عبدالرحمن سے روایت کرتی ہیں، اُن سے روایت کرنے والوں میں محمد بن مخلد سلیمان بن احمد وغیرہ شامل ہیں، ابو القاسم طبرانی نے اُن سے چند مرفوع احادیث نقل کی ہیں، اُن کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ احادیث حضرت ابوقتادہؓ کی اولاد ہی سے مروی ہیں اور میں نے ان احادیث کو عبدہ کے علاوہ کسی سے نہیں سنا ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں:

وكانت امرأة عاقلة فصيحة — یہ ایک عاقل، فصیح اللسان اور حدیث کی

متدینة (بغداد ج ۱۴ ص ۴۴۰) — روایت میں متدین تھیں،

خدیجہ ام محمد انھوں نے امام احمد بن حنبل سے سماع کیا تھا، اور ان سے روایت بھی کرتی ہیں، امام احمد کے علاوہ یزید بن ہارون، اسحاق بن یوسف اور ہاشم بن القاسم سے روایت کرتی ہیں، امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ اُن سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ

كانت تجئ الى ابى تسمع — میرے والد (امام احمد) کے پاس سماع کے لئے آتی تھیں،

خطیب نے ام محمد کی سند سے ام در دار کا ایک اثر نقل کیا ہے جس کے ایک راوی عبداللہ ہیں، وہ اثر یہ ہے،

---

[1] تہذیب ج ۳ ص ۱۱۲،

حدثنا عبد اللہ بن احمد قال حدثتنی خدیجۃ ام محمد سنۃ ست وعشرین

ومائتین قالت حدثنا اسحاق الازرق حدثنا المسعودی عن عون بن

عبد اللہ، قال کنا نجلس الی ام الدرداء فنذکر اللہ عندھا فقالوا لعلنا قد

امللناک؟ قالت تزعمون انکم قد امللتمونی فقد طلبت العبادۃ فی کل

شیئ فما وجدت شیئا اشفی لصدری ولا احری ان اصیب بہ الذی ارید

من مجالس الذکر، (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۳۶)

۲۲۶ھ کے بعد تک زندہ ہین،

یہ ذوق صرف آزاد خواتین ہی تک محدود نہین تھا، بلکہ اس مین لونڈیان اور باندیان بھی شریک تھین

امام محمد کے پاس متعدد لونڈیان، رات کے وقت آکر تحصیل حدیث کرتی تھین ابراہیم بن سعد ایک حافظ

حدیث گذرے ہین، اُن سے ایک بار مسند ابو بکر کے متعلق سوال کیا گیا، تو انھون نے اپنی لونڈی سے فرمایا، کہ

مسند ابو بکر کی ۲۳ وین جلد نکال لاؤ، اس سے ان کے علم حدیث کی واقفیت اور ذوق کا اندازہ ہوتا ہے،

سمانہ بنت حمدان! تیسری صدی کے اخیر مین وضاح بن حسان ایک محدث گذرے ہین، جنھون نے

حدیث مین ایک تحریری یادگار بھی چھوڑی ہے، سمانہ انھی کی نواسی ہین، وہ اپنے نانا سے روایت کرتی ہین

اُن سے روایت کرنے والون مین ابو بکر الشافعی اور ابو القاسم طبرانی ہین خطیب نے اُن سے متعدد روایتین

نقل کی ہین،[۱]

اسی صدی کے آخر مین ایک خاتون فاطمہ بنت محمد بھی تھین جنھون نے حدیث کی خدمت مین حصہ

لیا، اُن کی زندگی نہایت ہی زاہدانہ تھی، وہ مصلے ہی پر سوتی تھین، ۳۱۲ھ مین وفات پائی،

(باقی)

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۴۱،

تاریخ یمن کا ایک ورق

از

مولانا ابوالجلال ندوی

(۲)

اقوام | یہ عجیب بات ہے کہ یہ کتبہ اگرچہ حضرموت میں ملا لیکن اطراف حضرموت کے اماکن میں سے ایک مقام کا بھی ذکر اس میں نہیں ہے یہ تحریر یقینی طور پر یمن کے باشندوں اور ان کے حلفاء اور اقرباء میں سے کسی ایک کی ہے اس میں جن قوموں کے نام ہیں، وہ یہ ہیں،

حمیر | حمیر ایک مشہور قبیلہ کا نام ہے کتبہ کے ایام تحریر میں اسی قبیلہ کی حکومت تھی کتبہ اس قوم کے مخالفین کا ہے

قہات | بنو اسرائیل کے ایک سبط کا نام لاوی ہے، اس سبط کی ایک شاخ کا نام قہات ہے، حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام اسی خاندان کے افراد تھے، اس کتبہ میں قہات کا ذکر سینا کے باشندوں، یسار کے معاونوں اور باشندگان یمن کے دشمنوں کی حیثیت سے آیا ہے

نہرہ | بنو قضاعہ کی ایک شاخ کا نام جو یمن میں رہتی تھی، اس قوم کو اس کتبہ کے اندر مذکور جنگ کے انجام سے بہت خوشی ہوئی تھی، خاکہ کی تشریح سے ظاہر ہے کہ وہاں کے باشندے بنو عذرہ تھے، یہ نہرہ کی طرح بنو قضاعہ کی ایک شاخ ہیں، نہرہ کو جنگ کے انجام کی جو خوشی ہوئی تھی، اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ وہ بنو عذرہ کے ہم خاندان تھے،

زنذنوذ | زنذنوذ دو ناموں کا مجموعہ ہے نوذ سے مراد وہی ارض نود ہے جس کا ذکر فرزندان آدم کے توراتی

قصہ مین آیا ہو، یہود توراۃ کے مطابق بنو قین کا علاقہ ہے ارض نود کے مقام کی تعیین طویل بحث کی مقتضی ہو لیکن مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ مدین کا علاقہ دراصل علاقۂ بنو قین تھا، یہود مدینہ مین سے ایک گروہ بنو قینقاع تھا، یہ نام قاع قین کا مقلوب ہو، اس لئے نوذ کو یمن اور شاس اور حالک کے علاقہ سے تطبیق دینا بے جا نہ ہوگا، زند نوذ اسی علاقہ مین بسنے والی ایک قوم کا نام ہے، عدنان کے نسب نامہ مین ایک نام زند بن مری بن اعراق الثری کا نام آتا ہے (تاج العروس) زند نوذ سے مراد اطراف یمن مین بسنے والے بنو عدنان ہین جن کو اس کتبہ کے اندر مذکورہ جنگ کے انجام سے خوشی ہوئی،

کرذا کرذ کو کرد سمجھنا چاہئے، اس کتبہ کے بیان کے مطابق یمن والون نے شاہی نوکر یسل کی ناک اور اس کے کان کاٹ لئے جس کے انتقام کے لئے سینا سے یسار اور یمن سے ذویالیل فوج لے کر بڑھے، لیکن ان دونون فوجون نے شکست کھائی تب شاہ یمن نے اہل حبش کو خوش کیا اور حبش والون نے شاہ یمن کی نوکری کرلی لیکن کرذ نے جن کے سردار کا نام توذ تھا، نیز بنو داشح نے جنگ کی، اور اہل حبش کی امداد سے ذونوش، اور ذو شرح کو کوئی فائدہ نہین پہنچا، حکومت یمن پر توذ نے قبضہ کرلیا،

کرد ایک عجمی قوم کا نام ہے جن کے کچھ افراد یمن مین بستے تھے، انہی کردون کی بابت نشوان نے لکھا ہے، کہ

یقال انّھم من الازد، قال	کہتے ہین کہ وہ بنو ازد مین سے ہین شاعر
لعمرك ما کرد من ابناء فارس	نے کہا قسم ہے کرد فارس کے بیٹے نہین
ولکنّه کرد بن عمرو بن عامر	بلکہ عمرو بن عامر کی اولاد ہین نیز کہا شاعر نے
وقال لعمرك ما کرد بن عمرو بن عامر	قسم ہو عمرو بن عامر کا بیٹا کرد عجمی نہین تھا،
بعجم ولکن خالط العجم واعجم	البتہ اہل عجم کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے عجمی ہوگیا تھا،

نسبتھوا الشعراء الی الیمن ثمّ الی الازد، شعراء ان کو یمن پھر ازد کی طرف منسوب کرتے ہین،

یمنی کرد تھے تو نیز غیر عرب مگر بنو ازد مین شمار ہوتے تھے، بخیل ہونے کی حیثیت سے یہ انصار مدینہ کو نیز بنو خزاعہ کو جن کی ایک شاخ یمن مین بستی تھی، اپنا ہم نسب بتاتے ہونگے،

داشح | بنو داشح بن الحرث، یہ بنو ازد کی ایک شاخ تھے،

رجال کتبہ | اماکن واقوام کے بعد ایک نظر رجال کتبہ پر بھی ڈال لینا مناسب ہوگا، اس کے بعد کتبہ کا مضمون آئینہ ہو جائے گا،

سمیق | پہلا نام اس کتبہ مین سمیق کا ہے، اس کی بابت ہم صرف اتنا جانتے ہین کہ سموق درخت اور نبات کے طویل ہونے کو کہتے ہین، سمیق کا مفہوم طویل ہے، یہ شخص کون تھا اس کا عہد کیا تھا، اس کے متعلق ہم کچھ نہین کہہ سکتے،

ذونین | حصن غراب کے سہ سطری مختصر کتبہ کے نیچے اس شخص کا سماتی دستخط موجود ہے، معارف مئی ۶۵ء مین ہم بتا چکے ہین کہ یہ شخص ذو شرح کا چچا تھا، ذو کے معنی ہین صاحب اور لــــــ نن ایک مصری لفظ ہے جس کا مطلب پانی دینا ہے، لفظی مفہوم اس لقب کا ہے "رئیس محکمۂ آب رسانی" اس لقب کے اور معانی بھی ہو سکتے ہین مثلاً ذو نون (مچھلی والا) ذو نون (صاحب السیف) ذو نون (صاحب الدواۃ) لیکن کتبہ کے اندر چونکہ زراعت کے مرجھانے کی ذمہ داری سمیق، ذونین اور ذو شرح کی تباہ کاری پر عائد کی گئی ہے اس لئے اس لقب کا مناسب تر مفہوم رئیس محکمۂ آب رسانی ہی ہو سکتا ہے،

شرح ذو | یہ نام کتبہ مین دوبار آیا ہے، یہی عربی روایات کا ذو شرح ہے سیف بن ذو یزن سے امیہ بن ابی الصلت نے غمدان کی بابت کہا،

تصیر نباہ ابوک القیل ذو شرح

اس مصرع مین ذوشرح کو "قیل" کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ یمن نہین تھا البتہ کسی تبع کے ماتحت امیرون مین سے ایک امیر تھا، عربی مین ذوشرح مشہور ہے، اس کتبہ مین ذو کا لفظ شرح سے موخر ہے تاج العروس مین ہو کہ

قال ابو عمرو الشارح الحافظ وھو	ابو عمرو نے کہا شارح حافظ کو کہتے ہین، اہل
فی کلام اھل الیمن حافظ الزرع	یمن کی بولی مین شارح وہ ہے جو کھیتون
من الطیور،	سے چڑیون کو اڑاتا ہے،

شَرَحَ کے معنی ہین "اس نے زراعت کی رکھوالی کی" ذوشرح کے معنی ہین، محکمہ زراعت کا رئیس اعلیٰ" اس لقب کے بہتیرے افراد گذرے ہون گے، عربی روایات کے مطابق یہ ملکہ بلقیس کے باپ یا دادا کا یا اس کے دادا کا لقب تھا، اس کتبہ کا سنہ تحریر پچھلے مضمون مین ۳۳۰ءع بتایا جا چکا ہے، یہ سنہ ہم کو بتاتا ہو کہ حبش کے بادشاہ اذینۃ الصباح کی ہمعصر ملکہ بلقیس کے باپ یا دادا سے اس ذوشرح کو تطبیق دینا چاہئے،

یسل | اس کتبہ کی اہم ترین شخصیت کا نام ہے، تاج العروس مین ہے،

الیسل اھملہ الجوھری وصاحب	جوہری صاحب صحاح اور صاحب لسان
اللسان وقال الزبیر بن بکار ھو	نے یسل کا ذکر نہین کیا، مگر زبیر بن بکار
ید من قریش الظواھر قال و	کا کہنا ہے کہ یسل اور بسل قریش ظواہر کے
بالباء الموحدۃ الید الاخری	دو بازو تھے، بنو عامر بن لوی کو بسل سے
اعنی بنی عامر بن لوی ھکذا	کہا جاتا تھا، اس کی خبر مجھے (زبیر کو)
حدثنی محمد بن الحسن کما فی العباب	محمد بن حسن نے دی جیسا کہ العباب مین ہے،
وقد تقدم ذکر الیسل فی موضعہ،	

ج ۷ ص ۱۱۰

البسل لقب بنی عامر بن لوئی	بسل بنو عامر بن لوی کا لقب ہے، ان کا بھی
هكذا يدعون وكانوا ايدا يثين	دعویٰ ہے، وہ دو بازو تھے، دوسرے بازو
واليد الاخرى اليسر بالمثناة	کو یسل (یمی ست) کہتے تھے، زبیر بن بکار نے
تحت فاله الزبير بن بكار عن	محمد بن الحسن سے اس کی روایت کی، العباب
محمد بن الحسن هكذا اهرونى العبا	میں یونہی وارد ہے، حافظ تبصیر میں یہ قول
ونقله الحافظ فى التبصير ولكنه	نقل کرتے ہوئے بات الٹ دی ہے یسل
عكس القضية، (ب س ل) فقال	کہ بنو عامر اور ان کے غیر کو بسل بنا دیا،
اليسل بالتحتية بنو عامر بن لوى	
والباقون بموحدة، (ی س ل)	

اس سے معلوم ہوا کہ بنو عامر بن لوی یا اُن کے ہم جد کسی خاندان قریش اور اس کے مورث کو یسل کہا جاتا تھا، اس کتبہ میں اسی قرشی کا ذکر ہے، جو یسل کہلاتا تھا،

یسار اس کتبہ میں یسل پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ اُس نے یمن کے مقام میں ایک یا کباز بھولی بھالی لڑکی کی آبرو لینی چاہی جس کی سزا اُسے یہ دی گئی کہ یمن کی عورتوں نے اس کی ناک اور کان کاٹ لئے اور اس پر برہم ہو کر یمن کی سمت سے ذو یالیل ذی اجین اور سینا سے ایک شخص یسرما نے یمن دونوں پر چڑھائی کر دی، یسرما کے نام میں جو ما لگا ہوا ہے اس کی حقیقت براقش ما کے تذکرہ (معارف مئی ۱۹۵۰ء) میں بتائی جا چکی ہے، اصلی نام یسر رہ گیا جسے یاسر اور یسار کا مخفف قرار دیا جا سکتا ہے ہم نے اسے یاسر کے بجائے یسار سے تطبیق دی جس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے یسل کی توہین کا انتقام لینے والوں سے جنگ کی، ان میں بنو مرہ اور باشندگان حاکہ بھی تھے جو کہ بنو قضاعہ میں سے تھے، بنو قضاعہ کا ایک گروہ اپنے کو قریش کا ہم خاندان یعنی بنو عدنان میں خیال کرتا تھا، ایک گروہ قضاعہ کو بنو حمیر میں گنتا تھا، وہ کو حمیری بتانے والے بنو قضاعہ

پر ایک دوسرا تمنا عی شاعر اعتراض کرتا ہے،

ازنيتم عجوزکم وکانت　　　قديما لا يشم لها خمار

کیا اپنی مورثہ کو بدکار بتاتے ہو جس کی اوڑھنی سونگھی نہین جاتی تھی،

عجوز لودنا منها يمان　　　للاقي مثل ما لاقي يسار

ایسی بڑھیا کہ اگر کوئی یمنی اس کے پاس جاتا تو اس کا انجام یسار کا سا ہوتا

اس سے ظاہر ہے کہ یہ کتبہ جو الزام یسل پر لگاتا ہے اور اس کا جو مآل بتاتا ہے تقریبًا وہی الزام روایت یسل کی بجائے اس کے معین و مددگار یسرما پر لگا کر اس کا وہی انجام بتاتی تھی جو کتبہ مین مذکور ہے

ذو یالیل | جوہری نے لکھا ہے کہ یالیل ایک شخص کا نام ہے سید مرتضیٰ زبیدی صاحب تاج العروس کہتے ہین کہ یہ غلط ہے، یالیل ایک بت کا نام تھا، جیساکہ عبدیالیل کے نام سے ظاہر ہے، ذو یالیل ایک مذہبی لقب معلوم ہوتا ہے، یالیل نام کے دیوتا کے مندر کا محافظ ذو یالیل تھا،

یمن والون پر یسل کی توہین کا بدلا لینے کے لئے دو شخصون نے چڑھائی کی، ایک نے جنوب سے ایک نے شمال سے، جنوبی حملہ آور ذو یالیل کا نام بتاتا ہے کہ یہ ایک بت پرست رئیس تھا، شمال کی فوج کا رئیس علی یسرما تھا، اور اسکی فوج مین قبات یعنی یہود کا مذہبی گروہ شامل تھا، گویا یمن والون کے برخلاف موحدین اور مشرکین کے دو گروہ متحد ہو گئے، خود یمن والون کا مذہب ان دونون کیا تھا، اس کا اس کتبہ سے پتہ نہین چلتا،

رباح | ذو یالیل کے بعد ایک نام دیکھا ملتا ہے حمیرما اور یسرما کے نامون کی طرح ما کے حذف کے بعد یہ نام رَبَح رہ جاتا ہے جو عربی کے متداول لہجہ مین بنو ریاح بن یربوع بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ ابن تمیم کے مورث یا اس کے ہم نام کسی شخص کا علم ہو، ایک یربوعی شاعر کہتا ہے

ولكن لي عليات تدي محد　　　وعالي مفخر صعب السلوك

بیریوع وغلب بن بنیه لهم کانت ردافات الملوک

یعنی یریوع اور اس کے فرزندون کی بدولت جن کو ردافتِ ملوک کا شرف حاصل تھا، مجھے تجھ پر بزرگی حاصل ہوئی اس کتبہ مین نوبریوع ہی جیسی عظمت رکھنے والے ایک ریاح کا ذکر ہے،

الروف جلیس الملک عن یمینہ	روف بادشاہ کے ہمنشین راست کو کہتے
اذا شرب یشرب بعدہ قبل	تھے، بادشاہ جب شراب پیتا تو بادشاہ
الناس ویخلفہ علی الناس اذا	کے بعد اور سب سے پہلے روف پیتا، اور
غزا ویقعد موضع الملک حتی	بادشاہ جب غزوہ پر جاتا تو وہ اس
ینصرف واذا عادت کتیبۃ الملک	کی جگہ قائم مقامی کرتا یہان تک کہ بادشاہ
اخذ الروف المرباع ،	واپس آجاتا تھا، بادشاہ کی فوج جب واپس
	آجاتی تو ردف چوتھ وصول کرتا تھا،

ردف کا جو کام تھا وہی اس کتبہ مین ریاح کا نظر آتا ہے جس کا لقب ہے ذو یقنۃ، یہ لفظ دو لفظون سے مرکب ہے، (۱) ذو بمعنی وہ شخص (۲) یقنۃ بمعنی یقنوا الملوک یعنی بادشاہون کی خدمت کرتا ہے،

اس کتبہ کے اندر مذکور ہے ریاح کو کتبہ نویس کی قوم نے اس وقت نہایت ذلیل کر کے اپنے علاقہ سے نکال دیا، جب کہ حاکمہ شناس اور عین مین یسار اور ذو ولیل کی فوجون نے شکست کھائی اور ریاح کے اس انجام کو دیکھ کر قوم جہرہ اور زندنود کو بے انتہا خوشی ہوئی تھی،

ذو نوش سمیق، ذو ینین، ذو شرح، ذو یالیل، یسار اور نسیل مین سے کوئی بھی یمن کا بادشاہ نظر نہین آتا، یہ سب بادشاہ کے ماتحت امرا نظر آتے ہین، کتبہ کے بیان کے مطابق جب یمن کے باشندون اور اُن کے معاونون نے بغاوت کر دی تو اس وقت ایک ذو یقنہ جس کا نام ریاح تھا حضرموت مین بادشاہ وقت کی نیابت یا بالفاظ قدیم ردافت کے فرائض انجام دے رہا تھا، یمن یعنی مدینہ منورہ کے پاس جب

شاہی فوجون نے شکست کھائی، تو حضر موت والون نے بھی شاہ وقت کے ردیف یا قدیم تر لفظون مین ذویقنہ ریاح کے اپنے علاقہ سے نکال دیا، ذویقنہ ریاح جس بادشاہ کا ردیف تھا، غالباً اسی کا ذکر ذونوش کے لقب سے آیا ہے، یعنی ذونوش ذوشرح وغیرہ کا بھی بادشاہ ہوگا، جہان تک میرے علم کی رسائی ہے، ذونوش لقب رکھنے والے کسی شاہ یمن کا عربی لٹریچر مین ذکر نہین ملتا، البتہ بلقیس بنت ہداد بن (ذو) شرح بن شرحبیل بن ذوسحر کے خاندان مین ایک بادشاہ ذوبوس بن ذوسحر کا نشوان نے ذکر کیا ہے، مگر اس کا زمانہ اس کتبہ کے زمانہ سے بہت پیشتر گذرا ہے لیکن ہوسکتا ہے ذوبوس دراصل ذونوش ہی کی تصحیف ہو، اور اس کتبہ مین ذوبوس اول کے کسی جانشین کا ذکر ہو، بہرحال ریاح جس کا ذکر اس کتبہ مین ہے، ذونوش ہی کا ذویقنہ یعنی ردف اور قائم مقام نظر آتا ہے، ذونوش نے جب دیکھا کہ یمن کا راج جاتا رہا، یمن والون کی بغاوت نے حجاز کو بھی آزاد کرادیا، حضر موت والون نے ریاح کو لات مار کر اپنے علاقہ سے نکال دیا، تو

ذونوش رضا حبشتا شدسی

ذونوش نے اہل حبش کو راضی کیا اور وہ خادم ہوگیا

تنوذ | آخری نام اس کتبہ مین ایک شخص تنوذ کا ہے جو اس قوم کرد کا ایک فرد تھا، جو ازد کے خاندان نبو عمرو بن عامر مین دخیل ہوگئے تھے، اس سے زیادہ اس شخص کا حال معلوم نہین، اس کتبہ کے مطابق ذونوش نے حبشیون کی امداد حاصل کی تو پھر بھی بغاوت فرد نہین ہوئی، بلکہ کرد اور نبو شارح نے مقابلہ کیا جس مین کردون اور نبو شارح کو فتح حاصل ہوئی،

مضمون کتبہ | اماکن، اقوام، اور رجال سب کو پہچان لینے کے بعد اب ایک بار پھر کتبہ پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ۳۳ء کے ایام مین جب کہ شاہ یمن حضر موت سے لے کر یمن یعنی سرحد مصر تک حکومت کرتا تھا، بادشاہ وقت کہین غائب تھا، اسکی جگہ ریاح اس کے فرائض انجام دیتا تھا ہمیق، ذویمن، اور

ذو شرح کی بد انتظامی کی بدولت زراعت مرجھا گئی تھی، ان ذونون یسٔل نام ایک امیر جو کہ قریش ظواہر کی ایک شاخ کا مورث تھا، اکال وصول کرنیکے لئے مدینہ کے پاس یمن نام ایک وادی مین پہنچا، یہان اُس نے ایک عورت کی آبرو ریزی کرنی چاہی، عورتون نے اُس کی ناک اور کان کاٹ لئے، اس پر برہم ہو کر سینا سے یمنون کی ایک فوج لیکر یسار نے اور یمن کی طرف سے ذویایل نے یمن والون پر حملہ کر دیا، لیکن باغیون کو کامیابی ہوئی، یمین کے علاقہ اور حجاز سے اہل یمن کی حکومت اُٹھ گئی، حضر موت والون نے بھی ریاح کو اپنے دیار سے نکال دیا، ذو نواس نے جوان دنون شاہ یمن تھا، اہل حبش کو راضی کر کے ان کو نوکر رکھا تا کہ کھوئی ہوئی حکومت حاصل ہو، مگر بنو واشح، بنو مرہ، اور کردون نے اُن کا مقابلہ کیا، اور یہ کامیاب رہے، اور تنوذ کر ذحاکم یمن ہوا،

نقوش زیرین اس کتبہ کے نیچے داہنی طرف دو نقوش ہین، ان کے نیچے دو اور نقوش ہین، جن کے بالمقابل بائین طرف چھ نقوش ہین، ان پر بھی غور کر لینا ضروری ہے، نقوش کی کشش اور گہرائی شاہد ہے کہ نقوش زیرین دو مختلف شخصون نے کندہ کئے، جو دہ سطری نقوش کے کندہ کار نہین تھے،

فارسٹر کا ادعا فارسٹر کے نزدیک داہنی طرف کے نقوش لایعنی ہین، بائین طرف کے چھ نقوش کو طغراء قرار دے کر انھین گیارہ نقوش مین تحلیل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے،

ᛘ ᛘ ᛘ ו ɣ ۹ ⴳ ۹ ᛘ ᛘ ᛘ ⴳ

ہ د س ا ا ی س ب س

تشریح کتبہ کے محل (ج ۲ ص ۳۱۸) پر ان نقوش مین سے کسی کی آواز نہین بتائی ہے لیکن (ج ۲ ص ۴۰۲ و ص ۴۰۳) سے ہم نے دس نقوش کی آوازین نقل کی ہین، ۴ کی آواز نہین معلوم پادری صاحب کے ذہن مین کیا تھی، اس نقش کو ج ۲ ص ۱۸۳ کے حاشیہ پر حبشی نقش بتایا ہے، اور اس سے اس تحریر کے زمانہ پر استدلال

گیا ہے کہ اصل کتبہ سے عرصہ بعد کی ہے خود اپنی بتائی ہوئی آواز ان کے مطابق انھیں پڑھنا چاہئے تھا،

هر × ساه ای سبس

لیکن ان نقوش کو انھوں نے پڑھا ہے،

Harelh or Hare lkah lhe Sabean

ع بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی است

صحیح قرات | ہمدانی نے اکلیل میں سین کی ایک صورت ﷽ ایسی بتائی ہے، داہنی طرف کے نقش اول اور بائیں طرف کا نقش دوم اسی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں، داہنی طرف کا نقش دوم، اور بائیں طرف کا نقش چہارم نشانی ۲ ۶ کی بدلی ہوئی صورت ہے، داہنی طرف کے نقش سوم اور بائیں طرف کے نقش پنجم کو فارسٹر کے علاوہ سب علمائے مسند نے کاف خیال کیا ہے،

داہنی طرف کے چوتھے اور بائیں طرف کے چھٹے نقش کو پادری صاحب نے ۳۱ اور ۴ میں تحلیل کیا ہے، درحقیقت یہ نقش ایک بیٹکی پر رکھے ہوئے تین چراغوں کے فتیلہ سوز کی صورت ۹۹ ہے جو روشنی کا مفہوم اور شین کی آواز دیتا ہے بائیں طرف کے پہلے اور تیسرے نقش کو ایک بار پادری صاحب نے X ۲ کی صورت میں اور دوسری بار ۹ X کی صورت میں حل کیا ہے، دراصل X ایک عا ذو (نقش زاید) کے اضافہ کیا تھا X ہے جس کی آواز زائے ہوز کی سی ہے، میرے نزدیک تحریر کی صحیح قرات حسب ذیل ہے،

سَطَ کُشْ

زُشْ ذُطُ لُوشْ

سوط کے معنی ہیں کوڑا، اس سے سواط مشتق ہے، صاحب لسان نے لکھا ہے کہ "حدیث میں ہے کہ جہنم میں سب سے پہلے سواط داخل ہوں گے سواط سے مراد وہ سرہنگ ہیں جو لوگوں کو کوڑے مارتے ہیں"،

کوش ایک قوم کا نام ہے، جس کا ذکر بائبل میں کثرت سے آیا ہے، انگریزی بائبل میں اس نام کو عموماً

ایتھوپیا (حبش) سے بدل دیا گیا ہے، کیونکہ جن دنوں یونانی میں بائبل کا ترجمہ ہوا، صرف اہلِ حبش خود کو کوش کہتے تھے، اس تحریر میں کوش کو اہلِ حبش کا مرادف سمجھنا چاہئے،

پچھلے مضمون میں بتایا گیا ہے کہ یہ تحریر ۳۳۰ء کی ہے، ۳۳۵ء سے ۳۷۰ء تک یمن اور حضر موت پر اہلِ حبش نے حکومت کی، اہلِ حبش کو ذو نوش نے اپنی امداد کے لئے نوکر رکھا تھا، مگر بعد میں وہ خود حاکم بن بیٹھے، ۳۳۰ء اور ۳۷۵ء کے درمیان کسی نے دو سطری کتبہ کے اس مصرعہ کی بنا پر کہ

ذونوش رضا حبشا شسی

ذو نوش نے اہلِ حبش کو راضی کیا انھوں نے نوکری کر لی۔

دائیں طرف کا دو لفظی فقرہ لکھ کر بتایا کہ

کوش نے باغیوں کو ٹکڑے مارے،

زوش عربی میں ذلیل غلام کا مرادف تھا، زیاط کے معنی ہیں شور مچانا جھگڑا کرنا، بائیں طرف کے تین لفظ دو سطری کتبہ لکھنے والی قوم کے کسی فرد نے اہلِ حبش کی توہین کے لئے بعد میں کندہ کئے اس کا مطلب یہ ہے،

کوش ایک جھگڑالو ذلیل غلام ہے

ایک قدیم کتبہ اس کتبہ کی تشریح پر اب مزید لکھنے کی ضرورت نہیں رہی، لیکن اس سے ایک قدیم روایتی کتبہ کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کا بھی اسی جگہ ذکر کر دیا جائے،

تیجان اور اکلیل میں ہے کہ ہود علیہ السلام کے پاس سے عمرو ذوالاذعار کے خزانہ میں ایک لوح برآمد ہوئی تھی جس پر منقوش تھا،

لمن ملک ذمار؟ — ملک ذمار کس کا ہے

لحمیر الاخیار — نیک نفس حمیر کا

لمن ملک ذمار	ملکِ ذمار کس کا
للحبشۃ الاشرار	شریر الطبع اہلِ حبش کا
لمن ملک ذمار	ملک ذمار کس کا
للفارس الاحرار	شریف طینت اہلِ فارس کا
لمن ملک ذمار	ملکِ ذمار کس کا
لقریش التجار	تجارت پیشہ قریش کا۔

یہ تیجان اور اکلیل کی روایتین یہین ختم ہو جاتی ہین، یاقوت نے معجم البلدان ذکر ذمار مین اس تحریر کی بابت لکھا ہے کہ جس سال قریش نے کعبہ کی عمارت کو (سنہ ۶ ءمین) ڈھایا، اس کی بنیاد سے ایک پتھر نکلا جس پر یہی عبارت منقوش تھی آخر مین یہ بھی تھا کہ

ثم حار محار	پھر اپنی جگہ لوٹ گیا،

ظفار کے تذکرہ مین اسی کو ذکر قریش کے حذف اور ذمار کی بجائے ظفار کی بابت نقل کیا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ عبارت ظفار کی ایک دیوار پر لکھی تھی، اور (ثم حار محار) کی بجائے یہ منقوش تھا کہ

لحمیر ستحار	عنقریب حمیر کے پاس لوٹے گا،

یہ تینوں روایتین کچھ نہ کچھ اصلیت رکھتی ہین، ظفار کا کتبہ خانہ کعبہ والے پتھر سے قدیم تھا، جیسا کہ (ستحار) اور (ثم حار) کے فرق سے ظاہر ہے، منبر ہود والے کتبہ کی روایت مین صرف اتنی بات درست ہے کہ اس تحریر کا تعلق عمرو ذوالاذعار کے زمانہ سے ہے، جو کہ ابرہہ ذوالمنار کی نسل سے اور بلقیس بنت ہدہاد کا حریف تھا، جو کہ حبش کے بادشاہ اذبیۃ الصباح کی ہم عصر تھی، عمرو ذوالاذعار غالباً انہی حبشیون سے تنگ تھا جن کی خدمات ذونواس نے بغاوتین فرو کرنے کے لئے حاصل کی تھین،

اس قدیم کتبہ سے ظاہر ہے کہ ایک زمانہ مین ملک ذمار پر قبضہ کرنے کی جد و جہد چار قومین کر رہی تھین

(۱) حمیر اخیار یعنی خود یمن کا قدیم شاہی گھرانا،

(۲) حبشہ اشرار جن کی بابت زیر بحث کتبہ مین ہے کہ ذونوش نے حبش والون کو راضی کیا، اور وہ خاموش ہوگئے، اور نقوش زیرین کے کندہ کارنے جن کا ذکر کوشش کے نام سے کیا ہے، اور ان کو ذیس جھگرالو نام بتایا ہے اب تک کی معلومات کے مطابق اہلِ حبش نے ۳۴۵ء اور ۵۲۵ء مین یمن پر حکومت کی قدیم کتبہ کی روایت مین پہلی بار کے قبضہ اہل حبش کا ذکر ہونا چاہیے، کیونکہ سنہ ۶۰۰ء مین جو کتبہ خانہ کعبہ کے پاس ملا تھا، اس مین مذکور تھا کہ یہ ذمار اپنی جگہ لوٹ گیا، یعنی حمیر نے اس پر حکومت قائم کرلی، ملک ذمار ملک یمن ہی کا ایک نام ہے،

(۳) فارس احرار زیر بحث کتبہ کی تشریح سے پہلے تک کے معلومات کے مطابق فارس والون نے یمن پر ۵۷۲ء یا ۶۰۰ء سے لے کر ۶۳۲ء تک حکومت کی تھی، اس لئے سمجھا جاتا تھا کہ قدیم کتبہ مین فارس احرار کے ذکر سے یہی دور مراد ہے جب کہ یمن مرزبان بہرزر (وہرز) کے ذریعہ حکومت کرتے تھے لیکن اس پر یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ ۶۰۰ء مین خانہ کعبہ مین جو کتبہ ملا تھا، اس کے مطابق تو اس زمانہ سے پہلے حمیر نے فارس اور قریش کی جو ٹکر ختم ہوکر حکومت ذمار اپنے اصلی محور پر لوٹ گئی تھی اور حمیری حکومت قائم ہوگئی تھی، زیر بحث کتبہ مین تو ذکر ذی کے تذکرہ نے حل کر دشواری حل کردی، اسی زمانہ (۳۲۳ء تا ۳۴۵ء) مین حمیر اخیار، حبشہ اشرار اور فارس احرار تینون گروہ حکومت یمن کے حصول کی کوشش کرتے تھے،

(باقی)

رحمتِ عالمؐ

مدرسون اور اسکولون کے طالب علمون کے لئے عام فہم اور سادہ زبان مین سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت،

ضخامت:- ۲۰۰ صفحے، قیمت: مجلد:- عار غیر مجلد ۱۲ (طبع پنجم) "منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

نیا ادب

شاہ معین الدین احمد ندوی

مولفہ جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول تقطیع بڑی ضخامت ۴۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت
بہتر قیمت للعہ پتہ :- انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔

نئے اور ترقی پسند ادب کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اب تک کسی صاحب نظر ادیب نے اس کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا، اور غیر جانبدارانہ محاکمہ نہیں کیا تھا، اس کام کو اردو کے نامور ادیب پنڈت کشن پرشاد کول نے انجام دیا ہے، اور اس کتاب میں انھوں نے نئے ادب کے ہر پہلو کا تفصیلی تجزیہ کرکے اس کے محاسن و معائب ظاہر کئے ہیں، ابتدا میں ترقی پسند ادب کی حقیقت، اس کی غرض و غایت اور اس کے خیالات و نظریوں پر تبصرہ ہے، پھر اس کے افسانوں پر اجمالی، اس کے بعد مشہور ترقی پسند افسانہ نگاروں کے افسانوں اور ناولوں پر تفصیلی تنقید کرکے ان کی خوبیاں اور نقائص دکھائے ہیں، اور آخر میں مشہور ترقی پسند شعراء کے کلام پر نقد و تبصرہ ہے، اردو میں اس موضوع پر اس سے زیادہ جامع اور بہتر کتاب نہیں لکھی گئی ہے، لائق مصنف نے بڑے اعتدال و توازن اور غیر جانبداری کے ساتھ ترقی پسند ادب کے محاسن و معائب دونوں دکھائے ہیں جس سے اس کا ہر رُخ، سارے خط و خال اور عیب و ہنر سامنے آجاتے ہیں، پوری کتاب مصنف کے بلند ادبی ذوق، نکتہ سنجی، دقتِ نظر اور صحیح تنقیدی نگاہ کی آئینہ دار اور تنقیدی و ادبی حیثیت سے اصحابِ ذوق خصوصاً ترقی پسند ادیبوں کے مطالعہ

کے لائق ہے،

درحقیقت ترقی پسند ادب کے بارہ میں اس کے حامی اور مخالف دونوں تنگ نظری اور افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، سویٹ زدہ ترقی پسندوں کے نزدیک محض اشتراکی خیالات اور روسی ادب کی نقالی ترقی پسندی کی معراج ہے، انھوں نے محض بھوک، پیٹ، روٹی، کسان، مزدور، غریب، سرمایہ دار، انقلاب، آگ اور خون کے الفاظ اور فرائیڈ کے جنسی نظریات کی تبلیغ و اشاعت، فحاشی، و عریاں نگاری اور شعر و ادب میں بے لگام آزادی کا نام ترقی پسند ادب رکھا ہے، اس کے علاوہ ہر ادب ان کے نزدیک غیر صحت مند، اور مجموعۂ خرافات ہے، ان کے مقابلہ میں پرانے ادب کے پرستاروں کا طبقہ جو اب بہت کم باقی رہ گیا ہے، پرانے ڈھرے سے ذرا بھی الگ ہونا باگناہ و ادب میں سوء ادب سمجھتا ہے، یہ دونوں نقطۂ نظر غلط ہیں،

ترقی پسندی اور نیا ادب اگرچہ اصطلاحیں نئی ہیں، لیکن نیا ادب اس زمانہ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ ہر زمانہ کے حالات اور ذوق و رجحان کے تغیر کا فطری نتیجہ ہے جس سے کسی زبان و ادب کی بھی تاریخ خالی نہیں ہے، اگر اردو کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے، تو فضلی کی دہ مجلس، میر شیر علی افسوس کی آرایش محفل، اور میر امن کے قصہ چہار درویش سے لیکر موجودہ ترقی پسند ادب تک، ہر زمانہ میں ترقی پسندی اور نئے ادب کا ایک سلسلہ نظر آئے گا، اس کے ابتدائی دور میں ادب محض مقفیٰ و مسجع عبارت آرائی اور خیالی افسانہ طرازی تک محدود تھا، اس کے بعد جب ترقی کا قدم آگے بڑھا تو افسانہ طرازی باقی رہی لیکن عبارت میں سلاست و سادگی آنے لگی، جس کا نمونہ چہار درویش ہے، اور کم و بیش ۱۸۵۷ء کے انقلاب تک یہ طرز قائم رہا، اس کے بعد جب حکومت کے ساتھ پرانی تہذیب کی بساط الٹی اور جدید تعلیم و تہذیب سے مذاق و خیالات میں تغیر پیدا ہوا، تو اس کے ساتھ ادب بھی بدلنا شروع ہوا، اور خیالی افسانہ طرازی کی جگہ حقیقت پسندی، ذہنی تفریحی ادب کے بجائے مفید سنجیدہ علمی و اصلاحی لٹریچر اور عبارت آرائی کے بجائے سادگی شروع ہو گئی، اور ادب محض ذہنی تفریح کے بجائے زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کا کام لیا جانے لگا، سرسید، شبلی، حالی، محمد حسین آزاد اور مولوی

چراغ علی وغیرہ کی تصانیف اس کا ثبوت ہین، بلکہ خالص ادبی افسانون مین بھی واقعیت و مقصدیت پیدا
ہو گئی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی راشد الخیری کے اصلاحی افسانے اُس کے شاہد ہین، اور ترقی پسندی کی
یہ رفتار برابر قائم رہی، اور حالات و ضروریات کے مطابق اردو ادب کا رنگ بدلتا اور ہر قسم کا لٹریچر
پیدا ہوتا گیا، ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے بعد سے اس وقت تک اردو مین اچھا خاصہ سیاسی لٹریچر
بھی پیدا ہو گیا ہے،

اسی قسم کے تغیرات نظم مین بھی ہوئے، غدر کے بعد ہی سے اردو شاعری کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا
تھا، سب سے پہلے غالب نے نیا راگ چھیڑا، اور خیالات اور طرز ادا دونون مین وسعت و تغیر پیدا کیا، اُن کے
بعد محمد حسین آزاد اور حالی نے ترقی کا قدم اور آگے بڑھایا، انھون نے اردو شاعری کو اُس کے قدیم تنگ کوچہ
سے نکال کر نئے خیالات و تعقدات سے آشنا کیا، مولانا حالی نے اس سے پسماندہ کاروان ملت کے لئے
حدی کا کام لیا، جس کا نمونہ مسدس حالی اور اُن کی دوسری نظمین ہین، اور پرانی شاعری کی عام اصلاح کے
لئے مقدمۂ شعر و شاعری لکھا، اُن کے بعد اکبر الٰہ آبادی نے شاعری کے مقاصد مین اور زیادہ وسعت پیدا کی،
اور اس سے گوناگون اصلاحی و تنقیدی کام لئے، اور اقبال نے اس کو محشرستان حیات کا صور اور جہاد زندگی
کی تکبیر بنا دیا، قومون کے عروج و زوال ترقی و تنزل اور موت و حیات کا وہ کون سا اصول و فلسفہ ہے، جو اُن
مین نہین ہے اور بعد کے سارے واقعی ترقی پسند شعراء درحقیقت اُنہی کے خوشہ چین ہین، غرض غدر کے بعد اردو
نظم و نثر کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے اس مین ترقی پذیری، حقیقت پسندی اور مقصدیت نظر آئے گی، اس لئے
یہ سمجھنا کہ ترقی پسندی موجودہ دور کے ترقی پسند شعراء اور ادیبون کا کارنامہ ہے سراسر غلط ہے، البتہ زمانہ
کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے ترقی پسندی کا رُخ بدلتا رہتا ہے، چنانچہ موجودہ زمانہ مین سیاسی و
معاشی و سماجی مسائل کے متعلق بھی اردو لٹریچر پیدا ہو رہا ہے، ترقی پسندی کو محض اشتراکی ادب کی نقالی
پیٹ کی آگ اور جنسی بھوک مین محدود کر دینا درحقیقت ترقی پسندی نہین بلکہ تنزل ہے، اس کے علاوہ

بھی زندگی کے بہت سے مسائل ہین، جو اُن سے کم اہم نہین،

پرانے ادب پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ عوام کی زندگی سے دور ہو، اسمین ان کی زندگی کی عکاسی اور اُن کے مذاق کی چیزین نہین ہین، اور وہ محض ذہنی و دماغی تفریح کا ذریعہ ہے، اس مین زندگی کے مشکلات و مسائل کا حل نہین ہے، ان اعتراضات کے جوابات کے لئے ان پر تفصیلی بحث کی ضرورت ہے، یہ صحیح ہے کہ پرانا ادب عوام کی زندگی سے دور ہے، اس کا سبب یہ ہو کہ اس زمانہ مین عوام کی اتنی اہمیت ہی نہین تھی، اور نہ عوامی مسائل پیدا ہوئے تھے، ان کا بڑا حصہ تعلیم سے بیگانہ تھا، اور وہ زیادہ تر خواص تک محدود تھی، اس لئے پرانا ادب خواص کے طبقہ مین محدود رہا۔ اور انہی کے اثرات بھی اس مین آئے لیکن اس سے مراد اردو ادب ہے، اردو زبان نہین،

لیکن اس کے باوجود کہ اردو ادب عوام کی زندگی سے دور رہا، اس مین ان کے ذوق اور اُن کی ذہنی تفریح کا پورا سامان موجود تھا خصوصاً شہری عوام کے لطف و تفریح کا بڑا ذخیرہ ہے، قصّہ چہار درویش، آرائش محفل، الف لیلہ، قصّہ لیلیٰ مجنون، نل دمن، گل بکاولی، نورتن، سنگھاسن بتیسی، بتیال پچیسی، قصّہ مادھول، اور اندرسبھا امانت وغیرہ بیسیون کتابین موجود تھین جن سے عوام ایسی ہی لطف و تفریح حاصل کرتے تھے جیسی موجودہ زمانہ کا ایک تعلیم یافتہ شخص اچھے سے اچھے ناول کے مطالعہ سے حاصل کرتا ہے، فرصت کے اوقات مین چند ہم سن و ہم مذاق ایک جگہ جمع ہو جاتے، حقہ کا دور چلتا، ایک خواندہ شخص ان مین سے کوئی کتاب پڑھتا، اور تمام سامعین اس سے لطف اندوز ہوتے، آج بھی لکھنؤ کے زردوزون، سادہ کارون اور دوسرے اہلِ حرفہ مین اس قسم کے ادبی اجتماع عام ہین، بلکہ ان مجلسون مین فسانۂ آزاد اور داستان امیر حمزہ تک کا دور چلتا ہے، شہرون کے علاوہ بڑے قصبات تک مین اس قسم کے تفریحی اجتماع ہوتے ہین،

البتہ خالص دیہاتی اور ان پڑھ کسانون کی تفریح کا سامان اردو ادب مین موجود نہین ہے، یہ طبقہ اردو کی ادبی زبان ہی نہین سمجھ سکتا تھا، اس کے لئے لٹریچر کہان سے پیدا ہوتا، لیکن اُن کے ذوق و دلچسپی اور لطف و تفریح

کے لئے برج بھاشا مین بہت سی کتابین قصے اور کہانیان موجود تھین اور جن کتابون کے نام گنے گئے ہین ان مین نورتن سنگھاسن بتیسی، بتیال پچیسی، قصہ نل دمن وغیرہ اور دوسری بہت سی کتابین برج بھاشا مین بھی ہین اُن کے علاوہ ہنس جواہر، اسلام کھنڈ، آلھا اودل کا قصہ، بارہ ماسے اور بہت سی داستانین اور حکایات موجود ہین، جو آج بھی دیہاتون مین بڑے ذوق اور دلچسپی سے سُنی جاتی ہین،

ان کے مقابلہ مین آج بھی دیہاتی عوام عوامی یا نئے ادب کے فیض سے محروم بلکہ اس کے نام تک سے واقف نہین، پُرانے ادب کی تفریحی کتابون سے کم از کم وہ ذہنی تفریح تو حاصل کر لیتے تھے، نئے ادب نے تو اُن کو اس سے بھی محروم رکھا ہے، اور وہ محض شہری تعلیم یافتہ نوجوانون کی مشق سخن اور تفریح کا ذریعہ ہے، البتہ زبانون پر عوامی ادب کی فیض بخشی کا شور ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ پرانے ادب مین دیہاتی زندگی کی عکاسی نہین ہے اسکی وجہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ اس دور مین اُن کی اتنی اہمیت نہین تھی، دیہاتون مین تعلیم نہ تھی لکھنے والے سب شہری تھے، مختصر افسانون کا رواج نہ ہوا تھا، اور اس زمانہ مین اردو کی عمر ہی کیا تھی، کہ اس مین ہر قسم کا لٹریچر موجود ہوتا، اس قسم کے مختصر افسانے تو مغربی زبانون مین بھی ان کے انتہائی عروج، بلکہ زمانۂ حال مین پیدا ہوئے، ایسی حالت مین اردو مین ان کا وجود کہان سے ہو سکتا تھا لیکن اسکی ترقی کے ساتھ سب چیزین رفتہ رفتہ آرہی ہین، اس کے علاوہ ان معترضین سے یہ سوال ہے کہ اُن کے عوامی ادب اور عوامی زندگی کی عکاسی سے خوان غریب دیہاتی عوام کو کیا فائدہ پہنچا، وہ اس کے علمی و عملی دونون فوائد سے محروم ہین، ان مین اتنی استعداد صلاحیت نہین کہ وہ کم سے کم انھین پڑھکر ذہنی تفریح ہی حاصل کر سکین، اُن کی پرمحن زندگی جیسے پہلے تھی اب بھی ہے، ان کو جو فائدہ پہنچا بھی ہے، وہ سیاسی حالات نے پہنچایا ہے، عوامی یا نئے ادب کو اس مین کوئی دخل نہین، وہ ویسے ہی محض تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہنی تفریح کا ذریعہ ہے، جیسے پرانا ادب ہے، روس مین عوامی ادب اس وقت پیدا ہوا جب عوام کا بڑا حصہ تعلیم یافتہ یا کم سے کم خواندہ ہو گیا، یہان حال یہ ہے کہ دیہاتی آبادی کا بڑا حصہ بلکہ تقریباً کل کا کل جاہل مطلق ہے، اور اس کی ضیافت کے لئے عوامی ادب کا خوان موجود ہے

جس کی خبر بھی ان بیچاروں کو نہیں ہے، یہ تو ویسی ہی ستم ظریفی ہے کہ غریب کسانوں کو آج بھی پیٹ بھر کھانا اور تن کا کپڑا میسر نہیں، لیکن اُن کی ترقی کے لئے دیہاتوں میں بجلی اور ریڈیو رائج کرنے کی اسکیمیں بنائی جاتی ہیں، اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عوامی ادب سے عوام کو عملاً کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا، ایسی حالت میں اس کا نام محض عوامی ادب رکھ دینے سے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا،

ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی کا جھگڑا بھی نہایت مہمل ہے، یہ دونوں قسمیں ہر زمانہ اور ہر زبان میں موجود رہی ہیں، گو یہ اصطلاحیں نہ رہی ہوں، البتہ اب ادب برائے زندگی کا تصور محدود ہو گیا ہے، پہلے زندگی نام تھا اس کے مادی، اخلاقی اور روحانی تمام پہلوؤں کا اور اب وہ سمٹ کر محض پیٹ اور جنسی بھوک میں محدود ہو گئی ہے، زندگی کے صحیح اور جامع تصور کے مطابق اس کے ہر پہلو کی ہدایت و رہنمائی کے لئے عربی، فارسی، سنسکرت، اور ہندی وغیرہ ہندوستان کی تمام رائج زبانوں میں حکیمانہ و فلسفیانہ کتابیں سبق آموز حکایات، حکیمانہ مقولے، اور ضرب الامثال موجود ہیں، اردو ایک نئی زبان ہے، اس لئے اس موضوع پر اس میں کم کتابیں لکھی گئیں، لیکن دوسری زبانوں سے بہت سی کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں، سنسکرت اور ہندی کے ترجموں کا راقم کو پورا علم نہیں ہے، لیکن انوار سہیلی یا کلیلہ دمنہ، گلستان سعدی، بہار دانش، اخوان الصفا، کیمیائے سعادت، مثنوی مولانا روم اور دوسری بہت سی حکیمانہ کتابوں کے جن سے زندگی کے ہر شعبہ میں سبق حاصل ہوتا ہے، ترجمے ہو چکے ہیں، اور یہ سب کتابیں تو ہمارے پرانے نصاب میں داخل تھیں یعنی زندگی کے جملہ مادی، روحانی و اخلاقی معاملات و مسائل کی باقاعدہ تعلیم ہوتی تھی، ایسی حالت میں پرانے ادب کو محض ادب برائے ادب میں محدود سمجھنا ناواقفیت کا ثبوت ہے،

خالص ادب یعنی ادب برائے ادب بھی زندگی کی ضروریات میں اور تہذیب و کلچر کی ترقی کا لازمی نتیجہ ہے، بلکہ دہقانی زندگی بھی اس سے خالی نہیں، انسان محض جانور یا مشین نہیں ہے، کہ وہ محض مادی ضروریات فراہم کرنے کا آلہ ہو، یا اس کی ضرورت محض پیٹ اور بھوک تک محدود ہو، بلکہ وہ مادی حوائج و

ضروریات کے ساتھ کچھ لطیف جذبات و احساسات اور پاکیزہ تصوّرات بھی رکھتا ہے، زندگی کی مشقتوں اور جد وجہد کے بعد اس کو سکون کے کچھ لمحات اور دماغی و ذہنی لطف و تفریح کا سامان بھی درکار ہے، عملی سے عملی آدمی کو بھی ایسے لمحات کی ضرورت ہوتی ہے، دیہات کے کسان بھی اس سے خالی نہیں ہیں، دن بھر کی محنت و مشقت کی تکان کے بعد اُن کو بھی ذہنی و دماغی سکون و تفریح کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ وہ بھی اپنی فرصت کے اوقات میں دیہاتی قصص و حکایات و افسانوں کو سن کر لطف و تفریح حاصل کرتے ہیں، اور جس قدر تہذیب و کلچر بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر اس قسم کے لٹریچر کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے، دل و دماغ کی تفریح و جلا کے لئے ادب برائے ادب ضروری اور تھکے ہوئے دماغ کی غذا ہے، جس سے دماغ تر و تازہ اور شگفتہ ہو جاتا ہے، اس کے بغیر دماغ کند اور ذہن غبی ہو جاتا اور زندگی کی بہت سی لطافتیں اور رعنائیاں ختم ہو جاتی ہیں، اس لئے انسانی زندگی کے لئے ادب برائے ادب بھی اسی طرح ضروری ہے، جس طرح ادب برائے زندگی، اگر ادب و شاعری کا حصہ زندگی سے خارج کر دیا جائے، تو وہ یکسر بے رنگ و بو ہو جائے،

نئے ادب کے بعض اصلاحی پہلوؤں کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں، ترقی پسند ادیبوں میں ایسے اصحاب قلم بھی ہیں جن کی کوششیں، ادبی و اصلاحی دونوں حیثیتوں سے قابلِ قدر ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے، جم غفیر ان نو آموزوں کا ہے جن کو قلم پکڑنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔، اور وہ ترقی پسند محض اس لئے کہلاتے ہیں کہ الٹے سیدھے اشتراکی خیالات کی نقالی کر لیتے ہیں، اُن کا سب سے بڑا عیب عریاں نگاری ہے، بلکہ پختہ کار ترقی پسند افسانہ نگاروں کے افسانے بھی اس سے یکسر پاک نہیں، سماجی اصلاح کی ضرورت مسلّم ہے، لیکن کیا اس کا طریقہ صرف عریاں نگاری ہے، اگر بالفرض کسی خاص صورت میں کسی درجہ میں اس کی ضرورت تسلیم بھی کر لی جائے، تو اس کو مزے مزے لے لیکر بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس سے تو خود ان ادیبوں کی جنسی بیماری کا پتہ چلتا ہے، انھوں نے فحاشی اور عریاں نگاری کو نوجوانوں میں اپنی شہرت و مقبولیت اور تجارت کا ذریعہ بنا لیا ہے، ورنہ یہ کام شائستہ طریقہ سے بھی کیا جا سکتا ہے، پرانے ادیبوں نے بھی اس موضوع پر

پر لکھا ہی، مرزا رسوا اور قاری سرفراز حسین نے طوائفون تک کی سرگذشت بیان کی ہے لیکن کس شائستگی کے ساتھ خود قاضی عبدالغفار صاحب جو پرانے اور نئے دونون ادب کے مجمع البحرین پرانے ادب کے نامور ادیب اور ترقی پسند ادیبون کے مقتدا ہین، ان کی کتابین لیلی کے خطوط اور مجنون کی ڈائری اصلاحی ترقی پسند ادب کا اچھا اور قابلِ تقلید نمونہ ہین لیکن اس کے لئے بڑے سلیقہ، حسن مذاق اور اس سے بھی بڑھ کر حسن نیت کی ضرورت ہی جس کا نئے ادیبون مین عموماً فقدان ہے،

یہ تو نئے اور پرانے ادب کے ایک حصہ یعنی نثر کا تجزیہ تھا، نظم کا حال بھی یہی ہے نہ ترقی پسند شاعری سراسر خیر ہے، اور نہ پرانی شاعری محض دفتر پارینہ، شاعری ہی نے اردو جیسی نومولود بولی کو مستقل زبان بنایا، اہل شعراء اور ادیبون کو زبان و بیان کے جوہر عطا کئے، ورنہ وہ ع

اک چیز لچر سی بہ زبان دکنی تھی

اس سے انکار نہین کہ اردو کی قدیم شاعری کا بڑا حصہ عشق و عاشقی کے جذبات اور ہجر و وصال و گل و بلبل کی داستان پر مشتمل ہے لیکن حسن مذاق اور لطافت کے ساتھ یہ چیزین شاعری کا عیب نہین، بلکہ ہنر ہین کس زبان کی شاعری اس سے خالی ہے، بلکہ شاعری کا آغاز ہی عشق و محبت کے جذبات سے ہوا، اسکو خارج کر دینے کے بعد شاعری مین رہ کیا جاتا ہی، البتہ اعتدال و سلامت مذاق ضروری شرط ہے، یہ صحیح ہے کہ آخری دور کے شعراء خصوصاً لکھنؤ کے شعراء نے شاعری مین بڑا ابتذال و رکاکت پیدا کر دی اور اس کو سفلہ جذبات کا چٹکلہ اور الفاظ کا کھیل بنا دیا، لیکن یہ اس دور کی زوال پذیر سوسائٹی کا قصور ہی، تاہم کوئی دور بھی بلند پایہ شعراء سے خالی نہین رہا، ان مین میر، مومن، ذوق، غالب، آتش اور انیس و دبیر بھی تھے جن کا کلام اردو شاعری کا لائق فخر سرمایہ ہے، خصوصاً انیس و دبیر نے اردو شاعری کا دامن نہایت وسیع کر دیا، انیس نے بالکل صحیح کہا ہے،

سبک ہو چلی تھی ترازوے شعر مگر ہم نے پلّہ گران کر دیا

یہ صحیح ہے کہ شاعری کا دامن محض عشق و محبت کی واردات سے زیادہ وسیع ہونا چاہئے اس کا

سے بلا شبہہ اردو شاعری کا گلہ بڑی حد تک صحیح ہے لیکن وہ دوسرے جذبات و خیالات سے یکسر خالی نہیں ہے خود غزل میں بھی جو اس حیثیت سے سب سے زیادہ مطعون سمجھی جاتی ہے، بہت سے اخلاقی و حکیمانہ خیالات پائے جاتے ہیں، بلکہ رباعی کے بعد غزل کے فرد اشعار ہی اس کے لئے موزون ہیں جس سے کسی غزل گو کا کلام بھی خالی نہیں ہے رباعی اور قطعات حکیمانہ خیالات کے لئے مخصوص ہیں، جن کا بڑا ذخیرہ اردو میں مسلسل نظم کے لئے مثنوی ہے جس میں ہر قسم کے واقعات اور خیالات و جذبات نظم کئے جا سکتے ہیں، اور اردو مثنویوں میں اس کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہیں اس لحاظ سے مرثیہ کا دامن بھی جن کا موضوع اگرچہ محدود ہے ہر قسم کے جذبات و خیالات، مناظر اور واقعہ نگاری کے لئے نہایت وسیع ہے اور اس کی بہتر سے بہتر مثالیں انیس و دبیر کے مراثی میں موجود ہیں جن کی نظیر جدید اردو شاعری میں اب تک نہیں مل سکتی، یہ تو پرانی شاعری کا حال ہے جدید دور کی شاعری میں ہر قسم کی نظمیں اس کثرت سے ہو گئی ہیں کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے البتہ موجودہ نقطۂ نظر سے قدیم شاعری زندگی کی حرارت اور اس کے تقاضوں کی تکمیل سے خالی ہے لیکن ایسے دور انحطاط کی شاعری میں جس کا نشو و نما حکومت کی تباہی، سوسائٹی کے فساد اور لکھنؤ کے گہوارۂ تعیش میں ہوا ہو زندگی کی حرارت اور اس کے تقاضوں کو تلاش کرنا ایسا ہی ہے، جیسے بہادر شاہ کی زنگ خوردہ تلوار میں ہمایون اور بابر کی تلوار کے جوہر اور رجا نعام پیا کے رنگ محل میں خونِ جگر تلاش کرنا، لیکن جب سے اردو شاعری کا قدیم رنگ بدلا ہے، اس میں قومی، ملی، معاشی اور سیاسی مضمون کا بڑا ذخیرہ پیدا ہو گیا ہے،

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جدید شاعری کے سرگروہ حالی، آزاد، شبلی، ظفر علی خان، اکبر اور اقبال سب کے سب پرانے مکتب شاعری کی پیداوار تھے، انھی نے جدید شاعری کا آغاز کیا، اور اس کو کمال کے اس درجہ تک پہنچا دیا کہ اب اس میں مشکل ہی سے اضافہ کیا جا سکتا ہے، خود ترقی پسند شعراء کے امام جوش ملیح آبادی بھی شاعری کے پرانے اسکول کی پیداوار ہیں، اگرچہ انھوں نے اپنے کلام میں ترقی پسندی کے رائج الوقت سکہ کا ٹھپہ لگا دیا ہے لیکن وہ اسی پرانی ٹکسال کا ڈھلا ہوا ہے، اسی لئے اس میں کھوٹ نہیں ہے اور کمالِ فن اور محاسن شاعری کے اعتبار سے استاد انہ ہے، اس لئے پرانی شاعری کا دفتر بالکل پارینہ نہیں ہے، البتہ اس کے بعض پہلو قابل اصلاح ضرور ہیں جنکی اصلاح ہوتی جا رہی ہے،

اس کے مقابلہ مین ترقی پسند شاعری کی ابھی کوئی حیثیت ہی قائم نہین ہوئی ہے اور ترقی پسند شعرا مین جوش مجاز، علی جواد زیدی، فراق اور اس قسم کے دو چار شعرار کو چھوڑ کر جن کی شاعری کا قالب وہی پرانا ہی، اور جو درحقیقت شاعری کہی جاسکتی ہے، باقی نظم منثور لکھنے والے کسی شمار مین نہین ہین، اور اُن کی حیثیت اشتراکی ادب کے بھونڈے نقال سے زیادہ نہین، اگر پُرانی شاعری محض عشق و محبت، گل وبلبل اور ہجر و وصال کے افسانون تک محدود تھی تو جدید ترقی پسند شاعری محض پیٹ، روٹی، انقلاب، مزدور، سرمایہ دار اور فرائیڈ کی جنسیات تک محدود ہے،

ترقی پسند نثر اور نظم دونون کے عیوب ونقائص قریب قریب یکسان ہین، نظم مین دو عیب مزید ہین، ایک شاعری کے قواعد سے آزادی، دوسرے ابہامیت یا رمزو کنایہ، قواعد سے آزادی کے لئے یہ عذر کیا جاتا ہی کہ وہ خیالات کے تنوع اور وسعت کا ساتھ نہین دے سکتے، اور اردو شاعری کی ترقی کے لئے اُن کا توڑنا ضروری ہے لیکن یہ محض عذر لنگ اور عجز بیان کا ثبوت ہے، رامائن، مہا بھارت، شاہنامہ، مثنوی مولانا روم وغیرہ دنیا کی بہت سی غیرفانی کتابین پابند نظم مین لکھی گئی ہین، اور ان مین مختلف النوع جذبات وخیالات، افکار وتصورات، واقعات و حالات، فلسفہ وحکمت، اخلاق وروحانیات وغیرہ کا ایک عالم موجود ہے، اور اُن کے نظم کرنے مین شاعری کی پابندیان حائل نہ ہوسکین، خود اردو جیسی نو عمر زبان مین غالب، انیس و دبیر اور اقبال کے کلام مین کیا کچھ نہین ہے، اقبال سے زیادہ بلند و دقیق کس کے خیالات ہونگے لیکن اُن کو کبھی قواعد شاعری کے دائرے سے باہر نکلنے کی ضرورت نہین پڑی، خود ترقی پسند شعرا مین جوش، مجاز، فراق، علی جواد زیدی، جان نثار اختر کر جن کا کلام درحقیقت شاعری کہلانے کا مستحق ہی شاعری کے قواعد کی تنگ دامانی کا شکوہ کبھی نہین ہوا، خصوصاً جوش کا کلام تو قادرالکلامی کا نمونہ ہے، اور اسی لئے اُن کے کلام مین جان ہی کہ اس کا قالب پرانا ہی،

بحر، ردیف اور قافیے کی پابندیان محض لایعنی نہین ہین، بلکہ اُن سے کلام مین حسن و اثر پیدا ہوتا ہی، ایک ڈھلا ہوا شعر سامعہ اور ذوق دونون کو متاثر کرتا ہے، قوت حافظہ بھی اسے جلد اور آسانی کے ساتھ محفوظ کرلیتی ہی، اس لئے تبلیغی مقصد کے لئے بھی پابند شاعری زیادہ مفید ہے، اس حد تک تو تسلیم ہے کہ ان تمام

قوانین کی پابندی کی ضرورت نہین جن سے شاعری محض صنعت گری بن جائے لیکن موٹی موٹی باتون مثلاً بحر و وزن اور قوافی کا لحاظ جن سے شعر کا قالب بنتا ہے ضروری ہے، ورنہ وہ شعر شعر نہین رہ جائے گا، ایسا تو نہ ہو کہ ایک نظم کا ہر مصرع دوسرے سے مختلف ہو، اور نثر و نظم مین امتیاز کرنا دشوار ہو جائے، بلکہ نظم منثور کے فقرے بھی ایک دوسرے سے مربوط نہ ہون، انگریزی کے بلینک ورس کی شوق سے تقلید کی جائے لیکن تھوڑی ترمیم کے ساتھ، ہر زبان کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جو دوسری زبانون کی بجنسہ نقل و تقلید کا متحمل نہین ہو سکتا، ایک ماہر و مبصر ادیب کا یہ کام ہے کہ دوسری زبانون کے ادب کی نقل و ترجمہ کو اپنی زبان کے مزاج کے مطابق ڈھال لے، ورنہ ایک کی روح دوسرے کے قالب مین بالکل اجنبی نظر آئے گی، اس قسم کے تصرفات خود عربی فارسی اور اردو کی بحرون مین جو ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہین کئے گئے ہین، اس لئے کہ بجنسہ ایک زبان کے قوانین شاعری دوسری زبان کی شاعری کیلئے موزون نہین تھے، ایسی حالت مین انگریزی جیسی اجنبی زبان کی شاعری کی نقل و تقلید مین تو ترمیم اور تصرف کی بھی زیادہ ضرورت ہے،

دوسرا عیب ابہامیت یا رمز و کنایہ ہے، اردو شاعری مین بھی استعارہ و کنایہ ہے لیکن اس کا استعمال خاص خاص مواقع پر اس خوبصورتی کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ کلام کے حسن و اثر دونون مین اضافہ ہو جاتا ہے، اور شاعر کا مفہوم و مقصد، تصریح سے زیادہ بلیغ طریقہ سے ادا ہو جاتا ہے، الکنایۃ ابلغ من التصریح مشہور مقولہ ہے، لیکن جدید شاعری کی ابہامیت ع

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تحریر کا

کی مصداق ہے اور اس کا مفہوم و مقصد سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے، ترقی پسند شاعری کا بڑا مقصد خاص خیالات کی تبلیغ و اشاعت ہے، اور اس قسم کی ابہامیت اس کے بالکل منافی ہے، اس لئے سنجیدہ ترقی پسندون کو ان نقائص کے اصلاح کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ ترقی پسند ادب کا اصل منشا پورا نہین ہو سکتا اور اس کی زندگی بھی بہت تھوڑی ہو گی،

مطبوعات جدیدہ

مسدس بے نظیر مصنفہ جان صاحب، مرتبہ جناب محمد علی خان صاحب اثر رامپوری، تقطیع چھوٹی،

ضخامت ۱۶۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ/ پتہ:- خسرو باغ روڈ ریاست رامپور،

نواب کلب علی خان والی رامپور بڑے علم دوست، علمار نواز اور علم و فن کے بڑے قدردان و سرپرست تھے اُس دور کے بہت سے نامور علمار و شعرار اور ادبا، دربار رامپور سے وابستہ تھے، نواب موصوف کے زمانہ مین بعض تمدنی کام بھی انجام پائے، اسی سلسلہ مین انھون نے اپنی تخت نشینی کی یادگار مین ۱۸۶۶ء مین ایک میلہ قائم کیا تھا، یہ رامپور کا تاریخی میلہ تھا، سرکاری انتظام مین باغ بے نظیر مین لگتا تھا، نواب ممدوح خود بنفس نفیس اس مین شریک ہوتے اور ہر فن کے باکمال اس میلہ مین اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے تھے، شعر و ادب کی محفل بھی جمتی تھی، چنانچہ دربار رامپور کے بہت سے متوسل شعرار نے میلہ اور باغ بے نظیر کی تعریف مین اشعار کہے تھے، مشہور ریختی گو جان صاحب نے ایک مستقل مسدس مسدس بے نظیر تصنیف کیا تھا، جو اب تک نہین چھپا ہے، اس کا قلمی نسخہ ریاست کے کتبخانہ مین موجود تھا، جناب اثر رامپوری نے اسکو مبسوط مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، مسدس تو کل ۳۲ صفحون کا ہے، لیکن مقدمہ کی حیثیت مستقل تصنیف کی ہے، اس مین لائق مصنف نے بڑی تلاش و جستجو سے تاریخی و ادبی ماخذون، شعرار کے دواوین اور رامپور کے پرانے بزرگون کی معتبر زبانی روایات سے میلہ اور باغ بے نظیر کے مفصل حالات تحریر کئے ہین، اور جان صاحب کے مسدس اور دوسرے شعرار کے کلام مین جن لوگون کے نام یا جو اشارات آئے ہین، اُن کے مختصر حالات اور اُن کی تشریحات تحریر کی ہین، اس طرح اس مقدمہ مین اس دور کے رامپور کی نہایت دلچسپ تمدنی تصویر آگئی ہے جس کا اب صرف تاریخون مین ذکر ملے گا، "م"

جلد ۶۶ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۰ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۰ء عیسوی عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

آثارِ علمیہ و ادبیہ

شذرات

معارف نے ہمیشہ مذاقِ عام سے اپنا دامن بچایا اس لئے آج تک اس کا کوئی خاص نمبر نہیں نکلا، لیکن بعض حالات ایسے پیش آجاتے ہین کہ پرانی روش سے ہٹنا ضروری ہوجاتا ہے، انہی مین مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم کا حادثۂ وفات بھی ہے، مرحوم کی ذاتِ گرامی ایسے گوناگون اوصاف وخصوصیات کی جامع تھی کہ ایسے نمونے اب دیکھنے مین نہ آئین گے، بلکہ وہ اپنے زمانہ مین بھی ان اوصاف مین منفرد تھے، اُن کی وفات سے فضل وکمال، علم دوستی وعلماء نوازی، تقویٰ ودیانت، تہذیب وشرافت، سیرت کی استواری ووضعداری کی جامعیت کا خاتمہ ہوگیا، اس لئے اُن کی یادگار درحقیقت ان اوصاف وکمالات اور علم وفن کی یادگار ہے،

اس عمومی حیثیت کے علاوہ مرحوم کو دار المصنفین سے خاص تعلق تھا، وہ مولانا شبلی مرحوم کے بڑے گہرے اور مخلص دوست تھے، اُن کی وفات کے بعد یہ ربط وتعلق اُن کی یادگار دار المصنفین کی جانب منتقل ہوگیا، چنانچہ مرحوم اس کے بڑے قدردان، ہواخواہ، مجلس دار المصنفین کے رکن رکین اور اُس کے صدر نشین تھے، اسلئے دار المصنفین پر اُن کا بڑا حق تھا جس کو وہ اُن کی علمی یادگار ہی کی شکل مین ادا کرسکتا تھا،

اس نمبر مین اس کی کوشش کی گئی ہے کہ مرحوم کی زندگی کے تمام اہم پہلو اور اُن کی نمایان خصوصیات سامنے آجائین، چنانچہ متعدد مضامین ایسے اصحابِ علم وقلم کے ہین، جن کو برسون مرحوم کے ساتھ رہنے یا اُن کو زیادہ قریب سے مسلسل دیکھنے کا موقع ملا ہے، اس لحاظ سے یہ نمبر اُن کی زندگی کا نہایت مستند مرقع ہے، حضرة الاستاذ مدظلہ کا مضمون ایسے وقت ملا جب معارف کا ابتدائی حصہ چھپ چکا تھا، لیکن مضمون کی اہمیت کے لحاظ سے اُس کو سرِ مقالہ رکھنا ضروری تھا، اس سے صرف چند ابتدائی صفحون کے ہندسے مکرر ہوگئے ہین، باقی اور کوئی فرق نہین آیا ہے، ان گذارشات کے ساتھ مولانا شروانی مرحوم کی زندگی کا یہ مرقع اور اُنکی علمی یادگار ناظرینِ معارف کی خدمت مین پیش ہے،

مقالات

آہ! مولانا شروانی

از

سید سلیمان ندوی

اگست کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ لاہور کے کسی اخبار مین سرسری طور سے یہ خبر چھپی کہ مولانا شروانی کا انتقال ہوگیا، خبر پڑھ کر دل دھک سے ہوگیا، اور اپنی دوری، مجبوری، اور مجبوری پر بڑا افسوس آیا، مین نے مرحوم کی زندگی ہی مین اُن کے واقعات اور خاندان شروانی کے بعض احوال لکھوا کر دار المصنفین مین رکھ لئے تھے، اب جب اُن کا سانحہ پیش آیا، تو تقدیر کی مجبوری دیکھئے کہ تدبیر کوئی کام نہ آئی،

مرحوم نے چھیاسی سال کی عمر مین بتاریخ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء اس دنیائے رنگ و بو کو خیرباد کہا، اور سلف صالحین سے جا ملے، مرحوم سے میرے تعلقات اس قدر گوناگون تھے کہ نہین کہا جا سکتا کہ اس کو کہان سے شروع کیا جائے، اور کیا کہا جائے اور کیا چھوڑا جائے، مین نے موصوف کو سب سے پہلے ۱۹۰۶ء مین نصف صدی پہلے پٹنہ کے اجلاس ندوہ مین دیکھا تھا، بھرا شباب، مردانہ حسن و جمال، سپید رنگ، سیاہ خوبصورت داڑھی، اور سر پر زلفین، بلند و بالا قامت، لطیف و قیمتی لباس، جلسہ کے ہر اجلاس مین نیا جوڑا زیب بدن، کبھی سر پر عمامہ، کبھی گول ٹوپی، کبھی ترکی ٹوپی، جدھر نکل جاتے آنکھین اُٹھ جاتین انگلیان اشارہ کرتین لوگ ایک دوسرے کو دکھاتے اور بتاتے، اسی طرح مین نے دیکھا، اور بتایا گیا کہ یہ علی گڈھ

کے ایک رئیس عالم ہیں،

۱۹۰۱ء میں جب میں ندوہ آیا، تو مدرسہ اُن کے ذکر جمیل سے پُرشور تھا، انتظامی جلسے سال میں چند بار ہوتے، اور وہ اُن میں جب آتے تو جلسے کی اہمیت بڑھ جاتی، ۱۹۰۴ء میں جب الندوہ نکلا، اور وہ اس کے اڈیٹر ہوئے، اور میرے ایک دو مضمون اس میں نکلے تو تعارف بڑھا، اور جب وہ آتے، تو میں حاضر ہوتا اور وہ اپنے بزرگانہ لطف و نوازش سے نوازتے ۱۹۰۶ء میں جب میری جماعت کی دستاربندی کا جلسہ ہوا اور خاکسار کی عربی تقریر نے حاضرین سے دادِ تحسین حاصل کی، اور حضرۃ الاستاذ نے خوش ہو کر اپنے سر سے عمامہ اُتار کر میرے سر پر رکھی تو اُس جلسہ میں مولانا شروانی شریک تھے تاہم حضرت الاستاذ نے خود اپنے قلم سے لکھ کر اُن کو اس واقعہ کی بڑی مسرت سے خبر دی، (یہ خط مکاتیب شبلی میں درج ہے) استاد کی یہ وساطت مولینا شروانی سے تقریب کا نیا ذریعہ بنی،

۱۹۱۰ء میں جب مکاتیب شبلی کی تدوین کا خیال آیا، تو اُستاد نے پھر مولانا شروانی سے تقریب کی، کہ اُن کے پاس شبلی کے خطوط ہوں وہ سید سلیمان کو دیئے جائیں، ۱۹۱۲ء میں جب ندوہ میں حضرۃ الاستاذ کے حسب ایما انگریزی مدارس کے نصاب تاریخ کی غلطیوں کی تصحیح کا کام میرے سپرد ہوا تو پھر تازہ تقریب کی گئی، نومبر ۱۹۱۴ء میں جب حضرۃ الاستاذ بیمار ہوئے، اور حالت مایوسی کو پہنچی تو خاکسار حاضر خدمت تھا، سب سے پہلے میں نے اس شدتِ تعلق کی بنا پر جو اُن دونوں دوستوں میں تھا، اس مضمون کا ایک مختصر کارڈ اُن کو بھیجا "افسوس کہ الفاروق کا مصنف اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں ہے"، ۱۸ نومبر کو مولانا نے وفات پائی، اس کی اطلاع دی، اس کے بعد سے جو اُن سے مکاتبات کا سلسلہ شروع ہوا، تو آج سے دو برس پہلے تک اُس وقت تک برابر قائم رہا جب تک اُن کی قوتِ حافظہ اور عام قوتِ جسمانی کام دیتی رہی، آج سے دو سال پہلے میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کی میٹنگ میں سب سے آخری دفعہ اُن سے ملا، میں نے دیکھا کہ اُن کا نیم سا قد نیم کمان بن چکا ہے، وہ چہرہ جو گلاب سا تر و تازہ اور شاداب رہتا تھا، پژمردہ

اور مرجھایا تھا، اوسی وقت دل نے کہا کہ یہ چراغِ سحر بجھا ہی چاہتا ہے،

میرا عمر بھر یہ دستور رہا کہ حضرۃ الاستاذ کے مخصوص احباب اور دوستون سے بزرگداشت کا تعلق رکھون اور ہمیشہ اُن کے سامنے اپنے کو چھوٹا سمجھون، چنانچہ مرحوم سے خصوصیت کے ساتھ میری طرف سے خوردانہ اور اُن کی طرف سے بزرگانہ تعلق قائم رہا، مین اُنھین مخدوم لکھتا وہ عزیز لکھتے، دار المصنفین کی تاسیس مین مرحوم کی بزرگانہ حمایت ہمیشہ رہنما رہی، دار المصنفین کے پہلے صدر جسٹس مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عماد الملک اور تیسرے مولانا شروانی ہوئے، اس تعلق سے بھی اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ اکثر رہا کیا، ایک دفعہ جب احباب اور بزرگون کے محفوظ خطوط گنے تو سب سے زیادہ جن کے خطوط میرے پاس نکلے، وہ انہی کے تھے، مین نے جب اُنھین اس کی اطلاع دی، تو اُس پر مسرت ظاہر فرمائی، اور لکھا کہ اس مین تعجب کی کیا بات ہے، اس کا الٹا ہوتا تو تعجب ہوتا،

وہ قدیم و جدید تعلیم کا بہترین مجموعہ تھے، فارسی و عربی تعلیم گھر پر حاصل کی، عربی کی اونچی کتابین حضرت مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب علی گڈھی کے درس مین پڑھین، انگریزی تعلیم میٹرک تک آگرہ اسکول آگرہ مین پائی، اُن کی جوانی تک علم و فن اور دین و تقوی کے باکمال اکابر موجود تھے، وہ ہر ایک کے در تک پہنچے اور ہر ایک سے حسب استعداد کسب فیض کیا، شیخ حسین یمنی عرب مقیم بھوپال سے سندِ حدیث حاصل کی، قاری عبد الرحمن صاحب پانی پتی سے فیض پایا، بیعتِ قطب الہ تحت حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی سے کی تھی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کی زیارت سے بھی فیض یاب تھے،

اُن کا سب سے پہلا مضمون جس نے لوگون سے خراجِ تحسین وصول کیا، وہ بابر پر ہے، جو رسالہ حسن حیدرآباد مین چھپا تھا، اور جس پر مصنف کو ایک اشرفی انعام ملی تھی، مولانا شبلی کی المامون پر اُن کا تبصرہ اُن کا پہلا تنقیدی کارنامہ ہے، جو غالباً ۱۸۸۹ء مین شوق قدوائی کے اخبار آزاد مین چھپا تھا، اُن کے رسائل مین دو بہترین تاریخی رسائل ہین، یہ دونون ندوہ کے سالانہ جلسون مین پڑھے گئے تھے، پہلے کا نام علمائے سلف ہے،

اور دوسرے کا نام نابینا علما، یہ دونون انیسوین صدی کی یادگار ہین، ۱۹۰۱ء مین لاہور سے جب مخزن نکلا، تو اُس کی محفل مین بھی یہ شریک تھے، حضرت خسرو کے غزلیات پر اس مین اُن کا مضمون چھپا تھا، ۱۹۰۴ء مین الندوہ کے شریک اڈیٹر ہوے، تو اخلاق پر اُن کے مضامین نکلے،

علی گڈھ کی مجلسون مین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات مین الصدیق لکھ کر پیش کی، حیدرآباد کی میلاد کی مجلسون کے وہ بانی تھے، اُن مین سیرۃ پر مختلف رسائل لکھے، جو چھپے اور پھیلے، معارف مین اُن کے مضامین اور اُن کی غزلین اکثر زیب اوراق رہین،

شعر و شاعری کا ذوق اُن کو آغاز سے تھا، حسرت تخلص کرتے تھے، اردو اور فارسی دونون مین مشق سخن کرتے تھے، اردو مین حضرت امیر مینائی سے اصلاح اور فارسی مین مولانا شبلی سے مشورہ کرتے تھے، فارسی کے مشہور شاعر حضرت خواجہ عزیز سے بھی مولانا شبلی کے ذریعہ سے تعلق رکھتے تھے،

اُن کے اخلاقی فضائل مین وضعداری بڑی نمایان تھی، جس سے جتنا ملتے تھے، تمام عمر اسی طرح ملتے رہے، جب لکھنؤ آتے تو منشی احتشام علی صاحب کی کوٹھی مین ٹھہرتے تھے، اور تمام عمر مین کبھی اس وضع مین فرق نہین آیا، پھر اس قیام مین جن جن بزرگون اور دوستون سے ملنے کا دستور تھا، اسی طرح وہ جاکر ملتے، اور اتنی دیر بیٹھتے، لکھنؤ مین فرنگی محل اور وہان بھی مولانا محمد نعیم صاحب کی نشست گاہ مین ضرور حاضر ہوتے،

اُن کی جوانی تھی کہ ندوہ کا غلغلہ بلند ہوا، یہ وہ مجلس تھی جس کی روحانی اور علمی صدارت جن دو بزرگون سے نسبت رکھتی تھی یعنی مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی اور حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب دونون ہی سے اُن کو قلبی تعلق تھا، اس لئے وہ ندوہ کے اُن اصلی ارکان مین تھے، جن سے ندوہ کی مجلس عبارت تھی، وہ سب سے پہلے ۱۹۱۶ء مین ندوہ کے اجلاس ناگپور کے صدر ہوئے، اور یہین اسی وقت دولت آصفیہ مرحوم کی صدارت امور مذہبی کی خبر عام ہوئی، جس کے بعد اُن کا بارہ تیرہ برس کے قریب حیدرآباد مین قیام رہا، اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس اور شعبۂ دینیات کے افتتاح مین اُن کی مساعی مشکور رہین، حیدرآباد

کا حال وہاں کے مقیم احباب سنائیں گے،

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی وہ دو دفعہ ندوہ کے اجلاس کے صدر ہوئے، پہلی دفعہ انبالہ میں اور یاد آتا ہے کہ دوسری دفعہ لکھنؤ میں مرحوم کو قومی اداروں میں سے علی گڈھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دار المصنفین اعظم گڈھ سے خصوصیت کا تعلق تھا، مولانا شبلی مرحوم کے بعد غالباً ۱۹۱۵ء میں وہ انجمن ترقی اردو کے بھی ناظم ہوئے، اور دو تین سال کے قریب خدمت کے بعد قرعۂ فال مولوی عبد الحق صاحب کے نام نکلا، ان اداروں کے علاوہ دار العلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے بزرگوں سے بھی ارتباط رکھتے تھے، اور ان درسگاہوں کی بھی امداد فرمایا کرتے تھے،

عجیب اتفاق ہے کہ ناداستہ ۱۹۲۶ء میں سفر حج میں بھی میرا ان کا ساتھ ہوا، یہ موتمر اسلامی والا مرتبہ تھا، یہاں یہ سخت بیمار پڑ گئے تھے، مگر بڑی ہمت کے ساتھ سارے ارکان ادا کئے، مدینہ منورہ کے قیام کے زمانہ میں میں نے ان کا تعارف شیخ ابراہیم خربوطی مدیر کتب خانہ شیخ الاسلام سے کرادیا، یہ تعلق چونکہ علمی اور روحانی دونوں تھا، اس لئے بڑا سازگار آیا، اور آخیر آخیر وقت تک قائم رہا، حرمین محترمین کی خدمت بھی وہ سالانہ کیا کرتے تھے، آخیر دفعہ جب دو سال ہوئے، میں نے اپنے ارادۂ حج کی اطلاع ان کو دی تو لکھا کہ اس دفعہ حرمین شریفین کی خدمت کی رقم آپ ہی کے ذریعہ جائے گی، مگر روانگی کے وقت نہ ان کو یاد رہا، اور نہ میں نے یاد دلایا،

ان کو نادر اور قلمی کتابوں کا بڑا شوق تھا، اور اس شوق کی تاریخ خود انھوں نے لکھ کر معارف میں چھپوائی ہے، مولانا شبلی مرحوم کے ذریعہ سے اور ان کی پسند سے کتابیں خریدا کرتے، لکھنؤ میں عبد الحسین اور واجد حسین قلمی کتابوں کے تاجر تھے، لکھنؤ آتے تو ان کے نوادر دیکھتے، اور چھانٹ کر لے جاتے، یوں بھی کتابیں ان کے پاس پہنچتی رہتی تھیں، حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی بہت سی کتابیں حاصل کیں، میں جب ۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ سے واپس آیا، تو عزیزوں اور بزرگوں کے لئے جو تحفے لایا مرحوم کے لئے نستعلیق کے اچھے خطاطوں کی وصلیوں کی

کی عکسی تصاویر کا مجموعہ لاکر پیش کیا،

پہلے تو اصل وطن علی گڈھ مین بھیکم پور مین تھا، بعد کو بھیکم پور سے کچھ دور اپنے نام سے حبیب گنج نام ایک گاؤن آباد کیا تھا، وہین زنانہ اور مردانہ مکانات مسجد اور ایک کتب خانہ کی عمارت تیار کی تھی، زمینداری کے شغل کے بعد بھی کتب خانہ اُن کی دلچسپی کا مرکز تھا،

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد ہاتھ مین ایک بڑی سی لکڑی لے کر باغ مین سیر کو نکل جاتے، اس وقت ان کے دوسرے ہاتھ مین تسبیح ہوتی، لکھنؤ آتے تو صبح کو پیدل منشی احتشام علی کی کوٹھی واقع خیالی گنج سے مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی کوٹھی ہارڈنگ روڈ تک پیدل جاتے، واپسی سواری پر ہوتی، دارالمصنفین آتے تو احاطہ کے اندر کمرہ کے باہر روش پر ٹہلا کرتے،

ایک دفعہ دارالمصنفین کا جلسۂ انتظامیہ رمضان المبارک مین مقرر کیا، ہم نے عذر کرنا چاہا، تو جواب مین لکھا کہ کیا رمضان مسلمانون کے کام مین مانع ہے، غرض تشریف لائے، اس زمانہ مین وہ چائے کے بجائے اولٹین پیتے تھے، مین کافی اور مولوی مسعود علی صاحب چائے پیتے تھے، سحری مین یہ تینون شراب الصالحین لائی جاتین، اور ہر ایک کا ایک ایک دور چلتا، اور بڑی خوشی سے پیتے، اور بعد کی ملاقاتون مین اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے،

دارالمصنفین کی مسجد مرحوم ہی کی کوشش سے نواب فضل اللہ خان مرحوم کی امداد سے مولوی مسعود علی صاحب کی نگرانی اور انجنیرنگ مین بنی، پھر دارالعلوم ندوہ کی مسجد بھی برادر موصوف ہی کی نگرانی اور انجنیرنگ مین بنی، مرحوم دونون کو دیکھ کر برادر موصوف کے تعمیری ذوق کو بہت پسند فرماتے تھے، چنانچہ جب وہ علی گڈھ مین حبیب منزل بنوانے لگے، تو مولوی صاحب موصوف کو بلوا کر اُن سے مشورہ کیا، انھون نے جو مشورہ دیا اس مین سے سامنے کی روکار عمارت ہی فرماتے تھے کہ اگر یہ حصہ نہ بنتا، تو یہ عمارت کچھ نہ ہوتی،

مرحوم کے اخلاق کی دو خصوصیتین عجیب تھین، ایک یہ کہ جس شخص سے جس حیثیت سے اُن کو تعلق ہوتا وہ

اس سے اوسی جہت سے ملتے، اور اسی کے متعلق باتین کرتے، اوسکی دوسری جہتون سے اُن کو کوئی تعلق نہ ہوتا،

حکیم اجمل خان مرحوم سے گہرے تعلقات تھے، مگر یہ یکجہتی، قدیم قلمی مخطوطات اور قدیم تہذیب و شرافت کے اذکار سے تھی، ان دونون کی ملاقاتون مین یہی تذکرے رہتے کبھی بیچ مین سیاست کا نام بھی نہین آتا، مولانا ابو الکلام سے بھی مولانا شبلی کے واسطہ سے اُن کے تعلقات تھے، اُن کی ملاقات اور مکاتبت بھی جو چھپ چکی ہے، سیاست کے تذکرہ سے خالی ہے، میری زندگی پر مختلف دور گذرے ہین، جن مین سیاست بھی ہو، مگر کبھی کسی خط مین نہ مین نے اُس کے متعلق کچھ لکھا، اور نہ کبھی انھون نے پوچھا،

اُن کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اُن کی مجلس مین کبھی کسی کی بُرائی یا غیبت نہین ہوتی، کوئی کرتا بھی تو اوڑادیتے، خطوط مین بھی یہی احتیاط تھی، اگر ناگزیر طور سے کچھ ذکر آتا، تو اس طرح اشارہ و کنایہ مین کہتے کہ غیر اوس کے سمجھنے سے قاصر رہتے،

مرحوم کو اچھی اور تاریخی یادگارون کا شوق تھا، بعض بادشاہون کے فرامین، تلوارین یا خنجر اُن کے پاس تھے، مین جب ۱۹۳۳ء مین کابل کے سفر سے واپس آیا، اوس کے بعد مرحوم دار المصنفین آئے تو قالینون کا تذکرہ نکلا، مین نے عرض کیا کہ نادر شاہ شاہ کابل نے مجھے ایک قالین عنایت کیا ہے، اُن کو دکھایا تو اُس کو پسند کیا، مُلّا صاحب سے جو اُن کے رفیق خاص تھے، اور ہمیشہ سفر مین ساتھ رہتے تھے، فرمایا مُلّاجی یہ تو پٹھانون کا مال ہے، ساتھ باندھ لو، چنانچہ وہ قالین اُن کے نذر کردیا کہ شاہان بشاہان می زیبند، فقیرون کے یہان اس کا کیا کام، البتہ شاہ کی دی ہوئی تسبیح سبز شاہ معصود کی نقیر کے پاس ہے،

مرحوم بزرگون کے قصے لطیفے، حالات اور حکایتین اس قدر ذوق و شوق و لطف سے مجلس مین بیان فرمایا کرتے تھے کہ اوس وقت وہ بلبل ہزار داستان معلوم ہوتے تھے، اُن کی تقریرون کا بھی یہی رنگ تھا، آواز گو پست تھی، مگر تقریر مسلسل اور تاریخی واقعات کے حوالون سے پر تاثیر ہوتی تھی، اُن کی انشا پردازی کا بھی ایک خاص رنگ تھا، نہایت ستھرا اور پاکیزہ، تکلف سے بری تصنع سے خالی، اردو اور دسے پاک بزرگون

کے تذکرے ادب سے کرتے تھے، زبان فطرۃً نہایت ادب شناس عنایت ہوئی تھی، لہجہ مین سختی اور آواز مین کرختگی مطلق نہ تھی، گرم سے گرم موقعون پر بھی وہ حدود سے باہر قدم نہین رکھتے تھے،

بظاہر وہ اخلاق مین بڑے نرم، مرنج و مرنجان تھے، مگر جب کسی وقت کسی چیز پر اڑ جاتے، تو پھر اُس سے نہ ٹلتے تھے، چنانچہ حیدرآباد سے علٰحدگی کا سبب یہی پیش آیا، اس پر ایک شعر انھون نے کہا جو مجھے لکھ بھیجا تھا،

شاہباز ہمتم، ربطے بدست شاہ داشت
دست دیگر ترک کردم در ہوا پرواز کرد

یہ بھی اُن کی سیرت کا قابلِ ذکر واقعہ ہے کہ باوجود ایک رئیس ابنِ رئیس ہونے کے اور حکامِ ضلع سے اچھے تعلقات رکھنے کے سرکاری اعزاز و احترام اور خطاب و القاب سے بچتے تھے، ایک دفعہ اُن کو شمس العلماء کا خطاب ملنے والا تھا، اُن کو خبر ہوئی تو بڑی کوشش کی کہ اس خطاب سے اُن کو بری رکھا جائے، فرماتے تھے کہ حیدرآباد کا خطاب اس لئے قبول کیا کہ یہ ایک دولتِ اسلامیہ کی نشانی تھی،

مرحوم کو ملتِ اسلامیہ سے بڑی محبت تھی، اُس کے اچھے واقعات اور مسرت بخش تذکرون سے خوش ہوتے تھے، اور اس کے نفاق و اختلاف کی باتون سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے، ندوہ کے باہمی اختلاف کے زمانہ مین باوجود اس کے کہ طرفین دوست تھے، دونون سے بیگانہ رہے، اور جب مولانا شبلی کی وفات کے بعد مصالحت کا زمانہ آیا تو وہ سب کے آگے تھے،

مرحوم گو سیاست سے سروکار نہین رکھتے تھے، تاہم ملک کے پچھلے واقعات سے بہت غمگین تھے، عمر کے ساتھ کچھ ملکی اور کچھ خانگی افکار نے بھی اُن کے دل و دماغ کو متاثر کیا، مگر ضبط اور تحمل ایسے تھے کہ کبھی اس داستان کا ایک حرف زبان پر نہین آیا، ادھر قویٰ مین سب سے پہلے اُن کے حافظہ نے جواب دیا، اکثر بات بھول جاتے، جب کاروانِ خیال نکلا تو اس مین مولانا ابوالکلام کے جواب مین اُن کا یہ بیان پڑھکر مجھے بڑی حیرت ہوئی، کہ ہان مجھے یاد ہے کہ دو نوجوان غلام محی الدین اور ابوالکلام سفرِ عراق کو نکلے تھے،

تفصیلات اب معلوم ہوئیں، میں نے انھیں لکھا کہ یہ صحیح ہے کہ سفر عراق پر (شاید ۱۹۰۸ء میں) دونوں جوان عراق کے سفر کو نکلے تھے جن میں سے ایک غلام محی الدین (مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی) تھے، مگر دوسرے ابوالکلام نہیں بلکہ حافظ عبدالرحمن امرتسری تھے، اور اس وقت مولانا ابوالکلام امرتسر میں وکیل کے ایڈیٹر تھے، بیچارے غلام محی الدین مرحوم نے عراق میں انتقال کیا، ہندوستان خبر آئی، تو مولانا ابوالکلام نے وکیل میں اپنے حزن و غم کا اظہار فرمایا، اخیر میں میں نے لکھا کہ آپ کی اس طرح تصدیق کر دینے سے افسانہ بھی تاریخ بن جائیگی،

اس پر مرحوم نے خاموشی اختیار کی، اور کچھ جواب نہیں دیا، یہ اُن کی خاص عادت تھی کہ جس بات پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے، اس کے جواب سے اعراض کرتے، اسی سے اُن کے ادا شناس اُن کے مطلب کو سمجھ جاتے،

مرحوم کو بزرگوں کی یادگاروں سے والہانہ شیفتگی تھی، پٹنہ کے اجلاس ندوہ میں غالباً حاجی شاہ منور علی دربھنگوی بانی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، ندوہ کے جلسہ میں دستار سر پر باندھ کر آئے جو حضرت حاجی صاحب کا عطیہ اور تبرک تھا، ایک تعلیم یافتہ کی تقریر پر جلسہ میں ایک ایسا پر عظمت جوش علماء، مشائخ، صلحا، اور عامۂ مسلمین پر طاری ہوا کہ جو جس کے پاس تھا، وہ ندوہ کے نذر کر دیا، شاہ منور علی صاحب نے وہی دستار اُتار کر پھینک دی، وہ دستار نیلام ہو کر بڑی قیمت کو فروخت ہوئی، وہ کون خوش قسمت تھا جس نے آگے بڑھ کر اس کی حسب حیثیت قیمت ادا کی، اور اس کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا، نوجوان حبیب الرحمن خان شروانی! پھر اس کو وہ ہمیشہ اپنے لئے طرۂ سعادت سمجھتے رہے"

اُن کے اخیر دور کی یادگاروں میں استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب کی سوانح عمری، اور حلیب بغدادی پر حنفی نقطۂ نظر سے تبصرہ ہے، جو معارف میں چھپے ہیں، اور الگ بھی شائع ہوئے انھوں نے

مولانا سلیمان اشرف صاحب کی کتاب المبین پر ایک تبصرہ لکھا اور میرے پاس بھیجا، اسی زمانہ مین فقیر کی تصنیف عرب و ہند کے تعلقات چھپی تھی، جی چاہا کہ مرحوم کے قلم سے اس پر ایک تبصرہ شائع ہوتا، تو مصنف کو فخر و مباہات کا ایک موقع ہاتھ آتا، اس موقع پر اپنے مطلب کو مین نے اس طرح ادا کیا، المبین پر تبصرہ ملا، یاد آیا کہ حضرۃ الاستاذ کی تصنیفات پر آپ کا تبصرہ ہمیشہ ہوا کرتا، چنانچہ المامون، الغزالی، سوانح مولانا روم اور شعر العجم وغیرہ پر تبصرے پڑھے، کیا حضرۃ الاستاذ کی متروکہ موروثی سعادتون مین سے راقم کو بھی اس سنت دیرینہ کی موروثی سعادت کے حصول کا موقع ملے گا، مرحوم نے بڑی خوشی سے تبصرہ لکھا جو معارف مین شائع ہوا،

مرحوم کی پابندی وضع کی ایک خاص یادگار علی گڈھ مین مولانا سلیمان اشرف صاحب کی قیامگاہ مین اخیر وقت کی حاضری تھی، جو بعد مغرب تک جاری رہتی، جب وہ علی گڈھ آتے، یہ حاضری بلاناغہ ہر موسم مین اور ہمیشہ رہی، اس وقت دلچسپ، علمی مسائل پر گفتگو رہتی، مولانا سلیمان اشرف صاحب کی وفات کے بعد مولانا مفتی عبد اللطیف کی قیامگاہ پر اسی وقت اور اسی حیثیت سے مجلس جاری رہی،

مرحوم اپنے دور کے خاتم تھے، اب اس جوہر شرافت کا نمونہ کبھی دیکھنے مین نہ آئے گا، اب گلستان کا رنگ اور ہے، چار دانگ مین ہوائین اور سمت کی چل رہی ہین، اب ریاست اور ریاست کے ساتھ کمالات و فضائل کا یہ اجتماع گذشتہ تاریخ کا ورق بن کر رہ جائے گا، مگر انشاء اللہ یہ ورق یادگار رہیگا،

ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی علیہ الرحمۃ والغفران

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

اپنی طالب العلمی کے ابتدائی دنون مین اس مبارک و مسعود نام کو پہلی دفعہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ارگن اور مجلہ شہریہ الندوہ کے سرورق پر دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا، مولانا شبلی نعمانی کے اسم گرامی کے محاذی یہی نام بالالتزام لکھا جاتا تھا، واقفیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ الندوۃ کی ترتیب و ادارت مین مولانا شبلی کے معاون کوئی صاحب ہین، راجپوتانہ کی دور افتادہ ایک سنگستانی آبادی ٹونک مین قدیم علوم کے ایک طالب العلم کے لئے اس سے زیادہ جاننے کی کوئی صورت بھی نہ تھی، اگرچہ بہت کم لیکن یاد آتا ہے کہ کبھی کبھی کوئی مضمون بھی مولانا شبلی کے اس ہمدوش و ہم قدم مدیر کے قلم سے اس رسالہ مین نکل جاتا تھا،

مگر کیا معلوم تھا کہ اتنی دور سے جو دکھایا جا رہا ہے، اسی کے ساتھ قرب و نزدیکی کا ایسا مقام زندگی مین میسر آئے گا، جسے اب بھی جب سوچتا ہون تو ظل پدر یا پدری شفقت کے سوا تشبیہ کے لئے کوئی دوسری چیز سمجھ مین نہین آتی، آہ! ۔

ع قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

مقادیر کی گردشون نے ٹونک سے دیوبند اور دیوبند سے حیدرآباد پہنچا یا، ٹھیک ان ہی دنون مین پہنچا یا جب مرحوم ہی کے محاورے مین ان ہی کی کمان سب سے زیادہ چڑھی ہوئی تھی، نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان استاذ السلطان رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی وجہ سے حکومت آصفیہ کی جدید

قائم کردہ وزارت (معین المہامی) مذہبی کی جگہ خالی ہو گئی، ملک کے طول و عرض پر نظریں دوڑائی گئیں اور طے کیا گیا کہ اس عہدے کے شایانِ شان ہمہ صفت موصوف ہی کی ذات والا صفات ہے جو بھیکم پور ضلع علی گڈھ کی ریاست کے ایک طرف رئیس بھی تھے، اور سیدنا استاذ العلما، مولانا لطف اللہ علی گڑھی سابق مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کے ممتاز تلامذہ میں بھی شمار ہوتے تھے، قلم بھی ان کے ہاتھ میں تھا اور زبان بھی گل افشانیوں، دُرباریوں میں اپنی آپ نظیر تھی، پیکر شاہانہ، دل فقیرانہ،

الغرض حکومتِ آصفیہ کے ذریعہ مذہبی کے لئے جن خصوصیتوں کی ضرورت تھی ایسا پایا گیا کہ

ع جامہ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بود

ابا عن جدِ پشتہا پشت سے جسکے یہاں نوکر رکھنے کا دستور چلا آرہا تھا، اسی کو شاہ دکن نے اپنی نوکری کی دعوت دی، مرحوم اس شاہانہ دعوت کے تاثرات کا ذکر خود فرمایا کرتے تھے "تلغرافی پیام حیدرآباد سے اُن کے نام وصول ہوا، فرماتے تھے کہ بجز اس بات کے کہ کسی قسم کی دینی خدمت چاہی جاتی ہے کہ مجھ سے لی جائے، اور اس جگہ کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا، یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اس عہدہ کا سرکاری نام کیا ہے، تار میں غالباً ناظم امور مذہبی کا لفظ کسی طرح داخل کر دیا گیا تھا: ناظم کا حیدرآباد کی سرکاری زبان میں کیا ترجمہ ہے، کس قسم کی ذمہ داریاں اُس کے سپرد ہوتی ہیں، اور اختیارات جو ملتے ہیں، ان کی نوعیت کیا ہوتی ہے، سب سے ناواقف تھے، تار ملا، بیان فرماتے تھے کہ سینہ پر تار رکھا ہوا تھا، خوابگاہ کے پلنگ پر لوٹ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے "نوکری" کا تو کبھی خطرہ بھی قلب پر نہ گذرا تھا، خاندانی روایات اس کے قطعاً منافی ہیں، ضرورت بھی بحمد اللہ نہ تھی، پھر خواہ مخواہ کی ذمہ داریوں کو اپنے سر کیوں لوں؟ ہجوم خیالات کا ایک سلسلہ تھا کہ آتا تھا اور جاتا تھا، دوسری طرف خیال گذرتا تھا کہ سرزمینِ ہند کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے فرمانروا کا حکم ہے، ان کے حکم سے سرتابی بلا وجہ کیوں کی جائے، اچانک فرماتے تھے کہ اپنے خیال کی آنکھوں کے سامنے پانے لگا کہ حشر کا میدان قائم ہے لوگ بلائے جا رہے ہیں

میری باری بھی آئی ہے' پوچھا جاتا ہے کہ

"میرے دین کی خدمت کا ایک موقع تیرے سامنے آیا تھا، کیا جواب ہو کہ اس موقع سے

تو نے اعراض کیا، صرف اپنی تن آسانی کے لئے اعراض کیا"

اسی کے بعد جو مقدر تھا وہ فیصلہ بن کر سینے مین جلوہ گر ہوا، لبیک کے ساتھ تار کا جواب تار ہی سے غالباً دیا

گیا، اور جب وعدہ حیدر آباد پہنچ گئے، لفظ "ناظم" کی وجہ سے شروع مین مغالطہ کی کچھ صورت بھی پیش آئی، مگر

بارگاہ خسروی سے جب تصریح ہو گئی، کہ "صدر الصدور ممالک محروسہ سرکار عالی" اس منصب کا سرکاری نام

ہوگا جس کی دعوت دی گئی تھی، تو مغالطے کا جو بادل پھیلایا گیا تھا، پھٹ کر صاف ہو گیا" ناظم امور مذہبی"

کا عہدہ اُن کے تحت کر دیا گیا، جب تک صدر الصدوری کے منصب جلیل پر وہ سرفراز رہے، نواب اختر یار

جنگ مولوی لطیف احمد مینائی مرحوم فرزند امیر مینائی مرحوم اُن کے محکمہ کے ناظم اور بعد کو معتمد بھی ہو گئے،

نواب موید الملک سر علی امام مرحوم نے جب" باب حکومت" کے نام سے کابینہ کی تنظیم کی، تو باب حکومت

کے صدر کا نام صدر اعظم اور ارکین کابینہ صدر المہام کے نام سے موسوم ہوئے، صدر الصدور کی حیثیت اس کے

بعد کیا ہوئی، اسے کیا بتایا جائے اسی سے قصہ شروع ہوا اور اسی پر ختم بھی ہو گیا، [۱]

---

[۱] قیام باب حکومت کے بعد زیادہ منتظم شکل مین اور اس سے پہلے بھی حکومت آصفیہ کے ہر محکمہ کا ایک ناظم (ڈائرکٹر) اور ناظم کے اوپر معتمد (سکریٹری) ہوتا تھا، یہی معتمد ہی کسی وزیر کے تحت کام کرتی تھی، جب تک باب حکومت قائم نہ ہوا تھا، وزیر اعظم کا نام مدار المہام اور اس کے رفقائے کار وزرار کو معین المہام کہتے تھے، باب حکومت جب قائم ہوا، تو کابینہ کے ہر رکن کا نام صدر المہام رکھا گیا، سوال پیدا ہوا کہ محکمہ امور مذہبی مین صدر الصدور کی حیثیت کیا ہو گی، سر علی امام مرحوم نے ذاتی طور پر باور کرایا تھا، کہ صدر الصدور کی حیثیت شیخ الاسلام کی رہے گی، جس کا رتبہ صدر اعظم اور وزراے کابینہ سے بھی بلند تر ہے، اسی لئے شروانی صاحب کو باب حکومت کا رکن نہین بنایا گیا، اور محکمۂ مذہبی کی نمایندگی کے لئے باب حکومت کے کسی وزیر کے دوسرے صیغون کے ساتھ

خیر میں کن باتوں میں مشغول ہو گیا، عرض یہ کر رہا تھا کہ تقدیر نے حیدر آباد جب پہنچایا، تو اس وقت حیدر آباد کی دینی و علمی سرگرمیوں کا مرکز وحید شروانی صاحب کی ذات والاصفات بنی ہوئی تھی، طالب العلمی کا زمانہ تو ختم ہو چکا تھا لیکن طالب العلمی کے بعد والی زندگی صحیح معنوں میں چونکہ شروع نہیں ہوئی تھی، اس لئے سن و سال وضع و قطع ہر لحاظ سے عربی مدرسہ کے ایک طالب العلم سے زیادہ میری کوئی حقیقت نہ تھی، تھوڑی دیر کے لئے صرف ایک سرسری ملاقات کا موقع ملا تھا لیکن دراصل نیازمندی کے صحیح تعلقات اس وقت سے شروع ہوئے، جب دوسری دفعہ درِ دولت پر فقیر حاضر ہوا تھا، ایک انگریزی کی کوٹھی کرایہ پر لی گئی تھی، اسی میں مقیم تھے، وہ اندر ملاقات کے سجے ہوئے کمرے میں تشریف فرما تھے، سامنے چلمن پڑی ہوئی تھی، باہر برآمدے میں کرسیوں پر میری طرح اور بھی مختلف طبقات کے لوگ ملنے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے، ان میں اونچے نیچے سرکاری غیر سرکاری ہر طرح ہی کے لوگ تھے، ایک کرسی پر فقیر بھی اسی جھمیلے میں بیٹھ گیا، صرف ہلکی سی سرسری ملاقات جس میں صورت کی شناخت بھی دوسروں کے لئے دشوار ہوتی ہے، مگر سنئے اُن کی نظر چلمن کی تیلیوں سے برآمدے پر جو بیٹھے ہوئے تھے، ان پر پڑتی ہے، اور ایک بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں اندر سے آتی ہے :-

"مولوی صاحب! آپ کی جگہ وہ نہیں ہے، آپ بے تکلف اندر چلے آیا کیجئے"

پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ خطاب کس سے ہے لیکن خیال آتا ہے کہ پھر شاید نام لے کر اس حیرت کا ازالہ فرما دیا گیا، اور آپ کا خاص خادم محبوب مرحوم باہر آیا، بولا کہ نواب صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہیں، حاضر ہو گیا پاس

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۷) اس صیغہ کی نمایندگی بھی ضم کر دی گئی، ابتدا میں اس عجیب و غریب پیچیدہ صورت حال کا اثر واقعات پر نہ پڑا، لیکن شروانی صاحب کی حیدر آباد سے دوری سچ پوچھئے تو اسی ابتدائی مغالطہ کا نتیجہ تھی جس کی تفصیل اب غیر ضروری ہے، "تلك امة قد خلت لها ما كسبت و لكم ما كسبتم يغفر الله لنا ولهم اجمعين" ۱۲،

بٹھایا اور مزاج پرسی کے بعد پھر اسی پدرانہ شفقت و عطوفت کے ساتھ فرمانے لگے کہ

"آپ کے لئے اجازت وغیرہ کے قصوں کی ضرورت نہیں، جب آنا ہو، بے تکلف چلیں اٹھا کر اندر چلے آیا کیجئے"،

غیر معمولی مہربانی سے تعلق کی ابتدا ہوئی، اسی عرصہ میں حضرۃ الاستاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمرکابی میں خاکسار اورنگ آباد اور خلد آباد کی سیر کے لئے روانہ ہوا، شروانی صاحب بھی شاہی فرمان کی بنیاد پر ضلع اورنگ آباد کے کسی بڑے جاگیر دار کے مقدمہ کے تصفیہ کے لئے اورنگ آباد ہی میں قیام فرما تھے، خلد آباد بھی سیر کے لئے گئے ہوئے تھے، خلد آباد کی مقدس پہاڑی پر سب کا اجتماع تھا، اسی اجتماع میں استاذ مرحوم نے شروانی صاحب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں وطن (اعظم گڈھ) جا رہا ہوں خاکسار کا نام لیکر فرمایا کہ انکو بطور امانت آپکے سپرد کرتا ہوں، مسکراتے ہوئے شروانی صاحب نے فرمایا کہ آپکی یہ امانت میرے پاس محفوظ رہیگی حضرۃ الاستاذ وہیں سے اعظم گڈھ کے ارادے سے روانہ ہوگئے اور فاقت کی سعادت پہلی دفعہ نواب صاحب مرحوم کے ساتھ میسر آئی، پہاڑی سے اتر کر اورنگ آباد سب واپس ہوئے، اب خاکسار شروانی صاحب کے ساتھ اورنگ آباد کے دار الامارہ میں مقیم تھا حکم دیا گیا، کہ شہر میں گھوم گھوم کر قلمی کتابوں کا پتہ چلاؤں، یہ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا، نواب صاحب کے منشار کو پاکر اپنے اپنے کتب خانے کی سیر کی اجازت ہر ایک نے دی، اس سفر میں بعض نادر مخطوطات کا سرمایہ اکٹھا ہوا، دس پندرہ دن بعد نواب صاحب کی معیت میں حیدر آباد واپسی ہوئی، اورنگ آباد ہی میں فقیر بھی اُن سے مانوس ہوگیا، اور اُن کے لطف و کرم کی موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ اس کے بعد جو شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنوں تک برستا رہا، امانت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کر دیا، فرحمہ اللہ ونور ضریحہ،

کم و بیش تقریباً بارہ سال کی طویل مدت اُن کے زیر سایہ حیدر آباد کی زندگی گذری، اس عرصہ میں سرکاری غیر سرکاری شعبوں میں اُن کے کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے جس کی پوری تفصیل کے لئے ضخیم جلد بھی غالباً کافی نہ ہو، یہاں سرسری طور پر بعض نمایاں خدمات کا جو یاد آتے جاتے ہیں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں

جس وقت نواب صاحب علیہ الرحمۃ والغفران حیدرآباد تشریف لائے تھے، میلادی مجلسون کا حیدرآباد مین جو رواج تھا، ان مین عموماً یہی دیکھا جاتا تھا کہ حضرمی عرب جن کے ساتھ کچھ مقامی پیشہ ور میلاد خوان لوگ بھی شریک تھے، اپنی مختلف پارٹیان بنائے ہوئے تھے، میلاد پڑھانے والے ان ہی میلادی ٹولیون مین سے کسی ٹولی کو دعوت دیدیتے، ٹولی میلاد پڑھنے والون کی اس کے گھر پر کچھ رات گذرے پہونچ جاتی، اور چیخ چیخ کر تین تین چار چار آدمی زیادہ تر اردو جس کے ساتھ فارسی اور عربی اشعار بھی ہوتے، ایک خاص لہجہ مین پڑھتے رہتے تا آنکہ صبح ہو جاتی، گھر کے لوگ اطمینان کے ساتھ سو رہتے، اور میلاد خوانو کی یہ ٹولی جاگ کر رات بسر کرتی، صبح کو معینہ فیس لے کر چلی جاتی تھی، شروع شروع مین حیدرآباد کے مسلمانون کے گھرون سے میلاد خوانی کی یہ آواز جب میرے کانون تک پہونچی تو مدت تک سمجھتا رہا کہ کہین بھجن گایا جا رہا ہے، کچھ ایسے لب ولہجہ مین لوگ اردو اشعار کو بھی پڑھتے تھے، کہ الفاظ سمجھ مین نہین آتے تھے کہنے والے پیشہ ور میلاد خوانون کی ان ٹولیون کے متعلق طرح طرح کی باتین منسوب کرتے ہین، واللہ اعلم بالصواب لیکن سنی سنائی باتون سے قطع نظر کر لینے کے بعد وہان کی میلاد خوانی کی عام حالت وہی تھی جو بیان کی گئی۔

لیکن نواب صاحب مرحوم نے میلادی مجلسون کا ایک نیا نظام قائم کیا، قائم کیا کیا، اندرونی طور دلون مین تقاضا تو اصلاح کا پہلے ہی سے تھا، لیکن اصلاحی اقدامات مین عملی شرکت کے لئے کوئی آمادہ نہین ہوتا تھا، نواب صاحب نے اس کا خیال کئے بغیر کہ ان کے منصب جلیل کا اقتضا کیا ہے، ہر اس شخص کے گھر پہنچ پر راضی ہو گئے جو اُن سے میلاد پڑھوانا چاہتا ہو، سیرت طیبہ کے متعلق اُن کا مطالعہ کافی وسیع اور عمیق تھا، بیان وخطاب کا طریقہ بھی حد سے زیادہ متین وسنجیدہ معلومات، اُن کے کھرے ہوئے تحقیقی ہوتے تھے جس نے بھی بلایا اپنی موٹر پر اس کے گھر پہنچ گئے، اور گھنٹہ دو گھنٹے "سیرت طیبہ" کے مختلف پہلوون پر مسلسل پرمغز، موثر تقریر فرماتے، رفتہ رفتہ لوگون کا مذاق بدلنے لگا، اور بجائے انفرادی مجلسون کے اجتماعی مجلسون کے انعقاد کا ذوق پھیلنے لگا، اس کے بعد کیا ہوا، یہ آٹھ دس سال حیدرآباد کے واقعہ ہے کہ بھلائی

نہین جاسکتے،

جلسہ مین شریک ہونے والون کی تعداد ہزارہا ہزار تک پہونچ جاتی تھی، مبالغہ نہ ہوگا اگر میلاد کی بعض اجتماعی مجلسون کے سامعین کی تعداد کا تخمینہ پچاس ساٹھ ہزار تک کرون، سکندرآباد کی میلاد کی مجلس نے اس سلسلہ مین پہلا نمونہ قائم کیا، پھر تو حیدرآباد کے مشہور محلون اور بستیون مین شاید ہی کوئی محلہ اور کوئی بستی ایسی باقی رہ گئی، جس مین سکندرآبادی مجلس کے معیار تک جلسہ کے نظم وانتظام فرش نہ فروش، جھاڑ فانوس وغیرہ کو نہ پہنچا دیا گیا ہو، نواب صاحب اس عرصہ مین بیان کرنے سے کبھی تھکے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اُن کی تقریرون کے سننے والون مین مجھے اکتا جانے کی کیفیت ہی کبھی محسوس نہین ہوئی، وہ کہتے جاتے تھے، اور لوگ سنتے جاتے تھے، حالانکہ اُن کی تقریرین موضوع جعلی حدیثون چھوٹے تراشیدہ افسانون، بلکہ شعر و نغمہ کی دلچسپیون سے قطعی طور پر پاک ہوتی تھین، بیان کا طرز بھی سادہ سیدھا، روان ہوتا تھا، مگر قرآنی آیتون سے نکالے ہوئے صحیح نتائج معتبر حدیثون اور سیرت کے تاریخی مستند واقعات ہی مین اتنی غیر معمولی دل آویزی پیدا ہو جاتی تھی، کہ مشکل ہی سے حیدرآباد کی پبلک دوسرے کی تقریر یا وعظ سننے کے لئے آمادہ ہوتی تھی، رئیس آدمی تھے، راحت وآرام کی زندگی کے قدرتاً عادی تھے، لیکن میلادی مجلسون کے لئے نہ وقت کا سوال اُن کے لئے باقی رہتا تھا، اور نہ موقع اور محل کا، رات کے بارہ بارہ بجے تک کبھی ایسی ہوتی لیکن مین نے کبھی ان کی زبان پر کسی قسم کی گرانی کی شکایت نہین پائی،[۵]

---

[۵] خاکسار بھی ان میلادی مجالس مین اپنی بساط کے مطابق تھوڑا بہت حصہ تقریباً لیا کرتا تھا، ایک دفعہ کثرت مجالس سے جو تقریری بار پڑتا تھا، اس کا ذکر ذرا گرانی کے ساتھ کرنے لگا، فرمانے لگے، مولوی صاحب کس کی مجلس ہے، آپ کے ٹخنون سے تو خون جاری نہین ہوا، اور آپکے دانت نہین توڑے گئے، ابھی سے گھبرا اٹھے شرم سے گردن جھک گئی،

غلط عقائد بے بنیاد اوہام، جاہلی رسوم و رواج، ہر ایک چیز کی اصلاح بھی اُن کی عالمانہ تقریروں سے ہوتی چلی جاتی تھی، لیکن مجھے یاد نہیں ہو کہ کسی کو کسی زمانہ مین اُن کی تقریر کے کسی فقرے سے کبھی شکایت پیدا ہوئی ہو، اور فتنہ و فساد کا برپا ہونا تو دور کی بات تھی، وہ سب کچھ کہتے تھے، سب کچھ سناتے تھے، جو کچھ کہتے اور جو کچھ سناتے تھے، سچ ہوتا تھا، لیکن تلخی اُن کے بیان سے کبھی پیدا نہین ہوئی، فہمایش کا طریقہ قطعاً غیر معمولی تھا، جس کی نظیر اپنے تجربہ مین تو نہین ملی، دیوبندیت، بریلویت، ندویت، نیچریت، وہابیت وغیرہ وغیرہ عصری اختلافات کے سلسلہ مین حالانکہ ہر مسئلہ کے متعلق فیصلہ کن رائے رکھتے تھے، اور اپنے فیصلون پر اُن کو کافی اصرار تھا، تقریرون مین وہ اپنے فیصلون کے حدود سے سر مو متجاوز نہ ہوتے تھے، مگر یہ طرز بیان کی خوبی تھی کہ مخالف خیال رکھنے والون مین بھی انکی باتون سے کسی قسم کی گرانی پیدا ہوتی تھی، اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ مسلمانون کے ان مختلف جتھون کے افراد کے قلوب مین غیر معمولی اعتماد اور بھروسہ اُن کے متعلق پایا جاتا تھا، اس راہ مین تو یہ واقعہ ہے کہ غیر اسلامی دائرون مین بھی اُن کی ہر دلعزیزی کا کافی وزن تھا، "امورِ مذہبی" کا شعبہ حکومت آصفیہ کا ایسا شعبہ ہے جس کے احاطے مین مسلمانون کے مساجد و مقابر اور دوسرے مآثر کے ساتھ ہندؤن، عیسائیون، پارسیون کے مذہبی و دینی مقامات کی نگرانی بھی داخل ہے، اسی وجہ سے ہر ملت و مذہب کے نمایندے اُن کی خدمت مین حاضر ہوتے، اپنے درد دکھ کے قصے سُناتے، ہر ایک کی بات سنتے، اور حُسنِ سلوک کا ایسا نمونہ پیش فرماتے، کہ ہر ایک آپ کا مداح ہو کر واپس ہوتا، کم از کم اس بارہ سال مین مین نے تو کسی دین و ملت کے ہیرو کو آپ سے شاکی نہ پایا، حالانکہ اپنی اسلامی و دینی زندگی مین اُن کا اصرار تصلب کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا، مگر اُن کی زندگی کے مختلف شعبے اپنے حدود مین اس خوبی کے ساتھ محدود تھے، کہ غلط مبحث کی صورت ہی کبھی پیش نہ آتی تھی، شروانی صاحب اس باب مین غیر معمولی کردار کے حامل تھے، اُن کی زندگی کا یہ پہلو بڑی تفصیل کا طالب ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف سیدنا مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ

اور اُن کے خلفا و جانشینون کے ساتھ ایسے تعلقات قائم تھے کہ گویا ان ہی صاحبدل درویشون مین ایک بڑے درویش وہ بھی ہین، دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی و مولانا ابوالکلام آزاد جیسے آزاد خیال بزرگون سے اُن کی راہ و رسم لوگون کے لئے باعثِ حیرت بھی بن جاتی ہے مگر ان مختلف الجہات بلکہ متضاد تعلقات کے نباہنے اور حسن و خوبی کے ساتھ نباہنے کا غیر معمولی سلیقہ قدرت کی طرف سے اُن کو عطا ہوا تھا، ہر ایک مین فضل و کمال کا جو حصہ پایا جاتا تھا، حد سے زیادہ فراخ چشمی کے ساتھ اس کا اعتراف اُن کی عجیب و غریب خصوصیت تھی، ایک ہی مجلس مین اُن سے آپ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا حبیب الرحمن مرحوم مہتمم دیوبند کی تعریف بھی سن سکتے تھے، اور اُسی کے ساتھ مولوی احمد رضا خان بریلوی مین جو علمی اور عملی خوبیان اُن کے علم مین پائی جاتی تھین، اُن کا بھی ذکر فرماتے، ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی امہات الامۃ کی مجلس تحریق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک رکن وہ بھی تھے، اور اس آتشین مجلس کی بھبتی اڑانے والے مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو سے بھی اُن کی دوستی تھی،

حیدرآباد جس زمانہ مین فقیر پہونچایا گیا تھا عثمانیہ یونیورسٹی اس وقت تک قائم نہین ہوئی تھی، چرچا البتہ اس کے قیام کا پھیلا ہوا تھا، سب سے بڑی رکاوٹ جیسا کہ خاکسار نے سُنا ہے نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان مرحوم کی طرف سے پیش آرہی تھی، کہتے ہین کہ "جامعہ" کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا، اسکو دیکھ کر مولانا مرحوم نے فرمایا تھا کہ ملک کی آمدنی مین اس یونیورسٹی کے تعلیم یافتون سے کوئی مدد نہین ملے گی بلکہ مصارف بڑھا دیئے جائین گے، اور الحاد و بے دینی کے جراثیم جن سے حیدرآباد ایک حد تک محفوظ ہے عوام مین پھیل جائین گے، حضرت آصف جاہ سابع پر مولانا انوار اللہ خان مرحوم کا غیر معمولی اثر تھا، نتیجہ یہ ہوا مولوی صاحب کی مخالفت راہ کا روڑا یونیورسٹی کے حق مین بن گئی تھی، نیچے سے اوپر تک اتنی طاقت کسی مین نہ تھی جو اس روڑے کو ہٹائے، اُن کی وفات کے بعد جب شروانی صاحب اُن کی جگہ مامور ہوئے تو اعلیٰ حضرت نے فرمان صادر کیا کہ یونیورسٹی کے متعلق جتنے کاغذات بھی ہون وہ صدر الصدور کے توسط اور معائنہ

کے بعد پیش ہوں،

شروانی صاحب نے اس سلسلہ میں بلیغ کوشش کی، اور مولانا انوار اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا اثر سرکار والا تبار کے قلب پر جو تھا، اس کے ازالہ میں کامیاب ہوئے، یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا، اور پہلے وائس چانسلر اس یونیورسٹی کے شروانی صاحب فرمانِ مبارک کی رو سے مقرر ہوئے،

ابتدا میں تو ان لوگوں کو جو جدید یونیورسٹی کا خواب دیکھ رہے تھے، بڑی خوشی ہوئی، وہ کلیۃ مشرق میں مغرب کا کھیل کھیلنا چاہتے تھے، سمجھتے تھے کہ شروانی صاحب روشن خیال آدمی ہیں، اس کھیل کی صرف اجازت ہی نہ دیں گے، بلکہ ایکٹ میں حصہ بھی لیں گے، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ،

چارٹر تو منظور ہو گیا، چارٹر ہی میں شروانی صاحب نے یہ بھی منظور کرالیا کہ مغربی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات اور اسلامی اخلاق و جذبات کی نشو و نما کا کام بھی اس جامعہ سے لیا جائے گا، سمجھا گیا تھا کہ یہ رسمی الفاظ ہیں عمل کے وقت ان الفاظ کو بے اثر کرکے رکھ دیا جائے گا،

یونیورسٹی کے اوقات مختلف شعبے اور ہر شعبہ کا درجہ واری نصاب جب بننے لگا تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب شروانی صاحب نے علاوہ شعبۂ دینیات کے (جو مرحوم دار العلوم کالج) کا جانشین، اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم کا مستقل ادارہ تھا، اس کے سوا بھی ان کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا کہ ہر مسلمان طالب العلم کو ابتدائی تعلیم سے بی اے تک ایک مستقل مضمون "دینیات" کا بھی لزوماً لینا پڑے گا، ان کو مغالطہ دیا جاتا تھا کہ "مضمون" کی حیثیت سے نصاب میں دینیات کا نام بھی لکھ دیا جائے گا، مطالبہ کے لئے کچھ کتابوں کی سفارش بھی کر دی جائے گی، لیکن یونیورسٹی کے کلاسوں میں اس کی تعلیم نہیں دی جا سکتی، خدا خدا کرکے تعلیم دلانے پر لوگ جب راضی ہوئے تو کہا گیا کہ اس مضمون میں طلبہ کا امتحان نہ ہوگا، مگر شروانی صاحب ڈٹے رہے کہ تعلیم بھی ہوگی اور امتحان بھی ہوگا، وقت ہی ایسا تھا کہ آخر سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا، لیکن ظاہر ہے کہ ایک "جبری عنصر" جو پہلی دفعہ ایک جدید طرز کی یونیورسٹی کے نصاب میں باہر سے بزور داخل کرا دیا

گیا تھا، اسی لئے دباؤ کے ہٹنے کے ساتھ ہی وہ باہر نکل پڑا جو نہیں جانتے ہیں وہ اس کو حکومت کے سکولر نظریہ کا کوئی جدید نتیجہ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم نظریہ کا یہ قدیم نتیجہ تھا جس کا ظہور اب ہوا ہے،

دوسرا اہم معرکہ اسی جامعہ کے تعلق میں جو پیش آیا، وہ شعبۂ دینیات کے اساتذہ کی تنخواہ کا مسئلہ تھا، کہا جاتا تھا کہ بازار میں جن علوم کے پڑھانے والوں کی جو قیمت ہے، اس سے زیادہ قیمت یونیورسٹی بھی انکی کیوں ادا کرے، لیکن نواب مرحوم کے اصرار نے اس مسئلہ کو بھی طے کرا چھوڑا، وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جامعہ کے حدود میں داخل کر کے اسلامی علوم کی اہانت کی جائے،

اس کا ل ایک جگ یا قرن میں اور کیا کیا قصے پیش آئے، انھیں کہاں تک بیان کروں، قدم قدم پر روڑے تھے، ٹھوکریں تھیں، مگر نہایت بے جگری اور دلیری کے ساتھ وہ آخر وقت تک زمانہ کی اس آندھی کا مقابلہ کرتے رہے، جو ہر موقع پر اُن کے قدم کا رُخ بدل دینا چاہتی تھی،

بعض دفعہ عجیب لطائف بھی اس سلسلہ میں پیش آتے، ایک دفعہ صاحب رزیڈنٹ بہادر کے یہاں ڈنر پر دوسرے حکام کے ساتھ مدعو ہوئے، انگریزی ڈنر میں جیسا کہ دستور ہے منجملہ دوسرے التزاموں کے ضروری ہے کہ نشست دو جنسی ہو، یعنی مرد کی ایک کرسی کے ساتھ دوسری کرسی جنس لطیف کے کسی فرد کی رکھی جاتی ہے، شاید نشستگاہ کی اس خصوصیت سے پہلے وہ واقف نہ تھے، ورنہ شرکت ہی سے عذر کر دیتے، مگر شریک ہو جانے کے بعد کیا کرتے، بقول امام ابو حنیفہ "ابتلیت به فصبرت" انھوں نے بھی صبر سے کام لیا، فرماتے تھے، کوئی میم صاحبہ دوسری کرسی پر اُن کے ساتھ بیٹھی تھیں، پوچھنے لگیں کہ آپ کی بیگم صاحبہ بھی کیا اس ڈنر میں شریک ہیں، "نہیں" کا جواب سن کر میم صاحبہ نے پر لطف فقرہ یہ فرمایا کہ

"اپنی بیویوں کو آپ لوگ کیا اپنی ذات کے لئے مختص سمجھتے ہیں"

انگریزی زبان کا فقرہ تھا شاید اس کا ترجمہ یہی ہو سکتا ہے، سُن کر چپ ہو رہے، بعد کو بار بار اس فقرے کو دہراتے اور مسکراتے کہ میم صاحبہ نے عجیب بات پوچھی،

کبھی کبھی جامعہ کے بعض علمی مقالات خصوصاً اسلامیات سے جن کا تعلق ہوتا، ان کے ملاحظہ کے لئے بھی بھیج دئیے جاتے تھے، ایک دفعہ حجاج بن یوسف مشہور ظالم امت کی مداحی مین ایک مقالہ ایک خاص نقطۂ نظر کے پروفیسر صاحب کی نگرانی مین کسی طالب العلم نے پیش کیا، پروفیسر کی طلبی ہوئی، اور مذہبی نہین بلکہ علمی حیثیت سے جو مواخذے اُن کی طرف سے پیش ہوئے وہ بڑے دلچسپ تھے،

خود فرمایا کرتے تھے کہ انگریزی حلقون کے متعلق اس قسم کی خبرین مجھ تک بسا اوقات پہنچائی جاتی ہین کہ "نیرو مائنڈ" کا عیب اس شخص مین پایا جاتا ہے، کہتے ہین کہ اپنے بچے کھچے ایمان کی سند مین تو اسی کو سمجھتا ہون، مگر ایک پہلو اُن کی زندگی کا اگر یہ تھا تو دوسری طرف ایک دفعہ نہین بیسیون مواقع پر تجربہ ہوا کہ قدیم خیال کے پرانے مولویون کا کسی مسئلہ پر شدید اصرار ہے لیکن اُن کے اصرار سے قطعاً متاثر نہ ہوتے، اور اپنے نزدیک جو بات دین کی روح کے مطابق ہوتی، اسی پر عمل کرتے، جامعہ عثمانیہ ہی کے شعبۂ دینیات کی انگریزی کا مسئلہ چھڑا، قصہ یہ تھا کہ گو اس شعبہ مین بھی انگریزی ادب کی تعلیم طلبہ کے لئے ضروری تھی، مگر آرٹس اور سائنس کے طلبہ کے مقابلہ مین معیار اُن کے نصاب کا پست تھا، نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی پڑھنے مین شعبۂ دینیات کے طلبہ کا وقت بھی صرف ہوتا تھا، لیکن انگریزی زبان سے جیسی کہ چاہئے مناسبت بھی پیدا نہین ہوتی تھی، نیز سرکاری دفاتر مین بھی یہ کہتے ہوئے کہ انگریزی آپ لوگون کو نہین آتی اس شعبہ کے طیلسانی (گریجویٹ) واپس کر دیئے جاتے تھے، خاکسار کی طرف سے تحریک شروع ہوئی، کہ شعبۂ دینیات کی انگریزی فنون و سائنس کے مساوی کر دیجائے، بلکہ انگریزی ادب کی تعلیم و امتحان تینون شعبون کی چاہئے کہ مشترک ہو، قدیم طرز کے علماء جن کی تعداد اس وقت شعبہ کے اسٹاف مین غالب تھی، اس ترمیم سے چراغ پا تھے، ناقص معیار کی انگریزی ہی سے وہ نالان تھے، مساوی معیار کی تجویز جس حد تک ان کو برہم کر سکتی تھی، ظاہر ہے، مگر نواب صاحب مرحوم نے اول سے آخر تک اسی پر زور دیا کہ شعبۂ دینیات کی انگریزی دوسرے شعبون کے مساوی کر دی جائے، بالآخر اسی کو طے کرا کے رہے، اس ترمیم کے نتائج غیر معمولی نکلے جن کی تفصیل کا یہان موقع نہین ہے،

قدامت و جدت کا امتزاج اُن کے اندر کچھ عجیب غریب طریقہ سے ہوا تھا، ایک طرف کوٹھی کے پائین باغ مین ورد وظائف و تلاوت مین بھی مشغول پائے جاتے، اور صبح کے اوراد سے فارغ ہونے کے بعد چائے کی میز پر بالالتزام کسی انگریزی روزنامہ کے مطالعہ مین مشغولیت بھی اُن کی عام عادت تھی، مسرف تو وہ نہین تھے لیکن کریم النفس، فیاض، امیر باذل ہونے مین بھی شک نہ تھا، حیدرآباد مین اُن کو دوہزار ماہوار کے ساتھ الاؤنس کی بھی کافی رقم ملتی تھی لیکن جہان تک فقیر جانتا ہے گھر سے بھی حیدرآباد کے مصارف کی تکمیل کے لئے بسا اوقات منگوانے کی ضرورت پیش آجاتی تھی، اُن کا ہاتھ کھلا ہوا تھا، مشکل ہی سے کوئی ضرورت مند اُن کے آستانے سے محروم واپس ہوتا تھا، ہر سال شب دیگ کی دعوتون کا سلسلہ موسم سرما مین مہینون جاری رہتا، ہر شب مین ایک ایک ٹولی ہم مذاقون کی مدعو ہوتی، آج بھی اُن کی شب دیگی دعوتون کا ذکر کام و دہن مین یارون کے ہلچل پیدا کر دیتا ہے،

مین اس سلسلہ مین دوسرون کا ذکر کیا کرون ملازمت کے ابتدائی سالون مین مجھ پر ایک سخت مرض کا حملہ ہوا، وطن ہی مین تھا، مین تو بیہوش پڑا ہوا تھا، میرے منجھلے بھائی برادرم مکارم احسن گیلانی سلمہ نے شروانی صاحب کو صرف میرے بیمار پڑ جانے اور مرض کی جو کیفیت تھی، اس سے مطلع کیا، جواب مین صرف استمزاج کا خط ہی نہین آیا، بلکہ منی آرڈر کے ذریعہ شاید ڈھائی تین سو کی رقم بھی ارسال فرمائی گئی خط مین میرے بھائی کو انھون نے لکھا تھا کہ مولوی صاحب کے علاج مین مصارف کا خیال نہ کرنا، جتنے روپے کی ضرورت ہو مجھ سے منگواتے رہنا، اگرچہ زیادہ منگوانے کی ضرورت بحمد اللہ نہ ہوئی لیکن اُن کے مشفقانہ برتاؤ کی یاد دل مین جب کبھی آجاتی ہے چشم پُرآب ہو جاتا ہون، اب ایسے بے غرض حسن سلوک کرنے والے بزرگون کو دنیا کے اس پردے پر ہم کہان پائین گے،

سچ تو یہ ہے کہ علاوہ ان عام مادی منافع کے اُن کی صحبت و رفاقت مین خدا ہی جانتا ہے کہ شعوری و غیر شعوری طور پر کتنے علمی و اخلاقی جواہر پارے میرے دل و دماغ مین رچ گئے، انھون نے انسانی زندگی

کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، عام ہنگامون سے آزاد ہو کر سوچنے کے عادی تھے، یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ دینی و اسلامی علوم کے جاننے والون کی بے قدریون کا عام دکھڑا اُن کے سامنے جیسا کہ اس زمانہ مین دستور ہے رو رہا تھا، سنتے رہے، پھر فرمایا کہ مولوی صاحب! آپکے دینی و اسلامی علوم کے ماہرین کا کیا آج ہی یہ حال ہے، آپکے امام ابو حنیفہ جیل مین کب گئے تھے، اور امام احمد بن حنبل پر تازیانے کیا کسی غیر اسلامی حکومت کی طرف سے لگائے گئے تھے، امام بخاری کو جلا وطنی کی سزا کیا ان ہی دنون مین بھگتنی نہین پڑی تھی، جب دنیا پر مسلمانون ہی کا سیاسی اقتدار قائم تھا، سمجھاتے کہ آپ کے بزرگون نے کام کرنے کی شرط کبھی یہ نہین رکھی تھی کہ پہلے حکومت قائم ہولے، مولویون کے لئے بڑے بڑے عہدون اور مناصب کے دروازے کھل جائین، تب کام کرین گے، اس دن کچھ ایسے انداز مین تقریر فرمائی کہ اپنے اندر بلا مبالغہ عرض کرتا ہون مین نے ایک کلی انقلاب محسوس کیا، مسلمانون کے سیاسی اقتدار کے زوال کو دین و علم کی بے قدری کا سبب قرار دینے کا جو دل عادی تھا، اس کا نقطۂ نظر ہی بدل گیا،

حیدرآباد کی مسجد چوک مین حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی یاد مین ایک جلسہ منعقد ہوا تھا، شروانی صاحب نے اس جلسہ مین تقریر کی، واقعہ یہ ہے کہ اس تقریر سے پہلے حضرت مجدد کے خدمات کی صحیح قیمت کا مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا، مجدد سے پہلے مغلون کے تخت پر اکبر و جہانگیر، اور مجدد کے بعد شاہ جہان و عالمگیر" ان کی تقریر کا اساسی عنوان تھا، پھر مین کیا بتاؤن کہ اس سلسلہ مین انھون نے معلومات کے کن خزینون کو وقف عام فرمایا، بعد کو حضرت مجدد الف ثانی پر فقیر نے جو مقالہ لکھا اور کافی مقبول ہوا، مجھے اس کا اعتراف ہے کہ صحیح نقطۂ نظر اگر نواب مرحوم سے نہ ملتا، تو اس مقالے کے لکھنے مین کبھی کامیاب نہ ہوتا،

ان کی خانگی مجلیس بھی علم و ادب کی مجلسین تھین، معلومات کا غیر معمولی ذخیرہ اُن کے سینے مین محفوظ تھا، مطالعہ ان کا غیر معمولی طور پر وسیع تھا، گو یا مین تو یہ سمجھتا ہون کہ سبقاً سبقاً کسی کتاب کے پڑھنے کا موقع تو اُن سے مجھے نہین ملا لیکن کسی شاگرد کو اپنے استاذ سے جو فوائد پہنچتے ہین، مجھے اس پر فخر ہے

اُن سے یہ منافع مجھے حاصل ہوئے، اور بہت زیادہ حاصل ہوئے، تفصیل کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے،

وہ بڑے صاف ستھرے اعلیٰ زندگی کے عادی تھے، جامہ زیبی میں مشکل ہی سے حیدرآباد میں کوئی دوسرا آدمی اُن کا مقابل بن سکتا تھا، ان کی موٹر بھی سب سے اچھی اور قیمتی موٹر ہوتی تھی، کوٹھی بھی ان کی سول لائن سوا جی گوڑہ کی کوٹھیوں میں ممتاز تھی، زندگی کے اکثر شعبوں میں ان کا یہی حال تھا، بعضوں میں اُن کے اس طرزِ عمل سے گرانی بھی پائی جاتی تھی، مگر یہ جو کچھ تھا، صرف ظاہر میں تھا، باطن میں اُن کے کچھ نہ تھا، خیال آتا ہے کہ سفرِ حج کا عزم جب فرمالیا گیا، تو فقیر کو علی گڈھ طلب کیا گیا، پہونچا، حکم ہوا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے بعض زندہ بزرگوں سے بھی ملنا چاہتا ہوں، اور اپنے پیر و مرشد مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے مزار فائض الانوار پر بھی حاضری کا قصد ہے، جی چاہتا ہے کہ کم از کم اس سفر میں تو تم میرے ساتھ رہو، بسر و چشم قبول کیا گیا، منجملہ دوسرے مقامات کے فیض آباد بھی پہونچے، یہاں حضرت مولینا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا شاہ نیاز احمد رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے، ان کا قیام کویلو کے چھپر کے نیچے تھا، جس کے سامنے مٹی کا ایک چبوترہ میدان میں تھا، جس پر بوریا بھی پڑا نہ تھا، گرد سے بھرا ہوا تھا، بیٹھنے کی جگہ اس کے سوا تھی بھی نہیں، اور شاہ صاحب نے حیدرآباد کے وزیر مذہب کو اسی چبوترے پر بیٹھ جانے کا اشارہ بھی فرمایا، بے تکلف میں نے محسوس کیا کہ بغیر کسی جھجک کے بخندہ پیشانی وہ اس چبوترے پر اپنی قیمتی شیروانی کے ساتھ بیٹھ گئے، پھر شاہ صاحب مرحوم سے دعا کی درخواست کی، اس عجیب و غریب دعا کے الفاظ آج بھی حافظے کے نہان خانہ میں گونج رہے ہیں، شاہ صاحب نے ہاتھ اٹھایا، اُن کے ساتھ ہم لوگوں کے ہاتھ بھی اٹھ گئے، پھر فرمانے لگے:-

"بارالہا! یہ حبیب الرحمن خان شیروانی تیرا ایک ناچیز بندہ ہے،

"بارالہا! جب اس پر ناگزیر وقت آجائے، سانس اکھڑ رہی ہو، تو اس کی امداد فرمائی جائے

"بارالہا! جب کفن پہنا کر اس کے تابوت کو لے چلیں تو اپنی رحمت کا سایہ اس پر ڈال، اور جب

گور کے خلوت خانہ مین حبیب الرحمن خان کو لوگ رکھ کر واپس آجائین اور غریب وہان تنہا رہ جائے تو اپنی رحمت اپنے کرم سے روشنی پیدا فرما، قوت بخش کہ نکیرین کے سوال و جواب مین یہ بیچارہ ثابت قدم رہے۔"

بار الہا! جب حشر کا میدان قائم ہو، اور بڑے چھوٹے پتنگون کی طرح ادھر ادھر مارے پھرتے ہون، تو اس بیچارے حبیب الرحمن بھیکم پور والے کی دستگیری فرما، اس کے گناہون کو بخش دے اور بجائے جہنم کے اس کو تیرے فرشتے جنت کی طرف لیجائین۔"

بیس سال سے زیادہ مدت کی بات ہے، یہ دعویٰ تو مشکل ہے کہ یہی بجنسہٖ اُن کے الفاظ تھے، لیکن بہت سے الفاظ اُن کی زبان سے نکلے ہوئے اس مین محفوظ ہین، شاہ صاحب نے اور بھی کیا کیا فرمایا، اب یاد نہین، نواب علیہ الرحمۃ والغفران کی داڑھی آنسوؤن سے تر تھی، سارا مجمع مجسم گریہ و بکا بنا ہوا تھا، آخر مین فرمایا کہ

اے اللہ اس غریب پر اس کے حج و زیارت کے سفر کو آسان فرما۔"

کیا معلوم تھا کہ بیس سال پہلے جن ضرورتون کی تصویر مراقبت بین کے سامنے تھی، وہ ہم سب کے سامنے بھی آجائے گی، اُن پر اُن کا ناگزیر وقت آگیا، اب وہ تنہا اس عالم مین ہین جہان نہ اُن کے اعزہ مین نہ اقربا، نہ احباب ہین، اور نہ دوست، نئی دنیا ہے، نئے رفقا ہون گے، نئے حالات ہون گے، آدمی خواب مین بھی پاتا ہے کہ ایک دوسری دنیا مین پہنچ گیا، اور بیداری کی دنیا کے واقعات سے بے تعلق ہو کر رہ جاتا ہے، کون کہہ سکتا ہے اپنے حقیقی مرقد (خوابگاہ) مین کچھ یہی صورت اُن لوگون کے سامنے پیش آتی ہے، جو اس دنیا والون سے تو الگ ہو جاتے ہین، لیکن نئی دنیا مین نئی ولادت اُن کی ہوتی ہے،

اللھم اغفر لہ وارحمہ، کن اللھم انیسہ واجعل لہ من الملائکۃ والانبیاء والاولیاء رفیقا،

قلم ہاتھ مین آگیا ہے قصداً اس کو اگر نہین روکتا ہون تو یہ بہکتا ہی چلا جائے گا، بہت کچھ کہنا چاہتا

تھا، لیکن کچھ کہہ نہ سکا امرؤ القیس کے قصیدے کا ابتدائی شعر ؎

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

بسقط اللوی بین الدخول فحومل

بار بار زبان پر آجاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی کے لئے کل یہ شعر عرب جاہلی کے اس

شاعر سے کہلوایا گیا تھا، آخر مین اُن ہی کے فرمودہ چند اشعار پر اپنے اس بیان کو ختم کرتا ہون،

"مجلس مذاکرات علمیہ" ان ہی کی سرپرستی مین ایک علمی مجلس قائم تھی جس مین شہر کے ممتاز اہل علم و

ادب جن کا علوم کے مختلف شعبون سے تعلق تھا، اس مجلس کے ارکان تھے، اسی مجلس مین اپنی زبان مبارک

سے اردو کی یہ غزل سُنائی تھی، اس کا کیف و اثر دل پر اس وقت تک باقی ہے، "تیری" کی خطابی ضمیر سے

کسی کو مخاطب بنا کر یہ غزل انھون نے لکھی تھی، دل اس خطاب کے رُخ کو آج کل خود غزل کہنے والے کی

طرف کر کے بسا اوقات گنگناتا ہے، فرمایا تھا،

خوشا وہ باغ مہکتی ہو جس مین بو تیری خوشا وہ دشت کہ ہو جس مین جستجو تیری

رہین صحن گلستان نہین دل افزائی شمیم لطف دل افزا ہے کو بکو تیری

"کو بکو" سے ذہن اُس مقام کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے جہان آج کل یہ فقیر کچھ دنون سے مقیم ہے،

انھون نے بہار کے اس دور افتادہ کوردہ گیلانی کو بھی ایک دفعہ اپنی تشریف فرمائی سے سرفراز فرمایا

تھا، اسی کا خیال آجاتا ہے، اور پھر زبان پر اسی غزل کا یہ شعر جاری ہو جاتا ہے،

ہنوز دشت ختن نافہ زار عالم ہے

کبھی کھلی تھی ادھر زلف مشکبو تری

آخر کے دو شعر یہ تھے :-

فرشتۂ اجل آئے پری کے قالب مین
بوقتِ مرگ جو صورت[1] ہو روبرو تیری

امید تو یہی ہے کہ انشاء اللہ ان کی یہ آخری آرزو پوری ہوئی ہوگی، دوسرا شعر جو مقطع بھی تھا،

خیالِ لطف سے حسرت ہے باغ رضوان مین
سنا ہے جب سے کہ لطف و کرم ہے خو تیری

اب اُن کا "شنیدہ" انشاء اللہ الملک الکریم الجواد "دیدہ" بن چکا ہوگا، فتغمدہ اللہ بغفرانہ وطاب ثراہ،

---

[1] بخاری شریف کی روایت ہے کہ مرنے والون سے پہلی بات یہ پوچھی جاتی ہے کہ ما تقول فی ھذہ الرجل (اس آدمی کے متعلق تم کیا کہتے ہو،) یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارکہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے، حسرت کا سارا سازوسامان اسی بشارت مین پوشیدہ ہے،

نوائے حیات

طبع دوم

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرینِ معارف اور دوسرے اصحابِ ذوق پوری طرح واقف ہین، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن مین بہت سی نئی غزلون اور نظمون کا اضافہ ہے اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے، اس کے شروع مین مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

ضخامت:- ۲۱۴ صفحے، قیمت:- عہ

"منیجر"

نفثۃ المصدور

از جناب مولانا سید بدرالدین صاحب علوی استاذ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی

حکم ہوا ہے کہ جو تعلقات میرے اور مولانا شروانی مرحوم کے درمیان تھے، ان کی بنیاد پر مین معارف کے صدر یار جنگ نمبر کے لیے ان کی علمی زندگی کے کسی پہلو پر کچھ لکھ کر دون، اس کی تعمیل ناگزیر ہے، اول تو جو خلوص مجکو خود ان کے ساتھ تھا، اس کی بنا پر، دوسرے وہ نظر شفقت و کرم جو ان کی میرے حال پر تھی دونون ہی اس کی متقاضی ہین، تیسری چیز یہ بھی ہے کہ کرم فرماؤن کی بات رد نہین کی جا سکتی، چنانچہ جو کچھ ہو سکتا ہے مختصراً حاضر کرتا ہون، مگر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میرے جذبات کا تاثر میری تحریر مین بہت نمایان ہوگا، اور بجائے مخصوص پہلو کے میری تحریر مین عموم نظر آئے گا، امید ہے کہ یہ دونون بے اعتدالیان بنظر درگذر دیکھی جائین گی، کیونکہ مین اپنی افتاد طبیعت سے مجبور ہون، اور اسی وجہ سے عنوان تحریر وہ ہے جو اوپر نظر آرہا ہے،

آغاز واقفیت | جن دنون مین استاذ العلما رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین پڑھتا تھا، مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی حضرت کے آستانے پر حاضر ہوتے رہا کرتے تھے، اول اول میرا سبق حضرت کی خدمت مین ظہر کی نماز کے بعد مقرر ہوا تھا، لیکن چند ہی روز بعد مولوی کرم الٰہی صاحب مرحوم کے دو سبقون مین سے ایک مین مجھے شرکت کا حکم ملکر صبح کے وقت بھی میری حاضری لازمی قرار پاگئی، شروانی صاحب استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین کبھی کبھی ایسے وقت آتے کہ میرا سبق ہو رہا ہوتا یا فوراً ہو چکا ہوتا، الغرض مجکو ان کے متعلق اس طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ایک رئیس ہین اور میرے استاد کے عقیدتمند شاگرد، وہ مجکو اس سے زیادہ نہ

جانتے ہوں گے کہ کوئی طالب علم ہے، جو استفادہ کر رہا ہے، اور استاد ایسے شفیق ہیں کہ معذوری کی حالت میں بھی اس کو پڑھا رہے ہیں، اس دوران میں کبھی ایسا بھی ہوا کہ حضرت نے میرے قلم سے کوئی خط مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب کو لکھوایا، کیونکہ جیسا کہ میں کلام لطف کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں، یہ سعادت مجھکو حاصل تھی کہ حضرت اپنے خطوط اکثر میرے ہی قلم سے لکھوایا کرتے، اس دور کے خاتمے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، کہ استاذ العلماء رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد جب شروانی صاحب پہلی بار استاذ کے آستانے پر حاضر ہوئے تو میں نے خود دیکھا کہ جس مکان میں حضرتؒ کا قیام تھا، اس کی ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر بیساختہ رونے لگے، اور اس قدر بے قابو ہو گئے کہ رونے میں آواز بلند ہو گئی، اس دور کے بعد کوئی خاص تعلق ملاقات یا خط وکتابت کا نواب صاحب مرحوم کے اور میرے درمیان نہ تھا، تا آنکہ میرا تعلق لائبریری اور یونیورسٹی سے پیدا ہوا، اور کسی علمی ضرورت سے کبھی میں نے کوئی خط لکھا یا کسی بات پر توجہ دلائی تو اس کے جواب سے مجھکو مشرف کیا، عرصہ کے بعد ایک بسیط مقالہ استاذ العلماء کے سوانح حیات کا معارف میں شائع فرمایا، جو بعد میں بصورت رسالہ علیحدہ بھی نکلا، اس میں میرا ذکر اس خصوصیت کے ساتھ آیا کہ حضرت نے علمی شغف کی وجہ سے معذوری کی حالت میں مجھکو تعلیم دی، اور اس سلسلے میں ایک مخصوص جملہ میرے متعلق فرمایا، جسکو میں اسی رسالے سے کلام لطف کے مقدمہ میں نقل کر چکا ہوں، اور اپنی سعادت کے لیے پھر دہراتا ہوں،

"میاں مولوی بدرالدین جب پڑھنے آجاتے ہیں تو میں اپنی تکلیفیں بھول جاتا ہوں اور جبتک ان کو پڑھاتا رہتا ہوں ہائے ہائے سے نجات مل جاتی ہے"،

میری پہلی ملاقات شروانی صاحب سے علی گڈھ میں ان کے جائے قیام پر اس وقت ہوئی جب میں شرح المختار پر کام کر رہا تھا، جس وقت میں پہنچا، سر راس مسعود مرحوم تشریف رکھتے تھے، ان کو رخصت کر کے میرا کام دیکھا اور بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا، میری یہ ملاقات بے غرض تھی، اس لیے خلوص کا اثر ظاہر ہوا، گو کہ میرا سلسلۂ آمد و رفت قائم نہیں ہوا، تاہم جب اور جہاں ملاقات ہوتی، بہت شفقت

فرماتے، اسی زمانہ مین اورئینٹل کانفرنس کا جلسہ لاہور مین تھا، نواب صاحب بحیثیت صدر شعبۂ اردو نثر تشریف لے گئے تھے، اور مین انٹرمیڈیٹ کالج کے نمایندے کے طور پر شریک ہوا تھا، کانفرنس کے عصرانہ مین بھی ملاقات ہوئی، دیر تک متوجہ ہوکر مجھسے باتین کرتے رہے، اور مغرب کا وقت ہوجانے پر مجھے آگے بڑھاکر نماز پڑھ

تعلقات مین استحکام | غرض خلوص اپنا اثر دکھاتا رہا، مین جب شہر کی سکونت چھوڑکر یونیورسٹی کے احاطے مین قیام پذیر ہوا، تو اس کی اطلاع پانے پر مجھکو تحریر فرمایا "یونیورسٹی مین قیام مبارک ہو" اس احاطے مین مقیم ہوکر مین نے اپنے مذاق کی صرف ایک ہی جگہ پائی جو مولوی سلیمان اشرف صاحب مرحوم کی قیام گاہ تھی، مولوی صاحب میرے والد مرحوم کے استاد بھائی تھے، یونیورسٹی سے میرا تعلق ہوجانے کے بعد اکثر میری آمد و رفت ان کے یہان ہونے لگی تھی، اب پڑوس مین آکر روزانہ عصر و مغرب کے درمیان مین نے وہان حاضری کا معمول مقرر کرلیا، یہ سلسلہ بھی بے غرض اور خلوص سے تھا، پختہ ہوتا چلا گیا، مولوی صاحب میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے جیسا ایک بزرگ خورد کے ساتھ کرتا ہے، آمدم برسر مطلب۔ نواب صدر یار جنگ مرحوم کی عادت تھی کہ جتنے دن بھی علی گڈھ مین قیام رہتا، روزانہ مغرب کے قریب مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہان تشریف لاتے، علمی و دینی مسائل، بزرگون کے تذکرے اور تاریخی واقعات موضوع سخن رہتے، مولوی سلیمان اشرف صاحب نے نشست کی یہ ترتیب قائم کی تھی کہ ایک جانب خود بیچ مین نواب صاحب اور دوسرے پہلو پر مین، بعد مین یہی ترتیب مفتی عبداللطیف صاحب کے یہان اور حبیب منزل مین بھی قائم رہی کہ وسط مین نواب صاحب ایک پہلو پر مفتی صاحب اور دوسرے پہلو پر مین،

استاد سے عشق | نواب صاحب مرحوم کے ذاتی اوصاف کا آغاز مین اس عنوان سے کر رہا ہون جو کہ مجھکو بھی بہت محبوب ہے، شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو جس مین استاد کا ذکر نہ ہو، استاذ العلماءؒ کی شاگردی پر ناز تھا، درس کے واقعات، تلامذہ کے تذکرے استاد کے علمی کمالات بہت لطف سے بیان فرماتے، میرے متعلق حضرت کا فرمایا ہوا جملہ جو اوپر نقل ہوچکا، حرف بحرف یاد تھا، مجھکو دیکھکر حاضرین مجلس کے سامنے

اکثر اس جملہ کا اعادہ فرماتے، سنتا تھا کہ میری غیبت مین بھی استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر مین یہ جملہ زبان پر لاتے،
حبیب گنج اور علی گڈھ کے درمیان ایک ایسی جگہ پڑتی ہے جہان سے پلکھنہ کو راہ جاتی ہے، پلکھنہ استاذ
العلماء کا مولد اور آبائی وطن تھا جب ادھر سے گذر ہوتا فرماتے تھے کہ استاد سے تعلق پلکھنہ کی طرف
جاذب توجہ ہو جاتا، وہان تقریبات مین شریک ہونا اور علما کے مجمعون کا سمان نگاہ کے سامنے آجاتا،
ادھر آخر مین کئی بار اس مقام پر پہنچکر ایک ایک دو دو شعر بھی برجستہ موزون ہو جاتے تھے، جو کبھی
حبیب گنج سے بذریعہ ڈاک میرے پاس بھیجدیتے کبھی بروقت ملاقات زبانی سناتے یا کسی پرچہ پر لکھ کر
مجھے دیتے، اس وقت میرے پاس چار تحریرین موجود ہین، جنکو مین یہان نقل کرنا موزون سمجھتا ہون،

(۱) ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ اثنائے سفر علی گڈھ محاذی پلکھنہ

پلکھنہ وہ ہے نورِ شمس معارف ۔۔۔ کیا جس نے پرنور عالم سراسر
پلکھنہ دیا فیض دنیا کو جس نے ۔۔۔ لکھا نام اس کا ہے اوج فلک پر

"دنیا" پر نشان لگا کر نیچے یہ عبارت تحریر ہے" مبالغہ نہین، ایک بار جناب مولانا مرحوم کے یہان
تقریب شادی مین علماء کا مجمع حسب معمول تھا، ذکر چلا سرحدی درسگاہوں کا، ایک عالم سرحدی نے کہا کہ
ایک بار ایک اہل علم کے جلسے مین صوبہ سرحد کے ان مدارس کو شمار کیا جو مولانا کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کے جاری تھے،
تو تین سو شمار مین آئے، اگر فی مدرسہ پچاس طالب علم اقلاً رکھے جائین تو پندرہ ہزار ہوئے، اب مبالغہ کی
گنجائش کہان ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ یہ فیض کب سے جاری تھا اب بھی بفضلہ تعالیٰ جاری ہوگا،

(۲) بذریعہ پوسٹ کارڈ" ابھی علی گڈھ سے آکر اترا ہون، فیض پلکھنہ فی البداہۃ

پلکھنے کا ہو وصف، کب ہے یہ امکان ۔۔۔ یہان گرم تھی بزم ارباب عرفان
وہ ارباب عرفان جو تھے جان عالم ۔۔۔ وہ محبوب عالم وہ جانان عالم

۲ر نومبر ۱۹۴۷ء

(۳) پالکھنہ وہ معمور لطفِ لدنی — منور ہے عالم تجلی سے جس کی

(۴) پالکھنے مین برسے ہین انوار حکمت — درخشان وہان پر ہے نور تجلی

مرشد سے عقیدت | مولانا فضل رحمان صاحب سے ارادت تھی پورے خاندان کے اندر یہ سعادت صرف نواب صاحب مرحوم کو اور ان کے چچازاد بھائی خلیل الرحمٰن خان صاحب کو حاصل ہوئی، ورنہ خاندان کے تمام زن و مرد شاہ جہان پور کے شاہ عبد الغفور صاحب سے بیعت تھے، بہت عقیدت سے فرماتے کہ خاندان مین کبھی کسی کا نام رحمان پر نہین ہوا تھا، مولانا کی یہ کشش نام رکھتے وقت ہی ظاہر ہوئی کہ ہم دونون ان سے بیعت ہونے والے حبیب الرحمٰن اور خلیل الرحمٰن کے نامون سے موسوم ہوئے، مولانا کے واقعات اور انکے ارشادات سے شاید ہی کوئی مجلس خالی ہوتی ہو، پہلی بار جب گنج مرادآباد کی حاضری ہوئی تو مولانا نے دریافت فرمایا "مولوی لطف اللہ کو جانتے ہو"، عرض کیا "جانتا ہون"، فرمایا "خدمت کرتے ہو"، عرض کیا "بزرگ خدمت کرتے ہین"، اس واقعہ کا ذکر بہت خوبی کے ساتھ اکثر معمول تھا، فرماتے کہ خوش نصیبی تھی مولانا لطف اللہ صاحب سے پڑھا اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے بیعت کی، آخر مین استاد کی جو خدمت نصیب ہوئی اس کو بھی مرشد کے سوال کا نتیجہ خیال کرتے تھے،

میرے ساتھ شفقتِ بزرگانہ | جیسا کہ مین لکھ چکا ہون، میرے تعلق کا آغاز بہت معمولی طریقہ پر ہوا، مگر بعد مین اتنا مستحکم ہوگیا کہ احاطہ تحریر مین لانا ممکن نہین، استحکام کی دو وجہین معلوم ہوتی ہین، پہلی جو آغاز مین کارفرما تھی علمی اور ادبی یکجہتی اور ہمخیالی، اس مقام پر یہ بتا دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ بڑے آدمیون اور حکام سے دور رہنا مجھکو ہمیشہ سے محبوب رہا ہے، لیکن نواب صاحب مرحوم کی درویشانہ صفت، علم دوستی اور اور خود ان کی کشش نے مجھکو ان سے قریب کر دیا، دوسری وجہ میرا خصوصی تعلق استاذ العلماء رحمۃ اللہ کی خدمت مین، اب تو نواب صاحب مرحوم کا تعلق میرے ساتھ مستحکم ہو جانے کا یہ عالم تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر تمھاری کوئی بات ہوتی ہے تو مولانا کی صورت سامنے آجاتی ہے، مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان

کرتا ہون، میرے یہان تقریب تھی عین وقت پر معلوم ہوا کہ نواب صاحب حبیب گنج جا رہے ہین، شریک نہ ہون گے، مین فوراً پہنچا، اور عرض کیا کہ شرکت کے بعد تشریف لے جائین، تھوڑے سے تامل کے بعد فرمایا بہت اچھا، شرکت کی، پھر حبیب گنج گئے، دوسری بار جب تشریف لائے، تو مخصوص جلسہ مین تبلایا کہ جب مین روکنے کے لیے پہنچا تو مولانا کی صورت سامنے آگئی، پھر یہ تاب کہان تھی کہ شرکت نہ کرتے، اپنی تالیفات بہت اہتمام کے ساتھ مجھکو عطا فرماتے، سال گذشتہ جب فارسی کا دیوان چھپ کر آیا تو اسکا ایک نسخہ اپنے دست مبارک سے حسب ذیل عبارت لکھ کر مجھ کو دیا،

"ہدیہ مولف خدمت زبدۃ العلماء مولوی بدرالدین بدر سہارکمال مدفضلہ

حبیب الرحمن صدر یار جنگ، ۲۵ شعبان المعظم ۱۳۶۰ھ

اہل علم سے محبت اور علمی بنا پر تعلقات اہل علم سے بہت رغبت تھی، محض علمی فضل کی بنا پر لوگون سے تعلقات پیدا کرتے، اہل علم پر احسانات کرتے جس کے پس پردہ بجز علم پروری کے کوئی اور غایت نہ ہوتی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی وائس چانسلری کے زمانہ مین اچھے اچھے علما کو یونیورسٹی مین جمع کر دیا، اہل علم کے ساتھ نشست کا خاص ذوق تھا جس کا ایک مظہر یہ تھا کہ مولوی سلیمان اشرف صاحب اور مفتی عبداللطیف صاحب کے یہان روزانہ پابندی کے ساتھ تشریف لا کر گھنٹون بیٹھتے، نواب صاحب مرحوم کی یہ مجلسین بڑی پاکیزہ ہوتی تھین، جن مین معلوم ہوتا تھا کہ اہل مجلس دنیا اور مافیہا سے بلند تر کسی اور عالم کے لوگ ہین، خالص دینی، علمی اور تاریخی مضامین پر گفتگو ہوتی تھی، یہان یہ بتانا مناسب ہے کہ سارے ملک کے مشاہیر اہل علم و کمال سے پختہ تعلقات تھے جن کا ظہور خصوصیت سے سفر کے موقعون پر ہوتا تھا، مثلاً ایک واقعہ لکھنؤ کے بابت بیان کرنا ہے، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی اور مولانا عین القضاۃ صاحب کے پاس جانا لکھنؤ پہنچ کر لازم تھا، ایک بار وہان کوئی دربار تھا، نواب فضل اللہ خان صاحب کی رفاقت تھی، ایک ہی جگہ دونون صاحب مقیم ہوئے، دوسرے روز صبح کو ضروریات سے فارغ ہو کر حسب معمول شروانی صاحب مولانا نعیم صاحب وغیرہ کے یہان گئے

اور نواب مزمل اللہ خانصاحب حکام سے ملے، جائے قیام پر واپسی کے بعد جب ملاقات ہوئی، تو نواب مزمل اللہ خانصاحب نے جو چچیرے چچازاد بھائی اور عمر مین بڑے تھے، ذرا تیز ہوکر پوچھا "کہان چلے گئے تھے"، جواب سننے پر انھون نے پھر تیز ہوکر کہا کہ "ان لوگون سے ملنے آئے ہو یا دربار کے لیے"، اس کا جواب یہ تھا، کیا کیا جائے ایک خبط ہے"؛ اسی طرح ایک بار مزمل اللہ خانصاحب نے گرم ہوکر کہا کہ "یہ کیا واہیات ہے کہ روزانہ جہان شام ہوئی مولوی سلیمان اشرف کے یہان"۔ اس کا بھی جواب یہی تھا کہ "خبط ہے"؛ یہان ایک واقعہ اور لکھنے کے قابل ہے، یونیورسٹی مین کوئی تقریب تھی، لائبریری مین ممبران کورٹ اور ممبران اسٹاف اپنی اپنی مقررہ جگہ پر آکر بیٹھتے جارہے تھے، اسٹاف کے سلسلہ مین مین بھی آکر ایک طرف بیٹھ گیا تھا کہ نواب صدیار جنگ مرحوم لائبریری کے دروازہ پر آکر رکے، ادھر ادھر نظر ڈالی اور مجھ کو دیکھکر میرے پاس تشریف لے آئے، اور اسکا کچھ خیال نہ فرمایا کہ وہان ان کی جگہ نہ تھی، جب تک لائبریری مین اجتماع رہا، میرے ہی پاس تشریف فرما رہے، اور برابر باتین کرتے رہے،

درویشی اور تواضع | باوجود خاندانی خوش حال ہونے کے مزاج مین درویشی اور فروتنی تھی جس کے بکثرت مناظر ہر شخص نے دیکھے ہین، مین سمجھتا ہون کہ اہل علم سے بے تکلف محبت کرنا شانِ درویشی ہی کا نتیجہ تھا، اپنے خاص واقعات بیان فرماتے، مگر اس طور پر کہ ہرگز کبھی کبر و نخوت ظاہر نہ ہوتی، بلکہ فروتنی کے انداز سے بیان کرتے،

وضعداری اور پختگی | نہایت وضعدار تھے، جس سے جو رسم قائم ہوگئی بہت پختگی کے ساتھ اس پر عمل رکھا، اختلاف خیال اور اختلاف مذاق ہرگز اس رسم مین کمزوری پیدا نہ کرسکا، شاید ہی کوئی شخص شناساؤن مین ایسا ہو جس کے خیال مین اس کی مثالین نہ ہون، وضعداری کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جب تک قوت رہی نہ مانۂ قیام علی گڈھ روزانہ عصر کے بعد مفتی عبداللطیف صاحب کے یہان جو معمول آنے کا تھا اس مین کبھی ناغہ نہ ہوتا، اس مضبوطی کو دیکھئے کہ اگر مفتی صاحب علی گڈھ مین نہ ہوتے تو بھی حسب معمول تشریف لاتے، ان کی آمد

کی وجہ سے دوسرے اہل مجلس حاضر ہو جاتے، ایک بار ایسے ہی موقع پر مجھ سے فرمایا:

ومن مذہبی حب الدیار لاھلہا وللناس فیما یعشقون مذاہب

یہ بھی فرماتے کہ اس وقت کہیں اور کا خیال بھی نہیں آتا، آخر میں جب کمزور ہو گئے، تو یہ معمول قرار پایا کہ عصر کے بعد مفتی صاحب کو اور مجھ کو لینے کے لیے ہمارے قیام گاہوں پر گاڑی آتی، اگر کبھی مفتی صاحب کسی وجہ سے نہ جا سکتے تو تنہا میں جاتا، پیشتر تشریف آوری کا معمول اسی پختگی کے ساتھ مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہاں مقرر تھا، غرض پختگی کی یہ کیفیت تھی کہ جو بات تھی پتھر کی لکیر کے مانند کسی کی طاقت نہ تھی کہ ذرا سی بھی جنبش دے سکے،

دینداری اور ضبط اوقات | بھیکم پور عرصہ سے دینداری کا مرکز تھا، اور اسی ماحول کے اثر سے نواب صاحب مرحوم میں بھی دینداری بدرجۂ اتم تھی، دینداری کا ایک جز ضبط اوقات ہے، وہ بھی بہت نمایاں تھا، نماز باجماعت کے لیے مسجد میں جانا اور ورد و وظائف میں مشغول رہنا سفر تک میں نہ چھوٹتا، علی گڈھ کے قیام میں مغرب کی نماز لازمی طور پر جماعت سے ہوتی، پہلے مفتی صاحب کے مکان پر اور بعد میں حبیب منزل میں جماعت سے فارغ ہو کر بے ساختہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتے، نماز کی امامت مفتی صاحب کیا کرتے، مگر اب کئی سال سے یہ بارگراں مجھ کو سپرد ہو گیا تھا،

حیدر آباد کی صدر الصدوری دینی خدمت ہی کے خیال سے منظور کی تھی، فرماتے تھے کہ طبیعت گریزاں تھی، مگر بالآخر خدمت اسلام کا پہلو غالب آیا، چنانچہ وہاں کے دوران قیام میں بکثرت اصلاحیں کیں، بدعات کو توڑ کر صحیح اسلامی اور مسنون طریقے رائج کیے ۔۔۔ سچی دینداری ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کے یہاں غیبت کا گذر دور دور نہ تھا۔

علمی ذوق | نواب صاحب مرحوم کو علم کا بے حد ذوق تھا، تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ایک خوش حال گھر میں پیدا ہو کر پورے ماحول سے جداگانہ مذاق ان کے اندر پیدا ہوا، ان کے چچا عبدالشکور خان صاحب اپنے اور بھائیوں میں ضرور ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے کہ خود ذی علم اور روشنانہ زندگی بسر کرتے، لیکن

اس کے ساتھ ہی ایک اور نمونہ خود ان کے والد محمد تقی خانصاحب کا بالکل رئیسانہ تھا، نواب صاحب مرحوم نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف اپنے چچا کے حکم سے عربی پڑھی، اور اچھے اساتذہ کے فیض صحبت سے علم کی طرف مکمل رجحان پیدا کیا،

کتب خانہ | اسی رجحان کا نتیجہ دو صورتوں مین ظاہر ہوا جن مین سے ایک یہ ہے کہ نوادر کو فراہم کرکے کتبخانہ قائم کیا، کتب خانہ کے آغاز کا بیان جیسا کہ خود فرمایا کرتے تھے، بہت دلچسپ ہے، اور "مقالات شروانی" مین معارف سے منقول ہوکر درج ہے۔

"ان کے لڑکپن مین ایک کتب فروش بچون کی کتابین بیچنے آیا کرتے تھے، ان کو دیکھ کر کتابین فروخت کرنے کا شوق ہوا، رات کو زنانخانہ مین یہ کھیل ہوتا، کہ کسی چادر یا کپڑے کی گٹھری بنا کر کتابین بیچا کرتے ہویان اس کھیل کو دیکھ کر ہنستین اور تعجب کرتین، بچپن مین کتابین بیچنے کا شوق آئندہ کتابین خریدنے مین تبدیل ہوگیا، پہلے اردو دیوانون کے نسخے خریدے، جو صندوقون مین پلنگ کے پاس رکھے تھے، بعد کو الماری کا انتظام ہوا، انگریزی تعلیم کے لیے آگرہ گئے، وہان قلمی کتابین خریدنے کا شوق ہوا، جو علامہ شبلی سے تعلقات ہونے کے بعد شغف کے درجے پر پہنچ گیا، چنانچہ دہلی اور لکھنؤ کے سفرون مین قلمی کتابون کی فراہمی کا خاص خیال رہتا تھا، حیدرآباد مین بھی بڑا ذخیرہ نایاب کتابون کا فراہم ہوا جن مین ایک نسخہ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ کا خود مصنف شیخ عبدالحق دہلوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس طرح برابر کوشش کے ساتھ نایاب کتابون کی بلکہ نایاب چیزون کی فراہمی جاری رہی، شوق کی وجہ سے بعض اوقات خرچ بھی کافی کرنا پڑا، نتیجہ یہ ہے کہ محض کتابین ہی نہین بلکہ ہر قسم کے نوادر جمع کر لیے، جن کے دیکھنے کے لیے غیر ممالک کے لوگ بھی آتے ہیں، کتبخانہ کی چند خاص باتین قابل ذکر ہین، کوئی نادر کتاب یا چیز ناجائز طریقہ پر حاصل نہین کی جتنی کتابین فراہم کیں سب سے استفادہ کیا، جو شخص کتبخانہ کو دیکھنے کے لیے حبیب گنج آیا خواہ وہ کوئی بھی ہو بہت خوش ہوکر اس کی غیر معمولی خاطر کی،

تصنیف وتالیف | علم کی طرف رجحان کی دوسری صورت کا ظہور تصنیف وتالیف سے ہوا، اس کا آغاز بھی

دلچسپ ہے، خود فرماتے تھے کہ ان کی طالب علمی کے زمانہ میں حیدرآباد سے رسالہ "حسن" نکلتا تھا، جو اچھے مضامین پر ایک اشرفی انعام دیتا، چنانچہ بار بار ایک مضمون لکھ کر بھیجا، جواب علحدہ بھی چھپ چکا ہے، رسالہ نے اس پر ایک ایک اشرفی انعام دی، اس طریقہ پر لکھنے کا شوق بڑھتا گیا جس کی بدولت بکثرت تصانیف کیں، مضامین لکھے، سارے ملک میں علمی شان کی دھوم مچ گئی، مضامین کا مجموعہ "مقالات شروانی" کے نام سے حال میں شائع ہو چکا ہے جس کے ۴۰۰ صفحات ہیں، افسوس یہ ہے کہ اس مجموعہ میں المامون پر ریویو نہیں شامل ہو سکا، جو علامہ شبلی مرحوم سے تعلق کا باعث بنا تھا، تصانیف میں "سیرۃ الصدیق" انگریزی میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہوئی، چھوٹی بڑی مذہبی، تاریخی اور ادبی تصنیفات تیس سے متجاوز ہیں،

ایثار اور وقار ملک میں جتنے تعلیمی، علمی اور دینی ادارے قائم ہوئے یا پہلے سے تھے، سب کے ساتھ گہرے تعلقات رکھے، ہمیشہ انکی مالی اعانت کی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری ۲۳ سال تک بالاتفاق منتخب ہوتے رہے، کانفرنس کے جلسوں کے لیے بڑے بڑے لمبے سفر کیے، اور اخراجات خود برداشت کیے، اسی کا نتیجہ تھا کہ بڑا زبردست وقار ملک میں حاصل ہوا، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات اور مشرقی علوم کے رکن رکین سر سید کے زمانہ سے آخر تک رہے، بغیر خواہش یونیورسٹی کورٹ اور انگزیکٹو کاؤنسل کے ممبر بھی ہوتے رہے،

ادبی ذوق اب میں نواب صاحب مرحوم کے ادبی ذوق کے چند نمونے پیش کرتا ہوں، جس زمانہ میں حبیب منزل زیر تعمیر تھی، میرس روڈ پر حبیب منزل کے سامنے ایک جگہ بہ تقریب شادی میرا اور نواب صاحب کا اجتماع ہوا، فراغت کے بعد مجھ سے فرمایا کہ "آؤ ایک چیز تمھارے ذوق کی دکھلائیں"، حبیب منزل لے گئے، اور ایک بڑے پتھر پر جلی اور خوشخط حرفوں میں امرء القیس کا مصرعہ نہایت بلیغ تصرف کے ساتھ یوں کندہ کیا ہوا دکھلایا،

فیاحبذا ذکری حبیب منزل

اس تصرف کو میں نے بیحد پسند کیا، اور متاثر ہو کر بے ساختہ دیر تک پسندیدگی کا اظہار کرتا رہا، میں ان دنوں شہر میں رہتا تھا، تانگہ پر شہر سے آیا تھا، فرمایا "تانگہ رخصت کر دو"، اور خود اپنے ساتھ مجھکو میرے قیامگاہ

کے قریب لاکر اتار گئے، پسندیدگی سے جو تاثر مجھے ہوا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکان پہنچکر چند منٹوں کے غور کے بعد بے اختیار تضمین ہوگئی، جو درج ذیل ہے۔

بناء عظیم للحبیب بکوئل عن النقص والاخلال صار بمعزل

فیبقی علی الآیاہ ذکری کلیھما فیا حبذا ذکری حبیب و منزل

اسی دن، یا دوسرے دن میں نے اس تضمین کو خط کے ذریعہ خدمت میں پیش کر دیا، جسکا جواب نیچے نقل کرتا ہوں

"مصرعے بیتے ہیں، کوئل کا قافیہ غنیمت بار دہ ہے، امرؤ القیس کے مطلع پر اہل نظر نے یہ ایراد کیا تھا کہ مطلع کا دوسرا مصرعہ بسقط اللوی الخ مصرعہ اولیٰ کے پایہ کا نہیں، آپ کا تیسرا مصرعہ چوتھے سے خوب چسپاں اور ہمپایہ ہے"

اسی خط میں مولوی عبید الرحمٰن خانصاحب کی سفر حج سے واپسی کی عربی تاریخ لکھ کر عنایت فرمائی جو بغیر نام کے محض تاریخ پر مشتمل تھی، میں نے اس پر عربی میں مصرعے لگا کر ان کا نام اور یہ کہ ان کے والد ماجد نے یہ تاریخ کہی ہے نظم میں ظاہر کر دیا، اس پر بھی خوشی کا اظہار مندرجہ ذیل کلمات میں فرمایا،

"عربی تاریخ پر مصرعے صاف اور برمحل لگ گئے، کمی پوری ہوگئی، اہل کمال کے فیض سے نقص بھی کمال حاصل کر لیتا ہے"

بعض بعض جملے نواب صاحب مرحوم کی تحریروں میں انتہا درجے کے بلیغ ہیں، مثلاً خزینۃ المعانی کے مقدمہ میں اپنی تعلیم اور اساتذہ کے مختصر ذکر کے بعد تحریر فرماتے ہیں" جو حاصل ہوا فیض استادی ہے جو رہ گیا اپنے قصور استعداد سے" رسالہ استاذ العلماء میں مولوی امانت اللہ صاحب مرحوم کا حال لکھ کر تحریر فرماتے ہیں" باسٹھ برس کی عمر کا سرمایہ دو لفظ ہیں، "پڑھا اور پڑھایا" مقدمہ دیوان اردو میں لکھتے ہیں" شہروانی دہقانی مقدمہ نگاری پر مامور ہے" یہ تین نمونے اس وقت دماغ میں موجود تھے جن کو پیش کر دیا، بیسیوں جملے اسی قسم کے انکی تحریروں میں موجود ہیں،

ان کا ادبی ذوق ایک ایسا بڑا عنوان ہے جس کو بہ تفصیل لکھنا بہت مشکل ہے، شاید ہی کوئی مجلس ایسی ہوتی ہو جس مین ادبی ذوق کے جوہر ظاہر نہ ہوتے ہون، جب مین حاضر ہوتا، اس قسم کی گفتگو مین، روے سخن میری طرف کر لیتے اردو اور فارسی دونون زبانون کے دیوان طبع ہو چکے ہین، کبھی خود اپنے اشعار سنا کر حاضرین کو لطف اندوزی کا موقع دیتے، اور کبھی استادون کا چیدہ چیدہ کلام پیش فرما کر کیفیت پیدا کرتے جو کیفیت اسوقت پیدا ہوتی اسکو احاطۂ تحریر مین لانا ممکن نہین، یہان مین اس تحریر مین جان ڈالنے کیلئے ان کے کچھ اردو فارسی کے اشعار نقل کرتا ہون

اردو

جلوہ فرما تو ہوا صحرا گلستان ہو گیا — تو چلا منہ پھیر کر گلشن بیابان ہو گیا

آنکھ جب بند ہوئی تب کھلین آنکھین اپنی — بزم یاران جسے سمجھے تھے وہ زندان نکلا

پھول فرقت مین تری خار ہوئے جاتے ہین — ہلکے پھلکے ہین مگر بار ہوئے جاتے ہین

کیے دیتی ہے وحشت پارہ پارہ کسوت ہستی — کہان فرصت کہ بیٹھون چاک کرنے مین گریبان کو

حیا، ناز، پندار، رعب و تغافل — تمھارے بھی ہین پاسبان کیسے کیسے

تاب نظارہ تو جب ہو کہ رہین ہوش بجا — پھر کہان ہوش جو ہو سامنے صورت تیری

فارسی

دل بری ہائے اگر بردہ ز من نیست عجب — اہرمن بردہ ز کف مہر سلیمانے را

ہمت ما سرتہی آرد بہ مال و زر فرود — دولت ما بس بود آن شوخ سیم اندام ما

دلم با ساغر و مینا تہی کشد حسرت — کہ بردہ نرگس مستانہ ز خود ما را

فدائے زخم نگاہت ہزار مرہم باد — نثار درد تو سازم ہزار درمان را

وا مقام مملکت عشق دیاریست غریب — کہ شہ غازی محمود غلام است اینجا

ہوائے باغ بہ ہجر تو سازگارم نیست — جدا ز کوے تو ذوقے بہ نو بہارم نیست

باد چمن علاج تب دل نمی کند — عیسی دمے ز گوشۂ دامانم آرزوست

از بن ہر موے حسرت نالہ سر می زند — نغمہ ہائے دلکشا در بند چوب تار نیست

از بدخشان لعل و از عمان گہر | جوہرِ طبعم ز کانِ دیگر است
منتِ رائحۂ نافہ و غنچہ نہ کشند | سرخوشانے کہ بہ بوئے دہنے ساختہ اند
شاہبازِ ہمتم ربطے بدستِ شاہ داشت | خوش نہ کردہ بندِ دستِ دیگران پرواز کرد
ز چشمِ مستِ تو مستم شراب را چہ کنم | ز تابِ حسنِ تو سوزم کباب را چہ کنم
نکرد جلوہ بتِ شوخ باختم دل و دین | اگر برافگند از رخ نقاب را چہ کنم
در حریمِ وصلِ جانانم وطن خواہد شدن | شمعِ بزمِ انس آن ماہ ختن خواہد شدن
نگاہ شوخ بہ چشمِ سیہ بدان ماند | کہ مستِ نازِ خرامد بتے بہ بت خانہ
اے کہ از غایتِ لطافتِ طبع | سحرِ نو بہار را مانی
ربودہ ہوش و قرارم غزالِ رعنائے | نگارِ مستِ خرامے، بلند بالائے
مداوائے مریضِ عشق قانونِ دگر خواہد | طبیبِ دردِ دل آن نرگسِ بیمار باید

مجموعی حیثیت سے ایک نظر | خلاصہ یہ ہے کہ نواب صاحب مرحوم سیدھے اور سچے آدمی تھے، ایچ پیچ سے پاک، نہایت مہذب اور شائستہ، ان کی ہر ادا اور ہر بات انتہائی شائستگی سے پُر تھی، اس زمانہ مین ان کی ذات قدیم تہذیب کا مجسم نمونہ تھی، پاکیزگی اور صفائی نظر پڑتے ہی نمایان ہوتی جس کے اندر وجاہت اور جمال صوری کی درخشانی بدرجۂ اتم تھی، گفتگو مین وہ لطف تھا کہ مجلس کے [illegible] وقت پر میری تو یہ حالت تھی کہ سب کامون کو چھوڑ اس مین شرکت کے لیے مستعد ہو جایا کرتا، کبھی ناغہ کرنے کو جی نہ ہوتا، ان کی ذات ایسی بہت سی بے مثال صفات کا مجموعہ تھی جو اس زمانہ مین مفقود ہین، اللہ تعالیٰ ان کو بہشت برین مین بلند درجات پر فائز کرے۔ ویرحم اللہ عبدا قال امینا

اب مین اس تحریر کو متمم بن نویرہ کے دو حسب حال بیتون پر ختم کرتا ہون،

وکنا کندمانی جذیمۃ حقبۃ | من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کأنی ومالکا لطول اجتماع لم نبت لیلۃ معا

اردو کا ایک مشہور مصرعہ بھی یہاں موزون ہوگا ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ضمیمہ | محترم جناب مفتی عبداللطیف صاحب سے بھی درخواست کی گئی تھی کہ اس مخصوص نمبر کے لیے کچھ تحریر فرمائیں کہ ان کی تحریر بہت قیمتی ہوتی، لیکن انھوں نے فرمایا کہ وہ لکھنے پر قادر ہی نہیں، اور یہ مصرع پڑھا،

حدیثِ دل بکہ گویم عجب غمے دارم

میرے اصرار سے اس پر راضی ہوئے کہ چند باتیں مجھے بتلا دیں جنکو میں لکھکر بطور ضمیمہ اپنی تحریر میں شامل کر دوں، چنانچہ جو کچھ موصوف نے فرمایا درج ذیل ہے، لیکن قبل اس کے یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نواب صدر یار جنگ مرحوم، مفتی صاحب، اور میں تینوں ایک ایسے لازوال رشتے میں منسلک ہیں جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا، اور جس کی طرف میں نے اپنی ایک عربی تحریر میں بایں الفاظ اشارہ کیا تھا،

ولیعلم أننا أغصان شجر واحد و تلامیذ أستاذ ماجد،

سنہ ۱۳۰۸ھ میں مفتی صاحب استاذ العلما رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھتے تھے، اسی سال مولوی حبیب الرحمن خانصاحب شروانی مرحوم بھی درس میں شریک ہوئے، اور اس طرح پر کئی سال تک دونوں صاحب ہم سبق رہے، اس وقت سے اس وقت تک کہ اکسٹھ سال کا زمانہ گذر گیا، باہم تعلقات میں شگفتگی ہی بڑھتی چلی گئی، طالبعلمی میں ساتھ رہا، ندوۃ العلما میں ساتھ رہا، حیدرآباد میں ساتھ رہا، اور آخر میں علی گڈھ میں ساتھ رہا، سفروں میں بھی بارہا رفاقت رہی، غرض جو ارتباط قائم ہوا، ایسا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا، نواب صاحب مرحوم کو جو محبت مفتی صاحب کے ساتھ تھی اس کا ذکر میری تحریر میں اوپر گذر چکا ہے، مفتی صاحب کے تعلق کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اب اکثر یہ شعر انکے ورد زبان رہتا ہے،

آتش اندر آشیان بے رحم صیادان زدند
در گلستان مشت خارے داشتم ہم نگذاشتند

کہ لے دے کے ایک ہی ذات سے تعلق تھا، وہ بھی نہ رہی

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ شروانی صاحب مرحوم کی طالبعلمی کی شان یہ تھی کہ ٹھیک بارہ بجے دن کو ان کا سبق ہوتا، گھوڑے پر سوار ہو کر پڑھنے آتے، ایک سائیس گھوڑے کا اور ایک خدمتگار کتابیں ہاتھ میں لیے ساتھ ہوتا، کیسی ہی لو، دھوپ یا بارش ہوتی، ناغہ نہ کرتے، اور بہت پابندی کے ساتھ ٹھیک وقت پر سبق کے لیے استاد کی خدمت میں پہنچ جاتے، جب مولانا کا کمرہ چالیس یا پچاس قدم رہ جاتا، گھوڑے سے اتر کر کتابیں اپنی بغل میں لیتے اور استاد کی خدمت میں ادب کے ساتھ حاضر ہو جاتے، یہ معمول چند روزہ نہ تھا، بلکہ مستقل تھا، ایک رئیس زادہ کو تحصیل علم کا اتنا شوق جس کے لیے کسی تکلیف کی پروا نہ کرنا لائق صد آفرین اور قابل تقلید ہے، جس سے اس زمانہ کے طلبہ کو سبق سیکھنا چاہیے، اس شان سے طالب علمی کا زمانہ گذارا اور بعد فراغت، مطالعہ اور تحریر و تقریر کے میدان میں قدم رکھا، استعداد پختہ تھی، نتیجہ یہ کہ تحریر میں وہ خصوصیت حاصل ہوئی کہ ہر شخص نے مدح سرائی کی، خاص خوبی یہ تھی کہ مطالب کی جامع ہوتی اور حشو و زوائد سے پاک بندش چست، تقریر میں وہ ملکہ حاصل کیا کہ کوئی علمی اور اسلامی مجلس ان کی تقریروں سے خالی نہ رہتی تھی خواہ نزدیک ہو یا دور، ایک بار پٹنہ میں ندوۃ العلماء کا جلسہ تھا، اندازہ ہے کہ پچاس ہزار کا مجمع ہوگا، جس کے اندر اس زمانہ کے بڑے بڑے اشخاص مثلاً سر علی امام جسٹس شرف الدین حسن امام وغیرہ وغیرہ شریک تھے، شروانی صاحب کی تقریر جب ہوئی تو مجمع کا ہر شخص از خود رفتہ ہو گیا خصوصیت کے ساتھ سر علی امام اور ان جیسے دیگر اشخاص بالکل بے قابو تھے،

تحریر اور تقریر کے علاوہ جو ایک بہت بڑا کام انھوں نے انجام دیا وہ انکا کتبخانہ ہے شخصی محنت سے اتنا بڑا کتبخانہ جمع ہونے کی مثال اس صوبہ یو پی کے اندر نہیں، گویا یہ ایک فرض کفایہ تھا جو انھوں نے پورے یو پی کی طرف سے ادا کیا، اس کتبخانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف نوادر اسمیں جمع کیے گئے ہیں،

علم کے ساتھ ساتھ خدا نے ان کو فہم سلیم عطا فرمائی تھی مفتی صاحب سے انکی گفتگو ہر قسم کے علمی مسائل پر ہوتی رہتی تھی جس سے اس بات کا مفتی صاحب کو یقین ہو گیا کہ مرحوم صحیح بات ہمیشہ فوراً سمجھ لیتے تھے، مزاج مین کجروی بالکل نہ تھی اور غلط بات ہرگز نہ مانتے تھے، مفتی صاحب سے استادبھائی ہونے کے علاوہ پیربھائی کا بھی رشتہ تھا، مولانا فضل رحمان صاحب سے ارادت اس طریق پر ہوئی کہ ملاقات کے بعد تمام رات بےچینی مین کٹی جس کی وجہ یہ بتلاتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے تمام گناہ پیش نظر تھے صبح کو مرید ہونے کے بعد وہ کیفیت زائل ہو گئی، مولانا نے دعا دی کہ خدا قرض سے بچائے جس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ عبدالشکور خانصاحب کے انتقال کے بعد جائداد پر تین لاکھ کا قرضہ تھا، اسکو ادا کیا، خود کبھی قرضہ نہین لیا، آمدنی مین خدا نے ایسی برکت دی کہ امور خیر بھی جاری رہے اور لاکھون روپیے کی جائداد خریدی، برادری مین اس طور پر لوگون کی امداد کی کہ جو کوئی مقروض ہوجاتا وہ اپنی جائداد ان کے ہاتھ مین دیدیتا، یہ اس کا قرض ادا کرکے جائداد واپس کردیتے،

سرکاری خطابات اور کونسلون کی ممبری سے باوجود اتنی بڑی ریاست کے سخت نفرت تھی، ایک بار خطاب کی سفارش گورنمنٹ مین گئی، خطاب آنے سے پہلے شروانی صاحب کو پتہ لگ گیا سخت وحشت ہوئی، اور کوشش کرکے خطاب کو رکوا دیا، اگر وہ چاہتے تو بہت سے خطابات، کونسلون کی ممبری ان کو بہت آسانی کے ساتھ مل جاتی، مگر ان کی زندگی تو دوسرے ہی مقصد کے لیے تھی، تمام زندگی کا کارنامہ دو باتین تھے مین، علم حاصل کیا اور اسلام کی خدمت کی، مختصر یہ ہے کہ شروانی صاحب مرحوم اپنی صفات مین بے نظیر

آخر مین یہ شعر پڑھا،

اندکے با تو بگفتم و بہ دل ترسیدم
کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اعتراف

از جناب سید معین الدین صاحب مرحوم مترجم نپولین اعظم وغیرہ

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے

چہ کنم کہ چشم بدبین نکند بہ کس نگاہے

سید معین الدین صاحب مرحوم شاہجہانپوری اپنے زمانہ کے مشہور مترجم اور صاحب قلم تھے، جیساکہ اس مضمون سے ظاہر ہوگا، یہ اعتراف انھوں نے آج سے ۲۳ سال پہلے بطور وصیت نامہ کے لکھا تھا، جسے بعد مین معارف مین اشاعت کے لیے بھیجدیا تھا لیکن شاید اسکی نوبت اسی لیے نہین آسکی کہ وہ مولانا شروانی کی یادگار مین کام آئے، اسلیے مضمون نگار کی وصیت کی تکمیل کے لیے اس کو اس نمبر مین شائع کیا جاتا ہے جو اس کے لیے سب سے زیادہ موزون ہے۔ "م"

۲۶ نومبر سنہ ۱۹۲۷ء کو یہ مضمون "اعتراف" کی سرخی سے میں نے اس وقت لکھا تھا جب کہ چھ سال متصل حیدرآباد دکن کے عہدۂ منتظمی دفتر پیشی صدر الصدوری امور مذہبی پر کام کر چکنے کے بعد مین اپنے وطن شاہجہانپور واپس آیا تھا، منشا صرف یہ تھا کہ اپنی عینی شہادت بطور وصیت تحریر کے ذریعہ سے اپنے پیچھے چھوڑ جاؤن جس ذاتِ گرامی کے متعلق یہ اعتراف مین نے لکھا تھا وہ ایک غیر معمولی شخصیت ہے اور مجھکو یہ درد انگیز خیال تھا کہ قاعدۂ قدرت کے موافق وہ ذاتِ گرامی ایک دن اس دارِ فانی سے اٹھ جائیگی، اور مین بھی نہ رہون گا، پس اس ذاتِ گرامی کی اگر کبھی سیرۃ لکھی جائے تو میرا یہ "اعتراف" اس سیرۃ کا ایسا ایک باب بن سکے جس سے

زیادہ سچا دوسرا کوئی واقعہ اس سیرۃ مین دکھایا نہ جاسکے، مین نے اس اعتراف کی تمہید مین لکھا تھا میری سچائی کی دلیل یہ ہے کہ اب جبکہ مین یہ اعتراف لکھ رہا ہون نہ اس ذات گرامی سے میرا کوئی دنیاوی نفع کا واسطہ باقی ہے، نہ مجھ پر کوئی دباؤ ہے، پس جو کچھ یہان لکھا جاتا ہے وہ آلودگی اور ہر قسم کی لوث سے انشاء اللہ پاک ہے۔"

لیکن ان پچھلے چار سال مین حالات نے کچھ ایسے پلٹے لیے کہ حیدرآباد چھوڑنے کے بعد مجھے پھر معلوم نہ ہوا کہ وہان کیا ہو رہا ہے، تین برس تک اس ذات گرامی سے جس کے ساتھ پورے چھ سال مین ایک ہی کوٹھی مین رہ چکا تھا! مدحس کا مین سب سے بڑا مرشتہ دار تھا کسی قسم کی خط و کتابت بھی نہ ہوئی کہ اب یکایک معلوم ہوا کہ استعفیٰ کے ذریعہ سے اس ذات گرامی نے حیدرآباد سے تعلق قطع کر لیا، چونکہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا ہے، جبکہ مین زندہ ہون، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "معارف" کے ذریعہ سے اپنا یہ اعتراف ناظرین کے سامنے پیش کر دون، میرا مدعاے اصلی اس طرح پورا ہو جائے گا، یعنی جب سیرۃ لکھی جائے گی تو معارف ہی سے سیرۃ نگار یہ سطور چن سکے گا،

وہ ذاتِ گرامی نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا مولوی محمد حبیب الرحمن خان صاحب شروانی کی ہے، جس سے اس اعتراف مین مجھے بحث کرنی ہے، مین اس طولانی داستان سے بات کو طول نہ دون گا، کہ شروانی صاحب سے کب اور کس طرح میری ملاقات ہوئی اور اس تیس برس مین باہمی ربط و قدردانیون نے کیا منزلین طے کین، اسلئے اصل مدعا کی طرف آتا ہون،

انتیس ۲۹ برس سررشتۂ تعلیمات مین کام کرنے کے بعد مین نے سلطانپور سے گورنمنٹ کی ملازمت سے استعفیٰ دیا، اور ہز ہائی نس نواب صاحب باؤنی کا پرائیویٹ سکریٹری ہوا، دہلی کالج اندور مین نواب صاحب ممدوح کا گورنمنٹ صوبہ متحدہ کے حکم سے مین پہلے اتالیق رہ چکا تھا، اسی زمانہ مین شروانی صاحب حیدرآباد دکن کے صدر الصدور امور مذہبی ہوئے، مین باؤنی مین دو برس کام کرنے پایا تھا کہ شروانی صاحب نے مجھے اپنے ساتھ لیا، اور حیدرآباد مین اپنے دفتر پیشی کا، سرکار آصفیہ

کی منظوری حاصل کر لینے کے بعد، منتظم کر دیا، یہ تقرر ۱۶ رجون ۱۹۲۰ء مطابق ۱۰ ررمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو ہوا، اب مین اس منزل پر پہنچ گیا کہ شروانی صاحب سے میرا ہر وقت کا ساتھ ہے اور مجھکو موقع ملتا ہے کہ انکو اتنے قریب سے دیکھون جتنے قریب سے دیکھنا ممکن ہے، غالباً میرا خیال صحیح ہے کہ کسی دوسرے کو متصل چھ سال ایسے نہ ملے ہون گے کہ اس نے ایک جاسوس کی طرح شروانی صاحب کی زندگی کا ہر پہلو، میرے جیسے مشاہدے کی نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اپنے نہایت باقاعدہ روزنامچہ کی جلدون مین یہ پہلو برابر قلمبند کیے ہون،

اب مین چھ برس کا تجربہ اور مشاہدہ اس اعتراف مین نہایت دیانت اور راستی سے لکھتا ہون کہ مین نے شروانی صاحب کو کس عالی رتبہ کا باعمل مسلم پایا، لیکن اتنا پھر لکھنا ضروری سمجھتا ہون کہ چونکہ مین شروانی صاحب کو اچھی طرح جانتا ہون اور یہ اعتراف اب ان کی نظر سے بھی گذرے گا، اگر خلاف واقعہ مین نے کوئی بات لکھی ہو تو میرے حق مین سب سے زیادہ سخت جج وہی ہون گے، اور مجھ پر سب سے زیادہ نفرین بھی کرین گے، چنانچہ جو کچھ شروانی صاحب کے متعلق مین آگے لکھتا ہون مین ان کو ایسا ہی جانتا ہون، اس کے بعد اصل علم خدا کو ہے اور صحیح اور بہتر جاننے والا وہی ہے،

وضع شکل وصورت | صحیح مسلمانہ وضع قطعی مشرقی، حسن صورت ہزارون مین ایک، حیدرآباد کے عظیم الشان جلسون مین مین نے یہی پایا کہ سب سے پہلے نظر انھین کی طرف بے ساختہ اٹھتی تھی اجمال صورت کے ساتھ مسلمانہ عبا، عمامہ اور لباس، سبحان اللہ، حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی کسی سرکاری تقریب مین بھی شروانی صاحب نے مغلی دستار کبھی سر پر نہ رکھی، اگرچہ ان کی پیشی مین مجھکو پچھلے تین سال پیشی کے وقت مغلی دستار استعمال کرنی پڑی،

انشا، | شروانی صاحب کی انشا مین ایک چاشنی اور وہ ذائقہ ہے کہ صاحب ذوق ہی وہ لذت جان سکتا ہے، وجہ اس چاشنی اور لذت کی یہ ہے کہ چونکہ وہ فارسی اور اردو کے ایک گران پایہ شاعر ہین،

اگرچہ وہ شاعری کی مشق نہین کرتے، اس لیے نثر مین شاعرانہ تخئیل داخل ہو کر نثر کا پایہ نہایت بلند کردیتی ہے، جملے چھوٹے چھوٹے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ و لغات سے پاک، لیکن آمد مضامین کی رَو مین کبھی توانی کا واقعہ ہو جاتا یا کہین پر خفیف عرقِ ظرافت کی جھلک ناوک و نشتر کی گویا چھیڑ ہوتی ہے، مین نے چونکہ ان کے ہر قسم کے مسودات کثرت سے صاف کیے ہین، ان کی نثر کا اسلوب مین جانتا ہون، منصف مزاج ایسے کہ زبان کے متعلق کسی لفظ کے استعمال کے متعلق جب کبھی مین نے اپنا کوئی خطرہ یا شبہہ ظاہر کیا، انھون نے کبھی برا نہ مانا، فوراً تحقیقات کی، اگر میرا خطرہ یا شبہہ صحیح ہوا تو نہایت مسرت سے انھون نے قبول کرلیا، اگر مین غلطی پر ہوا تو خود میری غلطی کی اصلاح ہوگئی، ان کے انشا مین بیکار اور زائد باتون کا دخل نہین،

تقریر مین نے شروانی صاحب کی قریب قریب ہر ایک تقریر حیدرآباد مین سنی ہے، تقریر عام فہم، تقریر کا ایک خاص مرکز و مقصد، پیرایہ دلون سے استغاثہ کرنے والا، مذہبی تقریرین رطب و یابس روایات سے قطعی پاک، تقریر مسلسل، برجستہ اور آخر مین اپنے مرکز و مقصد پر پہنچ جانے والی، اور تقریر کا منتہاے کمال یہی ہے، اعلیحضرت سلطانِ دکن مدظلہ العالی کی موجودگی مین بھی مین نے دیکھا ہے کہ بال برابر بھی لہجہ یا تقریر کے تیور مین فرق نہین آتا،

وقت کی قدر اور تقسیم اوقات روزانہ واجبی اشغال مین اپنے نفس کے رجحان سے کبھی وقت ضائع کرتے مین نے شروانی صاحب کو نہ دیکھا، حبیب گنج مین فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کے بعد سب سے پہلا کام وہ یہ کرتے تھے کہ رخصت ہونے والے پردیسیون اور مسافرون کو رخصت دیتے، پھر اپنے باغ کی سیدھی طولانی روش پہ تسبیح لیے ہوئے متصل ایک گھنٹہ کے قریب ٹہلتے اور وظیفہ پڑھتے رہتے، ایک مضبوط عموماً مرزاپوری بانس کی چھڑی ان کے ہاتھ مین ضرور ہوتی، چھڑی کبھی ترک نہ کی جاتی حتی کہ جب مسجد کو جاتے تب بھی چھڑی ہاتھ مین لے جاتے، حیدرآباد مین بھی فجر کی نماز کے بعد ٹہلنے اور وظیفہ کا یہی دستور تھا لیکن یہان مسافرون اور پردیسیون کی جگہ اطراف کے چھوٹے چھوٹے بچے جن کی تعداد کبھی ایک سو سے زیادہ ہو جاتی تھی،

شروانی صاحب کو گھیر لیتے تھے، اور شروانی صاحب ہر ایک بچہ کو ایک ایک پیسہ دیتے اور مسکراتے جاتے اور کسی بچہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ بھی پھیرتے تھے، وظیفہ سے فارغ ہوکر چائے پیتے اور خطوط لکھنے شروع کردیتے، دس بجے عموماً اجلاس پر آجاتے اور اسوقت تک کام کرتے کہ آج کا سب کام ختم ہو جاتا، ہر ایک مثل خود پڑھتے اور ہر ایک حکم اپنے قلم سے لکھتے، ظہر اور عصر کے درمیان کوٹھی کی بالائی منزل پر اتنی بلند آواز سے روزمرہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے کہ آواز نیچے صاف سنائی دیتی، نماز ظہر کے بعد بھی ہمیشہ چائے پیتے تھے، حیدرآباد میں نماز عصر کے بعد وہ بالاخانہ سے نیچے اترتے، مغرب تک یا تو ملاقاتیوں سے ملاقات ہوتی یا موٹر میں سوار ہوکر ہوا خوری کو جاتے، عموماً میں ساتھ ہوتا اور اس وقت مزاج کی شگفتگی دیدنی بہار پر ہوتی، واپسی پر نماز مغرب عموماً خود پڑھاتے لیکن اگر کوئی اور صاحب عبا و عمامہ موجود ہوتے تو انہیں کو امام بنا دیتے، خود نماز پڑھاتے تو اس نماز میں اور اس نماز میں جو وہ سنت یا نفل کی صورت میں تنہا پڑھتے تھے، بڑا فرق ہوتا، یعنی جب امام ہوتے تو قرأت مختصر اور ارکان نہایت معتدل ہوتے، مقتدیوں پر وہ نماز کبھی بار نہ ہوتی، لیکن جب تنہا پڑھتے تو ارکان طولانی ہوتے صحت ارکان کا یہ حال دیکھا ہے کہ کبھی سجدے سے وہ جانماز پر ہاتھ ٹیک کر نہ اٹھے، بس اگر صحیح نماز پڑھنی ہو تو شروانی صاحب کو نماز پڑھتے ہوے غور سے دیکھ لینا کافی ہے، مغرب کی نماز کے بعد وہ جانماز پر دیر تک بیٹھتے، پھر ایک لمبی دعا مانگتے، فجر کی نماز جماعت میں بھی یہی دیکھا کہ عموماً وہ سب مصلیوں کے بعد مسجد سے باہر آتے، مغرب کی نماز کے بعد حیدرآباد میں وہ ملاقات کے کمرہ میں بیٹھتے، ملاقاتی ہوتے تو ملاقات کرتے ورنہ اخبار دیکھتے، رات کا کھانا عشا کی نماز پڑھکر کھاتے، اس کے بعد مطالعہ شروع ہوتا، اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک ہوتا رہتا، انھیں اوقات میں کمیٹیوں کی شرکت، مدارس میں دینیات کے معاینے، تقریبات دعوتوں، تقریروں، وعظوں غرض ان سب ہی ضروریات کے لیے وقت نکال لیا جاتا،

لطیفہ | میں نے حیدرآباد میں اکثر دیکھا کہ مغرب کی نماز کی جس وقت شروانی صاحب امامت

کررہے ہوتے تھے تو اس وقت بعض بڑے عہدیدار جن کا عموماً سررشتۂ تعلیمات سے تعلق تھا، ان میں ایسے بھی تھے کہ ولایت مین انگریزی تعلیم پائی تھی، نہایت آسودہ اور بے غم مغرب کی جماعت مین شریک ہونے کے بجائے کرسیون پر بیٹھے سگریٹ پیتے رہتے تھے، ایک دن مین نے شروانی صاحب سے کہا کہ "آپ ان مسلمانون کو ہدایت کیون نہین فرماتے کہ نماز کا احترام کرین، اور جماعت مین شریک ہوا کرین"، اس پر شروانی صاحب نے مجھے یہ جواب دیا "منتظم صاحب، ان لوگون کو ابھی ٹھوکر نہین لگی ہے، ایک ٹھوکر مین یہ سیدھے ہو جائین گے کسی کی ہدایت کی ضرورت نہین"۔ اس کی تصدیق بہت جلد ہو گئی، یعنی چند ہی روز بعد مین نے ایک کو ایسا نمازی پایا کہ ریل مین بھی ان کی تسبیح اور جا نماز کا پورا اہتمام رہتا تھا، یہ ٹھوکر کھائے ہوئے تھے،

کثرت مشاغل شروانی صاحب کی تحریر دن کے حجم سے مجھ پر ہول طاری ہو جاتا تھا ہر ایک مثل وہ خود پڑھتے اور سب احکام اور تجویزین اپنے قلم سے لکھتے، امور مذہبی اور صدارت العالیہ کا کام انجام دینے کے ساتھ وہ عدالت العالیہ کے خاص اور اہم دیوانی کے مقدمات مین ججون کے افسر بنائے جاتے تھے، جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبون کے وہ رکن تھے، کتب خانۂ آصفیہ، دار العلوم نظامیہ شعبۂ تالیف و ترجمہ، دار الاشاعت، کتب درسی کا احتساب، مختلف مصنفین و مؤلفین کی تصنیفات و تالیفات پر اعلیٰ حضرت معظم کو ناقدانہ تحریری رائے کا بھیجنا، مدارس کے معائنے، دورے، امکنۂ مذہبی کی جانچ پڑتال وغیرہ، مذہبی جلسون مین وعظ، ادھر ہندوستان مین وقف کرنال، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی کے شعبون کی رکنیت، تعلیمی کانفرنس کی شرکت، صدارت کے خطبات، ندوۃ العلماء کے اہم امور مین عملی شرکت، اپنے عظیم الشان تعلقہ اور کتاب خانہ کی داشت و نگرانی، کثیر خط و کتابت، سلسلۂ تالیف، دیوانون تذکرون اور مثنویون پر مبسوط مقدمات لکھنا، مواعظ کے مستقل رسالے بنا دینا، رسالون مین مضامین لکھنا، اس کے ساتھ کتابون کا مستقل مطالعہ، گویا وقت کا ہر ہر لمحہ کام مین

لگا ہوا، اور ہمیشہ یہی دیکھا کہ وہ ایسا کام کرتے تھے جو کرنے کے لایق ہوتا تھا، نہ وہ کام جس کے کرنے کو جی چاہے، مطالعہ کا اندازہ کسی قدر اس سے ہو سکتا ہے کہ حبیب گنج کے کتاب خانہ سے مین نے بہت دفعہ کتابین لین، کھولین اور بہت سی پڑھین بھی، لیکن کوئی کتاب ایسی نہ ملی جس مین پنسل یا قلم سے شروانی صاحب کے مطالعہ صحت یا رائے وغیرہ کے نشانات نہ پائے ہون، ان کی معیت مین چھ سات سال کے دوران مین ہر سال حیدرآباد سے ہندوستان کو دو دفعہ آنا اور واپس جانا ہوتا تھا، اس طولانی سفر مین ان کا عزیز شغل مطالعہ رہتا تھا، روزانہ اخبار، ماہوار رسالے وغیرہ سبھی کچھ پڑھ لیتے تھے، کتب خانہ آصفیہ سے ان کے مطالعہ کے لیے کتب تاریخ، سیر اور تفسیر مین برابر منگاتا اور واپس کرتا تھا،

دیانت اور تقوی | حیدرآباد مین سرکاری کام مستثنی کرکے اپنے خانگی اور نجی کام مین شروانی صاحب نے کاغذ، روشنائی، قلم اپنے ذاتی استعمال کیے، خود ان کی ذات کا تو ذکر ہی کیا ہے، ان کی پیشی کے دفتر مین کسی اہل معاملہ کو کبھی یہ ہمت نہ ہو سکی کہ کسی ناجائز مطلب کے نکال لینے کے واسطے رشوت تو درکنار کوئی معمولی سوغات یا تحفہ پیش کر سکتا،

کسی بڑے امیر کی ایسی تقریب مین جہان رقص وسرود ہو شروانی صاحب کبھی شریک نہ ہوئے اور جہان ایسا احتمال ہوتا وہان دعوت دینے والے امیر سے بذریعہ تحریر پوچھا جاتا تھا کہ "کوئی ایسی ویسی تفریح تو نہین ہے"؟ چنانچہ جب حیدرآباد کے امرا کو یہ بات معلوم ہو گئی تو ایسی تقاریب مین جہان یہ خرافات ہونے کو ہوتے وہ شروانی صاحب کو مدعو ہی نہ کرتے تھے، ایسے ڈنر دن، دعوتون اور جلسون سے جہان کوٹ پتلون، لیڈیان، انگریز اور ہندوستانی نیم جنٹلمین جمع ہوتے شروانی صاحب کو عموماً پرہیز رہا، مین نے دیکھا ہے کہ جب کوئی "جنگ" یا "ملک" شروانی صاحب کی ملاقات کو آیا، تو سرکاری کام سے تو مجبوری تھی، مگر ان کو ایسی ملاقاتون سے وہ لطف نہ آتا تھا جو علماء سے ملاقات مین آیا کرتا تھا،

بزرگانِ دین یا ان کے مزارات کا احترام کوئی شروانی صاحب سے سیکھے، مین نے ان کو حبیب عیدروس صاحب کے حضور مین حاضر ہوتے بھی دیکھا ہے، اور گلبرگہ شریف مین حضرت باباگیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر اور بہاری شریف کے حضرت شاہ شرف الدینؒ اور حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے مزار پر خلدآباد شریف مین بھی شروانی صاحب کی مخصوص حالت دیکھی ہے، اچھی قوالی کا ان پر یہ اثر ہوتا کہ وہ قطعی ساکت ہوجاتے،

جمعہ کے دن کا خاص احترام ہوتا تھا، آج شروانی صاحب سرکاری کام کو ہاتھ نہ لگاتے، نمازِ جمعہ کی حیدرآباد مین خاص طریقہ سے تیاری کی جاتی، عمدہ لباس، عبا، عمامہ، عطر مین بسے ہوئے، اور اس پر شیروانی صاحب کا حسن صورت، بس کچھ نہ پوچھیے، حیدرآباد کی مکہ مسجد مین ہمیشہ جمعہ کی نماز پڑھتے پہلی صف مین امام سے پیچھے ان کی جگہ خالی رکھی جاتی، لیکن مین نے ہمیشہ دیکھا کہ اگر تین چار صفین بھر جانے پر وہ مسجد مین پہنچتے تو پھر مصلیوں کو جبر اور پھاند کر وہ اگلی صف مین کبھی اپنی خالی جگہ پر نہ جاتے بلکہ نہایت خاموشی سے کسی مناسب جگہ پر پیچھے ہی بیٹھ جاتے،

حیدرآباد مین مین نے ہمیشہ دیکھا کہ اپنی تنخواہ، جو دو ہزار تین سو روپیہ ماہوار تھی، شروانی صاحب نے کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھی، وہ روپیہ کی حقیقت سنگ ریزہ کی برابر سمجھتے، اکثر مقروض رہتے اور حبیب گنج سے برابر روپیہ منگاتے رہتے، کبھی وہ ایسے خالی ہاتھ ہوجاتے کہ مسافر، نومسلم، حاجتمند کی امداد کو اپنے خادم سے قرض لیتے، نیا کپڑا بنتے تو عموماً استعمالی پرانے، جو برائے گفتن پرانے کہے جاتے تقسیم کر دیے جاتے، یہ بات بھی مین نے اچھی طرح دیکھی ہے کہ ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے عالموں کے وہ سب سے بڑے قدردان تھے، اس گروہ کی وہ انتہائی عزت کرتے تھے،

لیکن ایک چیز کی شروانی صاحب کو مین نے ضرور ہوس یا حرص دیکھی، وہ چیز کتاب تھی، نادر، کمیاب پرانی قلمی یا مطبوعہ کتاب وہ کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑتے تھے، مجھے صحیح اندازہ نہین کہ کتابین جمع کرنے مین انھون نے کس قدر روپیہ صرف کیا، حبیب گنج کے اپنے کتاب خانہ مین ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا،

منتظم صاحب، یہ کتابین میری چالیس برس کی سعی کا نتیجہ ہین۔"

تمامی عمر مین شروانی صاحب نے صرف ایک عمارت بنائی ہے، وہ بھی ان کی نہین، خانۂ خدا ہے، حبیب گنج مین جاکر اس خانۂ خدا کی جلوہ ریزی دیکھو، خصوصاً جبکہ بھادون کی بھرن برس رہی ہو، اور کالی گھٹائین چڑھی ہون، یا طلوع آفتاب سے پہلے یا چاندنی رات مین،

رمضان المبارک مین شروانی صاحب اپنی کوٹھی کے احاطہ مین ہمیشہ بہترین حافظون سے دو قرآن مجید جماعت کے ساتھ سنتے، اور حافظون کو نہایت معقول نذرانے اور خلعت دیتے، جماعت مین ان سے بائین ہاتھ کو میری جگہ مقرر تھی، وہ عموماً عطر مین ایسے بسے ہوتے تھے کہ تیز حس کے عطر کی خوشبو سے جماعت مہک جاتی، اور کبھی مجھکو چھینکین آنے لگتین، یہی حالت افطار کے موقعون پر ہوتی، اور افطار کے جلسہ مین سب سے زیادہ بشاش وہی ہوتے، رمضان کا فریضہ وہ نہایت اہتمام اور خوشی سے ادا کرتے، وہ نہ تمبا کو کھاتے ہین نہ حقہ پیتے ہین،

ربیع الاول شریف مین مجالس عید میلاد شروع ہوتین، یہ سلسلہ ربیع الثانی تک حیدر آباد مین جاری رہتا اور جن پیمانون پر یہ مجالس ہوتین حیدر آباد کو یہ بات پہلے کبھی نصیب نہین ہوئی تھی شروانی صاحب ان جلسون کے صدر ہوتے، ان جلسون مین انھون نے نہایت معرکۃ الآرا وعظ کیے، اعلیٰحضرت بھی بعض جلسون مین شرکت فرماتے، شروانی صاحب ان ایام مین حیدر آباد کے مسلمون مین محبوب ترین ہستی تھے، ربیعین مین راتون کو تھیٹر اور سینما خانے عموماً مسلمانون سے خالی ہو جاتے، اسلام نے ایک عملی رنگ اختیار کر لیا تھا، بعض مجالس کے حالات مین نے منظوم کیے ہین، اور اکثر وعظون کے نوٹ میرے روزنامچہ ن مین محفوظ ہین،

حیدر آباد مین خدمات کا مختصر کارنامہ جن لوگون نے شروانی صاحب سے پہلے حیدر آباد کے محرم، رمضان، اور ربیعین وغیرہ دیکھے ہین اور حالات مذہبی پر نظر کی ہے، اب وہ اسی حیدر آباد کو شروانی صاحب کی صدالصدوری

کے زمانہ مین دیکھین اور دونون حالتون کا مقابلہ کرین اگر صدر المہام فینانس جو اب ایک مسلمان ہے، مسٹر گلانسی عیسائی انگریز سابق صدر المہام فینانس کی طرح مالی معاملات مین صیغۂ امور مذہبی کے ساتھ کشادہ دلی سے پیش آتا تو مین بڑے بڑے اسلامی رفاہ و ترقی کے واقعات دکھا دیتا، کیونکہ مین اسی امور مذہبی کے صیغہ کا سب سے بڑا سررشتہ دار تھا، اور ہر بات میرے ہی ہاتھون سے ہوتی تھی، لیکن پھر بھی اس گئی گزری مالی حالت مین شروانی صاحب نے جو کچھ کر دکھایا وہ نہایت اختصار کے ساتھ حسب ذیل ہے،

محرم کی بدعات شنیعہ یعنی مسلمانون کا شیر، ریچھ، بھیڑیے بننا، تاڑی سیندھی کے نشہ مین چور، ہجوم و ہنگامہ آرائیان اور بدمستیان کرنا، عورتون کی اس بدمستی مین بے حرمتی کر ڈالنا وغیرہ ایسی سب باتون کی ایسی جڑ کاٹ دی کہ پھر ان باتون کا عود کرنا قطعی ناممکن ہوگیا، تاڑی، اور سیندھی پیتے جانا، اور اسی حالت مین میلاد خوانی کرنا، وکھنی بھونڈی اردو مین نعت خوانی، بانی مجلس کا تاڑی اور سیندھی دیگران بدبخت میلاد خوانون کو رات بھر تنہا اپنے چھوڑ دینا اور خود گھر مین جاکر سو رہنا معدوم کر دیا گیا، یہ انتظام کیا گیا کہ ان میلاد خوانون کے طائفے صدارت العالیہ مین طلب کیے گئے، انکی جانچ کیگئی، اہل کو میلاد خوانی کی باضابطہ اجازت دیگئی، اور نا اہلون کو مکمل ممانعت کر دیگئی، سیندھی، تاڑی، شراب وغیرہ کی دکانین شہر پناہ سے باہر نکال دی گئین، اور شہر پناہ کے اندر مسکرات کا باہر سے لانا جرم قرار دیا گیا،

اہلیان خدمات شرعیہ کا جیسے قاضی وغیرہ احتساب ہوا، امتحان لیے جانے لگے، سندین دی گئین، ان کے لڑکے تکمیل تعلیم دین کے واسطے مدرسۂ نظامیہ حیدرآباد مین بھیجے اور دار الاقامہ مین رکھے گئے،

قاضیون کے دفتر از سر نو ترتیب دیے گئے، رویت ہلال کی صحت کا بڑی احتیاط کے ساتھ اہتمام کیا گیا، مسجدون مین تنخواہ دار امامون کی تعداد مین اضافہ کیا گیا، مؤذن، جاروب کش، جانمازون، برقی روشنی، پانی کے نلون، حوضون، طہارت خانون، غسل خانون، بڑی مسجد مین تنخواہ دار خطیبون وغیرہ کا اضافہ کیا گیا،

عیدگاہ میر عالم کی درستی اور توسیع ہوئی، جہان اب بیس بیس ہزار مصلیون کا عید کی نماز مین ہجوم ہونے لگا، اور اس عیدگاہ کو شروانی صاحب کی صدر الصدوری مین یہ فخر پہلی دفعہ نصیب ہوا کہ اعلحضرت نظام دکن میر عثمان علی خان بہادر خلد اللہ ملکہ نے عید کے دوگانے اسی عیدگاہ مین ادا کرنے شروع کیے، اور امرا

دارکین سلطنت عید کی نماز کو یہاں حاضر ہونے لگے، اضلاع میں دینی مدارس اور اصلاحی تبلیغی انجمنیں قائم کی گئیں، انگریزی مدرسوں میں دینی تعلیم کا خاص نگرانی کے ساتھ انتظام ہوا، واعظین مقرر کیے گئے، جو اضلاع کے دورے کرتے اور وعظ کہنے کو شہر مدراس تک بلائے جانے لگے، ہفتہ وار مذہبی رسالے جاری ہوئے، مدارس حفاظ قائم ہوئے، محکمۂ اوقاف کی تنظیم ہوئی، امکنۂ مذہبی سے متعلق اراضیات فائدہ کے ساتھ لوگوں کو دی گئیں یا نگرانی سرکار میں لی گئیں، مہتمم اوقاف و مساجد کے عہدے قائم کیے گئے، درگاہوں کی آمدنیاں خائن متولیوں سے نکالی گئیں، ماہ صیام میں چائے خانے، آبدار خانے اور ہوٹل دن میں بند کر دیے گئے، مسلمانوں میں ذبیحہ کی نگرانی کی گئی، حاجیوں کے قافلہ کا خاص انتظام کیا گیا اور سہولتیں بہم پہنچائی گئیں، غیر آباد مساجد بند کرکے بے حرمتی سے بچائی گئیں، مختصر یہ کہ شروانی صاحب کی صدر الصدوری میں مذہبی رنگ کچھ ایسا چڑھا کہ ولایت کے تعلیم یافتہ ہائی کورٹ کے جج اور حکیموں نے ججی کے فیصلوں اور مطب کے ساتھ ساتھ مجالس وعظ و میلاد میں خوب خوب تقریریں کیں،

شروانی صاحب نے ایسے نازک مذہبی جذبات و تعصبات کے زمانہ میں جیسا یہ زمانہ ہے تمام مذاہب کے انتظام کی باگ ایسے دانشمندانہ طریقہ سے ہاتھ میں لے کر کام کیا کہ ان کے خلاف کسی مذہبی گروہ کی آواز بلند نہ ہوئی، اور یہ ان کے عادلانہ انتظام کا کھلا ثبوت ہے،

عادت کی فلسفیت | مذہبی حسن عمل کے ساتھ شروانی صاحب کی عادت میں ایک خاص فلسفیت کا بھی مجھے تجربہ ہوا ہے، یعنی وہ دکھلاوے اور نمائش کے انسان نہیں، کسی فوری جذبہ سے ان میں تبدیلی نہیں ہوتی، اکثر باتیں وہ نہایت بے پروائی کی نظر سے دیکھتے تھے، نہ سب سے بڑی خوشی کے موقع پر وہ از خود رفتہ ہوتے نہ بڑے سے بڑے حادثہ یا نقصان پر وہ شکستہ دل اور مغلوب ہوتے تھے، اسی فلسفیانہ مزاج کی پرداز کا یہ نتیجہ تھا کہ سفر کے بڑے بڑے مصارف، جو میرے اہتمام سے ہوتے تھے، باورچی خانہ، روزمرہ کا دسترخوان، اور تمام حیدرآباد کے خانگی انتظاموں میں چیخ پکار، غصہ غضب، اعتراض اپنی

وجاہت کے اظہار، غرض ایسی کسی بات کا مین نے ان مین نشان تک نہ دیکھا، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مین ان کی ہر ادا پر عاشق ہون، ایک سطحی خیال کا آدمی تو یہ باتین دیکھکر کہے گا کہ "شروانی صاحب مین قوتِ انتظام نہین" لیکن ایک نگاہِ غائر دیکھے گی کہ ان تمامی باتون پر ایک اصل فلسفی کی طرح وہ توجہ نہین کرتے، اور ان کو قابلِ التفات نہین پاتے، اور شروانی صاحب کو سمجھنے کے لیے بڑی گہری مشاہدہ کرنے والی آنکھ کی ضرورت ہے، تعلیم اسلام ان مین کچھ ایسے عملی طریقہ سے پیوست ہوگئی ہے کہ جن معاملات کو ہم جیسے لوگ منجانب اللہ صرف زبانون سے کہنا سیکھتے ہین شروانی صاحب ان معاملات کے منجانب اللہ ہونے کا یقین رکھتے ہین،

قرونِ اولیٰ کے مسلمانون کو اگر آجکل کے بگڑے ہوئے لوگ دیکھتے تو ان کو (خاکم بدہن) احمق وخبطی کہتے، اور وہ برگزیدہ لوگ آجکل کے بندگانِ زر اور غلامانِ دنیا کو حیوانِ مطلق یقین کرتے،

حدیث شریف تو یہ تعلیم دیتی ہے کہ

خدمتگار کا قصور دن مین ستر بار معاف کرو، دولت وہ جمع کرتا ہے جس مین عقل نہین، سب سے بہتر وہ ہے جس کا برتاؤ اپنے گھر والون سے بہت اچھا ہو، بچون پر مہربان ہو، یتیمون کے سر پر ہاتھ پھیرو، بدزبانی نہ کرو، غصہ سے دور بھاگو، خوش خلقی مسلم کی سب سے اچھی صفت ہے، وغیرہ وغیرہ

جب اس معیار پر ہم شروانی صاحب کو جانچتے ہین، اور پورے چھ سال ایک عیب جو جاسوس کی طرح ان کو دیکھا، اور اپنے روزنامچون کی تین جلدین مین نے سیاہ کی ہین، لیکن مجبور ہون کہ فیصلہ شروانی صاحب کے حق مین دینا پڑا ہے، ہمارا روئے سخن ایسے مسلم رئیس کی طرف نہین ہے جو بات بات پر خدمتگارون یا ماتحتون کو اپنے زیر وتوبیخ، محاسبہ اور سخت گیری سے خائف و ترسان رکھتا، جرمانے کرتا یا برطرف کرکے اپنے ناچیز وجود کو ایک بڑی ہستی ظاہر کرتا، اور خود فریبی کے مرض مین مبتلا ہے، یا اپنی دولت کی بدولت اخلاقی معصیت کا شکار ہے، اور اس کا ہمسایہ اس کے شر اور درازدستی

سے امن مین نہین ہے،

راے کی مضبوطی اور جرأت اخلاقی

حیدر آباد مین مجھے یہ دیکھنے کا موقع ملا ہے کہ چاہے کتنی ہی خطیر و کثیر مالیت کا دیوانی کا مقدمہ ہو لیکن تجویز مین انھون نے پہلی دفعہ جو راے لکھ دی اس سے پھر نہ ہٹے اور ججون کے اصرار پر کہ ایک فقرے مین ذرا سی تغیر کر دی جائے کہ سب کی راے کا اتفاق ہو جائے شروانی صاحب نے یہی جواب دیا کہ "راے ایک دفعہ دیجاتی ہے، تجویز اعلحضرت معظم کے ملاحظہ مین بھیج دیجائے"، اور اپنی راے مین جو پہلی دفعہ لکھ دی تھی ذرا بھی تغیر و تبدیل نہ کی، ایسا تار حبیب گنج سے حیدر آباد کے ججون کو حسب الحکم مین نے خود دیا تھا، اخلاقی جرأت کا یہ حال دیکھا ہے کہ سات لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا مقدمہ ہے، فریقین مین ایک طرف تو اعلحضرت معظم کے خاص اسٹاف کا بڑا حضوری افسر ہے، اور دوسری طرف ایک ناچار بیوہ ہے، یہ مقدمہ پہلے اس بڑے درباری کے حق مین اس طرح فیصل ہو چکا ہے کہ بیس مفتی علما بیوہ کے خلاف فتاوی لکھ چکے ہین، درباری افسر کو ڈگری مل چکی ہے، لیکن اب وہ پرانی اور بھاری مثل اعلحضرت آخری توثیق کی غرض سے شروانی صاحب کو بھیجتے ہین، شروانی صاحب تجویز لکھتے ہین، اور بصیغۂ اشد راز وہ تجویز مجھے دی جاتی ہے مین اسے صاف کرتا ہون اور تجویز پر شروانی صاحب کے دستخط لیکر سر بمہر لفافہ مین یہ تجویز مع مثل کے اعلحضرت معظم کو بھیجدیتا ہون، تجویز یہ لکھی گئی ہے کہ بیسون فتاوی پر جو اسٹاف افسر کے موافق مفتیون نے لکھے تھے، مدلل تردید کا قلم پھیر دیا جاتا ہے، اسٹاف افسر ہرایا جاتا ہے، بیوہ کے حق مین ڈگری دیجاتی ہے، نہ بیس فتاوی کا لحاظ فرمایا جاتا ہے، نہ اسٹاف افسر کی وجاہت و مروت راہ انصاف مین حائل ہوتی ہے، نہ اسٹاف افسر کا خوف ہے کہ دربار سلطانی کا ہر وقت کا حاضر باش ہے آخر فقرہ اس تجویز کا یہ تھا "شرعی حکم تو یہ ہے، آیندہ اختیار سلطانی"۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اعلحضرت نے اسی تجویز پر عمل فرمایا، جو شروانی صاحب نے دی تھی، گذارش یہ ہے کہ بیس فتاوی کی تردید کسی معمولی فقیہ کا

کاکام نہین، نہ ایک ہندوستانی دربار مین ایسی جرأت اخلاقی آسان ہے،

جب کسی کی سرکار عالی مین شروانی صاحب نے سفارش کی تو اپنی صائب رائے سے استحقاق کو ایسا ملحوظ رکھا کہ وہ سفارش کبھی نامنظور نہ ہوئی، ہان، ایک دو مثالون مین ایسا ضرور ہوا کہ شروانی صاحب نے مثلاً تیس روپیہ ماہوار کی سفارش کی تو اعلیحضرت معظم نے تیس کو پچاس فرمادیا لیکن تیس کو پچیس یا بیس کبھی نہین کیا

کیسی ہی بڑی سفارش کے ساتھ کیسی ہی رایون یا تقریظون سے آراستہ کوئی تالیف و تصنیف قلمی شروانی صاحب کے پاس آئے جس کے متعلق مؤلف یا مصنف کو سرکار عالی کی سرپرستی، انعام یا وظیفہ کی بڑی توقع ہو لیکن وہ کتاب ناقص ہو، تو شروانی صاحب کبھی تو ایسا کرتے کہ اس پر رائے لکھتے ہی نہ تھے، انکار کر دیتے تھے، لیکن اگر لکھتے تو اس کتاب کے نقص نکال کر دکھا دیتے تھے، اور سفارشون یا تقریظون کا مطلق لحاظ نہ کرتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سب سے زیادہ لایق عالم تقریظ نگار کو بلاکر وہ کتاب اس کے سامنے رکھ دیتے اور پوچھتے تھے کہ ایسی ناقص کتاب پر یہ تقریظ اس نے کس طرح لکھی اور تقریظ نگار کو معذرت کرنی پڑتی، کہ مؤلف کتاب نے اس کو جان سے تنگ کر دیا تھا،

درت کی صنعت کاری کا اثر | اس عنوان مین سب سے پہلے یہ دکھانا ہے کہ کوئی عمدہ شعر ہو شروانی صاحب پر وجدانی حالت طاری کر دیتا تھا، یہ کلیہ یاد رکھنے کا ہے کہ حساس دل پر شعر کا اثر ہوتا ہے، اور ایسا ہی دل اخلاقِ حسَن کا گنجینہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے،

شعر سے یعنی نہ جس بے حس کو لذت آئے ہی / اس سے اخلاقِ حسَن کی کیا توقع کیجیے،

شعر بھی نیچر کی سحر کاریون مین سے ایک سحر کاری ہے، اسی شاعرانہ طبیعت کا انسان تیز محسوسات رکھتا ہے، پھر عیب و ہنر، نیکی بدی، جھوٹ سچ سب ہی باتون کا اسے احساس ہوتا ہے، حسن و قبح سے وہ متاثر یا متنفر ہوتا ہے، کسی بے حس دل کو پتھر کا ٹول سمجھو اور ایسے دل والے سے کوئی توقع نہ رکھو

یہ بے حسی ہی تو ہے جو آدمی کو کنجوس، فریب کار، بے حیا، سنگدل، کذاب، ریاکار، نمائشی یا ابن الوقت بنا دیتی ہے، خودداری اس سے معدوم کر دیتی، اور صرف جاہ طلبی اس کا نصب العین بنا دیتی ہے،

چنانچہ فطرت کی صنعت کاری کا اثر جو میں نے خود شروانی صاحب پر دیکھا ہے یہ ہے کہ وہ بھونگیر کے دورے میں جاتے ہیں، میں ساتھ ہوں، بھونگیر کے آسمانی قلعہ پر جو صرف ایک پتھر کی چٹان پر کسی پرانے زمانہ میں تعمیر کیا گیا تھا صرف تفریح اور تاریخی تحقیقات کی غرض سے پہنچنے کو، اس رفیع الشان چٹان پر ہم چڑھنا شروع کرتے ہیں، راہ میں ٹھہرتے اور دم لیتے جاتے ہیں، آخر میں جب ہم بڑی بلندی پر پہنچتے ہیں شروانی صاحب چٹان کے ایک شگاف میں پانی بھرا پاتے ہیں جس میں نیلو فر کے صرف دو پھول کھلے ہوئے ہیں، یہ پھول دیکھتے ہی شروانی صاحب پر عجیب حالت طاری ہو جاتی ہے، وہ اس بلندی، پہاڑی کی خشکی، پھر یہاں پانی، پانی میں نیلو فر، نیلو فر کی شادابی پر حیرت میں ڈوب جاتے ہیں، ان کا برقی خیال صانع حقیقی کی قدرت اور صنعت کی طرف جا پہنچتا ہے، وہ اس مقام پر ٹھہر جاتے اور اسی مبحث پر عجیب مؤثر پیرایہ میں گفتگو کرتے ہیں،

حبیب گنج کے اپنے بے نظیر باغ کے چمن میں وہ ٹہل رہے ہیں، جنوری کا مہینہ ہے، گلاب ایسا کھلا ہوا ہے، کہ چمن میں گویا آگ لگ رہی ہے، بس وہ کسی شاداب پھول، اس کے گہرے، ہلکے رنگوں اور اس کی نزاکت پر غور کرتے، اور صانع حقیقی کے کمال اور قدرت کے خیال میں غرق ہو جاتے ہیں، پھر مجھکو ایک ایک باریکی اور مصور قدرت کی قلم کاری سمجھاتے ہیں، اور اسی حال میں میں سودا کا یہ شعر پڑھتا ہوں ؎

رنگ گل بے طرح دہکے ہے، سن لے ابر بہار
آشیاں میرا چھڑک، لگتی ہے اب گلشن کو آگ

چمن کے قطعی حسب حال یہ شعر سنکر ان کا دل ایک اضطراری ولولے سے بھر جاتا ہے، کسی سایہ دار درخت، کسی پتے، کسی پھل میں بس فوراً صانع حقیقی کی قدرت گویا شروانی صاحب پڑھنے لگتے تھے،

ہم کو سرسون کے وسیع کھیتون کے کنارے بھی کھڑے ہونے کا اتفاق ہوا ہے، جہان تک نظر جاتی ہے زرد پھولون کا ایک زعفران زار ہے، نظر لوٹی جاتی ہے، لیکن سب سے زیادہ روحانی لذت اس سے شروانی صاحب ہی کو ہوتی ہے، کیونکہ جمال مین وہ جمال آرا کا مشاہدہ فرما رہے ہین،

حیدرآباد کی کوٹھی امید منزل کے احاطہ مین عزیزی عبدالوحید خان نے چھرے سے ایک دفعہ ایک چڑیا مار دی، ایسی حسین چڑیا ادھر شمالی ہندوستان مین نہین ہوتی، اس شہید بے گناہ کو شروانی صاحب نے دیکھا، اور انھون نے ایک عجیب انداز سے فرمایا" وحید! کس دل سے تم نے اسے مارا، کیا اس کا حسن بھی اس کا سفارشی نہوا، کس قدر تاسف کا مقام ہے کہ قدرت کا یہ حسین نقشہ کوئی یون مٹا دے"

یہ ذرا ذرا سی باتین ہین جو نہ اب عبدالوحید خان کو یاد رہی ہون گی، نہ شروانی صاحب کو خیال رہا ہوگا، لیکن میرا جاسوس روزنامچہ اس حسین چڑیا کی شہادت پر ہمیشہ مرثیہ خوان رہے گا، اور شروانی صاحب کی رقیق القلبی پر گواہی دے گا، مختصر یہ کہ مین نے شروانی صاحب مین ایسی ایسی پاک صفتین دیکھی ہین کہ جنکی غالبًا ان کو خود خبر نہین، اور اگر اپنے روزنامچون سے ان کی پوری تفصیل کرون تو یہ اعتراف ایک بڑی کتاب بنجائے گا،

اور تو اور شروانی صاحب کا طریقۂ تعلیم خیرات تو دیکھو کر غریب بچون کو حبیب گنج کی گڑھی مین وہ خود اپنے ہاتھ سے پیسے نہین بانٹتے بلکہ اپنے چار برس کی عمر کے پوتے سے یہ پیسے بٹواتے ہین یعنی پوتے کو خیرات دینے کی تعلیم گہوارے مین دیجاتی ہے، مرحبا۔

نمود و نمائش سے نفرت اور عام اخلاق شروانی صاحب کو رواجی شہرت کی نہ آرزو ہے نہ جستجو، اس کی کثرت سے مثالین مین نے دیکھی ہین، یعنی جب بڑے صاحبزادے آنریبل محمد عبیدالرحمن خان سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی ہوئی تو یہ شادی بڑے اونچے پیمانہ پر ہوئی تھی، لیکن کسی انگریز کو دعوت یا گارڈن پارٹی مین مین نے نہ دیکھا، شمس العلما کا خطاب انھون نے نہ لیا، اور سرکاری تجویز ابتدا ہی مین نامنظور

کردی، سرکار آصفیہ کے خطاب "نواب صدر یار جنگ" کی انھون نے اس لیے قدر کی کہ اسلامی سرکار سے اس کا واسطہ تھا، اور مذہبی نقطۂ نظر اس موقع پر ملحوظ تھا، حقیقی شہرت کا صحیح مفہوم وہ سمجھتے ہین احسان کرکے نہ احسان جتاتے ہین نہ محسن کے سے کبھی تیور اختیار کرتے ہین، تعلیم اسلام کا ان پر گہرا عملی رنگ چڑھا ہوا ہے، کتب سیر، اور احادیث مین شمائل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انھون نے بیکار مطالعہ نہین کیا ہے، صرف ادائے فرض اور مخلوق کے ساتھ بھلائی ان کی زندگی کا مقصد ہے جس مین ریا اور نمایش کو دخل نہین اور اس زمانہ مین سب سے بڑی اور سچی یہی تعریف ہے جو کسی کی جاسکتی ہے، ان کی نیکیون مین ایسی قوت ہے کہ "اہل" ہم نشین پر اپنا رنگ چڑھا دیتی ہین اور یہ بات شروانی صاحب کے اخلاص اور صداقت کا بین ثبوت ہے،

آخر مین یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ شروانی صاحب بھی صرف ایک انسان ہین، فرشتہ نہین، دنیا مین جتنی بڑی ہستی کا انسان ہوتا ہے، اسی قدر اس کی طرف نگاہین اٹھتی ہین اور اس گروہ مین ایک بھی انسان ایسا ہم کو تاریخ مین نہین ملتا جس کو سب نے اچھا کہا ہو، اچھے انسان کی یہ پہچان ہے کہ اسے صاحب تمیز، انصاف کی اہلیت رکھنے والے، اور بے غرض، لوگ اچھا کہین، انسان کسی دوسرے انسان کو اکثر اپنے ذاتی جذبات یا اغراض کی عینک سے بھی دیکھا کرتا ہے، اور کبھی اغراض، رشک وحسد یا خود اپنے نفس کی خباثت سے یہ عینک غبار آلود ہو جاتی ہے، جس سے نورانی چیزین صاف نظر نہین آتین بلکہ دھندھلی اور گرد آلود نظر آتی ہین، پس خطا نورانی چیزون کی نہین ہوتی، تقصیر غباری عینک کی ہوتی ہے، چنانچہ اس اعتراف مین جس پہلو کی شروانی صاحب کی تصویر نہایت دیانت وراستی سے دکھائی گئی ہے، وہ ناظرین کے سامنے ہے، اس تصویر کو دیکھتے ہوئے اب ناظرین دوسرے دولت والے امیر، کبیر مسلمانون سے جن سے ناظرین اچھی طرح واقف ہون شیروانی صاحب کا مقابلہ کرین اور اگر یہ مقابلہ وموازنہ کرنے والے انصاف

فرمائین گے، تو ضرور ایک سبق آموز نتیجہ پر انشاء اللہ تعالیٰ پہنچ جائین گے،

آخر مین نازک خیالون سے میری یہ گزارش ہے کہ مین نہایت تنہائی پسند اور قریب قریب وحشی انسان واقع ہوا ہون، امراء کے پاس حاضر ہونے کو بہتیرے عقلمند موجب فخر یقین کرتے ہین، لیکن مین امراء سے بہت ڈرتا ہون، شروانی صاحب میری یہ عادت اچھی طرح جانتے ہین، میری سادہ لیکن نہایت مصروف زندگی انھون نے خوب دیکھی ہی، صرف ادائے فرض کو مین نے خوشامد کا قائم مقام یقین کیا ہے، لیکن اس بیگانہ روش پر شروانی صاحب نے مجھ پر بڑی بڑی مہربانیان فرمائی ہین پس یہ اعتراف صرف دو وجوہ سے مین نے لکھا ہے کہ کچھ تو ادائے شکر گزاری کا فرض پورا ہو جائے اور دوسرے ناظرین یہ دیکھین کہ بڑے نفس و علم اور مرتبہ اور دولت کا اصل مسلم کیسا ہوتا ہے، امراء کو مین اپنی طرح عاجز اور درماندہ سمجھتا ہون جنکو میری ہی طرح بھوک پیاس لگتی ہے، اور میری طرح ان کے درد سر بھی ہو سکتا ہے، اور یہ مین نے شروانی صاحب سے سیکھا ہے جنھون نے حیدرآباد کی ایک عظیم الشان مجلس مین اپنی تقریر کے درمیان فرمایا تھا "صاحبو! اپنے نفس سے محاسبہ کرنے کی عادت ڈالو، یہی تم کو بتلائے گا کہ تم جس قدر بڑا اپنے تئین خیال کرتے ہو اسی قدر زیادہ تم درماندہ، عاجز اور محتاج ہو، یہی عادت آدمی کو انسان بناتی ہے، اور یہی اسلام کی تعلیم ہے"

دار المصنفین کی نئی کتاب

امام رازی

امام فخر الدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضا تھا کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے، اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس مین ان کے سوانح و حالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ فلسفہ و علم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق انکے نظریات و خیالات کی تشریح کیگئی ہی، جو لوگ قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور و فکر کرنا چاہتے ہین ان کیلئے یہ کتاب مشعل ہدایت کا کام دیسکتی ہے

(مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی) قیمت: ۶ر

"منیجر"

مولانا شروانی کی تصویر اُن کی تحریر کے آئینہ میں

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم ہماری پرانی تعلیم و تہذیب کے اُن نمونوں میں تھے جن کی مثال اب نہ ملے گی، اُن میں علم و عمل دین و تقویٰ اخلاق و شرافت وقار و متانت وغیرہ قدیم تعلیم و تہذیب کی تمام خوبیاں اور وضعداریاں جمع تھیں،

وہ صاحب علم، علم دوست، علماء نواز اور علم و فن کے بڑے قدر دان اور سرپرست تھے، ان کی ساری زندگی علمی و تعلیمی خدمات و مشاغل میں گذری، سرسید کے زمانہ سے لے کر موجودہ دور تک وہ مسلمانوں کی تمام مفید علمی، تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں کے حامی و مددگار رہے، کوئی اسلامی ادارہ ان کی عملی و اخلاقی امداد سے محروم نہ تھا، اسلامی علوم و فنون اور مسلمانوں کی علمی تاریخ اور قدیم تہذیب سے اُن کو عشق تھا، ان سب کی تفصیل نہ ایک مضمون میں سما سکتی ہے، اور نہ ہمارا مقصود ہے، یہ مرحوم کے ان رفقاء اور معاصرین کا کام ہے جن کو ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، راقم کو صرف دو چار مرتبہ مختصر ملاقات کا موقع ملا ہے، اس لئے وہ اس پر کچھ بھی نہیں لکھ سکتا، البتہ مرحوم کی تصانیف اور تحریریں برابر نظر سے گذرتی رہیں جن میں اُن کے بہت سے خیالات و رجحانات اور خصوصیات کی جھلک نظر آتی ہے، اس مضمون میں اسی آئینہ میں اُن کی تصویر دکھانے کی کوشش کی جائے گی،

مسلمانوں کی دینی اور قدیم تعلیم سے دلچسپی

مرحوم پرانی تعلیم کی یادگار اور عالم باعمل تھے، اس لئے عربی اور دینی تعلیم سے

اُن کو بڑی دلچسپی تھی، اور انھون نے علمی و عملی دونون حیثیتون سے اُس کی خدمت کی، وہ شروع سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معاون و مددگار رہے، انجمن ترقی عربی الہ آباد کے سرپرست، اور دوسرے عربی مدارس کے ہمدرد و ہوا خواہ تھے، مسلمانون کی قدیم تعلیم اور اُس کے نصب العین پر ایک رسالہ لکھا ہے، جس مین مذہبی نقطۂ نظر سے تعلیم کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے، یہ رسالہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے،

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اجلاس مدراس کے خطبۂ صدارت مین دینی تعلیم کے متعلق یہ خیالات ظاہر کئے ہین

"ہمارے علماء کی یہ شان رہی ہے، کہ انھون نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا، علوم دینیہ سے انھون نے خدا اور رسول کی خوشنودی مقصود رکھی، علوم دینویہ (جس کو بہت کم ذریعۂ جاہ و حشمت بنایا) اس کی خدمت بھی بحیثیت علم کرتے رہے، یہ واقعہ زرین تاریخ کا کارنامہ ہے کہ جب بغداد مین مدرسۂ نظامیہ قائم ہوا، اور وہان علماء کے گران قدر مشاہرے اور طلبہ کے بیش قرار وظائف اور سامان آسائش مہیا کئے گئے، تو علمائے بخارا نے علم کی مجلس ماتم منعقد کی اور رو کر کہا کہ اب علم علم کے لئے نہین بلکہ جاہ و حشمت کے لئے حاصل کیا جائے گا"

(مقالات شیروانی ص ۲۰۴)

مسلمان علماء کے حالات مین علمائے سلف اور نابینا علماء دو کتابین لکھین، اول الذکر مین علمائے سلف کے دینی، تعلیمی اور اخلاقی و معاشی حالات و واقعات تحریر کئے ہین جس کا اندازہ حسب ذیل عنوانون سے ہوگا، طلب علم، افلاس و تنگدستی، دشواریان، سفر کی مشقتین، کتابون کی نقل و کتابت، توجہ کامل، ذوق و شوق طلب، حفظ و استحضار علمی، علم کی حرص، اس کی راہ مین صرف، مسلمانان سلف کا علمی ذوق، امراء مین علم کا ذوق،

اختلاف و اتفاق تمہید (جس مین یہ ذکر ہے کہ مذہبی نزاع کو سلف صالحین کیسا سمجھتے تھے) اختلاف رائے صحابہ کے زمانہ مین، علمائے اہل سنت و جماعت کا برتاؤ، مخالف عقیدہ کے علماء کے ساتھ مختلف مذہب کے علمائے اہل سنت کا آپس مین برتاؤ، جب نزاع کا دروازہ کھل گیا، تو خود علمائے اہل سنت

وجماعت باہم کس طرح مخالف ہو گئے،

حق پسندی و راست گوئی، حق پسندی حکام کے مقابلہ مین، معاصرین وہمچشمون کے مقابلہ مین، اپنے نفس کے مقابلہ مین،

حسن معاشرت کسب معاش، تجارت، حرفت، تمول، علمار کے تعلقات، سلاطین کے ساتھ اور ان کا اثر سلاطین پر، ملک پر، مخالف فرقون کی محبت علمار کے ساتھ، غیر مذہب کے لوگون کی محبت علمار کیساتھ علمار کی معاشرت کے بعض اور حالات لباس، جسمانی ریاضت، اپنا کام خود کرنا،

ان عنوانات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب مین قدیم تعلیم کے تمام اہم اور ضروری پہلوؤن علما کی حیثیت، ان کے فرائض و ذمہ داریون اور ان کے اصلاح طلب امور کی پوری تفصیل آگئی ہے،

تعلیم جدید مین دینی روح کی ضرورت مرحوم زمانہ کے حالات وضروریات کے پیش نظر جدید تعلیم کے بھی حامی تھے اور ابتدا سے علی گڑھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کے معاون و مددگار اور اس کے رکن رہے، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری تھے، کچھ دنون تک جامعۂ عثمانیہ کے وائس چانسلر بھی رہے، لیکن اُن کا دینی جذبہ جدید تعلیم مین بھی مذہبی روح دیکھنا چاہتا تھا، اس لئے وہ سرسید احمد خان کی تعلیمی واصلاحی کوششون کے معترف ومداح اور ان کے معاون ومددگار رہے، لیکن اُن کے مذہبی خیالات سے اُن کو سخت اختلاف تھا، اور علی گڑھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کی مذہبی حالت سے وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہے، اس کا ثبوت ان کی مختلف تقریرون اور تحریرون سے ملتا ہے، حیات جاوید کے ریویو مین اس کی پوری تفصیل موجود ہے، اس مین انھون نے سرسید احمد خان کے مذہبی خیالات کے متعلق اپنے اختلافات تفصیل سے ظاہر کئے ہین، (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقالات شروانی ص ۸۰)

اسی ریویو مین کالج مین مذہبی تعلیم کی جانب سے بے توجہی پر بھی اظہار تاسف کیا ہے مولانا حالی نے حیات جاوید مین یہ بھی تحریر کیا ہے کہ کالج مین مذہبی تعلیم کا بڑا اہتمام تھا، مولانا شروانی اس اہتمام کے لفظا

پر تحریر فرماتے ہین،

"جو حالت مذہبی تعلیم کی کالج مین عہدِ سرسید مین رہی، مین نہین سمجھتا کہ اس پر اہتمام کا لفظ کس طرح صادق آسکتا ہے،...... افسوس ہے کہ سرسید کے عہد ٹرسٹی شپ اور مسٹر بیک کی پرنسپلی کے زمانہ مین کالج مین جو چیز سب سے زیادہ غیر مستحق باشان تھی، وہ مذہبی تعلیم تھی، بجائے اس کے کہ اس کی تربیت سے مذہب کی خدمت ذہن نشین ہوتی، اور وہ ایک عمدہ پالیسی کے پیرایہ مین دماغون مین جاگزین ہوتا، ہماری سمجھ مین نہین آتا، کہ کالج کی جس مذہبی تعلیم کو سراہا جاتا ہے، وہ کیا چیز تھی، سرسید تحریر و تقریر مین ہمیشہ مذہب کے سرگرم حامی رہے لیکن عالمِ عمل مین آئے تو معلوم نہین ہوتا کہ وہ مذہب کیا تھا جس کے وہ حامی تھے"

(مقالات شروانی صفحہ)

نان کوآپریشن کے زمانہ مین ٹرسٹیون کے ایک جلسہ مین کالج کے طلبہ کی مذہبی لاپروائی پر ان الفاظ مین تاسف کا اظہار کیا ہے،

"حضرات مین علی گڈھ اس خوشی کے خیال کیساتھ آیا تھا کہ حالیہ تحریک (نان کوآپریشن) کے اثر سے کالج کے طلبہ مین مذہب کا جلوہ دیکھون گا جس کی تمنا برسون سے دل مین تھی، اور باوجود گوناگون کوششون کے اب تک حاصل نہ ہوسکا لیکن حالات دیکھ کر مایوسی ہوئی،...... رات مین نے عشا کی نماز کالج کی مسجد مین جماعت کے ساتھ پڑھی میرا خیال تھا کہ اب جب کہ مذہبی روح طلبہ مین سرایت کر چکی ہے، (نان کوآپریشن کے اثرات مراد ہین) تو ایک دیرینہ آرزو پوری ہو گی، اور کم از کم ایک پوری صف مین طلبہ کو دیکھون گا" مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی،

حضرات! اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور جب تک دین قائم ہے، اسلام بھی قائم رہے گا، وہ زندگانی کا ایک خاص قانون لایا ہے جس کی پابندی علی العموم ہر مسلمان پر واجب ہے"، (مقالات شروانی ص ۲۱۹ و ۲۲۰)

مسلم یونیورسٹی مین اسلامی آرٹ کے سلسلہ مین ایک تحریر مین لکھتے ہین،

"اسلامی آرٹ کا مفہوم تفصیل طلب ہی، سب سے بڑا اسلامی آرٹ وہ حسین زندگی ہے، جو عالم انسانی مین خالقِ جمیل کے جمالِ کامل کے پرتو سے جلوہ فرما ہوئی، اسلام ہی نے مخلوق کو بلا واسطہ خالق کے سامنے بٹھا کر یہ حُسن زیبائی پیدا کی، حبیب کبریا، روحی فداہ کی حیات حسن و جمال سے لبریز ہے، اور اسلامی آرٹ کا اشرف و اعلیٰ نمونہ اس کے بعد قرآن مجید اور خالص اسلامی علوم ہین، پھر اسلامی تاریخ ہے، جو دلون پر تصرف و فرمانروائی کی دلکش مثالون سے معمور ہے، ..... اس کے بعد شاعری ہے، پھر عمارت و صنعت ہے پھر خطاطی، سب سے آخر مین مصوّری چونکہ تصویر بنانا شرعًا ممنوع ہے، اس لئے کم طبیعتین اس کی جانب مائل ہوئین، مگر اہل کمال نے حرفون کے نقوش مین عالم تصویر دکھایا، ایک استاد کا قطعہ ایک ہنر بین کی نگاہ مین وہی ذوق بخشتا ہے، جو ایک کامل مصوّر کی تصویر" (مقالات شروانی ص ۲۵۳)

اُن کی دوسری تقریرون اور تحریرون مین بھی اس قسم کے خیالات بکثرت ملتے ہین، لیکن ہمارا مقصد صرف ہر پہلو کی جھلک دکھانا ہے، اس لئے تفصیل مین نہ پڑین گے،

مسلمانون کی علمی تاریخ اور اسلامی علوم وفنون سے ذوق و شغف

اسلامی علوم وفنون، اور مسلمانون کی علمی تاریخ سے والہانہ شیفتگی تھی، اور اُس پر انکی نگاہ نہایت وسیع تھی، اُن کی کوئی تقریر و تحریر مشکل ہی سے اس تذکرہ سے خالی ہوتی تھی، ندوۃ العلماء کے اجلاسِ مدراس کے خطبۂ صدارت مین مسلمانون کی علمی تاریخ پر مختصر اور جامع تبصرہ ہے، فرماتے ہین :-

"اسلام جس سرعت و قوت سے پھیلا، اسی سرعت و قوت سے علم کا شوق مسلمانون کے دلون مین ترقی کرتا گیا، پہلی صدی ہجری مین ممالکِ اسلامیہ دار العلوم بن گئے، اس مین کسی قوم یا رنگ کی خصوصیت نہ تھی، تابعین ہی کے طبقہ مین عرب کی جگہ عجمیون نے لے لی تھی، امام مکحول، عکرمہ، امام ابو حنیفہ وغیرہ ائمہ جلیل القدر عجمی تھے، حدیث مین ارشاد ہے، الحکمۃ ضالۃ المومن حیث وجدھا اخذھا" اس گم شدہ

کی تلاش مین مسلمانون نے دنیا کا کوئی گوشہ نہین چھوڑا، جہان سے خزانۂ علم حاصل نہ کیا ہو، کوئی علمی زبان نہین چھوڑی جس کا سرمایہ عربی مین منتقل نہ کیا ہو ..... جن ممالک مین مسلمان گئے علم اور علم کا شوق ساتھ لیتے گئے، حجاز، شام، یمن، عراق، ماوراء النہر، ایران، خراسان، کابل، ترکی، مصر، تونس، مراکو، اندلس، چین، صقلیہ اور بحر روم کے دوسرے جزائر، جاوا وغیرہ، شرق الہند کے جزائر، ہندوستان، غرض وہ کون ملک تھا، جہان مسلمان گئے، اور وہ دار العلوم نہ بن گیا، اُن کے شہر اور قصبے در کنار گاؤن تک مرکز علوم بن گئے، مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، بغداد، اصفہان، نیشاپور، ہرات، طوس، دہلی، لکھنؤ، قیروان، قرطبہ، قاہرہ، قونیہ، بیت المقدس، بخارا، سطح ارض پر کہان کہان بکھرے ہوئے ہین، لیکن ان مین سے جس مقام پر جاکر گوش عبرت سے سنئے گا، ذرہ ذرہ کی زبان پر علوم اسلامیہ کا تذکرہ پائے گا، (مقالات شیروانی ص ۲۰۱)

یہ اس خطبہ کا ایک اقتباس ہے، خطبہ مین اس اجمال کی تفصیل پر نظر ڈالی گئی ہے، اُن کی بعض تصانیف اور بیشتر مضامین اسلامی علوم کی تاریخ سے متعلق ہین، خود علمائے سلف سے اسلامی فنون کی تاریخ کے بہت سے گوشون پر روشنی پڑتی ہے،

مسلمانون کی علمی دولت کی بربادی کا ماتم

ہندوستان مین مسلمانون کی حکومت کے زوال کے ساتھ، اُن کے علم، دولت، اور اعمال و اخلاق پر بھی زوال طاری ہوگیا تھا، اور نا اہل اخلاف کے ہاتھون اسلاف کرام کا علمی خزانہ بھی تلف ہونے لگا تھا، ہزارون بیش بہا قلمی، و نادر کتابین کوڑیون کے مول بک کر یورپ پہنچ گئین، جو کچھ بچا کھچا سرمایہ باقی رہ گیا تھا، سر سید احمد خان نے اس کے تحفظ کی جانب توجہ کی تھی، چنانچہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد مین نادر قلمی کتابون کی تلاش اور اُن کی حفاظت بھی تھی، لیکن اس پر عمل نہ ہوسکا، کانفرنس کی باگ جب مولانا شروانی مرحوم کے ہاتھون مین آئی، تو انھون نے دوبارہ اُس کی جانب توجہ کی، اور ۱۹۱۵ء مین قلمی کتابون کی حفاظت کے علمی خزانون کی بربادی کے عنوان سے ایک دردانگیز اپیل شائع کی، یہ اپیل بہت طویل ہے، اس کے بعض اقتباسات یہ ہین،

ہندوستان مین سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور بربادی کے ساتھ ساتھ جہان مسلمانون کی دولت اور ثروت کا خاتمہ شروع ہوا، اُن کی جاگیرین، زمینداری اور علاقے برباد ہوئے، اُن کی اخلاقی اور دماغی قوتین بھی فنا ہونا شروع ہوئین، اسی کے ساتھ ساتھ علم وفضل اور تحصیل علوم کا سرمایہ یعنی بیش بہا کتاب خانے جو جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی تھے، تباہ ہونا شروع ہوئے،

جو اسلاف مسندِ علم کی زینت دینے والے تھے، اُن کے اخلاف اور قائم مقام ایسے ہوئے جنھون نے ان انمول موتیون کی سنگریزون کے برابر بھی قدر نہ کی، غدر ۱۸۵۷ء کے واقعہ کو ابھی پون صدی بھی نہین گذری اہلِ بصیرت کو اس کا علم ہے کہ اس زمانہ مین شہر تو شہر صدہا قصبے بھی ایسے تھے، جہان یہ علمی سرمایہ بہت کچھ موجود تھا، دلی، لکھنؤ، لاہور، پٹنہ، آگرہ، سورت، احمدآباد، بنارس، بلگرام، کاکوری، پانی پت، مارہرہ، امروہہ، اور مثل ان کے بہت سے مقامات تو گویا اس بازار علم وعمل کے بسا ور تھے جس مین متاعِ حدیث، فقہ، تفسیر، منطق، معانی، تاریخ، طب، حکمت وفلسفہ، اور عربی وفارسی ادب کی کتابین، نامی شعراء کے دواوین، قلمی بے بہا نسخون، مشہور خطاطی کے اُستادون کے قطعات اور قلمی مرقعون کی شکل مین انبار کے انبار نظر آتے تھے، اُن کے مکانات کی الماریان اور بڑے بڑے صندوق ان جواہرات سے معمور تھے،

کتاب خانے ایک طرف رہنے کے مکانون کا یہ عالم تھا کہ جہان آج مکانات کی زینت اور آرائش مین یورپ کی نت نئی اشیاء نے جگہ حاصل کی ہے، وہان اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے تک مسلمانون کے دیوان خانون اور گھرون کے معمولی سے دالانون کی آرائش مین جو چیزین دیگر اشیاء نمائش مین نمایان نظر آتی تھین، وہ ان خوش نویس صاحبِ کمال خطاطون کی وصلیان اور طغرے ہوتے تھے جن مین نہایت پُر معنی اور پرکیف بیتین، پرنصیحت قطعے، پراخلاق جملے، دل آویز فقرے، حدیث شریف اور کلام پاک کی آیت مبارکہ کے پرتاثیر جملے اس خوبی اور کمالِ تحریر کے ساتھ چوکھٹون مین رکھکر آویزان کئے جاتے تھے جن کے درودیوار سوتے جاگتے، اخلاق آموزی حکمت پژوہی، اور خوبی مذاق کی طرف زبان حال سے تعلیم دینے مین مصروف

رہتے تھے، اس دستور کی وجہ سے صدہا اقوال مسلمانوں کے علمی لٹریچر کی جان بن کر جاہلوں تک کی زندگی کا دستور العمل بن گئے،

جن علمی جواہرات کو ہماری جہالت نے خزف ریزوں کی طرح پامال کرنا شروع کیا، یورپ نے اپنے دامنِ امید میں ان موتیوں کو بھرنا شروع کیا، آج بڑے سے بڑے مسلمان عالم کی نادر اور نایاب کتابوں کا، مسلمانوں کے علوم و فنون سے دلچسپیوں کا، بڑے بڑے مسائل علمی پر اُن کی مجتہدانہ اور محققانہ موشگافیوں کا، میدانِ علم کی تلاش وجستجو میں اُن کے پرمغز کارناموں کا پتہ لگانا چاہو تو اس کا نشان یورپ کے سوا کہیں اور نہیں ملے گا، جب قوم میں قومی علوم کی یہ قدر افزائی رہ جائے تو پھر قومی خصوصیات کا ذکر اور اس کی بقا کی امید ایک قصۂ پارینہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، جب اُن کے کتب خانے اپنے معلمانِ اخلاق کی تصنیفات سے خالی ہوں گے، تو اس جذبہ اور کیفیت کی تلاش تحصیل حاصل ہے کہ کبھی ہماری قوم بھی علوم و فنون کی دنیا میں اخلاق پھیلانے کی اور تہذیب و شائستگی کو اس عالم میں رواج دینے کی کفیل تھی، اور ہم نے بھی یہ سبق عالم کو پڑھایا تھا،

ایسی کوشش جو مسلمانوں کے قدیم قلمی و علمی ذخیرہ کو فنِ خوشنویسی اور خطاطی کے کمال کو اُن کی انشاء کے طور و طریق کے نمونوں کو قدیم خزائن کو آئندہ کی تباہی اور بربادی سے محفوظ رکھ سکے، جہاں تک میری محدود معلومات کا ذریعہ ہے کسی ذمہ دار جماعت کے اہتمام سے اب تک باقاعدہ طور پر عمل میں نہیں لائی گئی، اور نہ اس وقت تک لائی جا رہی ہے، لہٰذا اس کی حفاظت کی تدبیر عملاً اختیار کرنے کا وقت حد سے زیادہ گذر چکا ہے، اور ضرورت اس امر کی ہے کہ بقیہ نقیہ جس طرح بن پڑے سمیٹ کر رکھا کیا جائے، اور اس کو درست حالت میں رکھنے کی توجہ کے ساتھ کوشش شروع کی جائے" (مقالات ص ۲۲۲ تا ۲۲۴)

یہ اپیل بہت طویل ہے، مذکورۂ بالا عبارت محض اس کا ایک ٹکڑا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے

کہ مرحوم کو اسلامی علوم و فنون کے ساتھ کتنا شغف اس کی بربادی کا کتنا غم اور اُن کے تحفظ کا کتنا خیال تھا، گو یہ اپیل بھی زیادہ کارگر نہین ہوئی، لیکن انھون نے خود اپنی محنت تلاش سے بڑی دولت صرف کرکے نادر اور قلمی کتابون کا بڑا بیش قیمت ذخیرہ جمع کیا، اور اُن کا ذاتی کتب خانہ قلمی اور نادر نسخون کے اعتبار سے ہندوستان کے بہترین کتب خانون مین ہے،

پرانی تہذیب اور قدامت و وضعداری سے شیفتگی

علمی ذوق و شوق کے بعد مرحوم کی زندگی کا نمایان پہلو قدامت و وضعداری ہے، وہ خود قدیم تہذیب کا نمونہ تھے، اور اسی کا جلوہ وہ مسلمانون کی تہذیب و معاشرت مین دیکھنا چاہتے تھے، اُن کی تحریرین اس ذکر جمیل سے بھی بہت کم خالی ہوتی تھین، اُن کے تاریخی مضامین مین کسی نہ کسی عنوان سے ان کا ذکر ضرور آجاتا تھا، اور جہان ہندوستان کی قدیم اسلامی سوسائٹی، پرانی وضعداریون یا کسی پہلو سے پُرانی تہذیب کے کسی رُخ کا ذکر ضرور آجاتا، وہان اُن کے قلم کی بزم آرائی، اس اُجڑی ہوئی محفل کی یاد کی تڑپ اور تاثیر دیکھنے کے لائق ہوتی ہے، اور اُن کی تحریرون مین پُرانی صحبتون پُرانے بزرگون کی وضعداریون، قدیم تہذیب وآداب اور دوسری تہذیبی خصوصیات کے بڑے دلکش مرقعے نظر آتے ہین، اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہون،

فارسی زبان کے فیض کے سلسلہ مین تحریر فرماتے ہین :-

"فارسی ادب کی حیات بخشی کا نادر ثبوت وہ فضا ہے، جو اس ادب کی فیض باری سے سرزمین ہند مین پیدا ہوئی، اسی فضا کی روح پروری سے سارے مذہبی اور فرقہ واری اختلاف صلح سے بدل گئے، ہندو مسلم، شیعہ سُنی ...... کے سب ایک رنگ میں رنگ گئے، رنگ پوڈر کا نہین جمعیت و یک جہتی کا تھا، گجراتی، مرہٹی، ہندی، بنگالی، گورکھی، وغیرہ جس زبان کو لوگے، ادب فارسی کی گرمی سے اس کی نبض مین جنبش پاؤگے، آج کل کی تصانیف نہین، اس زمانہ کی تصنیف پڑھو، اس رنگ بلکہ بے رنگی کا واضح ثبوت پاؤگے، عارف رومی کی دو بیتین بیان بر سبیل تنزل سبق آموز ہون گی،

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد، موسی و فرعون اندر جنگ شد

چونکہ بے رنگی رسی کان داشتے موسی و فرعون داند آشتی

حال و ماضی پر نظر ڈالو یہ شعر مکرر پڑھو، مرقع عبرت نگاہون کے سامنے آجائے گا،

افسوس دیکھتے دیکھتے اس بہار پر خزان آگئی، وہ فضا ہی سمٹ گئی، خاقانی و انوری کا درس ہے مگر مٹا ہوا برائے نام بلکہ نام کو بھی نہین، کیون ادبی فضا نہین، نتیجہ آنکھون کے سامنے ہے، جو لوگ زمانہ حال کو بنا گئے، اُن کو آنکھین ڈھونڈھتی ہین، اور نہین پاتین، راجہ رام موہن رائے، پنڈت اجودھیا ناتھ سر سید احمد خان محسن الملک اور وقار الملک آج کہان ہین، ...... اس بے کیفی کی تاریکی مین اگر کسی طرف سے روشنی نظر آجائے تو اول حیرت اُس کے بعد مسرت ہوتی ہے، (مقالات ص ۱۲۴)

تیموری دور کے ایک صاحب علم و قلم امیر راجہ کندن لال اشکی کے حالات مین لکھتے ہین،

"اس عہد کی تعلیم پر نگاہ ڈالو علاوہ علوم کے مردانہ فنون، استعمال اسلحہ، گھوڑے کی سواری، فنونِ لطیفہ خوش نویسی تصویر کشی وغیرہ دائرۂ تعلیم سے باہر نہ تھے، راجہ کندن لال کی ہمہ گیر طبیعت کا رنگ اُن کی تصانیف اُن کی مختلف ملازمتون اور ان اہلِ کمال کی فہرست سے ٹپک رہا ہے جن سے وہ ملے، یہ ہمہ گیر طبیعتین وہی تعلیم پیدا کر سکی، جس پر صرف قدامت کے جرم مین نفرت کی نگاہین پڑتی ہین، (مقالات ص ۱۲۵)

فارسی شاعری کے مسلّم الثبوت استاذ خواجہ عزیز لکھنوی کے حالات مین تحریر فرماتے ہین،

"لکھنؤ کی سبزی منڈی مین خواجہ صاحب کی بارہ دری گویا خیابان شیراز تھی، انسان وہان پہنچا تو حافظ و سعدی کے کمال کی مہک پاتا رونق دوبالا ہوتی، جب علامہ شبلی بھی وہان ہوتے، اور یہ اکثر ہوتا، تو لکھنؤ کی حاضری مین خواجہ صاحب کی خدمت مین باریاب ہوتا، پیشتر یہ لازم تھا، جس وقت اطلاع پہنچتی، تو محلسرا سے اس شان سے برآمد ہوتے کہ لب پر تبسم ہوتا، ہاتھ مین چائے کا سامان بالا تر

قلبی محبت جس کا اثر تمام حرکات و سکنات میں عیاں نظر آتا، مراتب پذیرائی کے بعد بیٹھتے باتیں کرتے، چائے کی تیاری کا اہتمام جاری رہتا، ناممکن تھا کہ مہمان ہاتھ بٹائے، چائے میں زعفران ضرور پڑتی تمام کو سادی اور صبح کو دودھ ناشتہ کے ساتھ ..... خواجہ صاحب کے اوصاف میں وہ تاثیر تھی کہ سیدھی مختصر باتوں پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا، بارہا حاضر ہوا، مگر کلام سننے یا حاصل کرنے میں اتنا کم کامیاب ہوا کہ گویا نہیں ہوا، ہاں دوسروں کا کلام سناتے ادبی نکتے بیان فرماتے علمی سوالوں کا جواب شافی ملتا، ناممکن ہے کہ ان صحبتوں کا ذکر ہو، اور مرحوم کی نورانی صورت یاد نہ آئے، اس کا ایک طرف خاکساری سے بیٹھنا، کلام کے مزے لینا، نکتہ سنجی، لطف کلام ایک خاص لطف رکھتا تھا، جو برسوں گذر جانے کے بعد بھی آج تک نقش ہے، (مقدمہ کلیات عزیز لکھنوی ص ۲)

خواجہ صاحب با اوقات وعبادت گذار تھے، مذہب کی طہارت اور مشرب کی وسعت اُن کے جملہ حرکات و سکنات سے خود بخود عیاں ہوتی تھی، مشک آنست کہ خود ببوید، نہایت غیور اور سیر چشم تھے، کسی کا بارِ احسان نہ اٹھا سکتے تھے، تحائف کا خوش اسلوبی سے فوراً عوض کر دیتے تھے، بعض دفعہ دستی بھیجنے کا موقع نہ ملا تو پارسل ڈاک میں بھیجا، باوجود وضع کی پابندی اور شانِ استغنا کے نہایت ملنسار اور متواضع تھا، آدمی جتنی دیر حاضر رہتا، اخلاق کی پاکیزگی سے مسحور رہتا، حسن اخلاق مذہب و فرقہ کی قید سے بالاتر تھا، مسلمان، عیسائی، ہندو، سنی شیعہ سب کے ساتھ یکساں اخلاق سے پیش آتے محض ظاہری اخلاق نہیں، بلکہ وہ اخلاق جسکا دل پر اثر پڑتا عارف جامی کا مشہور شعر گویا انکی زندگی کا اصول تھا،

پس چنان زی کہ بعد مردنِ تو

ہمہ گریان بوند تو خندان

اپنے استاد مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے حالات میں لکھتے ہیں،

جب اس خاکدانِ سفلی میں اسلامی تمدن کی بہار آئی ہوئی تھی، اور اس کے فیض سے ایشیا افریقہ

اور یورپ تینوں براعظم رشکِ گلزار بنے ہوئے تھے، اس وقت قصبات کا ایک عظیم الشان نظام ممالکِ اسلامیہ میں قائم تھا، یہ قصبات زندگی کے سرچشمے تھے جن سے شہر خصوصاً دار السلطنت سرسبز و شاداب رہتے، شہری آب و ہوا، دو تین نسلوں کے بعد دماغوں کو سست کر دیتی، تو قصباتی اہلِ کمال تازہ زندگی لے کر پہنچتے، اور بزمِ حیات کو از سرِ نو منور و معمور فرماتے، دہلی مرحوم میں شاہ صاحب اور لکھنؤ میں فرنگی محل کا خاندان لاکھوں میں دو مثالیں ہیں،

اُن کے عادات و خصائل کی تصویر یہ ہے:-

"نشست و برخاست اور گفتگو میں تہذیب و وقار کی پوری شان تھی، نگاہ نیچی رہتی، کم سخن تھے لیکن خاموشی میں بھی ایک عالمِ شگفتگی محسوس ہوتا، روش سادہ تھی، جفاکشی اور محنت و اصل عادت تھی، چھتری کبھی نہ لگاتے، شدتِ گرما میں سر پر چادر ڈال کر دھوپ میں چلے جاتے، اس سلسلہ میں ایک جان پرور واقعہ سن لو،

گرمی کے سخت موسم میں ایک مرتبہ مدرسہ عالیہ کا امتحان لینے رامپور تشریف لے گئے، امتحان سے فارغ ہوتے ہوتے دوپہر کے بارہ بج گئے، حسب عادت سر پر چادر ڈال کر پیادہ پا استاذ العلماء مولوی ہدایت اللہ خان صدر مدرس مدرسہ جونپور کے مکان پر پہنچے، مولوی صاحب قیلولہ کے لئے زنانہ مکان میں جا چکے تھے، اطلاع پر باہر تشریف لائے، اول ایک پلنگ صاف ستھرا بچھوایا، اس کے بعد مہمان محترم کی پذیرائی فرمائی،

شانِ پذیرائی غور سے سنو، یہ واقعے اب کہاں دیکھنا درکنار، سنو گے بھی نہیں، اپنے بھتیجے حافظ سعد اللہ خان کو بھیج کر کنوئیں سے تازہ پانی منگوایا، مہمان گرامی کے پاؤں پر عزیز سے پانی ڈلوایا اور اپنے ہاتھ سے پاؤں دھوئے، سقاہ اللہ تعالیٰ کاساً دہاقاً،

ابھی کریم النفسی کی داستان باقی ہے، رامپوری فاضل اجل نے راوی سے یہ واقعہ بیان فرمایا تو

یون کہا کہ مولوی لطف اللہ صاحب نے بڑا کرم فرمایا، ایسی دھوپ مین تکلیف فرمائی، وہ بھی پیادہ پا اپنی خدمت کا اشارہ تک نہ کیا، ایک موقع پر جب راوی موصوف نے مفتی صاحب سے مولوی صاحب کی شکر گذاری کا ذکر کیا، تو فرمایا مین نے کیا کرم کیا، مجھ کو دوپہر کہین بسر کرنی تھی، وہین چلا گیا، کرم تو مولوی صاحب نے فرمایا یہ کہکر پاؤن دھلانے کا واقعہ بیان فرمایا، دیکھو یہ تھے وہ پاک مشرب صاف سینے جن سے علمی فیض کے چشمے کیا دریا بہتے تھے،

آدم بر بہر مطلب مزاج شگفتہ تھا، با مذاق تھا، تکلف سے بَری تھے، خاص صحبتون مین مزاح بھی فرماتے، شعر کا پورا ذوق تھا، خاص صحبتون مین شعر کا ذکر چھڑ جاتا، تو گھڑیون جاری رہتا اشعار لطیف پڑھتے، لطف و خوبی ظاہر فرماتے، ایک ہی قافیہ یا مضمون پر متعدد اساتذہ کا کلام سناتے، عربی فارسی اور اردو ادب سے یکسان ذوق تھا،..... گفتگو ہر شخص سے علیٰ قدر مراتب شفقت و محبت سے فرماتے جس کا اثر سامع محسوس کرکے محظوظ ہوتا، تعلّی یا ادّعا کا شائبہ بھی کلام مین نہ پایا جاتا، تقدس مآبی اور جلوہ نمائی پاس نہ تھی، تلاوت کلام مجید بھی تخلیئے مین فرماتے، سخت کلامی اور فحش الفاظ غصہ مین بھی زبان سے نہ نکلتے (استاذ العلما ص ۳۱ تا ۳۳)"

علامہ شبلی مرحوم کی خصوصیات کا مرقع،

"علامہ شبلی مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے، اس زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریون سے پاک اور صاف تھے، اُن کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا، نظر مین بلندی تھی، مزاج مین استغنا، حوصلے مین عزم تھا، مزاج مین نفاست تھی،... صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی، انسان خواہ کسی درجہ کا ہو، ان کی باتون سے محظوظ ہوتا تھا، جس مسئلہ پر گفتگو کرتے، کمال کی خوبیان نظر آتین، عقلی برتری مؤرخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی اُن کے بیان کے رفیق و ہمدم تھے، جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوئی تو بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کئے، فضول باتین اُن کی زبان سے مین نے کبھی نہین سنین،.....

اعزہ کے ساتھ بہت الفت تھی، اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسوں دلگیری کے ساتھ کیا، دوسرے بھائی (مولوی اسحٰق صاحب) کی موت تو اُن کی جان ہی لے گئی، احساس بہت شدید تھا، اس لئے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے، ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کلکتہ کے زمانہ میں میں اور وہ ایک مکان میں مقیم تھے، ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے اُن کے پاؤں میں ڈنک مار دیا، اس قدر بے تاب ہوئے کہ مجھکو حیرت ہو گئی، اس قدر زمانہ گذرنے کے بعد آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے، یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا، ہر ذوق میں شدت چاہتے تھے، نمک کھانے میں تیز ہو، دسترخوان پر نمک رکھ لیتے، اور کھانے میں ڈالتے جاتے، شیرینی بھی گلوسوز مرغوب تھی، یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے، باتیں کرتے جاتے ہیں، قند کے دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں، وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیرین کام رہتے، ع

سخن ہائے شیرین بہ از قند ہست،

مرچ کی تیزی کی تاب نہ تھی، فرماتے تھے، میں نے یہیں ہتھیار ڈالے ہیں،...... نیز پانی تیز وسرد پیتے تھے، جاڑوں میں بھی یہی ہوتا تھا، اس کے ساتھ سردی وگرمی بہت محسوس کرتے تھے، ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے، متعدد رضائیاں اوڑھیں تسلّی نہ ہوئی، دوسرے دن خاص اہتمام سے ایک خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا، گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے تھے، اس سلسلہ میں بمبئی کے سفر فارسی شعر وسخن کے یادگار رہیں گے، چائے سادہ اور کڑی پیتے تھے، صبح کو نماز کے اوّل وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے، عادات میں سادگی تھی، لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے، غذا بہت کم تھی، آخر آخر میں غذا کی قلت پر حیرت ہوتی تھی" (مقالات ص ۷۰، ۷۱)

منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کی تصویر،

"میرے محبِ قدیم منشی احتشام علی صاحب اسی آہنی حصار قصبہ کاکوری کے چشم وچراغ اور

نامور و مستحکم آئین باپ کے فرزند تھے، اُن کی صفات مین دونون کا جلوہ تھا، لکھنؤ کی شائستگی کا لباس مین، کھانے مین، نشست و برخاست مین، معاشرت مین، گفتگو مین پورا جلوہ شائستگی کا نمایان بلکہ تابان تھا، لباس مین وہی انداز جاڑے اور گرمی کا تھا، جو عمائد لکھنؤ کا تھا، جاڑون مین شال اور جامہ وار کے جلوے، اُن جوہر نظر آتے، گرمیون مین جامدانی وغیرہ نگاہ کو تازگی بخشتی، یہی نہین شال جواہرات وعطر وغیرہ کی شناخت اسکے مالہ وماعلیہ کی واقفیت اور پرکھ مین اعلیٰ دماغ تھا، اب بھی خربزے اور آم کا شوق لکھنؤ کے اجڑے گھرون سے بعض نادر نمونے شال وغیرہ کے باہر سے آتا ہے، جب ایسا موقع ہوتا، تو مین ضرور یاد آتا، قریبًا ہر سال شال کا کوئی نہ کوئی نادر نمونہ میرے واسطے خریدا جاتا، درست کرایا جاتا، اگر کنارے حاشیہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی، تو توشہ خانہ سے نکلوا کر اضافہ کیا جاتا، غرض پرانا بوسیدہ ٹکڑا نیا اور رعنا بن کر میرے سامنے آتا،

منشی صاحب کا دسترخوان قدیم مہمان نوازی، خوبی مذاق، بلند حوصلگی اور لطافت کا نمونہ ہوتا تھا برسون دیکھا لطف اٹھایا، ایک معیار بلند تھا جس سے کبھی نیچے نہ گرا، ہر کھانا دال سے لے کر بریانی اور زعفرے تک اپنے معیار پر ہوتا، دسترخوان ہمیشہ وسیع پایا، عزیز احباب صادر و وارد سبھی ہوتے، سب کی نشست مدارات یکسان بلا فرق ہوتی، کھانے مین منشی صاحب کی شگفتگی لطف پر بڑی جان نوازی فرماتی، کھانے ہر ہر موسم کی رعایت سے تیار ہوتے، عادات مین منشی صاحب تکلف تصنع طمطراق سے بالکل پاک وصاف تھے، اسی کے ساتھ نہایت شائستہ اور پختہ وضع، مین نے باون برس کی مسلسل رفاقت مین کبھی کوئی فرق کسی عادت مین نہین پایا، بے تکلف اور مخلصانہ صاف گوئی، کلام مین بھی، رائے مین پختہ بلکہ سخت تھے، جو کسی رعب طمع، یا خاطرداری سے مرعوب واثر پذیر نہ ہوتی،

مذہب کے سخت پابند تھے، نماز روزہ اور اوراد وظائف پر پورے عزم سے ثابت قدم، عقائد مین مستحکم یہ اثر تھا، حضرت پیر و مرشد کے فیض کا اور منشی امتیاز علی صاحب کی تربیت کا "

نہایت فیاض تھے، عزیزون ملنے والون، صادر و وارد، حاجتمندون غربا ومساکین کی خدمت
مین علانیہ اور خفیہ برابر سرگرم رہتے، اُن کی عظیم الشان کوٹھی کا ایک حصہ گویا بورڈنگ ہاؤس تھا، جو طلبہ
کے لئے مخصوص تھا، متعدد مستقل ٹھہر کر تعلیم حاصل کرتے، بعض امتحانون کے موقع پر آتے تیاری کرتے امتحان
دیتے چلے جاتے، اور یہ سب کے سب منشی صاحب کے مہمان ہوتے،

ایک حصہ کوٹھی کا عزیزون، مہمانون، دوستون کے تصرف مین رہتا، عارضی بھی اور مستقل بھی دوستی
اور دوست نوازی منشی صاحب کے اوصاف مین یون نمایان تھی، جیسے آفتاب کی کرنین ہر موقع پر ہر معرکہ
مین وہ دوستی کسوٹی پر پوری اترتی، محبت پیکر مجسم بن کر سامنے آجاتی، بہت کچھ لکھا گیا، پھر بھی قلب اور
قلم دونون کہتے ہین کہ کچھ نہین لکھا، اللہ تعالیٰ کی رحمت اُن پر ہو، ایک نمونہ تھے، قدیم پاکیزہ اخلاق
وضعداری حسن مذاق شائستگی، دوستی اور اسلامی زندگی کا (مقالات ص ۳۹۹ تا ۴۰۲)"

چودھری نور اللہ خان رئیس سہاور کی خصوصیات مین تحریر فرماتے ہین:

"چوہتر برس کی عمر پائی، اس طویل عمر کو جس پاکیزگی اور وضعداری سے نباہ گئے، وہ ایک کارنامہ
زندگی ہے، ایک صدی کے ان تین چوتھائی حصون نے عالم مین کس قدر تغیرات دیکھے ہین، اور کیسے کیسے
انقلابون کا تجربہ کیا ہے، مگر چودھری صاحب کی ذات اُن کی زد سے بچی ہوئی تھی، وضع عادات وحرکات
مین اپنے نیک سلف کے طریقہ پر قائم رہے،

عادات نہایت شائستہ، مگر بحد مستحکم اور مضبوط تھین، برآمدہ مین ایک جانب چوکی بچھی رہتی تھی اس
پر نیچی گدا اور تکیہ لگا رہتا، صبح کی نماز اور ضروریات سے فارغ ہوکر دوپہر تک اور پھر بعد ظہر اس پر نشست ہوتی
تھی، اور آنے جانے والون کاروبار کے آدمیون اور اہلِ حاجت کے واسطہ اذن عام ہوتا، کوئی موسم ہو
کیسی ہی سردی وگرمی ہو، اس مین فرق نہ آتا تھا، عصر کی نماز کے بعد ہوا خوری کے واسطے جنگل کو تشریف
لیجاتے اور مغرب کے وقت واپس آتے تھے، آندھی آئے بارش ہو اس مین تغیر نہ ہوتا تھا، (مقالات ص ۱۵)

ذوق ادب و انشاء فطرۃً لطیف الطبع، نفیس مزاج اور نازک خیال تھے، خوشگوار رنگینی کی بھی ہلکی سی جھلک تھی، اُن کی لطافتِ ذوق کا اثر اُن کی پوری زندگی مین نمایان تھا، چنانچہ اردو اور فارسی دونون زبانون کے شعر و ادب کا بڑا ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے، اردو کے صاحبِ طرز ادیب تھے، اور اپنی تحریرون مین حسن انشاء کا خاص اہتمام رکھتے تھے، اس لئے گو اُن کی تحریرین اور باوقار ہوتی تھی لیکن اس مین ادب و انشاء کی تمام خوبیان اور لطافتین موجود ہوتی ہین، اپنے مجموعۂ مقالات کے دیباچہ مین لکھتے ہین:-

"ایام طالب علمی مین کتاب مختصر المعانی علامہ تفتازانی کی پڑھی تھی، اس مین علامہ کا یہ قول بلاغت مین پڑھا تھا، کمالِ بلاغت اس مین ہے، کہ واقعات کے بیان مین جوہر بلاغت نمایان ہون اس لئے کہ واقعہ نگاری مین بیان واقعات کے تابع ہے، لہذا میدان تنگ ہے، اور افسانہ و خیالی مضامین کی نگارش مین بیان آزاد ہے، اور افسانہ و مضامین تابع اس قول کو دل نے لے لیا لکھنے کا شوق واقعہ نگاری مین پورا ہوا، افسانہ اور خیالی مضامین سے طبیعت کنارہ کش رہی، خودستائی معیوب ہے تاہم بعض نکتہ سنج اربابِ ذوق نے جو خیال میری تحریرون کی بابت ظاہر فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مین بحمد اللہ کامیاب ہوا، اب نظر کو بڑھائیے، مقالات پڑھئے، اور خود فیصلہ کیجئے"

بلاغت کے ان نکتون سے اُن کی کوئی تحریر خالی نہین ہے، خصوصاً شعر و ادب کے مضامین مین جوہر بلاغت زیادہ نمایان ہین، امیر خسرو کی مثنوی مجنون و لیلی کا مبسوط مقدمہ جو مرحوم کی تنقید و تصحیح کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اور خود مرحوم کے دیوانِ فارسی مین اُن کے قلم سے فارسی شاعری کے ادوار اور اسکی خصوصیات پر تبصرہ اُن کی ذوق ادب نکتہ سنجی اور حسن مذاق کے اچھے نمونے ہین لیکن یہ سب بہت طویل ہین اُن کے اقتباسات نقل کرنا دشوار ہے، اس لئے ان کی مختلف تحریرون سے ادب پارون کے کچھ نمونے نقل کئے جاتے ہین،

مرحوم نے اپنے زمانۂ شباب مین حیدرآباد کے رسالہ حسن مین بابر پر ایک مضمون لکھا تھا، جو ۲، ۳ سال

کے بعد جب کہ اس بہار پر خزان آچکی تھی، کتابی صورت مین شائع ہوا، اس کے دیباچہ مین لکھتے ہین،

"جون ۱۸۹۰ء سے ستمبر سنہ مذکور تک مضمون بالا رسالہ حسن مین شائع ہوتا رہا۔ اس کو ۲۶ برس گذر گئے، وہ وقت ابتدائے شباب کا تھا، زندگی تازہ بہار تھی، امیدون کے پھول سے دل و داغ شگفتہ و شاداب تھے، زندگی بعینہ اسی دلآویزی کے ساتھ نظر کے سامنے تھی، جیسے کسی خوشنما شہر کا پہلا منظر، اب بھی مضمون کے مطالب مین کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت محسوس نہین ہوئی، البتہ تقاضائے عمر نے فطرۃً بعض الفاظ کی شوخی و رنگینی پر چشمک زنی کی، مگر تصرف سے یہ خیال مانع رہا کہ یہ شوخی و رنگینی زندگی کے دور عزیز کی امانت ہے، اور امانت مین دست اندازی نا روا، وہ عزیز عہد نہ رہا، تو اس کی یادگار رہے، یا د رہے ع

جوانی کجائی کہ یادت بخیر، "

فارسی غزل کی خصوصیات کے جلوے ملاحظہ ہون،

"فارسی غزل کو دیکھو، مضامین اس مین بھی تقریباً متحد ہین لیکن یہان (اردو غزل) سے وہان (فارسی غزل) ایک بات زائد ہے، یعنی خیال اس خیال کی نیرنگی نے غزل کو ایک ایسا شاہد رعنا بنا دیا ہے، جس کے جلوون کی انتہا نہین، جب دیکھو ایک نیا جلوہ دیدہ افروز ہوگا، اور پہلا جلوہ دوسرے سے اتنا ممتاز ہوگا کہ یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ یہ وہی آفت روزگار ہے، جو پہلے جلوہ گر تھا، یا اور ہے،

عربی فارسی مین جس چیز نے شور محشر بپا کر رکھا تھا، وہ تصوف ہے، فارسی عربی گویون مین بہت سے باکمال ایسے ہوئے جن کے سینون مین عشق حقیقی کی آگ شعلہ زن تھی، یہ شعلے جب منہ سے نکلے تو غزل کہلائے" (مقالات ص ۲۶، ۸۰)

شوکت بلگرامی نے رباعیات خیام کا ترجمہ اردو رباعی مین کیا تھا، اس کا دیباچہ مولانا شروانی نے لکھا تھا، اس مین تحریر فرماتے ہین :-

"رباعیون کا وزن مخصوص ہے، زبان مخصوص، خیال پورا ہونا در ہو، توحید حکمت یا عشق کا نچوڑ اس مین ہو، ان قیود کے ساتھ چارون مصرعے باہم ایسے مربوط ہون کہ ایک پھول کی چار پنکھڑیان معلوم ہون، تلم شکن یہ کہ چوتھا مصرعہ کڑی کمان کا تیر بن کر نکلے، جو دل پر جا بیٹھے، خلاصہ یہ کہ ہر صنف سخن کی جان رباعی مین کھپائی پڑتی ہے، غزل کی تڑپ قصیدے کی متانت مثنوی کا تسلسل رباعی مین ہو، اس کے ساتھ رباعی کا مخصوص اختصار میدان سخن کو تنگ کر کے اشہب قلم کی کمر توڑ دیتا ہے، حاصل کلام عطر سخن رباعی ہے،

نیشاپور کے میخانہ قدیم مین ایک پیر میکدہ خیام تھا جس کے جام مین حکمت کا امتزاج ہوا، اس امتزاج سے نشہ دوبالا ہو کر جو رنگ لایا، اس کی جھلک اس بادۂ شیراز مین ہے،

از ان افیون کہ ساقی در مے افگند حریفان را نہ سر ماند نہ دستار

ممالک ایشیا اس نشہ سے جھوم رہے تھے، یورپ بھی جام اول مین نجود ہو گیا، افلاطون کدۂ بلگرام کے خم نشین شوکت نے اس بادۂ کہن کو تازہ روانی بخشی اور دور جدید سے آشنا کیا یعنی نیشاپوری شراب اردو کے ساغر مین لنڈھالی، اس مے دوآتشہ سے نشہ کی رسائی دوبالا ہو گئی، اسی مے دوآتشہ پر اس وقت ایک نظر ڈالنی ہے، مبادا دامن صدارت پر دھبہ لگے، (ریاست حیدرآباد کی امور مذہبی کی صدارت کی طرف اشارہ ہے) اس لئے اول ایک شعر سنا دیتا ہون :-

نہ من تنہا درین میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار شد مست"

(دیباچہ مے دوآتشہ)

شیخ محمد بن طالب گجراتی کے حالات کی تمہید مین ارقام فرماتے ہین :-

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام پہنچا تھا کہ ایک اور آفتاب علم طلوع ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب ملک عرب کو گئے، اور چشمۂ رحمت کا صاف اور خالص آب حیات دل سے لگا کر لائے، شاہ صاحب کا فیض تھا کہ دریا بن کر ملک مین پھیلا اور سرد دلون کی خشک کشت زار سرسبز ہو کر لہلہانے لگی، (مقالات ص ۳۹۰)"

خواجہ میر اثر دہلوی کا سلسلہ شاعری یہ ہے، خواجہ میر درد محمد نام عندلیب، شاہ سعد اللہ گلشن، شاہ محمد قدرت اللہ گل، یہ اصحاب شاعری کے ساتھ صاحب دل بھی تھے، مولانا شروانی خواجہ میر درد کے دیوان کے دیباچہ مین یہ شجرہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہین : ۔

"دیکھو گل کی جلوہ نمائی سے گلشن ہوا، گلشن نے نامۂ عندلیب پیدا کیا، نالۂ عندلیب سے درد جلوہ افروز ہوا، درد سے اثر پیدا ہوا،

این سلسلہ از طلائے ناب است   این خانہ تمام آفتاب است"

الندوہ کی اڈیٹری مین مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ مولانا شروانی کا نام بھی تھا، اس کی مصلحت یہ بیان کی ہے : ۔

"جب اس رسالہ کے اجراء کی تجویز مجلس انتظامیہ نے منظور کی تھی تو اڈیٹری مین میرا نام اس وجہ سے ضم کیا گیا تھا کہ میری جہالت کی تاریکی علامہ شبلی کے خیالات کی تیز روشنی کی چکاچوند کو کم کرتی رہے گی، اور بدگمانی کا زیادہ موقع نہ ملے گا، (مقالات ص ۲ ۷)"

علی گڈھ کالج کے مشہور استاد پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی کی ملاقات اور تعلقات کے علمی فوائد کی ان الفاظ سے تعبیر کی ہے،

"یہ دونون دلدادگان علم باہم ملے، اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعین باہم مل کر عالم کی روشنی کا سبب بنتی ہین"

مولانا شبلی کو شیرنی بہت مرغوب تھی، کچھ نہین تو شکر کے دانون ہی سے شغل کیا کرتے تھے، اس کا اس پیرایہ مین اظہار کیا ہے،

شیرنی حلوسوز مرغوب تھی، یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے، باتین کرتے جاتے ہین، قند کے دانے منہ مین ڈالتے جاتے ہین، وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیرین کام رہتے ع

ع سخنہائے شیرین بہ از قند ہست"

"خواجہ عزیز لکھنوی بہت کم سخن اور خاموش تھے، ان مین شیرین بیانی نہین تھی، دیکھئے یہ عیب حُسن بیان سے ہنر بن جاتا ہے،

"کم سخن تھے، اور سادہ بیان خود ستائی سے کوسون دور اسلئے گفتگو مین خوش بیانی نہ تھی، مگر ع

ورائے شاعری چیزے دگر بود

لیکن خواجہ صاحب کے اوصاف مین وہ تاثیر تھی کہ سیدھی سادہ مختصر باتون پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا"،

ایسے ادبی شرارے جن سے پوری تحریر چمک جاتی تھی، اُن کی تحریرون مین بکثرت ملتے ہین بلکہ ان کی کوئی تحریر بھی اُن سے خالی نہین جس کا اندازہ اوپر کے طویل اقتباسات سے بھی ہوا ہوگا، یہ مزید مثالین اندازہ کرنے کے لئے پوری طرح کافی ہین، درحقیقت دوسرے ممتاز ادیبون کی طرح مرحوم کا بھی ایک نہایت دلکش اور دلپذیر طرز تھا، جو انہی پر ختم ہو گیا،

صدر یار جنگ

ذاتی تاثرات

از جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

نام نامی پر نظر سب سے پہلے اس وقت پڑی جب اپنا زمانہ اسکولی طالبعلمی کا تھا، اور مولانا شروانی ایک خاصہ پختہ کار اہل قلم، اپنی جوانی کی آخری منزلون مین تھے، اور علی گڈھ منتھلی کے مضمون نگار تھے، یہ ذکر کوئی ۱۹۰۵ء کا ہے، چند ہی روز مین دیکھا کہ اسم گرامی الندوہ (لکھنو) کے سرورق پر شریک ادارت کی حیثیت سے ہر مہینہ چھپ رہا ہے — ایک اڈیٹر تو مولانا شبلی نعمانی تھے، اور دوسرے ان کے حبیب لبیب اور ہم قافیہ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی،

الندوہ مین شروانی صاحب نے لکھا لکھایا تو برائے نام ہی لیکن نام بحیثیت اڈیٹر کے برسون چھپتا رہا — کچھ ہم رنگی اس باب مین مولانا شرر مرحوم سے حاصل رہی، تخلص ان کا بچہ بچہ کی زبان پر، لیکن شاعری کا نمونہ دیکھنا چاہیے تو کسی "ریسرچ اسکالر" کی دستگیری کے بغیر کامیابی ممکن نہین! مضمون شاید چند سال کی مدتِ ادارت مین ایک ہی لکھا "حیات خضر" دو نمبرون مین، باقی ان کے نام کا تلازم مولانا شبلی کے نام کے ساتھ ذہن مین خوب جم گیا — دو چار سال اور گذرے، اور اب کالج کی طالب علمی کے زمانہ مین جب تقریباً روزانہ حاضری مولانا شبلی کی خدمت مین رہنے لگی، تو معلوم ہوا کہ کم از کم جہانتک معاملاتِ ندوہ کا تعلق ہے، خان شروانی اور شیخ نعمانی کے درمیان چولی دامن کا ساتعلق ہے،

ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم! ـــ علی گڈھ اور اعظم گڈھ کے درمیان ایک اور وجہ ارتباط، ایک اور رشتۂ توافق و اتحاد!

صوری زیارت سب سے پہلے ندوہ کے ایک جلسۂ انتظامیہ مین ہوئی، سنہ غالباً ۱۹۱۱ء تھا، ارکان مین دو پارٹیان تھین (اور مسلمانون کی کس انجمن یا ادارہ مین پارٹیان نہین!) ایک فریق کے لیڈر مولانا شبلی تھے، اور دوسرے کے قاری شاہ سلیمان پھلواروی اور مولوی خلیل الرحمن سہارنپوری ہملوگ کالج کے چند لڑکے بھی تماشائیون مین شریک کہ اگر کسی موقعہ پر پبلک کی مدد کی ضرورت پڑی تو تو پبلک کے نمایندہ بنکر مولانا شبلی کو کمک پہنچائی جائے گی، فلان صاحب آئے اور فلان صاحب آئے ـــ اپنے لیے فخر کا یہ موقع کیا کم تھا کہ ایسے معزز جلسہ مین بیٹھنے کو مل گیا، تماشائی ہی کی حیثیت سے سہی! ـــ یہانتک کہ مولانا شروانی آگئے: حسن مردانہ کا نمونہ، چہرہ پر شرافت برستی ہوئی، متانت ہلائین لیتی ہوئی، مشہور یہ تھا کہ یہ زبردست "شبلوی" ہین، دیکھنے مین یہ آیا کہ یہ اپنا دامن ہر فریقانہ آلودگی سے بچائے ہوئے، نہ گفتگو مین گرمی، نہ لہجہ مین درشتی، ایک پیکر حلم و آشتی،

سنہ غالباً ۱۹۱۵ء تھا کہ اپنی ایک لغو سی کتاب (لغو، تو اب کہہ رہا ہون، اس وقت تو وجہ نازش تھی) فلسفہ اجتماع کا مقدمہ الناظر مین نکلا، اس مین دہلی کے ایک واقعہ سے متعلق مولانا شبلی پر تعریض تھی، اس کی تردید اور صفائی مین بطور شاہد عینی کے شروانی صاحب کا مضمون الناظر کے دوسرے ہی نمبر مین موجود، لیکن تردید مین نہ تلخی نہ تعریض، بس صاف اور سادہ بیان واقعہ، سیرت کی شرافت کا اثر چہرہ ہی پر نمایان نہ تھا، قلم بھی اسی رنگ مین ڈوبا ہوا تھا،

۱۹۱۸ء کی شاید جولائی کا مہینہ تھا کہ شروانی صاحب حیدرآباد صدر الصدور امور مذہبی ہو کر نئے نئے پہنچے، ان کی مذہبیت اور گہری دینداری کا ڈنکا بجا ہوا، مین اپنی زندگی کے اسی دور مین الحاد و بے دینی کے لیے بجا طور پر رسوا اور بدنام، اور عین اسی زمانہ مین ایک کتاب کے سلسلہ مین خاص طور پر حیدرآباد

کے مسلم پریس کی زد میں آیا ہوا، شروانی صاحب عہدہ کے لحاظ سے بھی مجھ سے کہیں اونچے مرتبہ پہ، پہلی مرتبہ حاضری کی نوبت اتنے مخالف حالات میں! گیا تو بہت ڈرتے ڈرتے لیکن پہلی ہی ملاقات میں معلوم ہو گیا کہ ڈر بے محل اور اندیشہ بیجا تھا، خوب ملے، اس کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا کہ میری بد مذہبی اور بدعقیدگی ان کی شفقتوں اور عنایتوں کی راہ میں کچھ بھی حائل ہو رہی ہے۔ — اپنا رہنا اس کے بعد کچھ ہی دن اور حیدرآباد میں ہوا، شروانی صاحب کی فرض شناسی، دیانت، بے لوثی، مستعدی اور کارگذاری کے چرچے سن سن کر جی خوش ہوتا رہا،

اگست میں رخصت پر لکھنؤ آیا، اور یہاں سے استعفا لکھ کر بھیجا، بیکاری کو ابھی ۸ ہی ۹ مہینے ہوئے تھے کہ اپریل یا مئی میں سر امین جنگ مرحوم (صدر المہام پیشگاہ مبارک) کا تار پہنچا کہ اعلیٰحضرت نے یاد فرمایا ہے، فوراً آ جاؤ، گیا، اسٹیشن پر ہی حکم ملا کہ قیام سرکاری طور پر صدر الصدور امور مذہبی ہی کے یہاں رہیگا، جانا اور رہنا پڑا، ۴، ۵ روز کے قیام میں مولانا کو خوب قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، وہ ان کی صحیح مذہبیت (جس میں تعصب و نفرت کا شائبہ نہ تھا)، دینی پختگی (جو کرختگی سے نا آشنا تھی) معتدل اور متوازن خوش اخلاقی مہمان نوازی، ایک مرتب نظام اوقات کی پابندی، جدید اور قدیم رنگ کی خوشگوار آمیزش، لباس و طرز معاشرت کی نفاست، وضعداری، ایک ایک چیز کا مشاہدہ ہو گیا، اور ایک ایک چیز دل میں اتر گئی،

اعلیٰحضرت کے یہاں باریابی، اور پھر میرے لئے ماہوار تصنیفی وظیفہ کی منظوری کے سارے مرحلوں میں مرحوم جس شفقت اور اخلاص کے ساتھ قدم قدم پہ رہنمائی فرماتے رہے، اس کا نقش آج تک دل پر تازہ ہے،

اب تعلقات بڑھے، اور مراسلت خاصی کثرت سے رہنے لگی، اور ذاتی، قومی، ملی، دینی سب ہی مسئلے موضوع گفتگو رہے، اور ملاقاتیں کبھی لکھنؤ میں ہوتی رہیں، کبھی علی گڈھ میں، اور کبھی حیدرآباد ہی میں، —

مرحوم کو ندوہ کے ساتھ شغف تھا، اس کے رکن کیا معنی رکن اعلیٰ تھے، پابندی کے ساتھ اس کے ہر جلسہ میں شریک ہوتے، علی گڈھ سے بقصد کے لکھنؤ آتے، اور ہمیشہ اپنے محب خصوصی منشی احتشام علی علوی کاکوروی مرحوم

کے ہاں ان کی خیالی گنج والی کوٹھی میں ٹھہرتے جب تک سفر کی قوت ذرا بھی باقی رہی، اس معمول میں نہ فرق آنے پایا، اور علی گڑھ تو گویا ان کا گھر ہی تھا، یونیورسٹی کورٹ کی ہر میٹنگ میں التزام کے ساتھ کیوں نہ آتے۔

مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر، خواہ طوعاً خواہ کرہاً، ہر تھوڑی مدت کے بعد بدلتے رہے ہیں، ابھی مہاراجہ محمود آباد اس عہدہ پر ہیں، تو ابھی صاحبزادہ آفتاب احمد خان، کل سر سلیمان کا تخت سلیمانی اتر رہا ہے تو آج سر راس مسعود کے ورود مسعود کی تیاریاں ہو رہی ہیں، ابھی نواب مزمل اللہ خان کا طوطی بول رہا ہے، تو ابھی سر ضیاء الدین کا ستارۂ اقبال عروج پر ہے، ابھی نواب محمد اسمٰعیل خان ہاتوں ہاتھ لائے جا رہے ہیں، تو ابھی ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی پیشوائی کے لیے فرش بچھ رہے ہیں، کورٹ کے ممبر کچھ ان کے ساتھ کچھ ان کے ساتھ، اور کچھ "ان" اور "اُن" دونوں سے الگ صرف اپنے ساتھ ـــ شروانی صاحب کا مرکز ثقل ہر حال میں اپنی جگہ پر قائم، ندوہ میں بھی تو اپنا امتیاز اسی طرح قائم رکھے ہوئے تھے، مولانا شبلی اور منشی احتشام علی کی پارٹیاں آپس میں برسرپیکار، لیکن شروانی صاحب کے تعلقات دونوں سے یکساں ہموار و خوشگوار، گویا دونوں کے درمیان ایک نقطۂ اتصال!

۱۹۲۰ء و ۲۱ء کا زمانہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک خاص ہیجان کا دور ہوا ہے، تحریک خلافت و ترک موالات کا طوفان زوروں پر، ملک کا سواد اعظم شیخ الہند، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، اور علی برادران اور مولانا ابو الکلام کے ساتھ، ساری فضا پر یہی حضرات چھائے ہوئے، ندوہ اور علی گڑھ دونوں زد پر اور ندوہ غریب تو خیر، اصلی اور معرکہ کا مورچہ علی گڑھ تھا، شروانی صاحب مع اپنے گنے چند افراد کے دوسرے کیمپ میں، کچھ نہ پوچھیے کہ کیا کچھ سننا پڑا، کیا کچھ سہنا پڑا، جوش اور ہیجان کے وقت کس کو اپنی زبان و قلم پر قابو رہا ہے، آج گورنمنٹ کے جاسوس کہلائے، اور کل "حبیب الرحمٰن" سے "حبیب الشیطان" مشہور ہوئے! ـــ یہ بندۂ خدا سب کچھ صبر و متانت ہی سے سنتا رہا، سہتا رہا،

ایک زمانہ وہ تھا، ۱۳، ۱۴ سال قبل جب ابو الکلام آزاد کا شمار حلقۂ شبلی میں بندیوں میں تھا،

اور مولانا شروانی کے ہان ان کا تقرب خود ان کے لیے باعث فخر و مباہات تھا، اب دیکھتے دیکھتے وقت وہ آگیا تھا کہ مولانا ابوالکلام لیڈری کے بام بلند پر تھے، اور شروانی صاحب ایک اہل قلم، ورچھوٹے موٹے رئیس کی حیثیت سے جہان تھے وہین قائم ـــــ ظرف و شرافت کے امتحان کا اصلی وقت، دوستی و اتحاد کا نہین، مخالفت و بیزاری ہی کا وقت ہوتا ہے، پٹھان تو اپنی تند مزاجی کے لیے بدنام ہین، اور شروانی پٹھانون ہی کے ایک خاندان کا نام ہے، صدر یار جنگ کی مثال نے دکھایا کہ جنھون نے پٹھانون کو حلم و متانت سے یکسر معریٰ قرار دیا ہے، انھون نے کلیہ قائم کرنے مین جلدی یا غلطی کی ہے! محمد علی جوہر کا ایک شعر خفیف تصرف کے ساتھ ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہین علم[۵] بھی کبھی شروانیون مین ہم

مارچ ۱۹۲۲ء تھا کہ اس وقت کی خوش عقیدگی کے جوش مین ارادہ عرس اجمیر مین شرکت کا کر لیا، لکھنؤ سے ساتھ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے قافلہ کا ہوگیا، ان پر باوجود علم و فضل کے مشائخانہ رنگ غالب تھا، خیر صاحب اجمیر پہنچکر مولانا کی پارٹی کی خوب خاطر داریان ہوئین، شروانی صاحب بھی یہان آئے ہوئے تھے، ذاتی طور پر ہر آستانۂ چشت کے عقیدتمند تو تھے ہی، لیکن یہان اس وقت انکی آمد سرکاری حیثیت سے تھی، مملکت حیدرآباد کے صدر الصدور محکمۂ امور مذہبی کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے، اعزاز و تکریم کے ساتھ ہر طرف سے ہاتھون ہاتھ لیے جارہے تھے، اور دیوان صاحب درگاہ کے مہمان خاص تھے، رات کے وقت محفل سماع مین دیکھا، عام لوگون کی صف مین مسند سے دور ایک معمولی شریک محفل کی طرح بیٹھے ہوئے! ان سے کہین بہتر جگہ پر تو ہم لوگ قابض تھے، وہ ذرا چاہتے تو بہتر سے بہتر جگہ ان کے لیے خالی کرائی جا سکتی تھی، لیکن طبیعت مین یہ انکسار کہ ہر طرح قدرت رکھنے کے

---

۵ اصل شعر مین بجائے 'علم' کے 'عقل' ہے

باوجود اپنے لیے مقام امتیاز کسی طرح گوارا نہین! ــــــ غلبۂ تواضع کے مشاہدہ کا یہی ایک موقع نہ تھا، حیدر آباد، اعظم گڈھ، علی گڈھ، لکھنؤ مین خدا معلوم کتنی بار اور مشاہدے اسی قسم کے پہلے بھی ہو چکے تھے، اور بعد کو بھی ہوتے رہے، ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء مین علی گڈھ مین کسی عالم دین کا تقرر ہونے والا تھا، انتخابی کمیٹی مین مولانا شروانی کے ساتھ یہ خاکسار بھی تھا" انٹرویو کے وقت جب مختلف علما آنے شروع ہوئے، تو صدر مجلس (وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد) کرسی صدارت پر صدر یار جنگ کو بٹھا، کسی ضرورت سے باہر چلے گئے، ان حضرت نے کیا کیا کہ معاً خود بھی کرسیٔ صدارت چھوڑ اپنی جگہ اس بے علم و عمل کو بٹھا دیا! مین شرمندگی سے گڑا جاتا تھا، لیکن ان کے شدید اصرار کے سامنے میرا انکار کیا کچھ چل پایا! ــــــ اور آخر زمانہ مین جب تک ذرا بھی سفر کے قابل رہے، یہ تو بارہا دیکھنے مین آیا کہ لکھنؤ مین ندوہ کی مجلس انتظامی کا جلسہ ہو رہا ہے، اور حضرت صدر یار جنگ اپنی مستقل صدارت چھوڑے ہوئے اپنے ایک نیاز مند ہی کی عزت افزائی کر رہے ہین!

گفتگو بڑی پر لطف ہوتی تھی اور پر مغز بھی، علمی، ادبی، شعری، مذہبی، تعلیمی، سیاسی جو موضوع بھی چاہیے چھیڑ دیجئے، اور گھنٹون اس مجلس سے سیری نہ ہوگی، اللہ نے رئیس کے ساتھ ساتھ دل کا رئیس بھی بنایا تھا، کھاتے پہنتے تو خوب تھے ہی، کھلانے کا ذوق بھی خوب رکھتے تھے، اور جاڑون کے موسم مین شب دیگ کی دعوت بڑے اہتمام سے کرتے، اس دعوت مین جو ایک بار بھی شریک ہو جاتا اس کا مزہ مدتون نہ بھولتا ــــــ تحریر مین ادب سے بڑھکر انشا پردازی کی شان رکھتے تھے، متین، سلجھا ہوا انداز بیان اور ہر طرح گٹھا ہوا، الفاظ ضرورت سے زائد نہ کم، بس ٹھیک اتنے ہی جتنے مؤثر ادائے مطلب کے لیے ضروری ہوتے، گویا ہوشیار اور فنکار معمار عمارت مین گڑھی ہوئی اینٹین چن چن کر اور گن گن کر لگا رہا ہے! ــــــ اور تحریر سے بڑھ کر اس کمال فن کا ظہور تقریر و گفتگو دونون مین، میدان مین خطاب عام ہو تو، اور کمرہ کے اندر خطاب خاص ہو تو، زبان حشو و زوائد سے ناآشنا، میٹھے میٹھے بول گنے چنے ہوئے، دلکشی و تاثیر کے سانچے مین ڈھلے ہوئے، ۱۹۲۶ء مین جب حج و زیارت سے واپس آئے ہین تو حالات سفر خصوصاً مشاہدات

مدینہ منورہ سادہ اور بے ساختہ زبان میں اس انداز سے بیان کرتے کہ سماں بندھ جاتا، خود بھی آبدیدہ ہو جاتے اور سننے والوں کو بھی رلا دیتے،

غیرت دینی اور حرارت ایمانی کے تو کہنا چاہیے کہ پتلے ہی تھے، ۱۹۳۰ء یا ۳۱ء میں اردو کے ایک مشہور رسالہ نے دینی و اعتقادی حیثیت سے بڑا سر اٹھا رکھا تھا، ضرورت اس کی تھی کہ ملت اپنی اجتماعی قوت سے فتنہ کی سرکوبی کرے، خیر وہ تو جون تون کرکے ہو گیا، شروع ۳۲ء میں ایک منزل ایسی آئی کہ قانونی کارروائی کے لیے حکومت وقت کی منظوری لینی ضروری تھی، صوبہ گورنمنٹ کے ہوم ممبر نواب مزمل اللہ خان مرحوم تھے، ان پر مجرم کی طرف سے سفارشوں کا جادو چل چکا تھا، ان اثرات کو باطل کرنے کے لیے درکار ایسی ہی زبردست شخصیت تھی اور وہ صدریار جنگ کی ذات میں ہاتھ آگئی ــــ بیچارہ نے پس پردہ رہ کر وہ سب کچھ کر دیا جو ایک مرد مومن کو ان حالات میں کرنا تھا،

اسے چند سال گذرے تھے کہ ایک اور فتنہ کا سامنا کرنا پڑا، آج سے ۲۵ سال قبل ہمارے جوار میں ایک نوجوان وکیل سجاد علی انصاری مرحوم تھے، پڑھنے لکھنے کے بڑے شائق، بڑے ذہین و شوخ نگار، ذاتی طور پر خدا کے فضل سے پورے مذہبی لیکن مذہبی عنوانات پر قلم اٹھاتے تو معلومات کی سطحیت و بے مغزی کے ساتھ شوخیوں میں بھی حدود سے تجاوز کر جاتے، علی گڈھ میگزین وغیرہ میں طالبعلمی کے زمانہ میں مضمون لکھا کرتے، اور ہم لوگ بھی داد دے دیتے، جس طرح ہر نومشق اور ہونہار اہل قلم کی ہمت افزائی کے خیال سے داد دی جاتی ہے، اللہ کا کرنا کہ ۲۲ء میں تو سجاد مرحوم کا عین شباب میں انتقال ہو گیا، اور اس کے کئی سال بعد بعض "خوش مذاق" بے فکروں نے ان کے مضامین اور ایک ناتمام ڈراما کو کتابی صورت میں چھاپ دیا، اور علی گڈھ کے شعبۂ اردو کے کارکنوں کو خدا معلوم اس میں کونسی ادبی خوبیاں نظر آئیں کہ کتاب کو داخل نصاب کر دیا، اس خاکسار کو جب اس کا علم ہوا تو اس کھلی ہوئی بدمذاقی پر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آیا، اور پہلے با ادب تمام یونیورسٹی کے استادوں

کی خدمت میں عرض معروض کیا مطلق پذیرائی نہ ہوئی، ہار کر اور مجبور ہو کر بلند آواز سے چیخنا چلانا پڑا، اور اب یہاں سے شرکت صدر یار جنگ کی شروع ہوتی ہے، وسط ۳۳ء میں ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی جس کے صدر، موصوف تھے، اس مجلس نے متفقہ طور پر کتاب کو نصاب سے نکلوا دیا، حضرت کی پوری رائے صدق ۸ر نومبر ۳۳ء میں اس کے ڈھائی تین کالموں میں درج ہو چکی ہے، یہاں اس کے چند اقتباسات کافی ہوں گے :-

"علی گڈھ میگزین کی جو بھی عزت کی جائے، بہرحال اردو کے اعلیٰ میگزین میں نہ تھا اس میں مضامین کی اشاعت کسی بلندیٔ خیال یا پاکیزگیٔ ادب کی ضامن نہیں ہو سکتی،

سخت قابل افسوس اور خطرناک یہ پہلو ہے کہ سجاد فلسفہ، اخلاق، مذہب سب ہی سے بیزار ہیں، مذہبی ادب کی عظمت کا ایک فقرہ میں بہ خیال خود خاتمہ کر دیا ہے، گویا ان کے یہاں کوئی اصول زندگی نہیں، بے اصول زندگی محبوب و مقبول ہے، ان کے ہاں تین محبوب ہیں، عورت کا شباب بشرطیکہ وہ عفت و عصمت کی گندگی سے پاک صاف ہو، ایک غرق شباب تحبہ جو کسی کرہ پر داد عیش دے رہی ہو، وفا در پابندی سے سخت بیزار ہو، کہ لات نسوانی کا بہترین نمونہ ہے، اس کی تعریف میں ان کے تمام مضامین رطب اللسان اور گلریز ہیں، اگر کوئی نوجوان عورت نکاح کر کے عصمت و عفت کی زندگی بسر کرے تو وہ خارج از بحث، ننگ انسانیت ہے۔

دوسرا محبوب "معصیت لطیف" ہے، اگر باوجود پوری کاوش کے مجھکو پتہ نہ لگا کہ ان دو لفظوں کا اصلی مفہوم مضمون نگار کے ہاں کیا ہے، پڑھنے والا جس گناہ سے لطف لینا چاہے اسکو محبوب قرار دے لے،

تیسرا محبوب ان کا شیطان اور شیطنیت ہے، اول سے آخر تک شیطان اور شیطنیت کو سراہا ہے، خلاصۂ کائنات قرار دیا ہے، بلکہ پیدائش عالم کی اصل حکمت،

اس کے مقابلہ میں انبیاء کرام، ملائکہ مقربین بلکہ ان کے ڈرامہ "وزخ" کا خدا بھی پست و بے وقعت

ہین، حضرت جبرئیل اور دوسرے مقرب فرشتون کی جس طرح اس ڈراما مین شیطان کے مقابلہ مین تضحیک کی گئی ہے، اس کو پڑھکر ڈراما نگار کی فہم و دانش پر سخت تاسف ہوتا ہے، مذہب کے استخفاف سے محشر خیال اول سے آخر تک بھرا ہوا ہے، مضامین زلیخا، روز حشر مین جس طرح مضامین قرآنی کے مقابلہ مین کم فہمی جسارت اور خیرہ چشمی کا ارتکاب ہے، وہ قابل صد نفرین ہے .... بہرحال میری رائے مین محشر خیال نہ ادب ہے، نہ لٹریچر کی کوئی اعلیٰ خوبی اور تخیل انصب العین کی، اس طرح یہ کتاب مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ درس مین رہنے کا اپنی کسی خوبی کے لحاظ سے حق نہین رکھتی ہے، اس کے اوصاف خود اس کے قدر دانون نے دو تین لفظون مین بیان فرما دیے ہین، "شعلۂ مستعجلہ" "ٹمٹمایا اور جگمگایا" بس یہی پوری تعریف محشر خیال کی ہے، رات کو جگنو جگمگایا، تلملایا، تھوڑی دیر مین شعلۂ مستعجل کے مانند گل اور خاموش، پھر تاریکی اور اندھیرا۔"

اقتباس کے ذرا لمبے ٹکڑے سے مرحوم کی ادبیت، ذوق نظر، مذہبیت سب پر خاصی روشنی پڑ گئی، مسلم یونیورسٹی کی دینیت کے حق مین وہ ایک ستون مستحکم تھے، اور ملت کے سامنے ان کی تحریرین اردو مین ادب صالح کا ایک کامل ترین نمونہ تھین، اب ایسی جامع شخصیت ڈھونڈھنے سے بھی کہان نظر آئے گی؟ ـــــ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ سیکڑون بار کی طرح ایک بار پھر پڑھکر دل تھام لیجئے،

تاریخ اخلاق اسلام

اس مین اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتون سے نقد و تبصرہ ہے،

(مصنفہ مولانا عبد السلام ندوی) قیمت: ۱۲/عہ

"منیجر"

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی

کے

خاندانی اور ذاتی حالات

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے

علی گڈھ کا شروانی خاندان صوبہ متحدہ کا نہایت ممتاز صاحبِ وجاہت اور تاریخی خاندان ہے، مسلمانون کی تعلیم جدید کا مرکز بھی علی گڈھ ہی تھا، اس لیے شروع سے اس کی امداد و اعانت مین شروانی خاندان کا بڑا حصہ رہا، نواب سر مزمل اللہ خان مرحوم شروانی عرصہ تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، اور اس کو لاکھون روپئے کے عطیے دیے، خود مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مسلم یونیورسٹی کے رکن رکین اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری تھے، ان کے علمی و تعلیمی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اس لیے دنیاوی دولت و وجاہت کے علاوہ اس خاندان نے علمی و تعلیمی خدمات انجام دی ہین، اس لیے مولانا شروانی کی یادگار کے سلسلہ مین اس خاندان کی مختصر تاریخ بھی لکھدینا مناسب معلوم ہوا،

خاندانی حالات ہندوستان مین شروانیون کا ورود بہلول لودھی کے عہد مین ہوا، ۱۴۵۱ء مین جب اس بادشاہ نے خاندان سادات سے افغانون کے لیے سلطنت ہند کو حاصل کیا، تو اس نے افغانستان کے قبائل کو ہندوستان آنے کے لیے ترغیب آمیز اور تحریص انگیز خطوط لکھے، چنانچہ نواح

قندھار سے چند سربرآوردہ قبیلے شیروانی، غلزئی، لودھی، سوری، لوہانی، اور نیازی ہندوستان وارد ہوئے، ان میں سے شیروانی، غلزئی اور لودھی حقیقی بھائیون کی اولاد تھے، لودھیون نے اپنی حکومت کا سکہ ہندوستان پر بٹھایا، اور شیروانی خاندان نے مسند وزارت کو زینت دی، اور سپہ سالاری کے عہدۂ جلیلہ کے حقدار قرار پائے، بہلول لودھی کے عہد مین عمر خان شیروانی وزارت کے منصب پر متمکن تھے، ان کا خطاب مسند عالی تھا، ان ہی کی کوشش سے سکندر لودھی کو دہلی کا تخت حاصل ہوا تھا، جب ابراہیم لودھی کا زمانہ آیا تو افغانی امرا، اس کی بے عنوانیون اور مظالم سے تنگ آکر ملک کی مختلف سمتون مین پھیل گئے، اور افغانی قبائل کا جو شیرازہ بہلول لودھی نے باندھا تھا، وہ منتشر ہو گیا، سنہ ۱۵۳۸ء مین جب شیر شاہ نے ہمایون کو ہندوستان سے باہر نکال دیا، تو اس نے بنگالہ مین افغانی قبائل کی مجلس مشاورت منعقد کرکے یہ تجویز پیش کی کہ وہ جس کو چاہین اپنی مرضی سے سلطنت ہند کا مالک بنا دین، چنانچہ عمر خان شیروانی کے فرزند نے اصرار کرکے خود شیر شاہ کو تخت نشین کرایا، شیر شاہی معرکون کے بعد جب سلاطین مغلیہ افغانون سے برہم ہوکر ان کا قلع قمع کرنا چاہا تو خاندان شیروانی کے مورثون نے شاہی تعلقات کو چھوڑ کر مختلف مقامات مین زمینداریون پر قبضہ کر لیا،

مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی مرحوم کی خاندانی روایات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ خاندان شیروانی کے دو بزرگ محمد میر خان اور محمد مغیث خان نے لودھیون ہی کے عہد مین سرکار کول (یعنی علی گڈھ) کے نواح مین آکر آباد ہو گئے تھے، محمد میر خان کی اولاد پہلے موضع پرورہ مین آباد ہوئی، پھر وہان سے دتاولی، برلہ، سہاولی، سنہرہ، دھنساری اور بردلی کے مواضعات مین پھیل گئی، محمد مغیث خان کے تین بیٹے تھے، سالارالدین، رکن الدین اور بہارالدین، موخرالذکر کی اولاد مین سے اب کوئی باقی نہین ہے، سالارالدین کی اولاد بھموری، بھیکم پور، دادون، اکبر پور بڑھا گاؤن حسن پور، کنولی، بھامون، ہنڈولی اور کناوہ وغیرہ مین آباد ہے، محمد مغیث خان کے دوسرے بیٹے رکن الدین کی اولاد

دیہات بہریرا، بھرسولی، علی پور، اٹوا، گھنونہ، طالپور، عنایتی وغیرہ مین آباد ہے، اور رکندی کہلاتے ہین، عبدل خان یا عبداللہ خان شروانی خاندان کے ایک بزرگ تھے جنھون نے جہانگیری عہد مین شاہی ملازمت اختیار کی، پھر تارک الدنیا ہوکر حضرت مخدوم ثنائی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار (واقع گنگیری) پر گوشہ نشین ہوگئے، اور وہین سپرد خاک ہوئے، ان کی قبر وہان اس وقت تک موجود ہے، اس زمانہ مین اس خاندان کے مشاہیر مین نواب یوسف خان ساکن راج مئو وکنا وہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، انکی شان وشوکت کے بڑے قصے مشہور ہین، ان کا سال وفات ۱۶۶۳ء بتایا جاتا ہے، روایات مین یہ بھی مشہور ہے کہ نواب یوسف خان نے عہد شاہجہانی دیکھا تھا، اور شاہجہان کے دربار مین حاضری کا شرف بھی حاصل کیا تھا، اور ان کو شاہجہان آباد بنجبنہ کا موضع عطیۂ شاہی مین ملا تھا، نواب یوسف خان کی والدہ اور بہن یا لڑکی کی قبرین خاص راج مئو مین ابتک موجود ہین، خود نواب یوسف کی قبر چھاڑی گھنگنا وہ مین ایک حصار کے اندر واقع ہے، نواب یوسف خان کی شخصیت اپنے زمانہ مین بڑی ممتاز تھی، اور وہ اس وقت مرجع خلائق تھے، ان کے عروج واقبال کی کوئی انتہا نہ تھی، اس نواح مین دور دور تک کوئی رئیس ان کے مقابلہ کا نہ تھا،

۱۷۴۲ء سے ۱۷۷۰ء تک جاٹ گردی کے زمانہ مین پرگنہ علاقہ اترولی، سرکار کول کے حلقہ مین بوڑھا گانون بھموری، قلعہ چھرہ، دھنساری، وتاولی، برلہ وغیرہ کے علاقے تباہ کر دیے گئے، چنانچہ اس جاٹ شاہی عہد مین شروانی خاندان کے افراد اپنی اپنی زمینداریان چھوڑکر گنگا پار، کٹھیرن اور سہسوان چلے گئے، پھر طوائف الملوکی کا دور ختم ہونے کے بعد گنگا پار سے واپس آکر اپنی اپنی زمینداریو پر قابض ومتمکن ہوئے، گنگا پار سے واپس آنے والون کے سرگروہ بھموری کے باز خان صاحب تھے، جنھون نے اٹھائیس سال کی جلاوطنی مین بہت ٹھوکرین کھائی تھین، اور زمانہ کا بہت گرم وسرد دیکھا تھا، اس لیے جب وہ دوبارہ واپس آئے تو ایک پختہ کار اور تجربہ کار انسان اور زمیندار تھے،

اور انھوں نے اپنی آبائی ریاست پر حسن تدبیر سے قبضہ کیا، بہت سے گاؤں بذریعہ بیع و نیلام حاصل کیے، ۱۷۸۱ء میں پٹہ زمینداری میں بھموری کا تعلقہ نامزد ہوا جس میں دادون بھی شامل تھا، مرہٹوں کے استیلاء کے زمانہ میں یہ انتظام برقرار رہا، اس لیے بازخان صاحب کا اثر و اقتدار برابر ترقی کرتا گیا، اور جب ۱۸۴۳ء میں ان کا انتقال ہوا تو انھوں نے ایک وسیع علاقہ ترکہ میں چھوڑا جس میں ۵۰ گاؤں تعلقہ بھموری بزرگ میں، اور ۲۰ گاؤں تعلقہ تاہ اور ۲۵ گاؤں تعلقہ ہرودئی میں، ۱۴ گاؤں کنکتہ میں اور ۹ گاؤں رہن میں چھوڑے، بازخان خدا ترس بزرگ اور اپنے پیر کے بڑے عقیدتمند تھے، ۱۷۹۰ء میں انھوں نے اپنے پیر کے حکم سے بھیکم پور کو دوبارہ آباد کیا، اور خود مع اہل و عیال بھموری سے وہاں منتقل ہوگئے، بازخان کی شادی ڈوری میں نصیب خان کی لڑکی سے ہوئی تھی، بھموری کے قیام کے زمانہ میں ۱۸۰۵ء میں ان کو اچھلے اہر سے دادون کے مقام پر ایک معرکہ پیش آیا، جس میں خاندان کے لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا، اس معرکہ میں بازخان صاحب کے تلوار اور برچھے وغیرہ کے کئی زخم آئے تھے، ان کا انتقال ۱۸۴۳ء میں جب وہ حج کے لیے جا رہے تھے بمقام بڑودہ ہوا، ان کی قبر بھی بڑودہ ہی میں ہے، ان کی بی بی جو مدینہ بی بی کے لقب سے موسوم تھیں اس سفر میں ساتھ اور بڑی باہمت خاتون تھیں، اس حادثہ کے باوجود انھوں نے حج کا سفر ملتوی نہیں کیا اور اس فریضہ کو مع الخیر پورا کیا،

بازخان صاحب کے تین بیٹے نامور ہوئے، خان زمان صاحب جو شاخ بھیکم پور و حبیب گنج کے مورث اعلیٰ ہیں، حاجی محمد داؤد خان صاحب جو شاخ ظفر منزل علی گڈھ کے جد اعلیٰ تھے، اور حاجی غلام محمد خان جو بعد تقسیم جائداد ۱۸۴۳ء میں بھیکم پور سے دادون منتقل ہوئے،

خان زمان صاحب ہی کی اولاد میں مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی تھے، ان کے والد ماجد کا اسم گرامی محمد تقی خان صاحب تھا،

ولادت | مولانا حبیب الرحمٰن خان کی ولادت بتاریخ ۲۰ شعبان المعظم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء

صبح کے وقت بھیکم پور (ضلع علی گڈھ) میں ہوئی، لیکن مستقل سکونت حبیب گنج میں رہی جس کو ان کے والد ماجد نے ان ہی کے نام پر آباد کیا تھا، حبیب گنج بھیکم پور سے چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے،

تعلیم | کلام پاک ختم ہوا تو تعلیم کی ابتدا فارسی سے ہوئی، جو قدیم مکتبی طریقہ پر گھر ہی پر دی گئی، فارسی نصاب میں سہ نثر ظہوری، مینا بازار اور دیوان غنی وغیرہ ختم کرلیا، تو عربی شروع کرائی گئی، اور قاعدہ طور پر درس نظامی کی تحصیل کرتے رہے، حضرت سید احمد کبیر قدس اللہ سرہ کے فرزندوں میں سے ایک عالم سے عربی کے ابتدائی اسباق لیے، نحو (نیز ابتدائی فقہ) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی تلمیذ مولانا لطف اللہ سے پڑھی، لیکن زیادہ فیض مولانا عبد الغنی خان صاحب سے حاصل کیا، مولانا ممدوح سے فقہ میں شرح وقایہ ہدایہ آخرین کتاب الرہن تک پڑھی، حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر میں جلالین وتفسیر بیضاوی (ابتدائی حصہ) اور علم معانی میں مختصر المعانی پڑھتے رہے، فن منطق کی تکمیل علی گڈھ میں مولانا لطف اللہ سے کی، اور ان ہی سے حمد اللہ، قاضی مبارک، میر زاہد رسالہ مع حاشیہ غلام یحیٰی پڑھا، حدیث میں شمائل ترمذی اور صحیح بخاری (۹ پارے) سبقاً سبقاً شیخ حسین صاحب یمنی بھوپالی سے پڑھی، اور باقی کتابوں کی اجازت وسند بھی لی، حدیث کی دو سندیں سفر حرمین میں حاصل کیں، ایک شیخ حبیب اللہ شنقیتی سے اور دوسری شیخ عمری سے، ایک حدیث مسلسل بالاولیت کی سند میاں سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری سے بھی حاصل فرمائی، قرأت میں قصیدہ جزریہ قاری عبد الرحمن (مدرس احیاء العلوم الہ آباد) سے پڑھا، شاہ ولی اللہ صاحب کی چہل حدیث قاری عبد الرحمن صاحب پانی پتی سے پڑھی،

آگرہ کالجیٹ اسکول میں انٹرنس تک انگریزی تعلیم بھی پائی، اگرچہ انٹرنس کا امتحان نہیں دیا، لیکن یکے بعد دیگرے چار انگریزوں سے انگریزی پڑھنے اور لکھنے کی مشق کرتے رہے،

آگرہ سے واپسی کے بعد علیگڈھ میں محمڈن کالج کے ہڈ ماسٹر مسٹر پوٹ سے انگریزی لٹریچر پڑھا،

تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے زمانہ کے تمام مشاہیر صلحا و علما، مثلاً مولانا عین القضاۃ صاحب لکھنوی، مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب کانپوری، مولانا احمد حسن صاحب جونپوری، مولانا عبد المقتدر صاحب بدایونی، مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی، مولانا ابوالخیر صاحب مجددی، شاہ ابو احمد صاحب بھوپالی، خواجہ الطاف حسین حالی، حبیب عبد روس صاحب یمنی حیدرآبادی سے گہرے مراسم قائم رکھے، اور ان بزرگون سے علمی فیض حاصل کرتے رہے، مولانا شبلی مرحوم سے قلبی لگاؤ پیدا ہوگیا تھا، اور بہت سے علمی و تعلیمی کامون مین ان کے شریک کار رہے،

بیعت کی سعادت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی قدس سرہ العزیز سے حاصل کی تھی،

علمی ذوق کا نشو ونما | علمی ذوق کا آغاز غالب کی اردوے معلی کے مطالعہ سے ہوا جس کو انھون نے اپنے والد ماجد کے حکم سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد گلزار داغ کا مطالعہ کیا، اگرچہ ان کے چچا صاحب نے اس ذوق پر زجر فرمایا، لیکن طبیعت کی افتاد شوق دلاتی رہی، اور رفتہ رفتہ جب وہ زمانہ آیا کہ اپنی مرضی سے کتابون کا انتخاب کرین تو عربی کی متقدمین کی تصانیف کو زیادہ پسند کیا، اسی زمانہ مین کلام پاک کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہے، فارسی مین متاخرین ایران کی سحر آفرینی سے زیادہ مسحور ہوئے، اردو مین شعراے دہلی کا کلام زیادہ پسند تھا، شاعری مین امیر مینائی سے تلمذ حاصل تھا، کئی سال تک استاذ سے مراسلت اور اصلاح کا سلسلہ جاری رکھا، لیکن دونون مین ملاقات نہ ہو سکی، فارسی شاعری کے ذوق کا نشو ونما مولانا شبلی، مولانا عبد الغنی خان، خواجہ سنجر طہرانی، خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی اور خواجہ غلام غوث خان صاحب بیخبر الہ آبادی کی صحبت مین ہوا،

مضمون نگاری ۱۸۸۳ء سے مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا، اور لسان العصر سید اکبر حسین مرحوم نے بلنٹ کی کتاب فیوچر آف اسلام کا اردو ترجمہ مستقبل اسلام کیا، تو اس پر تبصرہ لکھا جو مولوی غلام محمد خان صاحب تپش کے اخبار مشیر قیصر لکھنؤ میں شائع ہوا، یہ غالباً ان کا پہلا مضمون تھا، اس کے بعد مختلف اخبارات مثلاً اودھ اخبار لکھنؤ، آزاد لکھنؤ، البشیر اٹاوہ، سرمور گزٹ، اکمل الاخبار دہلی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں مضامین لکھتے رہے، ۱۸۹۱ء میں رسالہ حسن (حیدرآباد دکن) میں ایک انعامی مضمون ظہیر الدین شاہ بابر پر لکھا، اور اودھ کی طرف سے ایک اشرفی انعام ملی، پھر ملک کے مختلف رسائل دلگداز لکھنؤ، مخزن لاہور، معارف علی گڈھ، زمانہ کانپور، علی گڈھ میگزین، اولڈ بوائے علی گڈھ، خاتون علی گڈھ، اردوئے معلی علی گڈھ، نظام المشائخ دہلی، الندوہ لکھنؤ، اور معارف اعظم گڈھ کو اپنے ادبی، علمی اور تاریخی مضامین سے رونق بخشتے رہے، رسالہ الندوہ (لکھنؤ) کی اڈیٹری میں مولانا شبلی مرحوم کے شریک ادارت تھے، جو ان کی اعلیٰ علمی صلاحیت اور ادبی ذوق کا ثبوت ہے، ۱۸۸۵ء سے ۱۹۴۷ء تک جتنے مضامین لکھے ان کا مجموعہ **مقالات شروانی** کے نام سے علی گڈھ سے شائع ہو گیا ہے۔

تصانیف تذکرۂ بابر کے علاوہ **ذکر حبیب** اور **ذکر جمیل** کے نام سے میلاد مبارک کے لیے دو کتابیں تحریر فرمائیں، **علماے سلف** میں علماے اسلام کے حالات ہیں، **نابینا علماء** میں ان علماء کا ذکر ہے جنھوں نے نابینائی کی حالت میں تحصیل علم اور ناموری حاصل کی، **سیرۃ الصدیق** میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے حالات ہیں، جس کو ابتداءً محمڈن کالج علی گڈھ کے طلبہ کے سامنے بطور لکچر پڑھا تھا، ایک رسالہ **اخلاقی لکچر** ہے جس میں اخلاق اسلامی کا بیان ہے، یہ لکچر بھی محمڈن کالج کے طلبہ کے سامنے پڑھا گیا، اور طلبہ کے نصاب میں داخل ہوا، ۱۹۱۷ء میں امیر خسرو کی مشہور مثنوی مجنون لیلیٰ کو تصحیح کر کے شائع کیا، جس کے شروع میں ان کے قلم سے ۱۱۵ صفحے

کا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے، میر حسن کا تذکرہ شعرائے اردو جو انجمن ترقی اردو سے شائع ہوا ہے، اس کا انشاپردازانہ مقدمہ ان ہی کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کئی رسائل وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے، مثلاً (۱) **اسلامی اخلاق** جس میں اخلاق پر دلنشین بحث کے بعد اچھے اور برے اخلاق کے متعلق حدیثوں کا اردو ترجمہ دیا ہے (۲) **فقہ حنفی** جس میں فقہ حنفی کی تاریخی اور محدثانہ حیثیت پر بحث ہے (۳) **تبصرہ**، یہ تاریخ خطیب بغدادی پر عالمانہ ریویو ہے (۴) **عرض اخلاص** یہ ایک تقریر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمان لڑکیاں زمانہ کے مطابق تعلیم ضرور پائیں لیکن اسلامی شعار اور معاشرت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں (۵) **سرسید کی یاد**، اس کو ۲۸ مارچ ۱۹۳۹ء کو مسلم یونیورسٹی کے یونین ہال میں پڑھا جس میں سرسید کی تعلیمی جدوجہد کا ذکرہ نہایت دلچسپ پیرایہ میں کیا ہے، (۶) **نقش وفا** میں حقوق و فرائض زوجین پر بہت سی مفید ہدایات ہیں (۷) **استاذ العلما** میں حضرت مفتی محمد لطف اللہ مرحوم کے سوانح ہیں، جن کے ضمن میں مفتی عنایت اللہ صاحب شہید اور استاذ الاساتذہ مولوی بزرگ علی صاحب کے کچھ حالات بھی آگئے ہیں (۸) **حالات حزین** آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس میں فارسی کے مشہور شاعر علی حزین پر ایک پرمغز مقالہ پڑھا، اس میں حزین کے کلام کا انتخاب بھی ہے (۹) **ذکر محبوب** میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے حالات ہیں (۱۰) **قرۃ العین** میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سوانح ہیں (۱۱) **مسلمانوں کی تعلیم قدیم** میں قدیم تعلیم کا نصب العین بتایا ہے (۱۲) **تعلیم اسلام کا اثر عمر و صحت پر**۔ اس میں بزرگان دین کی عمر کی درازی کا حال لکھ کر یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی کما حقہ پابندی قیام صحت کا باعث ہوتی ہے (۱۳) **برق تجلی**، اس میں حسن و عشق کی زندگی پر تبصرہ ہے۔

میلاد النبی کے موقع پر کچھ نہ کچھ ضرور تقریر فرماتے، اور اس کو قلمبند کر لیتے۔ بعض ایسے رسائل کے نام یہ ہیں **آفتاب رسالت**، **شان رسالت**، **رسالت عامہ**، **ذکر شریف**،

پیغام رحمت، شمع ہدایت،

اپنی زندگی کے آخری ایام مین اپنے اردو اور فارسی کلام کے علیحدہ علیحدہ مجموعے بھی شائع کیے تھے،

نادر کتب خانہ ان کے علمی ذوق اور اسلامی علوم و فنون سے ان کے شغف کا یہ بین ثبوت ہے کہ انھون نے اپنی محنت سے زر کثیر صرف کرکے ایک بڑا نادر اور قیمتی کتب خانہ جمع کیا جس مین پانچ ہزار سے زیادہ مطبوعہ اور نایاب قلمی عربی اور فارسی کتابین ہین، اردو اور انگریزی کی کتابون کا بھی ایک حصہ ہے، مولانا شبلی مرحوم کا خیال تھا کہ فارسی کلام کا جیسا اچھا ذخیرہ حبیب گنج کے کتب خانہ مین ہے، رامپور اور بانکی پور کے کتب خانہ مین بھی نہین، "حبیب گنج کا کتب خانہ کس طرح جمع ہوا" کے عنوان سے خود مولانا شروانی مرحوم نے معارف (اکتوبر ۱۹۳۱ء) مین ایک مقالہ تحریر فرمایا ہے، اپنی زندگی ہی مین اس کتب خانہ کو مسلم یونیورسٹی پر باضابطہ وقف کر دیا تھا،

قومی مشاغل سیاست سے ان کو ذوق نہ تھا، اور اس سے وہ ہمیشہ کنارہ کش رہے، لیکن مسلمانون کی علمی و تعلیمی تحریکون مین ہمیشہ پیش پیش رہے، ہوش سنبھالا تو علی گڈھ مین سر سید احمد خان کی تحریک کا چرچا سنا، جس مین خود ان کے خاندان کے کئی افراد شریک تھے، مولانا شروانی کو اگرچہ سر سید مرحوم کے بعض مذہبی خیالات سے اختلاف تھا، لیکن اس کے باوجود انھون نے ان کی مفید علمی تحریک مین پورا حصہ لیا، اور سر سید نے ان کو اپنے کالج کا ٹرسٹی منتخب کیا، محسن الملک مرحوم کی معتمدی کے زمانہ مین وہ اہل سنت جماعت کے دینیات کی تعلیم کے سکریٹری مقرر ہوئے، مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے زمانہ مین میرٹھ کمشنری کی کمیٹی کے سکریٹری بنائے گئے، اور اس سلسلہ مین متعدد وفود مین شرکت کی، اور تحریک کی اشاعت مین تقریرین کین، نقد چندہ دیا، اور جب سے مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی برابر کورٹ کے ممبر رہے، اور مختلف اوقات مین یونیورسٹی کی اگزکٹو کانسل، اکیڈمک کانسل کے ممبر مقرر ہوتے رہے، اور دینیات کی تعلیم کے مستقل نگران مقرر ہوئے، ۱۹۱۲ء مین مسلم

یونیورسٹی نے ان کے علمی و تعلیمی خدمات کے اعتراف مین ان کو ڈاکٹر آف تھیولوجی کی اعزازی ڈگری

دیکر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا،

۱۸۹۰ئ؁ سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبر تھے، ۱۹۱۷ئ؁ مین جب صاحبزادہ

آفتاب احمد خان صاحب انگلستان تشریف لے گئے تو مولانا شروانی کانفرنس کے جائنٹ سکریٹری

مقرر ہوئے، مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بعد جب کالج کے آنریری سکریٹری کا عہدہ ختم ہوگیا جو کانفرنس

کا سکریٹری بھی ہوتا تھا تو ۱۹۲۰ئ؁ مین مولانا شروانی کانفرنس کے سکریٹری مقرر ہوئے، اور اپنی

وفات کے کچھ دنون پہلے تک اس عہدہ پر امور رہے، بالکل آخر مین ضعف پیری کی وجہ سے اس سے

مستعفی ہوگئے تھے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بعض اجلاسون کی صدارت بھی فرمائی،

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شروع سے تعلق تھا، وہ اس کے رکن رکین اور بڑے معاون

و مددگار تھے، اس کے تین سالانہ اجلاسون کی صدارت بھی کی،

دار المصنفین سے بھی ان کو قلبی تعلق تھا، ۱۹۳۱ئ؁ سے آخر تک اس کی مجلس ارکان اور مجلس انتظامیہ

کے صدر رہے،

کرنال کے وقف کے بھی نگران تھے، اس کا جو معاوضہ ان کو ملتا تھا، وہ اس کو کسی

نہ کسی ادارہ کو دیدیتے تھے،

آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کے بھی ممبر تھے، ۱۹۲۸ئ؁ مین اس کا پانچوان اجلاس لاہور

مین ہوا، تو اس کے شعبۂ اردو کے صدر مقرر ہوئے، اس موقع پر جو خطبۂ صدارت انھون نے پڑھا،

اس پر تحسین و آفرین ہوئی، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کی بھی ۱۹۳۷ئ؁ مین صدارت فرمائی،

یو، پی ہسٹاریکل سوسائٹی، مسلم گرلز کالج علی گڈھ، اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ، انجمن حمایت

اسلام لاہور اور طبیہ کالج دہلی، آرٹس سوسائٹی لندن سے بھی مختلف شکلون مین وابستہ رہے،

قیام حیدرآباد دکن | نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ کی وفات کے بعد مملکت آصفیہ کے عہدۂ صدر الصدور پر ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں فائز ہوئے، اور اس منصب پر بارہ تیرہ سال رہے، صدر الصدوری سے متعلق دو صیغے تھے، صدارت العالیہ اور امور مذہبی، صدارت العالیہ خالص اسلامی صیغہ تھا، جو حضور نظام کے براہ راست ماتحت تھا، امور مذہبی ایک عاملانہ صیغہ تھا، جو ممالک محروسہ سرکار آصفیہ کے عام مذہبی نظم و نسق سے متعلق تھا، مولانا شروانی نے ان دونوں صیغوں کی اصلاح بڑی توجہ اور سرگرمی سے کی، جس کا صلہ ان کو ۱۳۴۱ھ میں "نواب صدر یار جنگ" کے خطاب کی شکل میں ملا، قیام حیدرآباد کے زمانہ میں یہاں کے باشندوں پر ان کی پاکیزہ سیرت کا بڑا گہرا اثر پڑا، وہاں کی تمام علمی و ادبی تحریکوں میں انکا نمایاں حصہ رہا، اور نواب عماد الملک مرحوم کے ذمہ جو ادبی فرائض تھے وہ ان کے بعد ان ہی کے سپرد کر دیے گئے، اور جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے بعد اس کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے، جامعہ کی مجلس دینیات کے بھی امیر تھے، اور اپنے قیام کے دوران میں کتبخانہ آصفیہ کی مجلس ذیلی کے صدر الصدور اور مجلس انتظامی کے نائب صدر، اشاعت علوم کے صدر، دائرۃ المعارف کے رکن، مدرسہ نظامیہ کی مجلس کے صدر اور انجمن احترام اور اماکن متبرکہ کے نگران اعلیٰ بھی رہے، انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن میں تھی، تو مولانا عبد الحق سے پہلے اس کے بھی سکریٹری تھے،

حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۰ء میں پنشن پائی، حیدرآباد ہی کے قیام کے زمانہ میں غالباً ۱۹۲۶ء میں حرمین شریفین کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے، مکہ معظمہ میں قاری سید عبد الرحیم کو پورا کلام پاک سنایا، اور مدینہ طیبہ میں قاری حسن شاعر سے ان کا رسالہ قرأت پڑھا، ان سے آخری سبق مسجد نبوی میں لیا، اور قرأت کی سند حاصل کی،

حیدرآباد سے سبکدوشی کے بعد ان کی زیادہ تر توجہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی، دارالمصنفین اور ندوۃ العلما کی طرف رہی،

وفات | ۸۶ سال کی عمر مین ایک ہفتہ کی شدید علالت کے بعد ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء مطابق ۲۶ شوال المکرم بروز جمعہ بوقت صبح عالم جاودانی کو سدھارے، دوران علالت مین زیادہ تر اللہ اور رسول کی باتین کرتے رہے، اور انگلیون مین پڑی ہوئی تسبیح کے ورد سے غافل نہ ہوتے، طہارت کا برابر خیال رکھتے، روح پرواز ہونے سے پانچ منٹ پہلے تک باتین کرتے رہے، اور جب آفتاب طلوع ہو رہا تھا، تو روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، جنازہ ایک فوجی کار مین مسلم یونیورسٹی کے کرکٹ لان پر لایا گیا، اس کے پیچھے پیچھے مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ، اور شہر کے حکام، رؤسا اور معززین بھی ساتھ تھے، نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد میت علی گڈھ سے ۲۶ میل دور موضع بھوری متصل حبیب گنج کے خاندانی قبرستان مین لے جائی گئی جہان علم وفضل، امارت و حشمت اور وقار و سنجیدگی کا پیکر پیوند خاک کر دیا گیا، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی تربت کو ہمیشہ ٹھنڈی رکھے، آمین ثم آمین،

حیات شبلی

یہ کتاب تنہا علامہ شبلی مرحوم کی سوانح عمری نہین ہے، بلکہ اس مین انکی وفات ۱۹۱۴ء تک اسکے پہلے کی ایک تہائی صدی کی ہندستان کے مسلمانون کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی، اصلاحی اور دوسری تحریکون اور سرگرمیون کی مفصل تاریخ آگئی ہے، شروع مین جدید علم کلام کی نوعیت، اسکی حیثیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، پھر غلجی اور تغلق کے زمانہ سے لیکر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبہ آگرہ و اودھ کے مسلمانون کی علمی و تعلیمی تاریخ کو بڑی تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے، اور اکابر علما کے حالات بڑی محنت سے جمع کیے گئے ہین،

صفحات ۸۴۶ صفحے، قیمت: مجلد عہ غیر مجلد: لعہ

"منیجر"

ادبیات

ماتم حبیب شبلی

از جناب یحییٰ اعظمی

محو آرام ہوئے جا کے قریب شبلی
آہ رخصت ہوئے دنیا سے حبیب شبلی

دانش افروز کہن، یار ادیب شبلی
ہر نوا جنکی تھی پیغام نقیب شبلی

قدر دانِ ادب و فلسفۂ نعمانی
سر پرستِ ہنر کہنہ و نو شروانی

آج قائم تھا انھیں سے شرف دانش و دین
آہ تھے بزم "معارف" کے وہی صدر نشین

شکل دیکھو تو ز سر تا بہ قدم نور یقین
جن سے اس دور میں تازہ تھی سلف کے آئین

ہو گیا ختم وہ دورِ رنگین افسوس
تیرہ و تار ہوئی مجلسِ دو دین افسوس

کس کو توفیق نے بخشا تھا وہ گل ریز قلم
کس کو قدرت نے دیا تھا وہ دل آویز قلم

گہر افشاں، گہر آرا، گہر انگیز قلم
نظم و نثر و ادب و فن بہم آمیز قلم

جس کے ہر نقش میں رنگینی و رعنائی تھی
جس کے ہر حرف میں صد حسن و دل آرائی تھی

آج سنسان ہوا میکدۂ دانش و فن
اٹھ گیا بزم سے جو ساقیِ صہبائے کہن

ہوگیا نذر خزان حکمت و عرفان کا چمن
وقفِ ماتم ہے جہانِ ادب و شعر و سخن

دیکھیے جن کو شریک غم و ماتم ہیں سبھی
مجلسِ علم "بھی" "دانش کدۂ قومی" بھی

آہ تنہا نہیں یہ حکمت و فن کا ماتم
آہ تنہا نہیں یہ شعر و سخن کا ماتم
ہے حقیقت میں یہ تہذیبِ کہن کا ماتم
سچ جو پوچھو تو ہے اک شیخِ زمن کا ماتم

غم ہے وہ حکمت و اسرار کا عارف نہ رہا
غم ہے سر دفتر "اربابِ معارف" نہ رہا

اب کہاں اٹھتے ہیں اس وضع کے اربابِ کمال
اب کہاں دولت و تقویٰ کی یہ پاکیزہ مثال
قدِ والا تھا کہ سرتا بہ قدم سروِ جلال
جس میں تھا صوت و معنیٰ کا دل آویز جمال

مظہر علم و ہنر پیکرِ زیبائے ادب
جس کی ہر فکر و نظر سرخوشِ صہبائے ادب

اک امیر اور حقائق کے یہ اسرار و نکات
اک رئیس اور معارف کے یہ پاکیزہ صفات
کس نے پائی ہے یہ رخشندہ و تابندہ حیات
صرف اک ذات گرامی کی نہیں ہے یہ وفات

کاروان حکمت و دانش کا رواں ہوتا ہے
قافلہ فضل کا آنکھوں سے نہاں ہوتا ہے

دورِ تابندۂ تحقیق کی رحلت یہ ہے
ثانی شبلی مرحوم کی رخصت یہ ہے
دفن سرتا قدم اسرار کی دولت یہ ہے
علم کے گنجِ گراں مایہ کی تربت یہ ہے

اے خدا تو اسے اب نور سے کر دے معمور
اس پہ ہوتا رہے دائم تری رحمت کا ظہور

حبیب گنج
(ضلع علی گڈھ)

۲۳ جنوری ۱۹۳۶ء

مکتوب شروانی

مولانا شروانی مرحوم ۱۹۳۶ء مین دارالمصنفین تشریف لائے تھے، واپسی پر انھون نے حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کو یہ خط لکھا تھا، جس سے دارالمصنفین کے متعلق ان کے تاثرات کا پتہ چلتا ہے۔

مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

لکھنؤ سے واپسی پر طبیعت ناساز ہوگئی اسلئے اسکے قبل

اللہ تعالیٰ شر و فساد سے دور رکھ کر محفوظ رکھے اور خدمت ملک
و ملت میں ترقی و کامیابی سے ہمیشہ مصروف رکھے ۔

آمین ۔

حضور صاحب کی رونق افروزی فرید کوٹ میں باعث تسکین ا
رواحِ پیشینہ خوش ہو چلی ہوں گی ۔

مطبوعات جدیدہ

اسلام کیا ہے

مولفہ جناب مولانا محمد منظور نعمانی تقطیع بڑی، ضخامت ۲۴۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۳ غیر مجلد ۲ پتہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ، لکھنؤ۔

آج مسلمانوں کو اسلام سے عملاً بہت کم علاقہ رہ گیا ہے، اور ان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اسلام کی حقیقت تک سے ناآشنا اور اسلامی زندگی کے صحیح تصور سے بھی بیگانہ ہے، اور مسلمان نام رہ گیا ہے صرف مسلمان کہلانے کا زیادہ سے زیادہ زبان سے کلمۂ توحید پڑھ لینے اور روزہ و نماز کی ظاہری صورت کسی نہ کسی شکل میں ادا کر لینے کا، اس کے علاوہ دوسرے اسلامی فرائض کا احساس بھی نہیں رہ گیا ہے، اس لیے فاضل مصنف نے جنکو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی روح کو سمجھنے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی خاص توفیق عطا فرمائی ہے، اس کتاب میں کلام مجید اور احادیث نبوی سے اسلام اور اسلامی زندگی کی حقیقت بیان فرمائی ہے، اور اس کے تمام اجزاء توحید، عبادات، روزہ، نماز، حج و زکوٰۃ، تقویٰ و پرہیزگاری، معاملات، اخلاق، معاشرتی حقوق و فرائض، اللہ اور اس کے رسول کی محبت، دین سے تعلق، اس پر استقامت، اس کی خدمت و نصرت و حمایت، عالم برزخ، عالم آخرت، جنت و دوزخ، ذکر اللہ، توبہ و استغفار وغیرہ اسلام کے جملہ ارکان اور اس کے تکمیلی عناصر یعنی اسلام، ایمان و احسان اور اسلامی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو کی پوری تفصیل اور نہایت موثر اور دلنشین انداز میں اس کی تشریح اور اسکی روح بیان کر دی ہے، اور انکا یہ لکھنا بالکل صحیح ہے کہ "اس کتاب میں دین کا پورا لب لباب آگیا ہے، اور قرآن و حدیث سے وہ سب تعلیمات جس اسباق کی شکل میں جمع کر دی گئی ہیں جن سے واقف ہو کر اور جن پر عمل کر کے ایک عامی مسلمان بھی نہ صرف اچھا مسلمان

اللہ تعالیٰ شروانی صاحب کو محفوظ رکھے اور خدمت ملک
و ملت میں ترقی و کامیابی کے ساتھ مصروف رکھے —

آمین —

حمدی[1] صاحب کی روانگی اور زیادہ فکر کا باعث ہوئی
روانہ پٹنہ وغیرہ ہو چکا ہونگا —
مولوی مسعود علی صاحب کو سلام مسنون اور دارالمصنفین
گرامی قدر رفقاء دارالمصنفین کو سلام و دعا کامیابی دارین

معارف :-
[1] حمدی صاحب سے مراد سید ابراہیم صاحب حمدی ناظم کتبخانہ شیخ الاسلام مدینہ طیبہ ہیں جو اس سفر میں شروانی صاحب کے ہمراہ تھے،

بلکہ انشاء اللہ مومن کامل اور ولی بن سکتا ہے"، اس لیے یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر مسلمان اس سے فائدہ اٹھائے، بلکہ اس مین اسلام اور اسلامی زندگی کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے، اس لیے وہ ان غیر مسلمون کے بھی مطالعہ کے لائق ہے جو اسلام کے متعلق غلط خیالات رکھتے ہین، اس سے اسلام کی صحیح تصویر ان کے سامنے آجائے گی،

جمہوریت اور مغربی تحریکین مترجمہ جناب مولوی عبد الوہاب صاحب ظہوری پروفیسر نظامیہ طبیہ کالج، تقطیع بڑی ضخامت ۲۶۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد سے ، پتہ: مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ، حیدر آباد دکن،

ڈاکٹر ایڈورڈ بنس سابق صدر جمہوریہ چیکوسلواکیہ یورپ کے مشہور سیاست دان صحیح جمہوریت کے علمبردار، انسانی برادری مین حقیقی مساوات کے داعی اور امن عالم کے بڑے مبلغ ہین، اس مقصد کے حصول کیلیے انھون نے چند خطبات دیے تھے، جن کا ترجمہ کئی زبانون مین ہو چکا ہے، لائق مترجم نے اسی کا اردو ترجمہ کیا ہی جمہوریت بلا امتیاز رنگ و نسل تمام انسانون اور قومون مین آزادی و مساوات کی داعی اور اس کی بڑی محافظ و پاسبان سمجھی جاتی ہی، اور اس لحاظ سے جمہوری نظام حکومت سارے نظامون مین بہتر سمجھا جاتا ہے، لیکن یورپ مین جو جمہوریت عملاً رائج ہے، وہ صحیح جمہوری روح سے خالی ہے، اور اس مین ایسے بنیادی نقص ہین کہ وہ آزادی مساوات اور قیام امن کے بجائے نسلی تفوق و برتری، قومی و جغرافی تفریق، طبقاتی تقسیم، معاشی ناہمواری، سیاسی کشاکش، اور جنگ و خونریزی کا ذریعہ بن گئی ہے، ان ہی نقائص کی بنا پر اس کے متوازی اشتراکیت، ٹریڈ یونین اور آمریت کی تحریکین پیدا ہو گئین اور قومی خود غرضی اور اقتصادی ناہمواری سے جنگ و جدال کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہو گیا، جس نے نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کے امن و سکون کا خاتمہ کر دیا، اور اس کے انسداد کی جتنی تدبیرین اختیار کی گئین وہ سب بنیادی خرابیون کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکین اور آج پھر دنیا ایک بڑی جنگ کے آتش فشان کے دہانہ پر کھڑی ہے، مصنف نے اس کتاب مین انقلاب فرانس سے لیکر جب سے یورپ مین جمہوریت کی بنیاد پڑی، گذشتہ جنگ کے خاتمہ تک یورپ کے سیاسی انقلابات، یورپ مین

قوموں کی سیاسی و اقتصادی کشمکش، ان کی لڑائیوں، مختلف سیاسی نظریوں اور تحریکوں کی روشنی میں جمہوریت کے نقائص اور اس سے پیدا شدہ مذموم نتائج پر مفصل تبصرہ کیا ہے، جس سے یورپ کا گذشتہ چند صدیوں کا پورا سیاسی مد و جزر اور اسکے اسباب و نتائج سامنے آجاتے ہیں، کتاب کے آخر میں مصنف نے صحیح جمہوریت کے بارہ میں جو حقیقی آزادی و مساوات کی ضامن ہو اور جس کے ذریعہ دنیا میں امن و امان قائم ہو سکے، اپنا مشورہ پیش کیا ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے اور یہ کتاب سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

اردو ادب کے معمار تقطیع اوسط، ضخامت ۱۵۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر،
قیمت عـہ۸ پتہ: سب رس کتاب گھر، خیریت آباد حیدرآباد دکن،

اردو زبان کی تعمیر و ترقی کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے، اور اس میں ہر زمانہ کے نامور شعراء اور ادیبوں کی کوششیں شریک رہی ہیں، اس کتاب میں یہ جدت کی گئی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اور ملا وجہی و غواصی سے لیکر موجودہ زمانہ تک کے اردو زبان کے ان چھتیس شعراء اور ادیبوں کے حالات جنکا اردو کی تعمیر و ترقی میں حصہ رہا ہے، موجودہ دور کے ممتاز اور نامور اہل قلم کی تحریروں سے لیکر مرتب کیے گئے ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ انتخاب کس اصول پر کیا گیا ہے، اس کے دو ہی اصول ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ کسی شاعر یا ادیب کی خدمت زبان مسلم ہو یا یہ کہ جس کے حالات کسی ادیب نے لکھے ہوں، لیکن ان دونوں اصولوں کے لحاظ سے ہر دور کے بہت سے شعراء، ادیبوں اور اردو کے معماروں کے حالات چھوٹ گئے ہیں، پرانے اساتذہ میں، مومن، آتش اور ذوق جیسے معماران اردو کے حالات نہیں ہیں، داغ کا حال ہے مگر امیر مینائی کا نہیں ہے، حالانکہ ان سب کے حالات ممتاز ادیبوں کے قلم سے موجود ہیں، یہ صرف چند نام لکھ دیئے گئے ہیں، ورنہ اس قسم کے بہت سے شعراء خصوصاً نثر نگاروں کے حالات نہیں لیے گئے ہیں، اور موجودہ زمانہ کے تو بہت سے مسلم شعراء اور ادیب چھوٹ گئے ہیں، تاہم اس کتاب میں ایک جدت ضرور ہے، کتاب کے شروع میں اردو زبان کی مختصر تاریخ ہے،

حج بیت اللہ از جناب مولوی محمد داؤد صاحب راز، تقطیع جیبی، ضخامت ۲۲۰ صفحے،
کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، پتہ، شوقی برادران، مالیگاؤں ضلع ناسک،

اردو میں حج کے بہت سے سفرنامے اور مناسک حج پر مستقل کتابیں موجود ہیں، حج بیت اللہ اس موضوع پر نئی جامع کتاب ہے، اس میں عرب کا جغرافیہ، حرمین کی تاریخ، اس کے مقدس آثار و مقامات کی تفصیل، حج کے مناسک، اس کے متعلق ضروری مسائل، اور انکے اسرار و حکم کو اختصار و جامعیت کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے، جس سے مناسک حج، اور اس کے مسائل کے ساتھ حرمین کے متعلق بہت مفید مذہبی و تاریخی معلومات حاصل ہو جاتے ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب حج کی معلم بھی ہے اور حرمین کی تاریخ بھی، تاریخی حالات کی توضیح کے لیے حج کے نقشے اور مقدس مقامات کے متعدد نقشے اور فوٹو بھی دیدیے گئے ہیں،

تلقین حق از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم، اے، تقطیع اوسط، ضخامت ۰، صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱ر، پتہ ادارہ تعلیمات اسلامی نمبر ۳ امین آباد پارک لکھنؤ،

مصنف کی نظر دوسرے مذاہب اور ان کے صحیفوں پر بہت وسیع ہے، یہ کتاب انھوں نے بچوں کے لیے اسلام پر تحریر فرمائی ہے، اس میں دوسرے مذاہب کے مشرکانہ عقائد اور ان کی افسانہ طرازیوں کے مقابلہ میں اسلام کی توحید خالص، اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانوں کی ہدایت کے سامان، وحی کی حقیقت، دوسرے صحیفوں کے مقابلہ میں کلام مجید کی خصوصیات، اس کے خاص خاص مضامین سزا وجزا، روزہ، نماز، حج و زکوٰۃ، اور اسلام کی دوسری اہم تعلیمات، اس کے اوامر و نواہی، حلال و حرام، اخلاق حمیدہ و رذیلہ وغیرہ اسلام کے عقائد و اعمال کو مختصراً سادہ اور سلجھی ہوئی زبان میں تحریر کیا گیا ہے، گو یہ رسالہ بچوں کے لیے لکھا گیا ہے، لیکن افادہ کے لحاظ سے ہر عمر کے اشخاص کے مطالعہ کے لائق ہے،